مدارس میں بطور فن
پڑھانے کے لیے
مکمّل نصاب

کتاب الجغرافیہ

رنگین تصویروں معلوماتی نقشوں اور تازہ ترین اعداد و شمار کے ساتھ

نقشہ خوانی | سیاسی جغرافیہ | طبعی جغرافیہ | قرآنی جغرافیہ









مفتی ابولبابہ شاہ منصور

السعید
AL-SAEED
PUBLICATION

کتاب الجغرافیہ

مدارس میں بطور فن پڑھانے مکمل نصاب

فن جغرافیہ ● نقشہ خوانی ● سیاسی ● طبعی ● قرآنی جغرافیہ

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

السعید
0313-9264214

اجمالی فہرست فن جغرافیہ

اجمالی فہرست قرآنی جغرافیہ

اجمالی فہرست دروسِ جغرافیہ

تفصیلی فہرست فن جغرافیہ

تفصیلی فہرست فن جغرافیہ

تفصیلی فہرست قرآنی جغرافیہ

تفصیلی فہرست قرآنی جغرافیہ

تفصیلی فہرست قرآنی جغرافیہ

تفصیلی فہرست قرآنی جغرافیہ

تفصیلی فہرست قرآنی جغرافیہ

تفصیلی فہرست دروس جغرافیہ

تفصیلی فہرست دروس جغرافیہ

تفصیلی فہرست دروس جغرافیہ

انتساب

ان طلبہ اور قارئین کے نام

جن کی ضرورت اور مطالبے کی تکمیل کے لیے

یہ کتاب وجود میں آئی

مُقدّمہ

ارمانوں کی کسک

فن جغرافیہ کے ساتھ فقیر کے تعلق کی کہانی بھی عجیب ہے۔

جغرافیہ کا شوق بلکہ ضرورت، سیرت و تاریخ کے مطالعے کے دوران پیدا ہوگئی تھی۔ کیونکہ جغرافیائی محل وقوع سمجھے بغیر فن سیرت و تاریخ کما حقہ سمجھ میں آتا ہے اور نہ اس سے درست نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ ہرنئی کتاب کے مطالعے سے اس شوق میں اضافہ ہوتا تھا اور ہر نئے تاریخی واقعے سے گذرتے وقت اس فن کی ضرورت کا احساس بڑھتا جاتا تھا، لیکن کوئی صورت ایسی نظر نہ آتی تھی کہ اس ارمان کی تکمیل ہو سکے یا یہ ضرورت پوری ہو۔ یہاں تک کہ جزیرۃ العرب سے متعلق مضامین لکھنے کا دن آ گیا۔

ہوا یوں کہ جزیرۃ العرب سے متعلق عالمی استعمار کے منصوبوں پر کام کرنے کا موقع ملا تو انہیں سمجھانے کے لیے نقشوں کی ضرورت پڑی۔ یہ نقشے بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیے جاتے تھے اور ان میں دی گئی معلومات اور اعداد و شمار کی صحت اور استناد کا بہت اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس سے رفتہ رفتہ اس فن سے مناسبت پیدا ہوگئی اور اس کی گہرائی اور گیرائی کی حدود اور افادیت سے کافی آگاہی ہوئی۔ بہت سی اہم کتابیں ہاتھ لگیں اور پتا چلا کہ اہل عرب نے اس پر کافی کام کیا ہے اور ان کے ہاں شاہی خاندان کے افراد کو تاریخ اور جغرافیہ دونوں فنون خصوصیت سے پڑھائے جاتے ہیں۔ جہاں تک اہل مغرب کی بات ہے تو انہوں نے اس پر اتنی توجہ دی ہے کہ بچوں کو ابتدائی معلومات سکھانے کے لیے ایسے ایسے کھیل ایجاد کیے ہیں جن کا تصور ہمارے ہاں منتہی گریجویٹوں کی تعلیم کے لیے بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس فن سے تعلق کا پہلا دور تھا۔

پھر نقشہ تیار کرنے کا یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ رفتہ رفتہ احقر کی عادت ہوگئی کوئی بھی انکشافی یا تحقیقی تحریر لکھی جاتی تو اس کی تفہیم اور توثیق کے لیے ساتھ نقشہ یا تصویر ضرور لگتی۔ اس سے بات آسانی سے سمجھ میں آتی تھی اور لکھنے والا اپنی بات کی ثقاہت کے لیے مزید ثبوت کا محتاج نہ رہتا تھا۔ حتیٰ کہ جب یہ مضامین نقشوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوئے تو مقدمہ میں چند سطور کچھ یوں لکھی گئیں:

''نقشے عموماً بولا نہیں کرتے، لیکن خدا کی شان! بہت سے قارئین نے بتایا کہ ان کالموں میں چھپنے والے نقشے نہ صرف یہ کہ سرگوشیاں کرتے ہیں بلکہ بولتے بھی ہیں۔ اس زعم میں ان کا نام ''بولتے نقشے'' ایسا پڑ گیا کہ اب یہ بولیں یا نہ بولیں، بلکہ ان میں کوئی نقشہ چھپے یا نہ چھپے، ان کا نام بولتے نقشے ہی لیا اور پکارا جاتا ہے.........اسلامی صحافت کا جو اصل مقصد ہے کہ مستند معلومات کی فراہمی کے ساتھ تعمیری ذہن سازی، اس کے لیے یہ نقشے ایسے کارآمد اور مؤثر ثابت ہوئے کہ پہلے کالموں کی بنیاد پر نقشے بنائے جاتے تھے، اب نقشوں کی بنیاد پر کالم لکھے جاتے ہیں۔''

یہ سلسلہ چلتا رہا اور بات صرف کالموں کے ساتھ نقشے چھپنے اور کتابی دنیا میں ایک نئی نوع کے اضافے تک محدود رہتی اگر ایک دن مجھے ''مسیحی کتب خانے'' میں ''لینڈ آف دی بائبل'' نامی کتاب نظر نہ آجاتی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک دن یہ عاجز اپنی عادت کے مطابق صدر میں واقع عیسائی حضرات کے کتب خانے میں ''ونڈو شاپنگ'' کر رہا تھا اور کسی اچھی کتاب کی تلاش میں تھا جو ذوق کے بھی مطابق ہو اور جیب کی سکت بھی اسے سہار سکے، کہ اچانک ''لینڈ آف دی بائبل''

پر نظر پڑی۔ کتاب کھولی تو پتا چلا کہ اس طرح کی اور کتابیں بھی ہیں جن میں عیسائی حضرات نے انجیل میں آنے والے مقامات، شہروں، ملکوں، دریاؤں، چشموں وغیرہ کے محل وقوع اور دیگر تفصیلات سے تصویری بحث کی ہے۔ اب ایک تو تغیر وتحریف کے بعد موجودہ انجیل کی استنادی حیثیت کتنی ہے؟ یہ خود مغربی دنیا بھی جانتی ہے، پھر اس میں مذکورہ مقامات کی تشریح کا تحقیق کی دنیا میں کیا درجہ ہے؟ یہ بھی اہل علم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں...... مگر کیا اہل اسلام نے بھی قرآن کریم پر اس طرح کا کام کیا ہے؟ دل نے گواہی دی کہ ضرور کیا ہوگا۔ قرآن کریم تو وہ مخدوم کتاب ہے جس کی قسما قسم جہات سے خدمت کی گئی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ انجیل مقدس کے خدام، عاشقان قرآن سے بازی لے جائیں۔ جب تلاش شروع کی تو جہاں اردو میں مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کی ''جغرافیۂ قرآنی''، ''حیوانات قرآنی'' مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا سجاد قریشی کی ''قصص القرآن'' اور مولانا سلیمان ندویؒ کی ''ارض القرآن'' ملیں، وہیں عربی میں ماشاءاللہ أطلس القرآن، أطلس الحدیث، أطلس السیرۃ اور أطلس التاریخ الاسلامی کے عنوان سے متعدد ضخیم کتب موجود ہیں۔ اس موقع پر اس عاجز نے ''جغرافیۂ قرآنی'' نامی وہ سلسلۂ مضامین شروع کیا جس نے اہل علم میں پذیرائی حاصل کی اور مسلسل تقاضے شروع ہوگئے کہ یہ مضامین کتابی صورت میں کب آئیں گے؟ اس طرح کے مضامین کے کتابی صورت میں آنے میں ایک رکاوٹ تو ان نقشوں پر کام کرنے والے ایسے گرافک ڈیزائنر حضرات کی کمی ہے (کم از کم ہماری دستیابی کی حد تک) جو مطلوبہ چیز کو علامات، حروف، رموز یا رنگوں کی شکل میں صحیح جگہ اور درست انداز میں ثبت کرسکیں، دوسری وجہ ہمارے ہاں رنگین نقشوں اور تصویروں کی اشاعت کا ناقص معیار ہے۔ بہر حال یہ اس فن سے تعلق کا دوسرا دور تھا۔

اس کے بعد اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ فلکیات کی تدریس کے دوران جغرافیہ کی تدریس کی بھی نوبت آگئی۔ فلکیات کے صحیح فہم کے لیے ریاضی اور جغرافیہ دو فنون کی مبادیات سے واقفیت ضروری ہے۔ لہٰذا فلکیات کے دورے میں جغرافیہ اور نقشہ خوانی کا فن بھی شروع ہوگیا۔ جب تدریس کی ذمہ داری سر پر پڑی تو راقم نے سنجیدگی سے اس فن کی طرف پوری توجہ دی اور اردو عربی میں اس فن کی تحقیقی کتابیں جمع کر کے عرق ریزی سے ان کا نچوڑ نکالا۔ تقریباً دو درجن سے زیادہ کتب کی مدد سے 700 صفحات کا ایک خام مسوّدہ تیار ہوگیا جسے ''کتاب الجغرافیہ'' کا نام دیا گیا۔ احقر اسے تدریس سے پہلے مطالعہ تازہ کرنے کے لیے ساتھ رکھتا تھا۔ اصل مآخذ سے بھی مراجعت ہوتی رہتی تھی۔ آج سے پانچ سال پہلے آخری مرتبہ جغرافیہ کا دورہ ہوا جن میں اسلامی تاریخ، ارضِ قرآنی، فلکیات کے مسائل اور وہ آیات واحادیث ساتھ ساتھ پڑھائی جاتی تھیں جن کا تعلق ''آیات آفاقیہ'' (سماویہ وارضیہ) سے ہے۔ اس کے بعد پانچ سال تک یہ سلسلہ منقطع رہا۔ اس دوران دل میں دو ارمانوں کی کسک رہتی تھی: ایک تو یہ کہ ایسی کوئی کتاب نہیں تیار ہوسکی جس کی مدد سے مدارس میں طبعی یا قرآنی جغرافیہ پڑھایا جاسکے۔ دوسرے ایسے ساتھی بھی تیار نہیں ہوسکے جو یہ فن مرتب انداز میں پڑھا سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل یہ ہوا کہ طویل انقطاع کے بعد جب یہ دورہ دوبارہ 1432ھ:2011ء میں منعقد ہوا تو اسباق کے آغاز پر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اس مرتبہ خوب محنت اور توجہ کے ساتھ یہ دورہ ہوجائے۔ اس میں کچھ پرانے ساتھی اساتذہ بھی شریک ہوں اور دروس کو بھی باقاعدہ مرتب کتابی شکل دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا مزید احسان یہ ہوا کہ تخصصات کے طلبہ میں سے ایسے ساتھی بھی مل گئے جنہوں نے کمپوزنگ اور ڈیزائننگ کی ذمہ داری سنبھال لی اور اس طرح سے بالآخر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مذکورہ بالا دونوں ارمان اس دورے کے ساتھ پورے ہوگئے۔ ساتھ ساتھ وہ رنگین صفحات بھی تیار ہوگئے جن کی مدد سے انشاءاللہ اساتذہ کرام ذرا سی محنت سے آسانی کے ساتھ طلبہ کو یہ فن پڑھا سکیں گے۔

یہ تو اس فن کے ساتھ اس عاجز کے تعلق کی سمع خراش داستان تھی جو آپ نے صبر سے سنی۔ اس کا اجر اللہ تعالیٰ آپ کو دے گا۔ اب کچھ باتیں زیر نظر کتاب کے متعلق:

۱- اس کتاب میں زیادہ محنت اس بات پر کی گئی ہے کہ فن جغرافیہ کو اس طرز میں ڈھال کر پیش کیا جائے جو مدارس میں مروج ہے اور جس سے طلبہ مانوس ہیں۔ یعنی تعریف، غرض وغایت، اہمیت اور اقسام سے ابتدا ہو، پھر مبادیات فن میں نقشہ خوانی کے اصول ہوں، پھر مقاصد فن میں ترتیب وار مختلف ابواب کو عقلی

منطقی ربط کے ساتھ آگے بڑھایا جائے تا آنکہ بات خاتمۂ کتاب تک جا پہنچے۔امید ہے کہ اس مانوس طرز پر ڈھالے جانے کے بعد اس کتاب کی مدد سے مدارس میں جغرافیہ کی تدریس یا دورے کروانا آسان ہو جائے گا۔

۲-اس کتاب میں جغرافیہ کی چار بڑی اقسام ہیں۔دو تمہیدی ہیں یعنی طبعی وسیاسی جغرافیہ اور دو مقصودی ہیں یعنی تاریخی وقرآنی جغرافیہ۔سب سے پہلے طبعی جغرافیہ رکھا گیا ہے جو جغرافیہ کی تمام اقسام کی بنیاد ہے۔پھر سیاسی جغرافیہ اور ان دو تمہیدی ابواب کے بعد اصل مقصود یعنی قرآنی جغرافیہ۔جہاں تک تاریخی جغرافیہ کی بات ہے تو اسے سیاسی جغرافیہ کے ساتھ ضمنی کر کے پڑھایا جائے تو زیادہ بہتر رہتا ہے۔اس لیے اس کو مستقل باب کی شکل دینے کے بجائے ان دروس کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جو اس دورے کے دوران محفوظ کیے گئے اور آواز سے کتاب میں منتقل کر کے ''دروسِ جغرافیہ'' کے نام سے اس کتاب کا حصہ بنائے گئے۔ان دروس میں آپ کو ''سیاسی جغرافیہ'' ہی نہیں، ''الغزو الفکری'' بھی ان شاء اللہ خاطر خواہ انداز میں دستیاب ہوگا۔

۳-جن کتابوں سے مراجعت کی گئی ان کا نام آخر میں ترتیب وار دیا گیا ہے تاکہ مدرسین حضرات ان کے مطالعے سے اپنی معلومات کو اور زیادہ وسیع کر سکیں اور ان مآخذ ومراجع کے ذریعے انہیں مزید استفادے میں آسانی ہو۔کتابوں کے ساتھ ان ''سافٹ ویئرز'' کی رہنمائی بھی دی گئی ہے جن کے ذریعے مغرب میں بہت آسانی سے بچوں کو فنِ جغرافیہ ازبر یاد کروا دیا جاتا ہے۔ان سے استفادے کو طلبہ پر لازم کر دیں۔چند دن میں ان شاء اللہ آپ خود بہترین نتائج ملاحظہ فرمائیں گے۔

٤-جغرافیہ پڑھنے پڑھانے والے حضرات سے درخواست ہے کہ اس فن کو آسان اور دلچسپ بنانا ہے تو اسے بڑے نقشے پر چھڑی کی مدد سے (یا ممکن ہو تو پروجیکٹر پر لیزر لائٹ کی مدد سے) پڑھائیں (پروجیکٹر نہ ہو تو بڑے سائز کا کمپیوٹر لے لیں) اس طریق سے وقت بھی کم خرچ ہوگا اور تفصیلات بھی بآسانی ذہن نشین ہوں گی۔نقشے کے بغیر جغرافیہ پڑھانا ایسا ہی ہے جیسا بچوں کو کوہِ قاف کی داستان سنانا۔جس میں آخر تک سننے والوں کو پتا ہی نہیں چلتا کہ کہانی کا مرکزی کردار جن تھا تو کس پہاڑ پر رہتا تھا یا پری تھی تو کون سی پہاڑی پر بستی تھی؟ بڑے سائز کے نقشے اور گلوب درس گاہ میں جا بجا لگا دیں تاکہ طلبہ سبق کے بعد ان کا مطالعہ کر سکیں۔ہر شہر کے اردو بازار سے بآسانی یہ نقشے اور گلوب مل جاتے ہیں۔اور سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب کے ہر باب کے آخر میں اس کے متعلق سولہ سولہ صفحات رنگین تصویروں اور جدید نقشوں سے مزین کر کے دیے گئے ہیں۔آپ کہیں نہ جائیں، انہی صفحات پر پورا جغرافیہ پڑھا سکتے ہیں۔نہ ہینگ لگے گی نہ پھٹکری اور ان شاء اللہ رنگ چوکھا ہی چوکھا آئے گا۔

۵-ایک اور چیز جو طلبہ کو متوجہ کرنے اور مطمئن رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں مقدماتِ فن اور طبعی وسیاسی جغرافیہ پڑھاتے وقت مسلسل ذہن بناتے رہیں کہ اس فن سے اصل مقصود تاریخی اور قرآنی جغرافیہ ہے۔ان دونوں کو سمجھنے کے لیے طبعی وسیاسی جغرافیہ سمجھنا ضروری ہے۔اس لیے ان دونوں کو توجہ سے ضبط کریں تاکہ اصل مقاصدِ فن میں رسوخ حاصل ہو سکے۔ساتھ ساتھ تاریخی وقرآنی جغرافیہ کا ہلکا ہلکا ذائقہ بھی چکھاتے جائیں۔اس سے ان شاء اللہ دلچسپی آخر تک برقرار رہے گی اور فن بھی ذہن نشین ہوتا جائے گا جو ہمارے طلبہ کو تاریخ وسیاست اور خطابت وصحافت میں بہت کام آئے گا۔

٦-مدرسین حضرات ہرگز یہ نہ سوچیں انہوں نے یہ فن خود نہیں پڑھا تو طلبہ کو کیسے پڑھائیں گے؟ یہ کتاب مطالعہ کریں۔ان میں دی گئی معلومات کو آخر میں دیے گئے تصویری صفحات پر منطبق کریں۔ساتھ دی گئی سی ڈی میں سے آڈیو سنیں اور ویڈیو دیکھیں۔مشہور مآخذ ومراجع بھی ساتھ رکھ لیں۔مشہور سافٹ ویئرز پر چند گھنٹوں کی مشق کر لیں۔ان شاء اللہ انہیں پڑھاتے وقت کوئی دقت نہیں ہوگی بشرطیکہ انہوں نے اوپر دی گئی ہدایات کو ملحوظ رکھا، یعنی کم از کم کتاب کے باب کے آخر میں دیے گئے رنگین صفحات سامنے رکھ کر پڑھایا اور تاریخی وقرآنی جغرافیہ کے لیے شروع سے ذہن بنانے کے ساتھ ان کا ہلکا سا ''ذائقہ'' بھی چکھاتے رہے۔

نظرِ ثانی کے دوران بہت سے ایسے مقامات آئے جن کے متعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے مقبول عام سفرناموں کے سلسلے ''جہانِ دیدہ''، ''دنیا مرے آگے'' اور ''سفر در سفر'' میں جابجا انتہائی مفید معلومات اور چشم دید مشاہدات ملتے ہیں۔ ان کو حسب موقع شامل کر کے حوالہ دے دیا گیا ہے۔ اس سے فنِ جغرافیہ و تاریخ یہ اضافی افادی جہت بھی قارئین پر آشکار ہوگی کہ ان فنون سے واقفیت کی بنا پر تقریر یا تحریر میں کتنی جان اور کسی تقریر و تحریر کے سمجھنے میں کتنی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

آخر میں یہ گذارش کہ اپنی طرف سے اس کتاب کو آسان اور جامع بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ جو چیز حروف میں ہے وہی رنگین صفحات میں نقوش میں ہے۔ تمام مآخذ اور حوالہ جات بھی آخر میں دیے گئے ہیں تا کہ از خود مزید مطالعہ کر کے اس فن میں بصیرت حاصل کی جا سکے۔ کئی مرتبہ ''نظرِ ثانی'' بھی کی گئی ہے۔ اس کے باوجود کسی چیز کی کمی، ابہام یا غلطی موجود ہو تو اس عاجز کو ضرور مطلع فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے شایانِ شان اجر آپ کو عطا فرمائیں گے۔

شاہ منصور

جمادی الاولیٰ: 1434ھ

علم الجغرافیہ

تعریف

لغوی: جغرافیہ یونانی لفظ ہے۔ یہ دوالفاظ کا مرکب ہے۔ جیو(GEO) اور گرافی(GRAPHY)

جیو: زمین۔ گرافی: لکھنا، تشریح کرنا۔ جغرافیہ: ''زمین کے حوالے سے لکھنا، تشریح کرنا''

اصطلاحی:

(1) ''ایسا علم جس میں کرۂ ارض کی سطح کا مطالعہ کیا جائے۔''

(2) ''ایسا علم جس میں انسان اور اس کے ماحول کے درمیان باہمی تعلق کا مطالعہ کیا جائے۔''

خلاصہ: سطح زمین پر دو طرح کے خطے ہیں: (1) ''قدرت ساز خطہ'' (2) ''آدم ساز خطہ''

جغرافیہ زمین پر ''قدرتی نقوش'' (سمندر، پہاڑ، صحرا) یا ''انسانی تصرفات'' (شہر، بستیاں، مصنوعی نہریں وغیرہ) کے مطالعہ کو کہتے ہیں۔

اہمیت وفوائد

علم جغرافیہ علمی و عملی دونوں اعتبار سے بہت ہی کارآمد علم ہے۔ یہ تحقیق و تجسس اور مطالعہ و اکتشاف پر زور دیتا ہے۔ یہ ذاتی اور علاقائی سطح سے ہٹ کر عالمی اور بین الاقوامی نظریات پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ انسانی ذہن کو وسعت بخش کر اسے ملکی اور عالمی سطح پر سوچنے کا شعور پیدا کرتا ہے۔ یہ خوبیاں دوسرے علم میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں اس کے افادی پہلوؤں (Utilitarian Aspects) پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

1-علمی فوائد:

علم جغرافیہ دنیا کی بہت سی چیزوں کی حقیقت کو سمجھنے اور اچھی طرح جاننے میں بہت مدد دیتا ہے۔ مشاہدہ کے ذریعے ذہن کو وسیع کرتا ہے۔ کائنات میں مختلف امور کی طبعی وجوہات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مختلف تاریخی و سیاسی واقعات کے حوالے سے فہم و فراست پیدا کرتا اور تجزیہ و تبصرہ کے قابل بناتا ہے۔ انسانوں میں تحقیق و تجسس اور مہم جوئی کا شوق پیدا کرتا ہے۔

2-نظریاتی فوائد:

علم جغرافیہ کی نظریاتی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ یہ علم اپنے گھر، وطن، غیر ممالک اور دنیا کے متعلق انسانی جذبات کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ یہ طالب علم کے ذہن میں اپنے گھر (سارا عالم اسلام ہمارا گھر ہے) اور اپنے وطن (سارا جہاں ہمارا وطن ہے) کے متعلق محبت اور ایثار کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہ علم دین، وطن

اور برادری (ہر کلمہ گو ہماری برادری میں شامل ہے) سے محبت کا صحیح تصور اور مکمل جذبہ پیدا کرتا ہے۔اس کے علاوہ یہ دنیا کے مختلف ملکوں کے متعلق یا ساری دنیا کے بارے میں طالب علم کے ذہن میں ایک خاص سوچ، ایک خاص طرز فکر اور ایک خاص زاویہ نظر پیدا کرتا ہے۔نظریاتی افق کو وسیع کر کے عالمی سوچ، عالمی طرز فکر اور عالمی رجحان پیدا کرتا ہے۔علاقائی یا لسانی نظریات جسے ہم نسلی تعصب یا قوم پرستی کہتے ہیں، سے بچنے کی فکر پیدا کرتا ہے۔آج کل کی دنیا میں جتنے بھی نظریات مثلاً کمیونزم، سوشلزم اور جمہوریت ہیں، وہ بنیادی طور پر جغرافیائی نظریات پر ہی مبنی ہیں۔مثال کے طور پر سوشلزم اور کمیونزم کو ہی لے لیجیے۔روس کے عوام انتہائی درجے کے وطن پرست ہیں، لیکن وہ اپنے مادی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے بین الاقوامیت کا پرچار کرتے ہیں۔یہی حال برطانویوں کا ہے۔ شیکسپیئر کی سرزمین کے یہ فرزند وطن پسندی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، لیکن اپنے قومی مقاصد کے حصول کی خاطر بات بات میں (کامن ویلتھ) کا نام لیتے ہیں۔ صرف مسلمان ہیں جو اس علم میں پیچھے رہنے کے ساتھ ساتھ جذبۂ حب الوطنی اور جذبۂ اخوت اسلامی سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

علم جغرافیہ حب الوطنی (پیچھے گزر چکا ہے کہ عالم اسلام ہمارا گھر اور سارا جہاں ہمارا وطن ہے) کے جذبات کو نہ صرف پیدا کرتا ہے، بلکہ ابھارتا بھی ہے۔کسی نے سچ کہا کہ حب الوطنی علم جغرافیہ کے بطن سے جنم لیتی ہے۔جغرافیہ دان محبِ وطن شہری ہوتے ہیں۔کیونکہ وہ دنیا کے لوگوں کے اپنے ملکوں سے رشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس مطالعے کے نتیجے میں ساری عمر وطن دوستی کے جذبات میں سرشار رہتے ہیں۔

3-صحافتی فوائد:

روزمرہ کی خبروں سے علم جغرافیہ کا بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔یہ امورِ رَواں اور امورِ گزشتہ (یعنی موجودہ حالات اور ماضی کی تاریخ) کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔امورِ رَواں سے مراد ایسے واقعات یا حالات ہیں جو دنیا میں ابھی ابھی وقوع پذیر ہوئے ہیں۔امورِ گزشتہ وہ واقعات ہیں جن کو وقوع پذیر ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے بیشتر واقعات کا تعلق علم جغرافیہ سے ہے۔مثلاً کسی بھی ملک میں سیلاب یا زلزلہ آجانا، آتش فشاں پھٹ جانا یا سیاسی یا فوجی انقلاب آجانا، وغیرہ۔کچھ واقعات سیاسیات یا معاشیات سے تعلق رکھتے ہیں: مثلاً کہیں معدنیات کا دریافت ہو جانا، ملکوں کا آپس میں اتحاد و اتفاق قائم کر لینا، ان کا تعلق بھی علم جغرافیہ سے ہے۔روزانہ کا اخبار ایک قسم کی جغرافیہ کی کتاب ہے، جس کی خبروں کا پس منظر علم جغرافیہ ہی ہوتا ہے۔اس پس منظر کو جانے بغیر خبروں کی حقیقت اور ان کے اصلی مفہوم کو سمجھنا مشکل ہی نہیں بعض اوقات ناممکن بھی ہے۔ہر روز اخبار میں ایسی بہت سی خبریں ہوتی ہیں جن کا تعلق علم جغرافیہ ہی سے ہوتا ہے اور انہیں صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو علم جغرافیہ سے واقف ہوتا ہے۔اس لیے اس بات میں کافی صداقت پائی جاتی ہے کہ علم جغرافیہ کا طالب علم ایک بہترین اخبار بین ہوتا ہے۔وہ خبر سن کر سر دھننے کے بجائے اس کا تجزیہ کرتا اور اس کے مضمرات کا درست اندازہ لگاتا ہے۔اسے خبر میں غلط فکر سمو کر گمراہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص یا طالب علم روزانہ اخبار یا ہفتہ وار رسالے کا مطالعہ جغرافیہ کی روشنی میں کرتا ہے تو اسے اپنے اردگرد کے واقعات یا حالات کا بہتر طریقے سے علم ہوگا اور اس کا علم اس شخص یا طالب علم کے علم سے زیادہ وسیع اور سچائی پر مبنی ہوگا جو روزانہ اخبار یا ہفتہ وار رسالہ تو پڑھتا ہے لیکن جغرافیہ نہیں جانتا۔اس مثال سے ثابت ہوا کہ اخبار یا رسالے کا مطالعہ کرنے کے لیے جغرافیہ شمع کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کی روشنی میں طالب علم اور دیگر حضرات عالمی واقعات اور ان کے پس منظر سے اچھی آگاہی حاصل کرتے ہیں۔جو حضرات جغرافیہ نہیں جانتے ان کے لیے اخبار پڑھنا یا خبریں سننا وقتی تفریح اور ذہنی عیاشی کے سامان ہیں۔جغرافیہ کا طالب علم نہ صرف خبروں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے بلکہ صحافت کے تقاضوں کو بھی آسانی سے نبھا سکتا ہے۔

4-مہماتی فوائد:

چونکہ علم جغرافیہ پڑھنے والے کے دل میں دلچسپی اور ذہن میں تجسس (کسی چیز کو اور زیادہ جاننے کا شوق) پیدا کرتا ہے اس لیے یہ دونوں آپس میں مل کر اس میں مہم جوئی کی ذہنیت پیدا کرتے ہیں۔ مہم جوئی سے مراد کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دینا ہے۔ مثلاً: کائنات کے سربستہ رازوں کا کھوج لگانا، کسی پہاڑ کی بلند ترین چوٹی کو سر کرنا، کسی بہت بڑے سمندر کو لکڑی کی بنی ہوئی کشتی میں عبور کرنا، کسی گھنے اور تاریک جنگل میں سے گزرنا، کسی برفانی علاقے کو پار کرنا، جنگل کے بڑے بڑے جانوروں کا شکار کرنا، دنیا کے گرد ہوائی جہاز یا بحری جہاز میں چکر لگانا، کسی آبنائے کو تیر کر پار کرنا، جنگ کے دوران دشمن کے بحری اڈوں یا بحری جہازوں کو چپکے سے حملہ کر کے تباہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ علم جغرافیہ خاص طور پر طالب علموں میں یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ یہ دلچسپی اور تجسس کے ذریعے انہیں مہم جوئی کی طرف مائل یا آمادہ کرتا رہتا ہے۔ یہ انہیں نڈر، تُند خو، جانباز اور متحرک بناتا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو ہر تعلیمی نصاب، پڑھنے والوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جغرافیہ میں یہ خصوصیات پہلے ہی سے موجود ہیں۔

5-سیاحتی فوائد:

علم جغرافیہ جسمانی اور ذہنی طور پر سیر و سیاحت کرنے والے دونوں قسم کے شائقین کے لیے مفید ہے۔ یہ سیاحت کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ اس خواہش کو جسمانی اور ذہنی دونوں طریقوں سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ جسمانی طور پر سیر و سیاحت کروانے کے علاوہ یہ ان حضرات کو بھی سیر کرا دیتا ہے جو دولت خرچ کرنا نہیں چاہتے یا جن کے پاس دولت نہیں ہے۔ ایسے حضرات بذریعہ جغرافیائی کتب و رسائل، نقشہ جات، تصاویر اور کیلنڈر گھر بیٹھے دوسرے ملکوں کی سیر کر سکتے ہیں۔ جغرافیہ ایسے حضرات کا نہ صرف وقت بچاتا ہے، بلکہ ان کی دولت کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ اس لحاظ سے جغرافیہ ایک سیاحتی رہنما (ٹورسٹ گائیڈ) کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ دنیا میں اکثریت ایسے طلبہ و شائقین حضرات کی ہے جو دنیا کا سفر جغرافیائی کتب ہی کے ذریعے کرتے ہیں۔

اقسام

جغرافیہ کی چار بڑی اقسام ہیں:

1-طبعی جغرافیہ:

زمین کی طبعی ساخت (قدرتی نقوش) اور خصوصیات کا مطالعہ۔ یہ قسم تمام اقسام کی اصل ہے۔ زمین کا طبعی جغرافیہ قدرتی ہے اور عموماً غیر مبدّل ہوتا ہے۔ صدیوں بعد کہیں سمندر چڑھ جائے یا دریا اتر جائے تو طبعی جغرافیہ تبدیل ہو جاتا ہے ورنہ ایک ہی رہتا ہے۔

2-سیاسی جغرافیہ:

زمین کی سیاسی تقسیم (مردم ساز نقوش) کا علم۔ یہ تقسیم مصنوعی ہے اس لیے تغیر پذیر ہے۔ وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے۔

3-ریاضیاتی جغرافیہ:

زمین کے رقبے، حجم، فاصلے اور کشش وغیرہ کی پیمائش۔ طول البلد و عرض البلد کی تحدید۔

4-معاشی وتجارتی جغرافیہ:

(1) معاشی جغرافیہ: قدرتی ذرائع آمدنی (نباتات، معدنیات وغیرہ) کے حوالے سے معاشی سرگرمیوں کا مطالعہ۔

(2) تجارتی جغرافیہ: درآمدات وبرآمدات کے حوالے سے تجارتی سرگرمیوں کا مطالعہ۔

5-قرآنی جغرافیہ:

اس سے مراد مطالعۂ ارضِ قرآن ہے۔ یعنی قرآن کریم میں جن مقامات (ملک، شہر، پہاڑ، دریا، سمندر، چشمہ وغیرہ) کا تذکرہ آیا ہے، ان کے محل وقوع اور دیگر تفصیلات کی روشنی میں قرآن کریم کی نصیحت یا عبرت کو سمجھنا۔ حدیث شریف، سیرت اور تاریخ کا بھی اس طرح مطالعہ کیا جائے تو جغرافیہ کی مزید تین شاخیں نکل آئیں گی: حدیثی جغرافیہ، سیرتی جغرافیہ، تاریخی جغرافیہ۔ اس مختصر کتاب میں ہم ان شاء اللہ یہ چار قسمیں پڑھیں گے: (1) طبعی جغرافیہ۔ (2) سیاسی جغرافیہ۔ (3) تاریخی جغرافیہ۔ (4) قرآنی جغرافیہ۔

غرض وغایت

علمِ جغرافیہ کی غرض وغایت یہ اہم امور ہیں:

1- زمین پر جابجا بکھری قدرت کی نشانیوں (آیات الٰہیہ) کی معرفت اور اُس کے نتیجے میں قدرت الٰہیہ کا کامل استحضار۔

2- عبادات (نماز [یعنی سمت قبلہ، غیر معتدل علاقوں میں اوقات نماز وغیرہ پہچاننا] حج، جہاد) اور معاملات (بین الاقوامی تجارت اور تجارتی اسفار وسیاحت) میں سہولت۔

3- علم تاریخ میں بصیرت، عالمی سیاست کے اسرار ورموز سے واقفیت، الغزو الفکری کا فہم۔

مشہور مسلمان جغرافیہ دان

علم جغرافیہ کی اہمیت کے پیشِ نظر مسلمان اہلِ علم نے اس پر بہت زیادہ توجہ دی۔ پہلے زمانے کے مسلمان دنیا بھر میں تبلیغ، جہاد، حصولِ علم، سیاحت اور تجارت کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔انہوں نے طرح طرح کے جغرافیائی اکتشافات کیے اور اس فن کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔اس کا فائدہ پوری امت کے اہلِ علم، مجاہدین اور تاجروں کو ہوا۔ذیل میں چند مشہور مسلمان جغرافیہ دانوں کا تعارف دیا جاتا ہے۔

1-خوارزمی:

ان کا نام ''عبداللہ بن محمد بن موسیٰ خوارزمی'' تھا۔آپ مشہور علم دوست اور علم پرور عباسی خلیفہ ''مامون'' کی سرپرستی میں ان کے قائم کردہ ادارے ''دارالحکمت'' میں علمی خدمات انجام دیتے تھے۔آپ نے 232ھ (847م) میں وفات پائی۔خوارزمی کی شخصیت عالمگیر شہرت رکھتی ہے۔اِن کی شہرت کی ایک اہم اور بنیادی وجہ ریاضی پر اُن کی مشہورِ زمانہ کتاب ''المختصر فی حساب الجبر والمقابلۃ'' ہے۔خوارزمی کے علم جغرافیہ کے لیے انجام دیے جانے والے کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ان میں سے ایک کارنامہ ''صورۃ الارض'' نامی کتاب کی تصنیف بھی ہے، جس میں انہوں نے مختلف قدرتی اور انسانی مظاہر (یعنی قدرتی اور آدم ساز خطے مثلاً: پہاڑوں، سمندروں، جزیروں، نہروں اور شہروں) کو ان کے ناموں کی ترتیب کے اعتبار سے ارضیاتی نقشہ جات میں دقت اور تصحیح کے ساتھ ذکر کیا ہے۔اس کے لیے خوارزمی نے ''علم الفلکیات'' کے ایک اہم ترین مفروضے یعنی کرۂ ارض کی سات براعظموں میں تقسیم کا سہارا لیا اور نقشہ سازی کے فن میں عمدگی اور جدت طرازی کی ایک مثال قائم کردی۔بعض مغربی مصنفین نے ان کی کتاب پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے: ''پوری مغربی تہذیب اس کتاب کے مقابلے میں کوئی ایک ایسی تصنیف پیش نہیں کرسکتی جس پر وہ فخر کرسکے۔بلاشبہ اس کتاب نے ''علم جغرافیہ'' پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔''

2-یعقوبی:

ان کا نام ''احمد بن جعفر بن وہب یعقوبی'' اور کنیت ''ابوالعباس'' تھی۔ان کی پیدائش بغداد میں ہوئی اور 298ھ (891 عیسوی) میں وفات پائی۔وہ اپنی جوانی کے ابتدائی زمانے ہی سے سیاحت اور سفر کے شوقین تھے۔ان کو شہروں کے احوال، ان کو ملانے والے راستوں اور ان کے درمیان مسافتوں کی پیمائش سے واقفیت حاصل کرنے کی دُھن تھی۔ان کی کتاب ''کتاب البلدان'' کے مخطوطے کا شمار ہمارے زمانے میں پائے جانے والے اہم ترین جغرافیائی مخطوطات میں سے ہوتا ہے۔یعقوبی کا اندازِ تحریر سہل اور سلیس تھا۔وہ نہایت خوبصورت انداز میں اپنی معلومات قارئین کے سامنے پیش کرتے تھے۔انہوں نے معمورۂ ارض کو جہاتِ اصلیہ اربعہ یعنی مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کا اعتبار کرتے ہوئے چار اقسام میں تقسیم کیا۔براعظموں کو سلطنتوں اور ملکوں میں تقسیم کے اعتبار سے یعقوبی کو علم جغرافیہ میں مجدّد سمجھا جاتا ہے۔

3-ہمدانی:

ان کا نام ''حسن بن احمد بن یعقوب ہمدانی'' اور کنیت ''ابومحمد'' تھی۔ یہ یمنی تھے۔ یمن میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ یمن کے شہر ''صنعاء'' میں 280ھ میں ولادت ہوئی اور 334ھ میں وفات پائی۔ وہ علم تاریخ کے بحرِ بیکراں تھے۔ جغرافیہ، فلکیات اور شعر گوئی سے بڑی اعلیٰ درجے کی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کا شمار ''براعظمی جغرافیہ'' پر قلم اٹھانے والوں میں ایک بہترین لکھاری کے طور پر ہوتا ہے۔ اس صنف میں ان کی کتاب ''صفۃ جزیرۃ العرب'' اپنی نوعیت کی انوکھی کتاب شمار ہوتی ہے۔ ہمدانی نے اپنی اس کتاب کی ابتدا بطور تمہید ''ریاضیاتی جغرافیہ'' سے کی اور طول البلد کے خطوط اور عرض البلد کے دائروں کی تعیین کے مختلف طریقوں کو تفصیل سے بیان کیا اور ''بطلیموس'' کی پیروی کرتے ہوئے زمین کو سات براعظموں میں تقسیم کیا اور آخر میں کتاب کے بنیادی موضوع یعنی ''جزیرۃ العرب کی ارضیاتی تقسیم'' کو بیان کرتے ہوئے سرزمینِ عرب کو نجد، تہامہ، حجاز، عروض اور یمن پانچ مناطق میں تقسیم کیا اور ہر ایک کی تفصیل بیان کی۔

4-البیرونی:

ان کا نام ''محمد بن احمد بیرونی'' تھا۔ یہ بیرون میں 362ھ (973ء) میں پیدا ہوئے اور علم المثلث، ریاضی، جغرافیہ، علم نجوم، کیمیا اور کئی علوم میں مہارت حاصل کی اور بالآخر ان میں امامت کے درجے تک پہنچے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات میں ریاضی، فلکیات اور بعض دیگر علوم سے خصوصی بحث کی۔ علم جغرافیہ میں البیرونی کی مشہور تصنیف ''علم البحار'' ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات میں خصوصی طور پر اس نکتے پر زور دیا کہ خطِ استوا کے جنوب میں واقع علاقوں میں اس وقت سردی کا موسم ہوگا جب ہمارے یعنی خطِ استوا کے شمال میں واقع علاقوں میں گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ بعد میں یہی نکتہ اس نظریہ کی بنیاد بنا کہ کرۂ ارض کے چار مختلف موسم اس کے قطبی محور پر 23.5 درجے کے جھکاؤ کے ساتھ گھومنے کا شاخسانہ ہیں۔ البیرونی کی جغرافیہ کے موضوع پر تصنیفات میں سے ایک اہم تصنیف ''تحدید نہایۃ الاماکن لتصحیح مسافات المساکن'' ہے جو اپنے موضوع پر سند سمجھی جاتی ہے۔

5-البکری:

ان کا نام ''عبداللہ'' اور کنیت ''ابوعبید'' تھی۔ اندلس کے شہر قرطبہ میں 432ھ میں ولادت اور 487ھ میں وفات ہوئی۔ ان کو بلا اختلاف بلاد اندلس کا عظیم ترین جغرافیہ دان مانا جاتا ہے۔ ان کی علم جغرافیہ میں دو مشہور اور اہم تصنیفات ہیں۔ ایک کا نام ''المسالک والممالک'' ہے۔ اس کتاب سے بعد کے جغرافیہ دانوں کی ایک بڑی تعداد جیسے یاقوت اور دمشقی وغیرہ نے کافی استفادہ کیا۔ دوسری تصنیف میں انہوں نے شہروں کی معجم حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی۔ اس کتاب کو بھی اپنی نوع میں ایک بے مثال تصنیفی کارنامہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ بیک وقت جغرافیہ، قدیم عربی تاریخ اور اشعار جاہلیہ جیسے موضوعات پر مشتمل ہے۔

6-ادریسی:

ان کا نام ''محمد بن عبداللہ بن ادریس'' تھا۔ ''سبتہ'' کے شہر میں 463ھ (1100ء) میں ولادت ہوئی اور 560ھ میں انتقال ہوا۔ ''سبتہ'' درۂ جبل الطارق کے کنارے واقع مراکش کے مشہور ساحلی شہر ''طنجہ'' کے قریب واقع ہے۔ ادریسی نے سب سے پہلے زمین کا نقشہ بنا کر اسے چاندی کی ایک پلیٹ جس کا وزن تقریباً 112 درہم تھا، پر کندہ کروایا۔ اس نقشے میں انہوں نے کرۂ ارض کو سات براعظموں میں عرض البلد کے دائروں کے اعتبار سے تقسیم کیا تھا۔ علم جغرافیہ میں ان کے تین کارنامے نہایت اہم سمجھے جاتے ہیں:

1- زمین کا چاندی کی پلیٹ پر اپنی نوعیت کا انوکھا نقشہ۔

2- کاغذ پر زمین کا ابتدائی نقشہ۔

3-ان کی کتاب ''المشتاق فی اختراق الآفاق''، جس میں دنیا بھر کے ملکوں اور شہروں کے احوال درج تھے۔

7-یاقوت حموی:

یاقوت ایک غلام تھے۔انہیں ایک حموی تاجر نے خریدا تھا۔ان کی ولادت 575ھ(1179ء) میں اور وفات 627ھ(1229ء) میں ہوئی۔علم الجغرافیہ سے انہیں خصوصی شغف تھا۔انہوں نے جغرافیہ کے موضوع پر ایک معجم ترتیب دی جس کے مقدمے میں دیگر فنون کے علاوہ فن جغرافیہ پر خصوصی گفتگو کی۔ مقدمے کے بعد انہوں نے علم جغرافیہ کے پانچ ابواب قائم کیے اور ان میں مندرجہ ذیل باتوں پر سیر حاصل بحث کی:

(1) جغرافیائی نظریات: جن کا مقصود اس بات کو ثابت کرنا تھا کہ زمین گول ہے۔آسمان کے اطراف اسے مقناطیس کی طرح ہر جانب سے کھینچ رہے ہیں۔

(2) کرۂ ارض کی سات براعظموں میں تقسیم: جس کی بنیاد 12 برج اور ان کے تحت واقع ہونے والے علاقے تھے۔

(3) طول البلد اور عرض البلد کے خطوط اور فلکیاتی جغرافیہ کی بعض اصطلاحات۔

(4) جن علاقوں کو مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ان کے حالات اور ان میں وقوع پذیر ممالک کی طبعی و سیاسی تقسیم کی توجیہ بھی کی۔

اس معجم کی خاصیت یہ ہے کہ یاقوت جس جگہ کو بھی ذکر کرتے ہیں، اس کے طول البلد و عرض البلد اور جس برج کے تحت وہ مقام آتا ہے، اس کے اعتبار سے اس جگہ کی تعیین بھی کرتے ہیں۔اس وقت تک ہونے والے جغرافیائی اکتشافات کے اعتبار سے یہ بہت مہارت کی علامت اور فن کی اہم خدمت سمجھی جاتی ہے۔

8-ابن ماجد:

ان کا نام ''احمد بن ماجد سعدی نجدی'' اور لقب ''شہاب الدین'' تھا۔خلیج عمان کے مغربی ساحلی علاقے میں ان کی پیدائش ہوئی۔ان کی تاریخ پیدائش اور وفات کے بارے میں تاریخ خاموش ہے، بس اتنا معلوم ہے کہ یہ ایسے نجدی خاندان کے فرد تھے جو کشتیوں اور سمندری سفر کی قیادت کا خصوصی شوق و شغف اور مہارت رکھتا تھا۔ان کے والد اور دادا کا شمار بہترین سمندری جہاز رانوں میں ہوتا تھا، جو بحری جغرافیہ کے علوم سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ابن ماجد نے اپنے والد اور دادا کے علمی ورثے سے خوب استفادہ حاصل کیا اور اپنے تجربات کی روشنی میں اس فن پر تصنیفات کا ڈھیر لگا دیا۔ان کی اکثر تصنیفات اشعاری یادداشت کی صورت میں ہیں۔ان کی اہم نثری تصنیف ''کتاب الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد'' ہے۔ان کے شعری مجموعے میں سب سے ضخیم مجموعہ ''حاویۃ الاختصار فی اصول علم البحار'' ہے۔جس میں تقریباً 1 ہزار اشعار 11 فصلوں کی صورت میں ہیں۔وہ سمندری راستوں کے نقشوں کے موجد اور بانی تھے۔جن سے بعد میں آنے والے مغربی جہاز رانوں نے اپنی تحقیق اور انکشافات میں خوب کام لیا۔

سیاسی جغرافیہ
(Political Geograpy)

تعارف:

یوں تو اللہ رب العزت نے اپنی قدرت کاملہ سے زمین کو ایک کُرے کی شکل میں بلا کسی امتیاز کے تخلیق کیا ہے لیکن وقت اور زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے انسانی آبادی بڑھتی گئی اور زمین اس پر تنگ ہوتی گئی، تو اُس نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے اس کرۂ ارض کو مختلف بنیادوں پر تقسیم کر ڈالا۔ اسی کے ساتھ جغرافیہ کی ایک نئی قسم یا شاخ ''سیاسی جغرافیہ'' وجود میں آئی۔ جغرافیہ کی اس قسم میں اس امر کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ زمین کی سیاسی تقسیم کیا ہے؟ کون سا ملک کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتا ہے؟ اور پھر وہیں سے دوسرا کون سا ملک شروع ہوتا ہے؟ علی ھذا القیاس لوگوں نے سیاسی بنیادوں پر کون کون سے اتحاد تشکیل دیے یا تنازعات کھڑے کیے ہیں؟ گویا سیاسی جغرافیہ کے تحت زمین کی مصنوعی تقسیم (ARTIFICIAL DISTRIBUTION) سے بحث کی جاتی ہے۔

سیاسی و طبعی جغرافیہ میں فرق:

چونکہ سیاست میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں اور مقتدر قوتیں عروج و زوال کا شکار ہوتی رہتی ہیں، اس لیے سیاسی جغرافیہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ممالک کی حدود اور دارالحکومت اور شہروں کے نام تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جبکہ طبعی جغرافیہ عموماً غیر مبدّل ہے۔ صدیوں کے بعد کہیں کوئی دریا راستہ تبدیل کرے یا سمندر جزیرے سے اتر جائے یا ساحل پر چڑھ دوڑے یا زلزلہ اور طوفان سطح زمین پر تبدیلی پیدا کر دیں تو جغرافیائی کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے۔

مختلف ممالک کے نام یاد رکھنے کے چند طریقے:

جیسا کہ پیچھے بتایا گیا ممالک کی تقسیم وانتشار اور اتحاد و اتفاق کا عمل ہوتا رہتا ہے، کچھ ممالک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، جیسے چیکوسلواکیہ دو ملکوں میں، یوگوسلاویہ سات ٹکڑوں میں بٹا......اور کچھ بیچ کی سرحدی لکیروں کو مٹا کر ایک ہو جاتے ہیں، جیسے مشرقی و مغربی جرمنی۔ ان بدلتی سدلتی جغرافیائی حدود کو یاد رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ذیل میں چند ایسے طریقے دیے جا رہے ہیں جن کی مدد سے بڑے بڑے براعظموں میں واقع چھوٹے چھوٹے ممالک کا نام یاد رکھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

پہلا طریقہ-براعظموں کی مشہور جہات (مشرق بعید، مشرق وسطی، شمالی افریقہ، مشرقی یورپ وغیرہ) اوران میں واقع مشہور ممالک:

''براعظم'' خشکی کے بڑے حصے کو کہا جاتا ہے۔اس کی وسعت کی وجہ سے اسے مختلف جہتوں (مثلا جنوبی ایشیا، مشرقی یورپ، وسطی امریکا وغیرہ) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ذیل میں چھ آباد براعظموں کی مشہور جہات اوران میں واقع ممالک کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔اس سے مختلف براعظموں کا سیاسی جغرافیہ سمجھنا آسان ہو جائے گا۔انشاءاللہ تعالی۔

1) براعظم ایشیا:

اس میں پانچ اصطلاحات بہت مشہور ہیں: (1) مشرقِ بعید (2) مشرقِ وَسطی (3) وَسطی ایشیا (4) جنوبی ایشیا اور (5) جنوب مشرقی ایشیا۔ان کے تحت درج ذیل (مشہور) ممالک آتے ہیں:

(الف) مشرقِ بعید:

چین (بیجنگ) جاپان (ٹوکیو) شمالی کوریا (پنگ یانگ) جنوبی کوریا (سیول) تائیوان (تائی پہ)

(ب) مشرقِ وَسطی:

بارہ عرب ممالک اس اصطلاح کا مصداق ہیں، جن کو دائیں جانب سے ''گھڑی وار'' یوں گنا جاسکتا ہے:

(1) عراق (بغداد) (2) کویت (کویت سٹی) (3) بحرین (منامہ) (4) قطر (دوحہ) (5) متحدہ عرب امارات (ابوظہبی) (6) عمان (مسقط) (7) یمن (صنعاء) (8) فلسطین (القدس) (9) لبنان (بیروت) (10) اردن (عمان) (11) شام (دمشق) (12) سعودی عرب (ریاض)

فائدہ:

قدیم زمانے میں ''شام'' کا اطلاق جس خطے پر کیا جاتا تھا وہ آج چار ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے: (1) شام (2) لبنان (3) اردن (4) فلسطین۔مؤخر الذکر تینوں ممالک پہلے شام کے تین صوبے ہوتے تھے۔اسی طرح خلیج عرب کے کنارے پر واقع چار چھوٹے چھوٹے امیر ممالک کاٹ کر الگ کر دیے گئے ہیں جو اپنے تحفظ کے لیے ہر وقت کسی ''محافظ'' کے محتاج رہتے ہیں: (1) کویت (2) بحرین (3) قطر (4) متحدہ عرب امارات۔

(ج) وسطی ایشیا:

اس میں نو ممالک شامل ہیں۔پانچ کے آخر میں فارسی کا ایک لفظ ''ستان'' آتا ہے، جس کے معنی ملک یا علاقے کے ہیں (انگلش میں ''لینڈ'' کا لفظ اسی کا ہم معنی ہے) یعنی پانچ قوموں (قازق، کرغیز، تاجک، ازبک اور ترکمن) کا گھر:

(1) قازقستان: یہ ان میں سب سے بڑا ملک ہے۔کچھ عرصہ قبل الما آتا (مسکراتی حسینہ) قازقستان کا دارالحکومت تھا، لیکن اب ''استانا'' کو دارالحکومت بنالیا گیا ہے۔(2) کرغیزستان (بشکک) (3) تاجکستان (دوشنبہ) (4) ازبکستان (تاشقند) (5) ترکمانستان (اشک آباد)

''قفقاز'' کی چار ریاستیں یعنی:

(1) چیچنیا (گروزنی) (2) جارجیا (تبلسی) (3) آرمینیا (یروان) (4) آذربائیجان (باکو) چیچنیا کو اب نقشوں میں نہیں دکھایا جاتا جو غاصب عالمی استعمار کے خفیہ گٹھ جوڑ اور ظلم کی واضح دلیل ہے۔

(د) جنوبی ایشیا:

اس میں سات ممالک آتے ہیں۔ اوپر سے نیچے ترتیب یوں ہوتی ہے:

(1) بھوٹان (تھمپو) (2) نیپال (کھٹمنڈو) (3) بنگلہ دیش (ڈھاکہ) (4) بھارت (دہلی) (5) پاکستان (اسلام آباد) (6) سری لنکا (کولبو) (7) مالدیپ (مالے) ان ممالک کی تنظیم کو ''سارک'' کہتے ہیں۔ اس تنظیم میں افغانستان (کابل) بھی شامل ہے۔ جبکہ ایران (تہران) اس میں مبصر کے طور پر شامل ہے۔ جنوبی ایشیا کے یہ تین ممالک پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش ''ہند'' کا مصداق ہیں۔ ''غزوۂ ہند'' کی فضیلت ان کے باسیوں اور مددگاروں کے لیے ہے۔

(ھ) جنوب مشرقی ایشیا:

اس میں 11 ممالک آتے ہیں: ہند چینی کے پانچ ممالک: (1) ویت نام (ہنوئی) (2) لاؤس (وینتیان) (3) تھائی لینڈ (بنکاک) (4) کمبوڈیا (نوم پنہ) اور (5) برما (رنگون/ینگون)۔ (6) ملائیشیا (کوالالمپور) اور اس میں واقع دو ممالک: (7) برونائی دار السلام (بندر سری بگوان) اور (8) سنگاپور (سنگاپور)۔ (9) انڈونیشیا (جکارتہ) اور اس سے الگ کیا گیا (10) مشرقی تیمور (دلی) اور آخری ملک (11) فلپائن (منیلا)

فائدہ (1):

ایشیا میں درج ذیل پانچ مشہور تاریخی خطے واقع ہیں:

(1) عرب (اس میں مشرق وسطیٰ کے 12 ممالک آتے ہیں) (2) فارس (ایران) (3) ہند (پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش) (4) خراسان، جہاں سے آخر زمانے میں کالے جھنڈوں والا لشکر فلسطین جائے گا۔ (خراسان کا مصداق دریائے آمو کے پار سے دریائے کابل تک کا علاقہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ افغانستان اٹک تک اور ایران میں سے نیشا پور یعنی ایرانی بلوچستان تک کا حصہ) (5) بلاد ماوراء النہر (آج کی اصطلاح میں دریائے آمو کے پار وسطی ایشیا کے 9 ممالک، پانچ بحیرۂ کیاسپین کے مشرق میں اور چار بحیرۂ کیاسپین کے مغرب میں)

فائدہ (2):

سابقہ سوویت یونین نے چودہ ممالک ہڑپ کر لیے تھے۔ افغانستان پر بھی اگر خدانخواستہ سرخ استعمار کا قبضہ ہو جاتا تو روس کو گوادر کی بندرگاہ اور بحیرۂ عرب کے گرم پانی تک پہنچنے سے کوئی نہ روک سکتا تھا، لیکن اللہ رب العزت نے اسے افغان مجاہدین کے ہاتھوں پارہ پارہ کیا۔ چودہ میں سے نو ملک وسطی ایشیا کے تھے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ تین بالٹک ریاستیں (اسٹونیا، لٹویا اور لتھوانیا) اور تین مشرقی یورپ کے ملک (بیلاروس، یوکرائن، مالدووا) تھے۔

2) براعظم یورپ:

اس کے تین حصے مشہور ہیں: مشرقی یورپ، مغربی یورپ اور وسطی یورپ۔

مشرقی یورپ کے پانچ مشہور ممالک یہ ہیں: بیلاروس (منسک) یوکرائن (کیو) مالدووا (چشیناؤ) رومانیہ (بخارسٹ) بلغاریہ (صوفیہ)
مغربی یورپ کے پانچ مشہور ممالک یہ ہیں: پرتگال (لزبن) اسپین (میڈرڈ) فرانس (پیرس) بیلجیم (برسلز) ہالینڈ (ایمسٹرڈیم)
وسطی یورپ میں آسٹریا (ویانا) اور چیکوسلواکیہ آتے ہیں جو اب دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے: چیک (پراگ) اور سلواک (برتیسلاوا)

3) براعظم افریقہ:

ایشیا کی طرح اس براعظم کو بھی اپنی وسعت کی وجہ سے چار جہتوں (مشرق، مغرب، شمال، جنوب) کے علاوہ وسطی افریقہ کے نام سے تقسیم کیا جاتا ہے۔
اس کی شمالی پٹی میں پانچ افریقن ممالک آتے ہیں جو اب عرب ہو چکے ہیں:
(1) مصر (قاہرہ) (2) لیبیا (طرابلس) (3) تیونس (تیونس) (4) الجزائر (الجزیرہ) (5) مراکش (رباط) سوڈان (خرطوم) کو بھی شمالی افریقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔
جبکہ انتہائے جنوب میں جنوبی افریقہ (پریٹوریا) واقع ہے۔ اس کے علاوہ سوازی لینڈ (مبابان) لیسوتھو (میسرو) بوٹسوانا (گیبرون) اور نمبیا (ونڈ ہوک) بھی جنوبی افریقن ممالک کہلاتے ہیں۔
مشرقی پٹی میں پہلے "قرن افریقہ" کے چار ممالک آتے ہیں۔ قرن کے معنی سینگ کے ہیں۔ ان چار ممالک کی مشترکہ شکل گینڈے کے اکلوتے سینگ کی بنتی ہے:
ایتھوپیا (عدلیس ابابا) اریٹریا (اسمرا) جبوتی (جبوتی) اور صومالیہ (موغادیشو) ہیں۔
اس کے بعد کینیا (نیروبی) تنزانیہ (دارالسلام) اور موزمبیق (مپوتو) مشرقی افریقہ میں واقع ہیں۔
مغرب میں المغرب الاقصیٰ (یعنی مراکش: رباط) مغربی صحرا (80 فیصد مراکش اور 20 فیصد موریطانیہ کے ساتھ ہے) موریطانیہ (نواکچوٹ) اور سینیگال (ڈاکار) ہیں۔
وسطی افریقہ میں اسی نام سے ایک ملک "وسطی افریقہ" (بنگوئی) ہے، اس کے علاوہ گیبون (لبرے ول) استوائی گنی (ملابو) عوامی جمہوریہ کانگو (کنساشا) جمہوریہ کانگو (برازول) وسطی افریقن ممالک کہلاتے ہیں۔

4) براعظم امریکا:

شمالی امریکا میں کینیڈا (اوٹاوا) امریکا (واشنگٹن ڈی سی) گرین لینڈ (نُوک) برمودا (ہملٹن) واقع ہیں۔
وسطی امریکا میں میکسیکو (میکسکوسٹی) گوئٹے مالا (گوئٹے مالاسٹی) بیلائز (بلموپان) ایسلواڈور (سان سلواڈور) ہنڈراس (ٹیگوسی گالپا) نکاراگوا (مناگوا) کوسٹاریکا (سان جوز) اور پانامہ (پانامہ سٹی) واقع ہیں۔ تمام کیریبین ممالک بھی وسطی امریکہ میں آتے ہیں جو جزائر کی شکل میں ہیں۔ ان کا ذکر آگے جغرافیائی اشتراکات کے تحت آئے گا۔

5) جنوبی امریکا:

جنوبی امریکا کی شمالی پٹی میں یہ ملک واقع ہیں: فرنچ گیانا (کیین) سوری نام (پاراماری بو) گیانا (جارج ٹاؤن) وینزویلا (کاراکاس) کولمبیا (بوگوٹا)۔
برازیل (برازیلیا) اور ارجنٹائن (بیونس آئرس) اس براعظم کے دو مشہور اور بڑے ملک ہیں۔ مشہور متنازعہ برّی جزیرہ فاک لینڈ (سٹینلے) اسی براعظم کے

جنوبی کنارے کے قریب واقع ہے۔

6) براعظم آسٹریلشیا:

اس میں یہ چھ ممالک ہیں: آسٹریلیا (کنبیرا) نیوزی لینڈ (ولنگٹن) انڈونیشیا (جکارتہ) ملائشیا (کوالالمپور) فلپائن (منیلا) پاپوا نیوگنی (پورٹ مورس بے) آسٹریلیا کو 1728ء میں ایک برطانوی جہازراں جیمز کک نے دریافت کیا۔ اس میں سات ریاستیں ہیں: مشرق میں بحرالکاہل کے کنارے تین ریاستیں: (1) کوئنز لینڈ (برسبین) (2) نیو ساؤتھ ویلز (سڈنی) (3) وکٹوریہ (میلبورن) درمیان میں شمالاً جنوباً دو ریاستیں ہیں: (1) نادرن ٹریٹوری (ڈارون) (2) جنوبی آسٹریلیا (ایڈیلیڈ) مغرب میں مغربی آسٹریلیا (پرتھ) واقع ہے، جبکہ ساتویں ریاست "بحری جزیرے" کی شکل میں تسمانیہ (ہوبارٹ) کے نام سے ہے۔

دوسرا طریقہ-جغرافیائی اشتراکات

کچھ ممالک ایسے ہیں جن کے مجموعے کو کوئی مخصوص نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی قدر مشترک رکھنے والے مشہور جغرافیائی اشتراکات میں سے براعظم ایشیا، یورپ اور وسطی امریکا میں دو دو جبکہ افریقہ میں تین مجموعے ہیں۔ تفصیل کچھ یوں ہے:

ایشیا

1-قفقاز کی ریاستیں:

(1) آرمینیا (تبلسی) (2) جارجیا (یروان) (3) آذربائیجان (باکو) (4) چوتھی ریاست چیچنیا (گروزنی) کی ہے، لیکن اب اسے نقشے پر نہیں دکھایا جاتا۔

2-ہند چینی ممالک (انڈوچائنا):

اس میں بھی تین ممالک ہیں: ویتنام (ہنوئی) لاؤس (وینٹیان) کمبوڈیا (نوم پنہ) یہ ممالک ہند اور چین کے درمیان واقع ہیں، اس لیے انہیں "ہند چینی" کہتے ہیں۔ اگر اس میں تھائی لینڈ (بنکاک) اور میانمار سابقہ برما (رنگون) کو بھی شامل کرلیا جائے تو ہند اور چین کے درمیان کل یہی پانچ ممالک ہیں۔

یورپ

3-سکنڈے نیوین ممالک:

اس میں تین ممالک آتے ہیں: ڈنمارک (کوپن ہیگن) ناروے (اوسلو) سویڈن (سٹاک ہوم) بعض جغرافیہ دان فن لینڈ (ہلسنکی) کو بھی اسی میں شمار کرتے ہیں۔

4-بالٹک ریاستیں:

یہ تین ہیں جو بحیرۂ بالٹک کے قریب واقع ہیں: اسٹونیا (ٹیلن) لٹویا (رگا) لتھوانیا (ویلنس)

وسطی امریکا

5-کیریبین:

اس میں وسطی امریکا کے یہ مشہور جزیرے شامل ہیں: کیوبا (ہوانا) جمیکا (کنگسٹن) ہیٹی (پورٹ آف پرنس) ڈومنیکن ری پبلک (سانتو ڈومنگو) پورٹو ریکو (سان جون) اور ویسٹ انڈیز (پورٹ آف اسپین)

6-ویسٹ انڈیز اور ایسٹ انڈیز:

ویسٹ انڈیز ان جزائر کا مجموعہ ہے جہاں کولمبس ہندوستان کی تلاش میں پہنچا تو کافی عرصے تک انہیں ہندوستان سمجھتا رہا۔ ان میں سے مشہور جزائر یہ ہیں: اینٹی گوا اینڈ باربودا (سینٹ جونز) ڈومنیکا (روسیو) بارباڈوس (برج ٹاؤن) سینٹ لوئیسا (کاس ٹریز) گرینیڈا (سینٹ جورج) ٹرینیڈاڈ اینڈ ٹوباگو (پورٹ آف اسپین)۔ ان میں سے پہلے یعنی "اینٹی گوا اینڈ باربودا" کو "اے اینڈ بی" اور آخری یعنی "ٹرینیڈاڈ اینڈ ٹوباگو" کو ٹی اینڈ ٹی کہتے ہیں۔

ویسٹ انڈیز کے مقابلے میں انڈونیشیا کو "ایسٹ انڈیز" کہتے ہیں جس کے 1750 جزائر پانچ حصوں میں تقسیم ہیں: (1) ساٹرا (2) جاوا (3) بورنیو (4) سلویسی (5) نیوگنی۔ یہ چھ اشتراکات ہو گئے۔ دو ایشیا میں، دو یورپ میں اور دو وسطی امریکا میں۔ اس کے بعد آخری تین اشتراکات براعظم افریقہ میں واقع ہیں:

7-قرنِ افریقہ کے ممالک:

افریقہ کی مشرقی پٹی میں تین ممالک ایسے ہیں جو سینگ (قرن) کی شکل میں ہیں۔ انہیں "قرنِ افریقہ" کے ممالک کہتے ہیں۔ (1) اریٹیریا (اسمارا) (2) ایتھوپیا (ادیس ابابا) (3) صومالیہ (موغادیشو) اب ان میں جبوتی (جبوتی) نام کا چھوٹا سا ملک بھی کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ "باب المندب" نامی مشہور سمندری درّے کے ناکے پر آتا تھا۔

8-مشرقی افریقی انجمن (منبع نیل کے پڑوسی):

دریائے نیل جس جھیل سے نکلتا ہے، اس کے کنارے یہ تین ممالک آتے ہیں، انہوں نے آپس میں مل کر اتحاد بنالیا ہے۔ "مشرقی افریقن" نامی اتحاد کے تحت یہ تین ممالک آتے ہیں: (1) کینیا (نیروبی) (2) تنزانیہ (دارالسلام) (3) یوگنڈا (کمپالا)

9-وسطی افریقی وفاق (وفاقِ رہوڈیشیا و ناسالینڈ)

درج ذیل تین ممالک کے باہمی اشتراک کو "وسطی افریقی وفاق" کہتے ہیں: (1) ملاوی (لیلانگ وے) (2) زمبیا (لوساکا) (3) زمبابوے (ہرارے)

فائدہ (1):

خلیجی ممالک سے یہ آٹھ ممالک مراد ہوتے ہیں جو دنیا کی اہم ترین خلیج "خلیج فارس" یا "خلیج عرب" کے کنارے واقع ہیں۔ ان میں سے ایران (تہران) مذکورہ خلیج کے شمالی جانب ہے اور سات درج ذیل عرب ممالک اس کے جنوبی جانب ہیں: (1) عراق (بغداد) (2) سعودی عرب (ریاض) (3) کویت (کویت) (4) بحرین (منامہ) (5) قطر (دوحہ) (6) متحدہ عرب امارات (ابوظبی) (7) عُمان (مسقط)

فائدہ(2):

''جی ایٹ'' کی اصطلاح سے درج ذیل آٹھ ممالک مراد ہوتے ہیں: (1) امریکا (2) کینیڈا (3) روس (4) برطانیہ (5) فرانس (6) جرمنی (7) اٹلی (8) جاپان

تیسرا طریقہ۔ ملتے جلتے ناموں والے ممالک:

کچھ ممالک ایسے ہیں جن کا نام ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے اور اکثر ان میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔ ان کے تلفظ اور محل وقوع کا فرق ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

براعظم افریقہ میں:

(1) لیبیا (طرابلس) لائبیریا (مونروویا) (2) نائجیریا (ابوجا) نائیجر (نیامی) (3) مالی (بماکو) ملاوی (لی لونگ وے) (4) گمبیا (بانجل) نمبیا (والوس بے) (5) زمبیا (لوساکا) زمبابوے (ہرارے)

جنوبی امریکا میں:

(1) گیانا (جارج ٹاؤن) فرنچ گیانا (کیین) (2) پیراگوئے (ایسنشن) یوروگوئے (مونٹی ویڈیو) [بیچ میں ارجنٹائن کی پٹی ہے] (3) ہنڈراس (ٹیگوسی گالپا) بہاماس (نساؤ) [دونوں وسطی امریکا میں ہیں: پہلا برّی ملک ہے اور دوسرا جزیرہ] (4) جمہوریہ ڈومینیکن (سانتو ڈومنیگو) ڈومنیکا (روسیو) [اول الذکر کیریبین ملک اور مؤخر الذکر ویسٹ انڈیز کا جزیرہ ہے]

مختلف براعظموں میں:

آسٹریلیا (کینبرا) آسٹریا (ویانا) [پہلا آسٹریلشیا کا اور دوسرا وسطی یورپ کا ملک ہے]

ویت نام (ہنوئی) سری نام (پاراماریبو) [اول الذکر ایشیا میں اور مؤخر الذکر جنوبی امریکا میں ہے]

(1) روس (ماسکو) [ایشیا] (2) بیلاروس (منسک) [مشرقی یورپ] (3) بیلائز (بلموپان) [جنوبی امریکا] مالدووا (چشیناؤ) مالدیپ (مالے) پہلا مشرقی یورپ کا ملک اور دوسرا بحر ہند کا ایک ''مجمع الجزائر'' ہے۔ جارجیا (تبلسی) وسطی ایشیا کا ملک ہے اور امریکا کی ایک مشہور ریاست کا نام بھی جارجیا (اٹلانٹا) بھی ہے۔

نیز:

(1) عُمان ملک بھی ہے اور اردن کا دارالحکومت بھی۔ اول الذکر مضموم العین ہے اور ثانی الذکر میں عین پر فتحہ اور میم پر تشدید ہے۔

(2) برونائی دارالسلام (بندر سری بگوان) ایشیا کا ملک ہے اور ''دارالسلام'' تنزانیہ کا دارالحکومت ہے۔

(3) دہلی بھارت کا دارالحکومت ہے اور ''دلی'' مشرقی تیمور کا دارالحکومت ہے۔

(4) واشنگٹن (سیاٹل) امریکا کی ایک ریاست بھی ہے اور واشنگٹن ڈی سی (یعنی ڈسٹرکٹ آف کولمبیا جو ریاست میری لینڈ اور جارجیا کی سرحد پر واقع ایک چھوٹی سی ریاست ہے) امریکا کا دارالحکومت بھی ہے۔ دونوں کے درمیان فرق کے لیے دوسرے کے ساتھ ''ڈی سی'' لکھا جاتا ہے۔

دلچسپ:

دنیا میں پانچ ممالک ایسے ہیں جن کا نام (سابقوں لاحقوں کے فرق کے ساتھ) ''گنی'' ہے۔تین براعظم افریقہ میں: گنی (کوناکرے) گنی بساؤ (بساؤ) استوائی گنی (ملابو)

[یہ خط استوا کے ساتھ افریقہ کا ایک امیر ملک ہے۔اِس کی آبادی کم ہے اور معدنیات زیادہ ہیں۔] دو ایشیا میں: (1) نیوگنی (انڈونیشیا) [یہ درحقیقت ملک نہیں، انڈونیشیا کے دو صوبوں کا ویسٹ ایرین جایا اور پاپوا مجموعہ ہے] (2) پاپوا نیوگنی (پورٹ مورس بے)

چوتھا طریقہ-وہ ممالک جن کے دارالحکومت کا نام غلط مشہور ہے یا ملک اور دارالحکومت کا ایک ہی نام ہے:

(الف) کچھ ممالک ایسے ہیں جن کا دارالحکومت عام لوگوں میں غلط مشہور ہوتا ہے۔مثلاً:

1) آسٹریلیا کا دارالحکومت ''سڈنی'' یا ''میلبورن'' نہیں.......... ''کینبرا'' ہے۔

2) سوئٹزرلینڈ کا دارالحکومت ''جنیوا'' یا ''زیورخ'' نہیں.......... ''برن'' ہے۔

3) کینیڈا کا دارالحکومت ''مانٹریال'' یا ''ٹورنٹو'' نہیں.......... ''اوٹاوا'' ہے۔

4) برازیل کا دارالحکومت ''ساؤپالو'' یا ''ریوڈی جنیرو'' نہیں.......... ''برازیلیا'' ہے۔

5) جرمنی کا دارالحکومت ''میونخ'' یا ''فرینکفرٹ'' نہیں.......... ''برلن'' ہے۔

6) ترکی کا دارالحکومت ''استنبول'' یا ''ازمیر'' نہیں.......... ''انقرہ'' ہے۔

7) مراکش کا دارالحکومت ''کاسابلانکا'' نہیں.......... ''رباط'' ہے۔

(ب) کچھ دارالحکومت اسی نام سے ہیں جس نام سے ملک ہے۔جیسے:

ایشیا:

1) کویت (کویت سٹی)

2) سنگاپور (سنگاپور، رقبہ 704 کلومیٹر، آبادی 49,87,600)

3) ہانگ کانگ (ہانگ کانگ، رقبہ ایک ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی 70 لاکھ ہے)

4) مکاؤ (مکاؤ، رقبہ تقریباً 29 مربع کلومیٹر اور آبادی تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ ہے)

افریقہ:

4) تیونس (تیونس)

5) الجزائر (الجزیرہ)

6) جبوتی (جبوتی)

یورپ:

7) منا کو(منا کو،کل رقبہ 2 کلومیٹر،آبادی 33ہزار)

8) لکسمبرگ(لکسمبرگ،رقبہ 2,586 مربع کلومیٹر اور آبادی 5,02,202)

9) اندورا(اندورا،رقبہ 468 کلومیٹر اور آبادی 84,082)

جنوبی امریکا:

10) میکسکو(میکسکو سٹی)

11) پانامہ(پانامہ سٹی)

12) گوئٹے مالا(گوئٹے مالا سٹی)

آسٹریلشیا:

13) ناؤرو(ناؤرو،رقبہ 21 مربع کلومیٹر اور آبادی 14,019)براعظم آسٹریلشیا کا ایک جزیرہ ہے۔جبکہ درج ذیل ممالک اور ان کے دارالحکومت کے نام ایک جیسے نہیں،البتہ ملتے جلتے ہیں:

1) گنی بساؤ(بساؤ)2) نکاراگوا(مناگوا)3) ڈومینیکن(سانتوڈومینگو)4) ایلسلواڈور(سان سلواڈور)

پانچواں طریقہ-فرضی شکل رکھنے والے ممالک

(الف) زمین کے بعض خطے ایسے ہیں جن سے چند انسانی اعضاء کی شبیہ بنتی ہیں:

-سر:براعظم افریقہ

-زبان:(قطر)

-دل:(جزیرۃ العرب،مکہ مکرمہ)

-چھوٹا دل:(صحرائے سینا،کوہ طور)

-ریڑھ کی ہڈی:(چلی)

-ٹانگ،ایڑی والا بوٹ(اٹلی)جو اپنی نوک پر ایک تکونی جزیرہ"سسلی"اچھال رہا ہے۔

(ب) چند ممالک ایسے ہیں جن سے مختلف جانوروں یا چیزوں کی فرضی شکل بنتی ہے:

-بطخ:پاکستان(اسلام آباد)

-خرگوش:جو گاجریں کھا رہا ہے:انگلینڈ(خرگوش)اور آئرلینڈ(گاجریں)

-خرگوش کے کان:(خلیجِ عقبہ اور خلیجِ سوئز)

-گینڈے کا اکلوتا سینگ:قرن افریقہ کے نام سے موسوم چار ممالک:ایتھوپیا،اریٹیریا،جبوتی،صومالیہ۔

- ہاتھی کی سونڈ: واخان کی پٹی (افغانستان)
- پچھلے پاؤں پر کھڑا کتا: ڈنمارک (کوپن ہیگن)
- دم: فلوریڈا (میامی)
- موسیقی کا ایک آلہ: ناروے (اوسلو)

چھٹا طریقہ - لاک لینڈ ممالک کے نام:

کچھ ممالک ایسے ہیں جو کلایا جزءاً دوسرے ممالک کے بیچ میں واقع ہیں اور چاروں طرف سے گھرے ہوتے ہیں۔ ایسے ممالک کو 'لاک لینڈ' ممالک کہتے ہیں۔ ان منفرد ممالک کی کچھ تفصیل یہ ہے:

کلی طور پر:

1- اٹلی کی حدود میں دو چھوٹے ممالک ایسے ہیں جو عیسائیت کی بنیاد پر وجود میں آئے: (1) ویٹی کن (ویٹی کن سٹی) اٹلی کے دارالحکومت روم میں چھوٹا سا ملک ہے جو دنیا بھر کے عیسائیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ اس کا رقبہ اعشاریہ چوالیس یعنی تقریباً نصف مربع کلومیٹر اور آبادی 4858 یعنی تقریباً 5 ہزار ہے (2) سان مارینو (سان مارینو) اس کا رقبہ 61 کلومیٹر اور آبادی تقریباً تیس ہزار ہے۔ یہ دنیا کی قدیم ترین جمہوریہ کہلاتی ہے، اسے 301ء میں مالٹینوس نامی ایک عیسائی مشنری نے قائم کیا۔

2- جنوبی افریقہ کی حدود میں دو ممالک واقع ہیں: سوازی لینڈ (مبابان) اور لیسوتھو (میسرو)۔

3- ملائیشیا کے شرقی حصے سے برونائی دارالسلام (بندرسری بگوان) اور غربی سے سنگاپور (سنگاپور) الگ کیے گئے ہیں۔

4- گمبیا (بانجل) نامی ملک سینیگال (ڈاکار) میں ایک پٹی کی شکل میں واقع ہے۔

جزوی طور پر:

1- امریکا کی 50 میں سے 48 ریاستیں یک جا ہیں۔ ایک ریاست الاسکا کینیڈا کے کنارے پر ہے۔ یہ رقبے کے اعتبار سے امریکا کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ ایک ریاست ''ہوائی'' (ہونولو) بحرالکاہل کے بیچ میں ہے۔ پرل ہاربر نامی بندرگاہ اسی جزیرے میں ہے جس پر جنگ عظیم دوم میں جاپان کے کامیاب حملے کے بعد امریکا نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسائے۔ واضح رہے کہ امریکا کی 52 نہیں 50 ریاستیں ہیں، اس کی علامت کے طور پر امریکی جھنڈے پر 50 ستارے بنے ہوئے ہیں۔

2- روس کا ایک حصہ ''لینن گراڈ'' بالٹک ریاستوں کے دوسری جانب واقع ہے۔

3- عمان (مسقط) کا ایک ٹکڑا متحدہ عرب امارات (ابوظبی) میں ''مضیق ہرمز'' کے کنارے واقع ہے۔ اس کا نام ''مُصب'' ہے۔

4- آذربائیجان (باکو) کا ایک ٹکڑا آرمینیا (یروان) کے دوسری طرف واقع ہے۔

ساتواں طریقہ - چند چھوٹے ممالک کے نام:

کرہ ارض کی سطح پر چھوٹے چھوٹے جزیرے تو بہت سے ہیں۔ ایسے جزیرے بھی ہیں جو ایک ہی جزیرہ مستقل ملک شمار ہوتا ہے جیسے مالٹا (بحرابیض، رقبہ 316 کلومیٹر آبادی: 4 لاکھ) ناؤرو (بحرالکاہل، رقبہ: 21 کلومیٹر آبادی: 13 ہزار) اور بحرین (یہ خلیج فارس میں مجمع الجزائر ہے۔ کل رقبہ تقریباً 650 کلومیٹر

اور آبادی تقریبا ساڑھے چھ لاکھ ہے۔) لیکن خشکی پر بھی چند ممالک ایسے ہیں جو بہت چھوٹا حجم رکھتے ہیں۔ ایسے چند ممالک کے نام اور دلچسپ معلومات یہ ہیں:

(1) لکسبرگ (لکسمبرگ) یورپ کا ایک چھوٹا سا امیر ملک ہے۔ اس میں دنیا کے ڈیڑھ سو بینکوں نے اپنی شاخیں کھولی ہوئی ہیں۔ یہ جرمنی فرانس اور بلجیم کے سنگم پر واقع ہے۔

(2) اندورا (اندورا) اسپین اور فرانس کی عین سرحد پر واقع ایک ملک ہے جس کا رقبہ تقریبا دو سو مربع کلومیٹر اور آبادی صرف اکیاسی ہزار ہے۔

(3) منا کو (منا کو) یورپ کا ایسا ملک ہے جو صرف دو کلومیٹر بڑا ہے اور فرانس کے جنوبی کنارے پر بحر ابیض کے ساحل کے ساتھ واقع ہے۔

(4) ہانگ کانگ (ہانگ کانگ) چین کی سمندری سرحد پر واقع ایک ملک ہے جس کا رقبہ ایک ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی 70 لاکھ ہے۔

(5) مکاؤ (مکاؤ) ہانگ کانگ کے قریب ایک ملک ہے جس کا کل رقبہ تقریبا 29 مربع کلومیٹر اور آبادی تقریبا ساڑھے پانچ لاکھ ہے۔

سیاسی تقسیم کا حیرت انگیز واقعہ:

پاکستان جب بنا تو مثلث کی شکل میں تین ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا:

(1) مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) جو تین طرف سے بھارت میں گھرا ہوا تھا۔ چوتھی طرف خلیجِ بنگال ہے۔

(2) مغربی پاکستان جو مشرقی پاکستان سے ایک ہزار میل (1600 کلومیٹر) دور تھا

(3) اور حیدر آباد دکن، جونا گڑھ جو بھارت کے بالکل وسط میں واقع تھے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ حیدر آباد اور جونا گڑھ پر پہلی رات قبضہ کر لیا گیا۔ (آدھا کشمیر بھی شروع میں ہی لے لیا گیا) بنگلہ دیش 23 ویں سال وجود میں آ گیا اور بقیہ پاکستان میں (خاکم بدھن) لسانی و نسلی بنیادوں پر چھ مستقل تحریکیں چل رہی ہیں۔ شہری و اندرونی سندھ میں جناح پور اور سندھو دیش، شمالی و جنوبی پنجاب میں تختِ لاہور اور سرائیکی صوبہ۔ بلوچستان میں گریٹر بلوچستان، سرحد میں پختونخواہ، ہزارہ جبکہ شمالی علاقہ جات میں اسماعیلی ریاست کے قیام کی کوششیں ہو رہی ہیں، دین کی طرف رجوع، اخوت اسلامی کی بنیاد پر اتحاد و اتفاق اور نسلی و لسانی تعصب سے بچے بغیر ان تحریکوں کے مضر نتائج سے محفوظ رہنا ناممکن لگ رہا ہے۔

طبعی جغرافیہ

(Physical Geograpy)

جغرافیہ کی اس قسم میں زمین کی طبعی ساخت اور خصوصیات (Physical properties&shape) کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔یعنی اللہ رب العزت نے زمین کو کیسا بنایا ہے؟اس کی شکل گول ہے یا چپٹی؟اس پر تری اور خشکی کا کیا تناسب ہے؟بحر و بر کے مختلف حصوں کے نام اور احوال کیا ہیں؟زمین پر پائے جانے والے پہاڑوں کی ساخت کیا ہے؟بہنے والے دریاؤں کی کیا کیفیت ہے؟کہاں جھیلیں ہیں اور کہاں صحرا؟کہاں جنگلات ہیں اور کہاں فلک بوس پہاڑ؟جغرافیہ کی اس شاخ کا تعلق انسانوں کے اجتماعی مسکن سے متعلق عمومی معلومات سے ہے۔گویا''طبعی جغرافیہ''بنی نوع انسان کے''مشترک علمی ورثہ''کی حیثیت رکھتا ہے اور انسانوں کو اپنے خالق و مالک کی کمال قدرت اور احسن الخالقین ہونے کا یقین پیدا کرتا ہے۔

کرۂ خاکی و آبی

سطح زمین دو بڑے حصوں پر مشتمل ہے:پانی اور خشکی۔ان حصوں کو''بحر و بر''یا''کرۂ آبی و خاکی''کہتے ہیں۔ہر حصے میں چھوٹے بڑے مختلف آبی و خاکی اجسام پائے جاتے ہیں۔آبی اجسام سے سمندر،خلیجیں،آبنائیں،دریا،جھیلیں اور خاکی اجسام سے براعظم،برصغیر اور جزیرے وغیرہ مراد ہیں۔کرۂ آب و خاک کا مطالعہ اور اس کے مختلف حصوں کے احوال''طبعی جغرافیہ''کا اصل موضوع ہیں۔جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

کرۂ خاکی:

ہماری زمین''خشکی''اور''تری''پر مشتمل ہے۔کرۂ خاکی میں ان پانچ چیزوں کا بیان ہوگا۔(1)براعظم (2)جزیرے (3)راس (4)صحرا اور (5)پہاڑ۔

فائدہ:

آگے چلنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے جغرافیائی اصطلاح کے مطابق جزیرے اور جھیلیں آپس میں متضاد ہیں۔اس اعتبار سے کہ جزیرہ خشکی کے اس حصے کو کہا جاتا ہے جو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہو جبکہ جھیل پانی کے اس حصے کو کہتے ہیں جو چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ہو۔اسی طرح راس اور خلیج بھی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔راس خشکی کے اس نوکیلے حصے کو کہا جاتا ہے جو پانی کو کاٹتے ہوئے دور تک چلا جائے جبکہ خلیج پانی کے اس حصے کو کہتے ہیں جو خشکی کو چیرتے ہوئے دور تک گیا ہو۔اب ہم پانچ بڑے خاکی اجسام کا مطالعہ کرتے ہیں:

برّاعظم

براعظم تعداد میں سات ہیں۔ان کے نام رقبے کے لحاظ سے بالترتیب یہ ہیں:(1) ایشیا (2) افریقہ (3) شمالی امریکا (4) جنوبی امریکا (5) یورپ

(6) آسٹریلیا (7) انٹارکٹیکا (براعظم قطب جنوبی)

قطب شمالی پر منجمد پانی کا سمندر ہے۔اس کی برف کو توڑا جائے تو نیچے پانی ہے، خشکی نہیں۔قطب جنوبی کے متعلق بھی قدیم جغرافیہ دانوں کا یہی خیال تھا مگر پھر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے نیچے زمین ہے جو برِّ اعظم آسٹریلیا سے بھی بڑی ہے۔ان برِّ اعظموں کی خصوصیات اور اہم معلومات ملاحظہ کیجیے:

(1) ایشیا:

ایشیا دنیا کا سب سے بڑا اور زیادہ آبادی والا براعظم ہے۔یہ زمین کے کل رقبے کا 8.6 فیصد، کل بری علاقے کا 29.4 فیصد اور کل آبادی کے 60 فیصد حصے کا حامل ہے۔ایشیا روایتی طور پر یوریشیا (یورپ+ایشیا) کا حصہ ہے جس کا مغربی حصہ یورپ ہے۔ایشیا نہر سوئز کے مشرق، کوہ یورال کے مشرق اور کوہ قفقاز، بحیرۂ قزوین اور بحیرۂ اسود کے جنوب میں واقع ہے۔قرون وسطیٰ سے قبل یورپی ایشیا کو براعظم نہیں سمجھتے تھے تاہم قرون وسطیٰ میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے وقت ایشیا کو بطور براعظم تسلیم کرلیا گیا۔افریقہ اور ایشیا کے درمیان سوئز اور بحیرہ قلزم کو سرحد قرار دیا گیا جبکہ یورپ اور ایشیا کے درمیان سرحد درہ دانیال، بحیرہ مرمرہ، باسفورس، بحیرہ احمر، کوہ قفقاز، بحیرہ قزوین، دریائے یورال اور کوہ یورال سے بحیرہ کارہ تک پہنچتی ہے۔عام طور پر ماہر ارضیات و طبعی جغرافیہ دان ایشیا اور یورپ کو الگ براعظم تصور نہیں کرتے اور ایک ہی عظیم قطعہ زمین کا حصہ قرار دیتے ہیں۔

ایشیا دنیا کا سب سے بڑا براعظم ہے۔جہاں دنیا کا سب سے اونچا، سب سے نیچا اور سرد ترین مقام پایا جاتا ہے (ماؤنٹ ایورسٹ دنیا کی بلند ترین چوٹی، بحیرۂ مردار سطح سمندر سے سب سے نچلا مقام اور شمالی سائبیریا سرد ترین مقامات میں سے ایک ہے) ایشیا میں کسی بھی براعظم سے زیادہ افراد رہائش پذیر ہیں جن میں سے ایک ارب دو کروڑ آبادی چین اور 94 کروڑ بھارت میں آباد ہے۔ایشیا میں دنیا کے کئی مشہور صحرا بھی واقع ہیں جن میں صحرائے عرب (ربع الخالی) صحرائے شام، دشت کویر، دشت لوط، تھر، تھلا اور صحرائے گوبی دنیا کے عظیم صحراؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ایشیا میں دنیا کے کئی بڑی دریا بھی واقع ہیں جن میں دریائے زرد، یانگزے، سندھ، گنگا، جمنا، برہم پترا، اراوتی، میکانگ، فرات، دجلہ او جیحون، سیحون دنیا کے عظیم دریاؤں میں سے ہیں۔جھیلوں میں جھیل قزوین جسے اس کے عظیم حجم کے باعث ''بحیرۂ قزوین'' بھی کہا جاتا ہے، دنیا کی سب سے بڑی کھاری جھیل ہے۔علاوہ ازیں جھیل ارال (بحیرہ ارال) جھیل بالکش، جھیل بیکال اور جھیل وان دنیا بھر میں جانی جاتی ہیں۔جزیرہ ساٹرا، بورنیو اور نیوگنی دنیا کے بڑے جزائر میں شمار ہوتے ہیں جبکہ دنیا کے سب سے بڑے جزیرہ نما جزیرہ نمائے عرب اور جزیرہ نمائے اناطولیہ (یا اناضول یعنی ترکی) بھی یہیں واقع ہے۔

(2) افریقہ:

رقبے کے لحاظ سے کرۂ ارض کا دوسرا بڑا براعظم، جس کے شمال میں بحیرۂ روم، مشرق میں بحر ہند اور مغرب میں بحر اوقیانوس واقع ہے۔دلکش نظاروں، گھنے جنگلات، وسیع صحراؤں اور گہری وادیوں کی سرزمین جہاں آج 53 ممالک ہیں۔افریقہ کے شمالی اور جنوبی حصے نہایت خشک اور گرم ہیں جن کا بیشتر حصہ صحراؤں پر پھیلا ہوا ہے۔خط استوا کے اردگرد گھنے جنگلات ہیں۔مشرقی افریقہ میں عظیم وادی ''الشق'' کے نتیجے میں گہری وادیاں تشکیل پائیں جن میں کئی بڑی جھیلیں بھی واقع ہیں۔براعظم کے مغرب میں دریائے نائجر بہتا ہے جو وسیع دلدلی ڈیلٹا بناتا ہوا، بحر اوقیانوس میں جا گرتا ہے۔اس کے مشرق میں دریائے کانگو افریقہ کے گھنے استوائی جنگلات سے گزرتا ہے۔براعظم کے مشرقی حصے میں عظیم وادی ''الشق'' اور ایتھوپیا کے بالائی میدان ہیں۔''قرن افریقہ'' براعظم افریقہ کا مشرق کی جانب آخری مقام ہے۔

صحرائے اعظم شمالی افریقہ کے بیشتر حصے پر پھیلا ہوا دنیا کا سب سے بڑا صحرا ہے۔اس عظیم صحرا کا ایک چوتھائی حصہ ریتیلے ٹیلوں پر مشتمل ہے جبکہ بقیہ

پتھریلے خشک میدان ہیں۔ براعظم کے دیگر بڑے صحراؤں میں نمیب اور کالا ہاری شامل ہیں۔ مشرق میں عظیم وادی "الشق" ہے، جو دراصل زمین میں ایک عظیم دراڑ کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ یہ عظیم دراڑ جھیل نیاسا سے بحیرہ احمر تک پھیلی ہوئی ہے۔ اگر یہ دراڑ مزید پھیلتی گئی تو ایک دن "قرن افریقہ" براعظم افریقہ سے الگ ہو جائے گا۔

1960ء کی دہائی تک افریقہ کا بیشتر حصہ یورپی ممالک کے قبضے میں تھا اور طویل غلامی کے بعد 1980ء کی دہائی تک تقریباً تمام ممالک کو آزادی مل گئی لیکن ان کے وسائل یورپیوں کے غاصبانہ دور جسے "نوآبادیاتی دور" (استعماری دور) کہتے ہیں، میں غصب کر لیے گئے تھے اور آج بھی غصب ہو رہے ہیں، اس لیے اقتصادی و معاشی طور پر وہ آج تک سنبھل نہ سکے اور غربت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بڑے پیمانے پر جہالت اور یورپی حکمرانوں کی سازشوں کے باعث نسلی و قومی تعصب نے بھی افریقی عوام کے دلوں میں جڑیں پکڑیں جس کے نتیجے میں خوفناک جنگیں اور خانہ جنگیاں ہوئیں جن میں لاکھوں انسان اجل کا نشانہ بن گئے۔ افریقہ کے 15 ممالک ایسے ہیں جن کی سرحدیں سمندر سے نہیں ملتیں جس کے باعث تجارت اور مواصلات کے رابطے محدود ہیں۔ شمال اور مشرق کے بیشتر ممالک کا مذہب اسلام ہے اور وہ دنیا کے دیگر اسلامی ممالک کے ساتھ عالمی اسلامی اخوت کے گہرے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں البتہ وسطی، جنوبی اور غربی افریقہ میں عیسائی مشنریوں نے کھل کر ہاتھ دکھائے ہیں۔ ایک طرف یورپ کے عیسائی حکمران افریقہ کی دولت لوٹتے رہے اور دوسری طرف عیسائی پادری انہیں تھپکی دے دے کر عیسائی بناتے رہے۔ لہٰذا ان ممالک کی اکثریت عیسائی مذہب رکھتی ہے اور اسلام کے داعیوں کی محنتوں اور قربانیوں کی منتظر ہے۔

(3) شمالی امریکا:

یہ دنیا کے سات براعظموں میں سے ایک ہے۔ کرۂ ارض کے نصف شمالی میں خط گرینچ کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کے بڑے ممالک کینیڈا، ریاستہائے متحدہ امریکا اور میکسیکو ہیں۔ اس کے شمال میں بحر منجمد شمالی اور جنوب میں بحر منجمد جنوبی اور مشرق میں بحر اوقیانوس ہے۔

اس کی آبادی 514 ملین ہے، آبادی کے لحاظ سے یہ چوتھا براعظم ہے۔ براعظم جنوبی امریکا اور شمالی امریکا کا نام اٹلی کے ایک سیاح "امریگو واسپیوشی" کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس نے کولمبس کے بعد امریکا تک رسائی حاصل کی اور واپس آ کر ایک سفرنامے کے ذریعے یورپی دنیا کو اس سے آگاہ کیا۔ اس پر اہلِ یورپ نے اس نو دریافت شدہ براعظم کو اس کے نام سے موسوم کر دیا۔ اس کا رقبہ 24.2 ملین مربع کلومیٹر ہے۔

(4) جنوبی امریکا:

جنوبی امریکا مغربی نصف کرہ میں واقع ایک براعظم ہے جس کا بیشتر حصہ جنوبی کرۂ ارض میں واقع ہے۔ مغرب میں اس براعظم کی سرحدیں بحرالکاہل اور شمال اور مشرق میں بحر اوقیانوس اور شمالی امریکہ اور شمال مغرب میں بحیرہ کیریبین سے ملتی ہیں۔ جنوبی امریکا کا نام شمالی امریکا کی طرح یورپی جہازراں "امریگو واسپیوشی" کے نام پر رکھا گیا جس نے پہلی مرتبہ یہ انکشاف کیا کہ امریکا دراصل ہندوستان نہیں بلکہ ایک نئی دنیا ہے جسے یورپی نہیں جانتے۔

جنوبی امریکا کا کل رقبہ 7,18,40,000 مربع کلومیٹر (68,90,000 مربع میل) ہے جو زمین کے کل رقبے کا 3.5 فیصد بنتا ہے۔ 2005ء کے مطابق براعظم کی آبادی 371,000,000 ہے۔ جنوبی امریکہ رقبے کے لحاظ سے (ایشیاء، افریقہ اور شمالی امریکا کے بعد) چوتھا اور آبادی کے لحاظ سے (ایشیاء، افریقہ، یورپ اور شمالی امریکا کے بعد) پانچواں بڑا براعظم ہے۔

اس براعظم کے مغرب میں بحرالکاہل کے ساتھ ساتھ "کوہِ انڈیز" کا عظیم پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔ براعظم کے وسط میں ایمیزون کا عظیم جنگل واقع ہے جو دریائے ایمیزون اور اس کے معاون دریاؤں کے کناروں کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ دریائے ایمیزون اور پارانا یہاں کے بڑے دریا ہیں جو بحر اوقیانوس

میں جا گرتے ہیں۔ انڈیز کے پہاڑی سلسلے میں آتش فشاں بھی ہیں جن میں براعظم کا سب سے بڑا اور متحرک آتش فشاں ''کوٹوپاکسی'' بھی شامل ہے، جس کی بلندی 19347 فٹ ہے۔ یہ آتش فشاں مغربی ملک ''ایکویڈور'' میں واقع ہے۔ انڈیز کا یہ عظیم پہاڑی سلسلہ شمالاً جنوباً تقریباً پورے براعظم پر پھیلا ہوا ہے اور اس کی لمبائی 4500 میل ہے۔ اس طرح یہ دنیا کا طویل ترین پہاڑی سلسلہ ہے۔

دنیا کی سب سے بلند آبشار "اینجل آبشار"، حجم کے اعتبار سے سب سے بڑا دریا "دریائے ایمیزون"، طویل ترین پہاڑی سلسلہ "انڈیز"، روئے زمین کا خشک ترین مقام "صحرائے ایٹاکاما"، سب سے بڑا جنگل "ایمیزون جنگل"، سطح سمندر سے بلند ترین دارالحکومت "لاپاز، بولیویا"، دنیا کی سب سے بلند جھیل "جھیل ٹیٹیکاکا" اور جنوب میں دنیا کا سب سے دور شہر "پورٹو روتو، چلی" اسی براعظم میں واقع ہیں۔

17 ویں صدی میں اندلس کی اسلامی خلافت کے سقوط کے بعد اسپین اور پرتگال کے جہاز رانوں کی جانب سے اس زمین کی "دریافت" کا کارنامہ سامنے آیا اور دونوں ممالک نے یہاں کی سرزمین پر قبضہ کر لیا اور یوں یہ ممالک طویل غلامی میں چلے گئے۔ اسپین اور پرتگال نے جنوبی امریکہ پر اپنی ثقافت کی گہری چھاپ چھوڑی جو آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جنوبی امریکہ کے ممالک میں برازیل میں پرتگیزی، جبکہ دیگر تقریباً تمام ممالک میں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے۔ شمال میں سرینام اور گیانا کے چھوٹے ممالک نیدرلینڈز اور برطانیہ کی غلامی میں رہے ہیں، جبکہ ''فرانسیسی گیانا'' فرانس کے قبضے میں رہا۔ طویل غلامی کے باعث یہاں مختلف النسل لوگ پائے جاتے ہیں جن میں یورپی، آبائی امریکی اور افریقی النسل شامل ہیں۔ چند اصل جنوبی امریکی افراد جن سے ان کا وطن یورپی حملہ آوروں نے چھین لیا، آج بھی ایمیزون کے گھنے جنگلات میں رہتے ہیں۔

(5) یورپ:

یورپ دنیا کے سات روایتی براعظموں میں سے ایک ہے تاہم جغرافیہ دان اسے حقیقی براعظم نہیں سمجھتے اور اسے یوریشیا کا مغربی جزیرہ نما قرار دیتے ہیں۔ اصطلاحی طور پر کوہ یورال کے مغرب میں واقع یوریشیا کا تمام علاقہ یورپ کہلاتا ہے۔ یورپ کے شمال میں بحر منجمد شمالی، مغرب میں بحر اوقیانوس، جنوب میں بحیرہ روم اور جنوب مشرق میں بحیرہ روم اور بحیرہ اسود کو ملانے والے آبی راستے اور کوہ قفقاز ہیں۔ مشرق میں کوہ یورال اور بحیرہ قزوین یورپ اور ایشیا کو تقسیم کرتے ہیں۔

یورپ رقبے کے لحاظ سے آسٹریلیا کو چھوڑ کر دنیا کا سب سے چھوٹا براعظم ہے جس کا رقبہ ایک کروڑ چالیس لاکھ مربع کلومیٹر ہے جو زمین کے کل رقبے کا صرف دو فیصد بنتا ہے۔ یورپ سے بھی چھوٹا واحد براعظم آسٹریلیا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ تیسرا سب سے بڑا براعظم ہے جس کی آبادی 71 کروڑ ہے جو دنیا کی کل آبادی کا 11 فیصد بنتی ہے۔

(6) آسٹریلیا:

دولت مشترکہ آسٹریلیا جنوبی نصف کرے کا ایک ملک ہے جو دنیا کے سب سے چھوٹے براعظم پر مشتمل ہے۔ آسٹریلیا کا مرکزی حصہ زمانہ قدیم سے مقامی قبائلی آسٹریلین لوگوں سے آباد رہا ہے۔ شمال سے آنے والے اکا دکا ماہی گیروں اور یورپی مہم جوؤں اور تاجروں نے 17 ویں صدی میں ادھر آنا شروع کر دیا تھا۔ یکم جنوری 1901 کو ان 6 کالونیوں نے مل کر اصل مقامی آبادی کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک فیڈریشن بنائی اور اس طرح دولت مشترکہ آسٹریلیا وجود میں آئی۔ فیڈریشن سے لے کر اب تک آسٹریلیا میں معتدل جمہوری سیاسی نظام موجود ہے اور یہ ابھی تک دولت مشترکہ ہے۔ اس کا دارالحکومت ''کینبرا'' ہے۔ اس کی آبادی 2 کروڑ 10 لاکھ ہے۔ اس کے مشہور شہر سڈنی، میلبورن، برسبن، پرتھ اور ایڈیلیڈ ہیں۔

اسے 28 اکتوبر 1768ء کو ایک برطانوی جہاز راں کیپٹن "جیمز کک" نے دریافت کیا۔ اس نے اس کا نام "نیو ساؤتھ ویلز" رکھا۔ ویلز انگلستان میں ایک خطہ ہے۔ اس نے اسے "نئے جنوبی ویلز" کا نام دیا، مگر بعد میں یہ آسٹریلیا کے نام سے مشہور ہوا۔ لاطینی میں آسٹریلیس کا مطلب "جو جنوب میں ہو" ہے۔

آسٹریلیا کی مقامی آبادی جس کا اندازہ یورپی لوگوں کی آمد کے وقت 350000 کے قریب لگایا جاتا ہے جو 150 سال کے بعد ڈرامائی حد تک کم ہو گئی۔ اس کی کی وجوہات بیماریاں، یورپی لوگوں کی زبردستی آمد اور ثقافتی تفریق تھیں۔ مقامی لوگوں سے ان کے بچے چھیننا بھی ان کی نسل کشی کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ ان قدیمی باشندوں کی تاریخ میں سیاسی اور نظریاتی مقاصد کے لیے تبدیلیاں بھی کی گئی تھیں۔ یورپی حملہ آوروں نے جس طرح امریکا کی اصل آبادی ریڈ انڈین کی نسل نابود کر دی، اسی طرح آسٹریلیا کی اصل مقامی آبادی کی نسل کشی کر کے اس زرخیز بڑاعظم پر بھی قبضہ کر لیا۔

آسٹریلیا میں چھ ریاستیں اور دو بڑی اور کئی چھوٹی مملکتیں ہیں۔ ریاستوں میں کوئینز لینڈ، نیو ساؤتھ ویلز، وکٹوریہ، ساؤتھ آسٹریلیا، ویسٹرن آسٹریلیا اور تسمانیہ شامل ہیں۔ بڑی مملکتیں شمالی مملکت اور آسٹریلوی دارالحکومت کی مملکت ہیں۔ عموماً ریاستیں اور مملکتیں ایک ہی کام کرتی ہیں لیکن ان کے قوانین میں کچھ فرق ہوتے ہیں۔

آسٹریلیا کا کل رقبہ 7617930 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے گرد، بحر ہند، بحر قطب، جنوبی اور اوقیانوس کے سمندر ہیں۔ آسٹریلیا اور ایشیا کے درمیان تیمور اور ارافورا کے سمندر واقع ہیں۔ آسٹریلیا کے پاس کل 34218 کلومیٹر کا ساحل موجود ہے۔

"گریٹ بیریئر ریف" جسے دنیا کی سب سے بڑی مونگے کی چٹان ہونے کا درجہ ملا ہوا ہے، آسٹریلیا کے شمال مشرقی ساحل کے بالکل ساتھ ہے اور 2000 کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہے۔ "ماؤنٹ اگسٹس" کو دنیا کی سب سے بڑی چٹان مانا جاتا ہے۔

(7) انٹارکٹیکا:

انٹارکٹیکا یونانی لفظ "Antarktikos" سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے "آرکٹک" (Arcatic) یعنی قطب شمالی کے مدمقابل (آرکٹک قطب شمالی کو کہا جاتا ہے) انٹارکٹیکا دنیا کا انتہائی جنوبی براعظم ہے جہاں قطب جنوبی واقع ہے۔ یہ دنیا کا سرد ترین، خشک ترین اور ہوادار ترین براعظم ہے، جبکہ اس کی اوسط بلندی بھی تمام براعظموں سے زیادہ ہے۔ 14.425 ملین مربع کلومیٹر کے ساتھ انٹارکٹیکا، یورپ اور آسٹریلیا کے بعد دنیا کا تیسرا سب سے چھوٹا براعظم ہے۔ انٹارکٹیکا 98 فیصد برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں کوئی باقاعدہ مستقل انسانی بستی نہیں۔

1959ء میں 12 ممالک کے درمیان معاہدہ انٹارکٹک پر دستخط ہوئے جس کی بدولت یہاں عسکری سرگرمیاں اور معدنیاتی کان کنی کرنے پر پابندی عائد کی گئی اور سائنسی تحقیق اور براعظم کی ماحولیات کی حفاظت کے کاموں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ہر سال موسم گرما میں دنیا بھر سے آنے والے سائنسدانوں کی تعداد 4 ہزار سے زائد ہو جاتی ہے جو انٹارکٹیکا میں مختلف تحقیقی کام انجام دیتے ہیں جبکہ موسم سرما میں یہ تعداد ایک ہزار رہ جاتی ہے۔

انٹارکٹیکا کی بلند ترین چوٹی "ونسن ماسف" ہے جس کی بلندی 4892 میٹر (16050) فٹ ہے۔ یہ دنیا کا سرد ترین مقام ہے اور سب سے کم بارش بھی یہیں ہوتی ہے۔ یہاں کم سے کم درجۂ حرارت منفی 80 سے منفی 90 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے اور موسم گرما میں ساحلی علاقوں پر زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت بھی 5 سے 15 ڈگری سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔ کم بارشوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قطب جنوبی پر بھی سال میں 10 سینٹی میٹر (4 انچ) سے کم بارش پڑتی ہے۔

(2) جزیرے

جزیرہ، جزیرہ نما اور مجمع الجزائر:

خشکی کے چھوٹے قطعات جو چاروں طرف پانی سے گھرے ہوتے ہیں "جزیرے" کہلاتے ہیں۔ اگر تین طرف پانی اور ایک طرف خشکی ہو تو اسے "جزیرہ نما" کہتے ہیں۔ سرزمین عرب دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے۔ اس کے بعد جزیرہ نما "اناطولیہ" (سابقہ ایشیائے کوچک، موجودہ ترکی، ترک باشندے اسے "اناضول" کہتے ہیں) آتا ہے۔ کسی ایک جگہ بہت سے جزیروں کے اجتماع کو "مجمع الجزائر" کہا جاتا ہے، جیسے: جزائر انڈیمان (کالا پانی) مالدیپ وغیرہ۔ انڈونیشیا دنیا کا سب سے بڑا مجمع الجزائر ہے جو تقریباً ساڑھے 17 ہزار چھوٹے بڑے جزائر پر مشتمل ہے۔

اقسام: جزیروں کو محل وقوع کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے: (1) بری جزائر (2) بحری جزائر۔

(1) بَرّی جزائر (CONTINENTAL ISLANDS):

بری جزائر ایسے جزیروں کو کہتے ہیں جو کسی نہ کسی براعظم کے قریب واقع ہوں۔ ماہرین ارضیات کا کہنا ہے یہ سابقہ زمانے میں بڑی براعظموں سے ملے ہوئے تھے جو بعد میں خشکی کے کسی قدر پست ہو جانے اور سمندر کے خشکی پر امنڈ آنے سے براعظموں سے الگ ہو گئے۔ براعظموں سے الگ ہونے کی بنا پر ان کے مابین سمندر تنگ اور اتھلے یعنی کم گہرے ہیں۔ نیز ان کی ساخت، نباتات اور ان کے حیوانات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جزائر کسی زمانے میں براعظم سے منسلک تھے، مثلاً: "سری لنکا" ایشیا سے، "مڈغاسکر" افریقہ سے اور "فاک لینڈ" جنوبی امریکہ سے کسی زمانے میں جڑا ہوا تھا۔

(2) بحری جزائر (BCEANIC ISLANDS):

جو جزائر براعظموں سے دور واقع ہوں، نیز براعظموں سے (یعنی ان کی نباتات، جمادات، حیوانات اور ساخت وغیرہ سے) مناسبت نہ رکھتے ہوں ان کو "بحری جزائر" کہتے ہیں۔ ان کی مختلف ساخت اور جداگانہ نباتات و حیوانات ان کی آزادانہ حیثیت کے شاہد ہیں۔ یہ عام طور پر بلند آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں جو سطح سمندر سے سر نکالے ہوئے ہیں۔ بحرالکاہل کے جزائر کا سلسلہ جو ایشیا کے مشرقی ساحل کے دوش بدوش شمال سے جنوب تک بشکل قوس چلا گیا ہے اور "حلقہ آتشیں" کے نام سے معروف ہے، اسی قسم کے جزیروں پر مشتمل ہے۔ جزائر موریشس بھی آتش فشانی کے نتیجے میں رونما ہوئے۔ بحری جزائر بڑے بھی ہوتے ہیں، جیسے: گرین لینڈ، آئس لینڈ اور چھوٹے بھی جیسے: قبرص، کریٹ، سسلی اور مالٹا۔

مشہور جزیرے

دنیا میں چھوٹے بڑے جزیرے اور مجمع الجزائر تو بہت سے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو مستقل ملک ہیں اور ایسے بھی ہیں جو غیر آباد ہیں۔ یہاں ہم صرف دنیا کے

مشہور اور قابلِ ذکر جزائر (یا مجمع الجزائر) کو سمندروں کی ترتیب سے پیش کرتے ہیں، یعنی پہلے بحرالکاہل کے جزائر، جو دنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے، پھر بحرِ اوقیانوس، (بحیرۂ روم اسی کی ایک شاخ ہے) پھر بحرِ ہند۔ ان جزائر کی خصوصیت اور انتخاب کی وجہ ساتھ ساتھ سمجھ میں آجائے گی۔

بحرالکاہل کے جزائر

1- ہوائی:

ہوائی ریاستہائے متحدہ امریکہ کی 50ویں ریاست ہے جو امریکہ کی دیگر ریاستوں سے دور، بحرالکاہل کے وسط میں واقع ہے۔ جزائر کی یہ کڑی آتش فشانوں کے نتیجے میں وجود میں آئی جن میں سے صرف ایک ''ماؤنا لوا'' آج تک متحرک ہے۔ جزیرے کے حقیقی باشندے پولینیشیائی ہیں لیکن غیر ملکیوں (یعنی یورپی و امریکی قبضہ گیروں) کی مسلسل آمد کے باعث اب یہ کل آبادی کا صرف 2 فیصد رہ گئے ہیں۔ گویا یورپی حملہ آوروں نے جو سلوک امریکا کی اصل ریڈ انڈین آبادی کے ساتھ کیا، وہی نسل کشی اس جزیرے کے باسیوں کے حصے میں بھی آئی۔ ہوائی کی سب سے اہم صنعت سیاحت ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک تہائی آبادی کا روزگار سیاحت سے وابستہ ہے۔ ''پرل ہاربر'' پر واقع مشہور بحری فوجی بندرگاہ بھی ملازمت کا بڑا ذریعہ ہے۔ یہ وہی بندرگاہ ہے جس پر جاپان نے جنگ عظیم دوم میں تاریخی حملہ کیا تھا۔ اس پر امریکا نے شکست کو سامنے دیکھتے ہوئے جاپان پر ''ایٹم بم'' برسا دیے۔ افسوس کہ جاپانی جاسوسوں نے اپنی فوج کو یہ خبر نہ دی کہ اس وقت امریکا کے پاس تیسرا ایٹم بم نہیں، لہٰذا جاپان نے ہتھیار ڈال کر شکست تسلیم کر لی اور آج تک وہاں چالیس ہزار امریکی فوجی براجمان ہیں، جبکہ جاپان کو اپنے ملک میں اپنی مستقل فوج رکھنے کی اجازت نہیں۔ علاوہ ازیں یہاں گنا، کیلے اور پھل بھی کاشت کیے جاتے ہیں جنہیں برآمد کیا جاتا ہے۔

2- گوام:

بحرالکاہل کے مغربی حصے پر واقع گوام جزیرے (Guam Island) کا رقبہ 541.3 مربع کلومیٹر ہے۔ جزیرے کے مغربی ساحل پر خلیج ایجن کے کنارے اس کا دارالحکومت ''ہاگاتنا'' (Hagåtña) ہے۔ جبکہ معروف ''اگانا'' (Agana) ہے۔ یورپی کھوج کاروں کے جس ہراول دستے نے اس جزیرے کو دریافت کیا تھا وہ پرتگالی مہم جو ''فرڈیننڈ میگیلین'' (Ferdinand Magellan) کی قیادت میں 6 مارچ 1521ء میں یہاں پہنچا۔ لہٰذا 1561ء تک یہ اسپین کے قبضے میں رہا پھر 1898ء میں اسپین امریکا جنگ کے بعد اسپین اس سے دستبردار ہو گیا اور اس وقت سے یہ امریکا کی تحویل میں ہے۔ 2009ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 1,78,000 تھی۔ اس کی وہ خصوصیت جس کی وجہ سے اسے یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے قریب بحرالکاہل کا ''ماریانہ ٹرینچ'' نامی وہ مقام ہے جسے سمندر کی سب سے پست ترین جگہ قرار دیا جاتا ہے۔

بحر اوقیانوس کے جزائر

1- جزائر برطانیہ:

براعظم یورپ کے شمال مغربی ساحلوں پر جزائر برطانیہ واقع ہیں جو دو بڑے اور 5 ہزار سے زائد چھوٹے جزائر کا مجموعہ ہیں۔ سیاسی طور پر یہ علاقہ دو علاقوں میں منقسم ہے: برطانیہ عظمیٰ اور جمہوریہ آئرستان (آئرلینڈ)۔ برطانیہ عظمیٰ چار حصوں پر مشتمل ہے: انگلستان، ویلز، اسکاٹستان (اسکاٹ لینڈ) اور شمالی آئرستان جغرافیائی طور پر جزائر برطانیہ شمال اور مغرب کے بالائی علاقوں اور جنوب اور مشرق کے زیریں علاقوں میں تقسیم ہیں۔ چھوٹی پہاڑیاں، وسیع بنجر علاقے اور بڑے

احاطوں میں چھوٹے قطعات زمین جزائر برطانیہ کے روایتی مناظر ہیں۔ آئرستان کو اپنی سرسبزی وشادابی کے باعث "جزیرۂ زمرد" کہا جاتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ اور ویلز پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہیں۔

انگلستان کے زیریں علاقوں میں وسیع اور ہموار زمینیں اسے برطانیہ میں زراعت کا اہم ترین مرکز بناتی ہیں۔ اگرچہ ملک خوراک کے حوالے سے خود کفیل نہیں لیکن گندم، آلو اور سبزیاں وافر مقدار میں پیدا ہوتی ہیں۔ آئرستان اور وسطی انگلستان میں گلہ بانی بھی کی جاتی ہے جبکہ پہاڑی علاقوں میں بھیڑ بانی عام معمول ہے۔ گذشتہ چند دہائیوں میں برطانیہ کی روایتی صنعتیں یعنی کوئلے کی کان کنی، لوہا سازی اور پارچہ بافی زوال کی جانب گامزن ہیں اور ان کی جگہ کاریاں تیار کرنے کے جدید کارخانے، کیمیائی مادے اور برقی وجدید مصنوعات کی صنعتیں لے رہی ہیں۔ یہ ریاست بنکاری و بیمہ کاری کی صنعت میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ ملک کا سب سے اہم قدرتی وسیلہ بحیرہ شمال کے تیل و گیس کے ذخائر ہیں۔

برطانیہ کی کثافت آبادی بہت زیادہ ہے یہاں کے بیشتر لوگ شہری علاقوں میں رہتے ہیں۔ جنوب مشرقی علاقہ ملک کا سب سے گنجان آباد علاقہ ہے۔ بالائی اسکاچ علاقوں میں سب سے کم آبادی ہے۔ آئرستان کی بیشتر آبادی دیہی ہے جہاں اکثریت زراعت کے شعبے سے وابستہ ہے۔

2-کینری آئرلینڈ (جزائر خالدات):

کینری جزائر (عربی: الجزائر الخالدات)، بحر اوقیانوس کا جزیرہ ہے۔ یہ آج کل اسپین کے ماتحت ہے، لیکن مغربی ممالک اس جزیرے میں اپنے حق کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ چار جزائر سے مرکب ہے: بڑا کینری جزیرہ (Grand Canaria)، تنریفی (Tenerife)، لانزروتی (Lanzarote) اور لاپالما (La Palma)۔ جبکہ اس میں چھوٹے چھوٹے سینکڑوں جزائر ہیں۔ اس کا دارالحکومت سانتا کروز Cruz(Santa) اگرچہ جزیرہ تنریفی میں ہے لیکن رقبے کے اعتبار سے سب سے بڑا جزیرہ "عظیم کینری" ہے، چنانچہ اس کا رقبہ 1532 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کی شکل کروی ہے۔ پانی کی سطح سے اس کی بلندی بعض علاقوں میں 2 ہزار میٹر سے بھی زیادہ ہے۔

ان جزائر کی دنیا کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ یہ امریکا کی دریافت تک دنیا کے انتہائے مغرب میں خشکی کا آخری حصہ سمجھے جاتے تھے۔ لہٰذا عرصۂ دراز تک ان کو طول البلد کا مبتدا بھی سمجھا جاتا رہا۔ ان کے بعد واقع سمندر کو "بحر ظلمات" کہا جاتا تھا۔ آج سے تقریباً سوا پانچ سو سال پہلے تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس سمندر کے پار بھی دو بڑے براعظم واقع ہیں۔ لاطینی امریکا کی دریافت کے سفر میں کولمبس کی چاروں کشتیاں زادِ راہ ساتھ لینے کے لیے ان جزائر میں آکر رکی تھیں۔

3-سینٹ ہلینا:

سینٹ ہلینا (انگریزی: Saint Helena) جنوبی بحر اوقیانوس میں برطانیہ کے زیر قبضہ ایک جزیرہ ہے۔ یہ سینٹ ہلینا، "اسینشن" اور "ٹرستان دی کونہا" کے جزائر پر مشتمل ہے۔ سینٹ ہلینا مشہور فرانسیسی فاتح "نپولین بوناپارٹ" کے آخری ایام کی قیام گاہ کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہے۔ نپولین کو 1815ء میں جلاوطن کر کے سینٹ ہلینا بھیج دیا گیا تھا جہاں 1821ء میں اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ نپولین کی قیام گاہ "لانگ ووڈ ہاؤس" اور اُس کی آخری آرام گاہ "سین دیلی" کو 1858ء میں فرانسیسی حکومت کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

سینٹ ہلینا کی آبادی چند ہزار نفوس پر مشتمل ہے جس میں سے بیشتر افراد مغربی اور جنوبی افریقہ، جزائر برطانیہ اور اسکینڈے نیویا سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالیہ چند دہائیوں میں لوگوں کی بڑی تعداد جزائر فاک لینڈ اور برطانیہ نقل مکانی کر گئی ہے۔ 21 مئی 2002ء کو جزیرے کی تمام آبادی کو باقاعدہ برطانوی شہریت عطا

کی گئی۔ جزیرہ کا کل رقبہ 410 مربع کلومیٹر ہے جس میں تینوں جزائر کے مجموعے شامل ہیں۔ صرف سینٹ ہلینا کا رقبہ 122 مربع کلومیٹر ہے جبکہ اس کا دارالحکومت جیمز ٹاؤن ہے۔ اپریل 2005ء میں برطانوی حکومت نے سفر کی سہولیات کو آسان بنانے کے لیے جزیرے پر ہوائی اڈے کی تعمیر کا اعلان کیا جس کے 2012ء تک مکمل ہونے کا امکان ہے تاہم کسی حتمی تاریخ کا اعلان نہیں کیا گیا۔

4-کیریبین جزائر:

بحیرہ کیریبین اس سے ملحقہ جزائر اور ساحلوں کا علاقہ ''کیریبین'' کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ شمالی امریکہ کے جنوب مشرق، وسطی امریکہ کے مشرق اور جنوبی امریکہ کے شمال اور مغرب میں واقع ہے۔ کیریبین پرت کے اوپر واقع یہ علاقہ 7 ہزار سے زائد جزائر پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ غرب الہند بھی کہلاتا ہے جو 28 آزاد و محکوم علاقوں کا مجموعہ ہے۔ اس علاقے کا نام کیریبین 15 ویں صدی کے اواخر میں یورپیوں کی آمد کے موقع پر یہاں کے ایک گروہ ''کیرب'' سے موسوم ہے جو یہاں کی اصل آبادی تھی۔ جبکہ دوسرا نام یعنی ''غرب الہند'' کرسٹوفر کولمبس کے اس نظریے کے باعث وجود میں آیا کہ وہ اس علاقے کو مرتے دم تک ہندوستان ہی سمجھتا رہا۔ دوسری جانب علاقے کے لیے استعمال ہونے والی ہسپانوی اصطلاح ''انٹیلا س'' کا مطلب نو دریافت شدہ علاقے ہے۔ یہ علاقہ اپنے خوبصورت ساحلوں اور تفریحی مقامات کے باعث دنیا بھر کے سیاحوں میں معروف ہے اس لیے سیاحت یہاں کی اہم ترین صنعتوں میں سے ایک ہے۔ برصغیر میں اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ کرکٹ کا کھیل ہے جس میں ویسٹ انڈیز دو مرتبہ عالمی اعزاز حاصل کر چکا ہے۔

5-گوانتانامو:

گوانتانامو (Guantánamo) ''کیوبا'' کے پندرہ صوبوں میں سے انتہائے مشرق میں واقع ایک صوبہ ہے۔ اس کے صدر مقام کا نام بھی گوانتانامو ہی ہے۔ اس نے سقوطِ اماراتِ اسلامیہ افغانستان کے بعد گرفتار شدہ مجاہدین کے عقوبت خانے کی حیثیت سے مجاہدین کی استقامت کا گواہ بن کر عالمی شہرت پائی۔
گوانتانامو کی تہذیب اور طرزِ تعمیر بقیہ کیوبا سے مختلف ہے۔ اس کی اصل بناوٹ 1786ء میں اسپین کے علاقے ''کیٹالین'' (Catalonia) کے شمال مشرقی علاقے ایمپرڈن (Ampurdan) کے کیٹیلن (Catalan) خاندانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ برطانوی فوجوں نے اس علاقے پر تقریباً 40 سال قبضہ کیے رکھا اور سکوٹ آئرش (Scot-Irish) باشندگان ہسپانوی فرمانرواؤں کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوئے۔
1805ء میں جب فرانسیسی قابضین ڈومینیکن کے شہر ''سینٹ ڈومیلنگو'' (St.Domingue) سے بزور نکال دیے گئے تو فرانسیسی باشندگان کو کیوبا ہی میں زمینیں دی گئیں۔ بہت سے فرانسیسی خاندان گوانتانامو میں رہائش پذیر ہو گئے اور کافی اور ناریل کی کاشت کرنے لگے۔ 1959ء کے کیوبا انقلاب سے قبل گوانتانامو عیسائیوں کی مذہبی رسومات اور تقریبات کے حوالے سے کیوبا میں مشہور تھا۔
یہ صوبہ ہیٹی (Haiti) سے صرف 80 کلومیٹر دور ہے۔ اس کا مرکز صاف رات میں ہیٹی کی روشنیوں سے بہت قریب نظر آتا ہے۔ گوانتانامو میں جمیکا (Jamaica) کے تارکین وطن کی بھی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ نائپ سیگوا باراکوا (Nipe-Sagua-Baracoa) نامی پہاڑی سلسلہ اس صوبے پر راج کرتا ہے اور اس کے موسم اور علاقے دونوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شمالی ساحل جو وہاں چلنے والی ہواؤں سے متاثر علاقہ ہے اس ملک کا مرطوب ترین علاقہ شمار ہوتا ہے، شمال کو رین فورسٹ (forest Rain) سے موصوف کیا جاتا ہے، جبکہ جنوب خشک ہے۔

6-برمودا جزائر:

برمودا: Bermuda بحر اوقیانوس میں واقع چند جزائر کے مجموعے کا نام ہے، جو ریاستہائے امریکہ کے مشرقی ساحل کے قریب واقع ہے۔ اس ملک کا

دارالحکومت ہملٹن (Hamilton) ہے۔ یہ 53.2 مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلے ہوئے 123 جزائر پر مشتمل ہے۔ یہ جزائر 9 بڑے حصوں میں منقسم ہیں جن میں سے اہم ہملٹن (Hamilton) اور سینٹ جارج (George's St) ہے۔ 2009ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 67.837 ہے۔ ان جزائر کو 1503ء میں ایک اسپینی مہم جو "جوان ڈی برمودیز" (Juan de Bermudez) نے دریافت کیا تھا لہٰذا اسی کے نام پر ان جزائر کو "برمودا جزائر" کہا جاتا ہے۔ برمودا سے بہاماس نامی جزائر کے بیچ میں سطح سمندر پر وہ پراسرار تکونی خطہ ہے جس میں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن کی کوئی عقلی تشریح یا سائنسی توجیہ اب تک نہیں کی جا سکی، لیکن اگر اس امر کو دیکھا جائے کہ یہ خطہ حیرت انگیز طور پر مدوّر، مربع یا خمس نہیں، "مثلث" مانا جاتا ہے تو ذہن خود بخود دنیا کے اس ترقی یافتہ انسانی گروہ کے مسیحائے غائب و مقید کی طرف جاتا ہے جو تکون اور تکون میں مقید آنکھ کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے اور اس مسیحائے منتظر یعنی دجال اکبر کے خروج پر راندۂ درگاہ قوم بنی اسرائیل کی کرۂ ارض پر بلا شرکت غیرے حکمرانی کا امیدوار ہے۔

بحیرۂ روم کے جزائر

1- گیلی پولی:

جزیرہ نما گیلی پولی (ترکی: Gelibolu Yarmadas) درۂ دانیال کے مغرب اور بحیرۂ ایجیئن کے مشرق میں ترکی کے یورپی علاقے ترک تھریس میں واقع ہے۔ یہ نام یونانی زبان کے لفظ Kallipolis سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے "خوبصورت شہر"۔ بازنطینی حکمران جسٹینین نے اس شہر کی قلعہ بندی کی اور عسکری گودام تشکیل دیے۔ 1354ء کے تباہ کن زلزلے کے بعد یہ شہر مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اسی سال یہ شہر یورپ کا پہلا علاقہ بنا جو عثمانی سلطنت کے زیر نگیں آیا اور بلقان اور وسطی یورپ تک عثمانیوں کی پیش قدمی کا نقطہ آغاز قرار پایا۔ سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں گیلی پولی کا شہر "ولایت ادرنہ" کا حصہ تھا جس کی آبادی 30 ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن میں یونانی، ترک، آرمینیائی اور یہودی بھی شامل تھے۔ جنگ عظیم اول کے دوران گیلی پولی ایک عظیم جنگ کا میدان بنا جو "جنگ گیلی پولی" کہلاتی ہے۔ یہ جنگ برطانیہ میں "درۂ دانیال مہم" اور ترکی میں "جنگ چناکلی" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور نیو فاؤنڈ لینڈ میں آج بھی گیلی پولی کی اصطلاح 8 ماہ کی اس مہم کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جنگ کے دوران 25 اپریل 1915ء کو برطانوی اور فرانسیسی دستے جزیرہ نما پر اترے اور اگلے 8 ماہ تک یہ علاقہ میدان جنگ بنا رہا جس کے دوران دونوں جانب بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں۔ تاہم فتح ترک مجاہد دستوں کی رہی اور برطانیہ اور فرانس کو پسپا ہونا پڑا۔ اس طرح جنگ عظیم اول کے دوران روس کو درۂ دانیال کے راستے رسد کی فراہمی نہ ہو سکی۔ مجموعی طور پر اتحادی قوتوں کی 140,000 اموات ہوئیں۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں آج بھی 25 اپریل کو ANZAC Day کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یعنی (Australian Newzealand Army Corps)۔ یہ دراصل آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ان فوجی جوانوں کی یاد میں منایا جاتا ہے جو 25 اپریل 1916ء کو جنگ عظیم اول میں ترکی کے جزیرے گیلی پولی کے میدانِ کارزار میں شریک ہوئے اور عثمانی مجاہدین سے لڑتے ہوئے موت سے ہمکنار ہو گئے۔ یہ دنیا کی ان چند جنگوں میں سے ایک ہے جسے دونوں حریف اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔

2- قبرص:

قبرص مشرقی بحیرہ روم کا ایک جزیرہ اور ملک ہے جو جزیرہ نما اناطولیہ (ایشیائے کوچک: موجودہ ترکی) کے جنوب میں واقع ہے۔ جمہوریہ قبرص 6 اضلاع میں تقسیم ہے جبکہ ملک کا دارالحکومت "نکوسیا" ہے۔ قبرص 395ء میں رومی سلطنت کی تقسیم کے بعد بازنطینی سلطنت کا حصہ بنا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں اسے مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ تیسری صلیبی جنگ کے دوران 1911ء میں انگلستان کے شاہ رچرڈ اول نے اس پر قبضہ کر لیا۔ 1489ء میں

جمہوریہ وینس نے جزیرے کا کنٹرول سنبھال لیا جبکہ 1571ء میں عثمانی کمانڈر لالہ مصطفیٰ کی زیر قیادت عثمانی فوج نے جزیرہ فتح کر لیا۔ 1913ء میں برطانوی نو آبادیاتی بننے والا قبرص 1960ء میں برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ 11 سال تک فسادات کے بعد 1964ء میں اقوام متحدہ کی امن فوج تعینات کی گئی جس کے بعد جزیرے کا یونان کے ساتھ الحاق کیا گیا جس پر ترکی نے 1974ء میں جزیرے پر حملہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں شمالی قبرص میں ترکوں کی حکومت قائم ہوگئی جو "ترک جمہوریہ شمالی قبرص" کہلاتی ہے تاہم اسے اقوام متحدہ تسلیم نہیں کرتی۔ شمالی قبرص اور قبرص ایک خط کے ذریعے منقسم ہیں جسے "خط سبز" کہا جاتا ہے۔ شمالی قبرص کو صرف ترکی کی حکومت تسلیم کرتی ہے۔ جمہوریہ قبرص یکم مئی 2004ء کو یورپی یونین کا رکن بنا۔

3-کریٹ:

کریٹ بحیرۂ روم میں یونان کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ یہ بحیرہ روم کا پانچواں سب سے بڑا جزیرہ بھی ہے۔ یہ جزیرہ سیاحوں میں بہت مشہور ہے اور لاکھوں سیاح یہاں کے تاریخی مقامات کی سیر کرنے آتے ہیں۔ کریٹ 824ء تک مشرقی رومن یا بازنطینی سلطنت کا حصہ رہا تاہم سن 824ء میں مسلمانوں نے اسے فتح کر کے امارت کا درجہ دیا اور کانڈیہ کا شہر بسا کر اسے دارالحکومت قرار دیا۔ 960ء میں بازنطینیوں نے ایک مرتبہ پھر اسے فتح کیا اور 1204ء تک یہ انہی کے قبضے میں رہا۔ چوتھی صلیبی جنگ کے موقع پر یہ جزیرہ صلیبیوں کے ہاتھوں فتح ہوا 1669ء میں عثمانی ترکوں کی فتح تک انہی کے قبضے میں رہا۔ 1648ء میں عثمانیوں نے اس جزیرے کے شہر کینڈیا کا محاصرہ شروع کیا جو تاریخ کا سب سے طویل محاصرہ ہے۔ 1669ء میں عثمانیوں نے شہر فتح کر لیا اور جزیرے کا آخری شہر اسپنالونگا 1718ء میں فتح ہوا اور جزیرہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن گیا۔ یونان کی جنگ آزادی کے وقت کریٹ میں مسلمانوں کی تعداد 45 فیصد تھی۔ اس وقت جزیرے کے 23 میں سے 19 اضلاع میں عیسائیوں کی تعداد 60 فیصد تھی لیکن شمالی ساحل پر تین بڑے شہروں میں مسلمانوں کی تعداد 60 فیصد سے زائد تھی۔

1832ء میں یونان کی سلطنت عثمانیہ سے آزادی کے بعد اس میں کریٹ شامل نہیں تھا بلکہ مصر کے خدیو مصطفیٰ پاشا کی زیر نگرانی تھا۔ اس عرصے میں جزیرہ مسلم اور عیسائی آبادی کے درمیان فسادات کا مرکز بن گیا۔ برطانیہ، امریکا، فرانس اور اٹلی کے تعاون سے یونان نے 1866ء میں عثمانی اقتدار کے خلاف بغاوت کھڑی کرا دی جس کے بعد عالی پاشا کو یہاں بھیجا گیا جنہوں نے مسائل کو بخوبی حل کیا۔ 1896ء تک عثمانی افواج کی جزیرے کے بیشتر حصوں پر گرفت نہ رہی۔ دسمبر 1898ء میں ترک افواج کو شکست دے دی گئی اور یونان کے شہزادہ جارج کی سربراہی میں آزاد کریٹ جمہوریہ وجود میں آئی۔ 1908ء میں سلطنت عثمانیہ کی ابتر صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کریٹ نے یونان سے الحاق کا اعلان کر دیا تاہم اس کی توثیق 1913ء میں جنگ بلقان کے بعد کی گئی۔ کریٹ کی مسلم اقلیت جزیرے پر موجود رہی تاہم 1923ء میں یونان اور ترکی کے درمیان معاہدہ لوزان کے تحت مسلم اور عیسائی آبادی کا تبادلہ کیا اور مسلمانوں کی اکثریت ترکی ہجرت کر گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مئی 1941ء میں یہاں جنگ کریٹ لڑی گئی جس میں جرمن افواج خصوصاً ان کے چھاتہ بردار دستوں نے برطانیہ کی افواج کو نکال باہر کیا۔

4-رہوڈس:

رہوڈس یونان کا ایک جزیرہ ہے جو بحیرہ ایجیئن میں واقع ہے۔ یہ ترکی کے مغربی ساحلوں سے صرف 11 میل (18 کلومیٹر) دور یونان اور قبرص کے درمیان واقع ہے۔ 2004ء کے مطابق جزیرے کی آبادی 110,000 ہے جن میں سے 55 سے 60 ہزار افراد تجارتی مرکز رہوڈس شہر میں بستے ہیں۔ تاریخ میں یہ شہر رہوڈس کے مجسمے کے باعث پہچانا جاتا ہے جسے جاہلیت جدیدہ میں دنیا کے 7 عجائبات میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے۔ قدیم شہر عالمی ثقافتی ورثے کا حصہ ہے۔ جزیرہ رہوڈس 79.7 کلومیٹر طویل اور 38 کلومیٹر چوڑا ہے جس کا کل رقبہ 1,398 مربع کلومیٹر (540 مربع میل) اور ساحلی پٹی 220 کلومیٹر طویل

ہے۔رہوڈس شہر جزیرے کے شمالی حصے پر 408 قبل مسیح میں بسایا گیا اور یہ جزیرہ 332 قبل مسیح میں سکندر اعظم کی سلطنت کا حصہ بنا۔ یہاں کے باشندے مشرک تھے اور دیوی دیوتاؤں کے مجسمے بناتے تھے۔ 305 قبل مسیح میں اس میں سورج دیوتا ''ہیلیوس'' کا ایک مجسمہ نصب کیا گیا جو رہوڈس کے مجسمے کے نام سے جانا جاتا ہے اور انسان جیسی اشرف المخلوقات کی سورج جیسی خادم مخلوق کے آگے جھکنے کی حماقت کی یاد دلاتا ہے۔ تیسری صدی عیسوی میں رہوڈس اپنے عروج پر پہنچ گیا اور یونان کا سب سے تہذیب یافتہ اور خوبصورت شہر بن گیا۔ 395ء میں رومی سلطنت کی تقسیم کے ساتھ ہی رہوڈس کے طویل بازنطینی دور کا آغاز ہوا۔

672ء میں اموی دور میں مسلمان فاتحین نے رہوڈس پر قبضہ کرلیا اور پہلی صلیبی جنگ تک یہ مسلمانوں کے زیر اقتدار رہا جب بازنطینی حکمران نے اسے واپس لے لیا۔ 1309ء میں نائٹس ہاسپٹلرز نے جزیرے پر قبضہ کر کے یہاں سے بازنطینیوں کا خاتمہ کردیا اور شہر کو یورپی طرز پر تعمیر کیا گیا۔

نائٹس کی تعمیر کردہ مضبوط دیواریں 1444ء میں سلطان مصر اور 1480ء میں سلطان محمد فاتح کے حملوں کو روکتی رہیں اور بالآخر دسمبر 1522ء کو عثمان سلطان سلیمان اعظم کی عظیم مجاہد فوج کے سامنے ہمت ہار بیٹھیں۔ اس کے بعد یہ جزیرہ 4 صدیوں تک سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہا۔ 1912ء میں خلافت عثمانیہ کے زوال کے دور میں اٹلی نے جزیرے پر قبضہ کرلیا اور 1947ء میں رہوڈس اور اس سے ملحقہ جزیرے یونان کے حوالے کردیے گئے۔

5-صقلیہ:

صقلیہ یا سسلی (اطالوی:Siclia، ہسپانوی:Sicilian، عربی:صقلیہ) اٹلی کا ایک خودمختار علاقہ اور بحیرہ روم کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ جس کا رقبہ 25 ہزار 700 مربع کلومیٹر اور آبادی 50 لاکھ ہے۔ سب سے بڑا شہر ''پالیرمو'' کہلاتا ہے جہاں پانچ مختلف تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں۔ صقلیہ مشرق میں آبنائے مسینا کے ذریعے اٹلی سے کٹا ہوا ہے۔ جزیرے پر واقع آتش فشاں پہاڑ ایٹنا 3 ہزار 320 میٹر (10 ہزار 900 فٹ) بلند ہے جو یورپ کا سب سے بلند آتش فشاں ہے۔ یہ دنیا کے متحرک ترین آتش فشانوں میں سے ایک ہے۔

قبل مسیح میں صقلیہ، یونانی اور کارتھیج سلطنتوں کے درمیان کشمکش کا مرکز رہا اور یہ کئی صدیوں تک رومی سلطنت کا صوبہ رہا۔ 552ء میں اسے بازنطینیوں نے فتح کرلیا اور 827ء تک یہ بازنطینی سلطنت کا حصہ رہا۔ 827ء تا 902ء تک مسلم عربوں نے صقلیہ کو فتح کرلیا اور آل کلبی نے امارت صقلیہ قائم کر کے پالرمو کو اپنا دارالحکومت بنایا جو آج تک صقلیہ کا دارالحکومت ہے۔ مسلم صقلیہ کا نام غیر مسلموں سے بہترین سلوک کے باعث تاریخ میں اندلس کی طرح روشن ہے۔ صقلیہ میں مسلمانوں کے ڈھائی سو سالہ اقتدار کا خاتمہ نارمن اقوام کے ہاتھوں ہوا، جنہوں نے 1060ء سے 1090ء کے دوران صقلیہ کو اپنی حکومت میں شامل کیا۔

صلیبی جنگوں کے دوران جزیرے پر مسلم اور عیسائی آبادی کے درمیان کشیدگی بڑھنے کے بعد 1224ء میں عیسائی حکمرانوں نے مسلمانوں کے دور حکومت کے حسنِ سلوک کو فراموش کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو جزیرے سے بے دخل کردیا۔

6-مالٹا:

مالٹا ایک یورپی ریاست ہے، جو بحر متوسط میں واقع ہے۔ محل وقوع کے اعتبار سے اٹلی کے جنوب میں، تیونس کے مشرق میں اور لیبیا کے شمال میں ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے براعظم افریقہ میں شمار ہوتا ہے اور سیاسی اعتبار سے یورپ میں۔ ان علاقوں کا موسم بحر متوسط کا موسم ہے۔ درجہ حرارت 12 درجہ سے 26 درجہ کے درمیان ہے اور سال کے اکثر حصے میں 19 درجہ حرارت رہتا ہے۔ مالٹا رقبے کے لحاظ سے چھوٹا ہونے کے باوجود زیادہ آبادی والے ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ ''مالٹا'' کے لوگ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ کلیسا کا اندرونی سیاست پر بڑا گہرا اثر ہے۔ اس جزیرے کو اس اعتبار سے تاریخی حیثیت حاصل ہے کہ تحریکِ ریشمی رومال کے قائدین کو انگریز سامراج نے یہاں قید رکھا تھا۔ انہوں نے یہاں انتہائی صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا، اس طرح برصغیر کے

مسلمانوں اور علمائے حق کے فرزندوں کی اس جزیرے سے ناقابل فراموش تاریخی یادیں وابستہ ہیں جو ان کے ذہنوں اور تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔

7-سردینیا:

''سردینیا''(Sardinnyaor Sardigna) یورپی زمین کے قدیم ترین مقامات میں سے ہے، جس میں 600 سال قبل مسیح سے انسان بس رہے ہیں۔ یہ اٹلی کی خودمختار ریاست اور بحر متوسط میں سسلی کے بعد دوسرا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ سردینیا کا لفظ شاید سردینیا کے قدیم افسانوی ہیرو جس کا نام ''سردس'' تھا سے بنا ہے۔ اس کا رقبہ 2382 کلومیٹر ہے۔ اس کا ساحل 1,849 کلومیٹر طویل ہے جو بلند اور پتھریلا ہے۔ یہاں سسلی اور اٹلی کی طرح زلزلے نہیں آتے۔ ایک تجزیے کے مطابق اس جزیرے کی زمین گرینائٹ اور دیگر مختلف پتھروں سے لبریز ہے۔ اس کی اوسطاً بلندی 300 سے 1000 میٹر تک ہے۔ اس کا بلند ترین مقام ''پنٹالا مرمرہ'' ہے جو اس جزیرے کے وسط میں واقع ہے۔ اس کی بلندی 1,834 میٹر ہے۔

جزیرے کا 13.6 فیصد رقبہ کوہ پیکر ہے، 18.54 فیصد ہموار اور 67.9 فیصد پہاڑی ہے۔ اس میں کچھ بڑے بڑے دریا ہیں جن میں سب سے بڑا ''تائرسو''(Tirso) ہے، جو 151 کلومیٹر لمبا ہے اور 54 مصنوعی جھیلیں ہیں۔ اس جزیرے کا موسم بحر متوسط کے دیگر قریبی علاقوں کی طرح ہوتا ہے۔ یہاں سردیوں اور بہار میں بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ اوسط درجہ حرارت 11 سے 17 سینٹی گریڈ رہتا ہے۔

8-کورسیکا:

کورسیکا بحیرہ روم کا چوتھا بڑا جزیرہ ہے (صقلیہ، ساردینیا اور قبرص کے بعد) جو آج کل فرانس کے قبضہ میں ہے۔ یہ اٹلی کے مغرب، فرانس کے جنوب مشرق اور جزیرہ ساردینیا کے شمال میں واقع ہے اور فرانس کے 26 خطوں میں سے ایک ہے۔ یہ نپولین بوناپارٹ کی جائے پیدائش کے طور پر مشہور ہے۔ جزیرے کا کل رقبہ 8,680 مربع کلومیٹر اور ساحلوں کی لمبائی ایک ہزار کلومیٹر ہے۔ آبادی یکم جنوری 2005ء کے اندازوں کے مطابق 2,75,000 جبکہ مارچ 1999ء کی مردم شماری کے مطابق 2,60,196 ہے۔ جزیرہ پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے، جن میں ''مونٹی سنٹو'' سب سے بلند پہاڑ ہے اس کی بلندی 2706 میٹر ہے۔ اس کے علاوہ دو ہزار میٹر سے بلند 20 مزید چوٹیاں بھی جزیرے پر موجود ہیں۔ یہ جزیرہ آبنائے بونیفیکیو کے ذریعے ساردینیا سے جدا ہوتا ہے۔ کورسیکا کے اہم شہروں میں اجاکیو (لاطینی نام: Ajax)، باستیا، کورٹی اور سارٹین (Sarte) شامل ہیں۔ کورسیکا کو نپولین بوناپارٹ کی جائے پیدائش کے طور پر بھی جانا جاتا ہے جو 1769ء میں اجاکیو میں پیدا ہوا۔ ان کے والدین فرانس چلے گئے اور نپولین نے وہیں تعلیم حاصل کی۔

9-میجورکا:

یہ اسپین کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ یہ بحر متوسط میں واقع ہے اور بلیرک (Baleric) مجمع الجزائر کا ایک حصہ ہے۔ یہ اسپین کی آزاد ریاستوں میں سے ایک ہے۔ اس جزیرے کا دارالحکومت ''پاما'' ہے، جو بیلرک جزائر کی خودمختار ریاستوں کا دارالحکومت ہے۔ بیلرک جزائر کے دوسرے جزیروں کی طرح یہ جزیرہ بھی سیاحوں کی آمد و رفت کا مشہور مرکز ہے۔

میجورکا میں قدیم زمانے سے انسانی آبادی چلی آرہی ہے۔ رومیوں نے اس جزیرے پر 123 قبل مسیح میں قبضہ کیا۔ ابتدا میں یہ رومی قانون کے ماتحت رہا، جب پولنٹیا (Pollentia) اور پامیریا (Palmaria) کے قصبے بنائے گئے اور مقامی معیشت وسیع پیمانے پر زیتون کی کاشتکاری (Oliv cultivation) کی طرف چلی گئی تو 466 میں ''وان ڈالس'' (wandals) نے اس جزیرے کو اپنی سلطنت کے زیر نگیں کر دیا۔ 534 قبل مسیح میں میجورکا بازنطینی حکمرانوں کے

قبضہ میں چلا گیا اور وہ سردینیا کے صوبے کے ایک ٹکڑے کے طور پر اس کا نظام چلاتا رہا۔ اس کے دور میں یہاں عیسائیت کی کافی نشو ونما ہوئی اور متعدد کلیسا تعمیر کیے گئے۔

بحرِ ہند کے جزائر

1- جزائرِ انڈیمان (کالا پانی):

یہ تقریباً دو سو جزائر ہیں جو خلیج بنگال میں واقع ہیں۔ یہ شمال سے جنوب کی طرف ایک لکیر کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کو شمالی، وسطی اور جنوبی انڈیمان میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جزائرِ انڈیمان شمال میں برمی صوبے ''اراکان'' جنوب میں ''انڈونیشین جزیرے ''ساٹرا'' کے قریب واقع ہیں۔ شمالی انڈیمانی جزائر دو سو پچاس (250) مربع کلومیٹر پر مشتمل ہیں۔ جبکہ جنوب میں 10 ڈگری چینل ان جزائر کو ''نکوبار جزائر'' سے جدا کرتا ہے۔ ان میں بلندترین مقام ''سیڈل پیک''(saddle peak) ہے جو 720 میٹر، 2,3070 فٹ بلند ہے۔ ان جزائر کو برصغیر کے جہادِ آزادی میں اس اعتبار سے ناقابلِ فراموش تاریخی حیثیت حاصل ہے کہ انگریز مجاہدینِ آزادی کو یہاں لا کر قید و بند کی صعوبتوں سے گذارتا تھا۔ اسے ''حبسِ دوام بعبور دریائے شور'' یعنی سمندر پار عمر قید کہتے تھے۔ ہندوستان کے علماء و مجاہدین بالخصوص صوبہ بہار و بنگال میں سے علمائے صادق آباد کی قربانیوں اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کی کتاب ''کالا پانی'' نے ان جزائر کو مجاہدینِ برصغیر کی جگمگاتی تاریخ میں انمٹ حیثیت فراہم کی ہے۔

2- ڈیگوگارشیا:

ڈیگوگارشیا بحرہند کے وسط میں واقع ایک جزیرہ ہے۔ یہ بھارت اور سری لنکا کے جنوبی ساحلوں سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اصل میں یہ حلقہ نما مونگے کی چٹانیں ہیں۔ یہ بحرہند میں واقع برطانوی مقبوضات کا حصہ ہے۔ 1973ء میں مقامی آبادی کی جبری بے دخلی کے بعد سے امریکا اور برطانیہ اس جزیرے کو فوجی اڈے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

یہ جزیرہ 37 میل (60 کلومیٹر) طویل اور 5 میل (8 کلومیٹر) چوڑا ہے۔ اس میں چٹانوں کی کئی چوٹیاں باہر نکلی ہوئی ہیں جس کے باعث جہاز رانی خطرناک ہے۔ جزیرے کا کل رقبہ 66 مربع میل (170 مربع کلومیٹر) ہے۔ اس جزیرے کو 16 ویں صدی میں پرتگیزی جہاز رانوں نے دریافت کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جزیرے کا نام بھی اولین سفر کے جہاز کے کپتان یا جہاز راں کے نام پر رکھا گیا ہوگا۔ جزیرہ 18 دیں صدی تک غیر آباد تھا اس کے بعد فرانسیسیوں نے غلاموں کی مدد سے یہاں کھوپرے کی پیداوار کا آغاز کیا۔ نپولینی جنگوں کے بعد ڈیگوگارشیا برطانیہ کے قبضے میں آ گیا، تاہم 1814ء سے 1965ء تک یہ مورشس کے زیرنگیں رہا۔

1971ء میں جزیرے پر دو ہزار مقامی افراد آباد تھے جو مشرقی ہند اور افریقہ کے اُن کارکنوں اور غلاموں پر مشتمل تھے جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہاں لائے گئے تھے۔ فوجی اڈے کے قیام کے باعث تمام مقامی آبادی کو جبری طور پر سیشلس اور موریشس سے بے دخل کر دیا گیا۔ مذکورہ افراد ہمیشہ سے جزیرے پر اپنے حق کو جتاتے آئے ہیں اس لیے اپریل 2006ء میں 102 باشندوں کو ایک ہفتے کے لیے ڈیگوگارشیا میں قیام اور اپنے آباؤ اجداد کی قبروں اور اپنے گھروں کو دیکھنے کی اجازت دی گئی۔ یہاں پر ایک بحری اڈے کے علاوہ فضائیہ کا ایک عظیم اڈہ بھی قائم ہے، جس میں جدید بمبار طیاروں بی 52 کا سب سے بڑا بیڑہ شامل ہے۔ عراق کے خلاف 1991ء اور 2003ء میں ہونے والی جنگوں اور افغانستان کے خلاف جارحیت میں اس اڈے نے اہم کردار ادا کیا اور بمبار طیارے اسی اڈے سے اڑ کر افغانستان اور عراق میں اہداف کو نشانہ بناتے تھے۔

ان جنگوں سے قبل سرد جنگ کے دوران امریکا بحر ہند میں اپنے اثر ورسوخ کو قائم کرنے کے لیے ایک اڈہ بنانے کا خواہشمند تھا اور اس کی خواہش کی تکمیل ڈیگوگارشیا میں اڈے کے قیام سے ہوگئی، تاہم بھارت جو روس کا قریبی حلیف تھا اس کا سخت ترین مخالف رہا۔ لیکن سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا۔ بھارت تعلقات میں ڈرامائی طور پر بہتری دیکھنے میں آئی حتیٰ کہ 2001ء سے 2004ء کے دوران امریکی اور بھارتی بحریہ کے درمیان کئی جنگی مشقیں بھی ہوئیں۔

اس جزیرے کی ایک اور خاص بات یہاں امریکی خلائی جہازوں کی لینڈنگ کے لیے تیار کردہ فضائی مستقر ہے۔ اور یہ بحر ہند میں واحد ہوائی اڈہ ہے جہاں امریکی خلائی تحقیقاتی ادارے "ناسا" کو اپنے جہاز اتارنے کی اجازت ہے، تاہم اس کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ علاوہ ازیں گلوبل پوزیشننگ سسٹم (جی پی ایس) کو چلانے میں مددگار جو تین انٹینا دنیا بھر میں نصب ہیں، ان میں سے ایک اسی جزیرے پر ہے۔

انسانی حقوق کے اداروں کی جانب سے امریکا پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ڈیگوگارشیا کے اڈے کو گوانتاناموا اور ابوغریب کی طرح ایک بڑے قید خانے کے طور پر استعمال کر رہا ہے اور جون 2007ء میں یورپی کونسل نے اس دعوے کی تصدیق بھی کی۔ اس کے بعد برطانیہ کے سابق وزیر خارجہ جیک اسٹرا کو پارلیمان میں یہ تک کہنا پڑا کہ امریکی حکام نے بارہا یقین دلایا ہے کہ ڈیگوگارشیا میں کوئی قیدی نہیں لے جایا گیا۔ اکتوبر 2007ء میں برطانوی پارلیمان کی کل جماعتی امور خارجہ کمیٹی نے اعلان کیا کہ وہ ان دعووں کی تصدیق کے لیے معاملے کی چھان بین کرے گی۔ روایت ہے کہ یہ اعلان اس طرح کی چھان بین کا دروازہ بند کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

3-جزائر القمر (Comoro Islands)

آتش فشاں کے مجمع الجزائر قمری جزیرے افریقہ کے جنوب مشرقی ساحل پر تنزانیہ کے مشرق اور مڈغاسکر کے جنوب مغرب کی طرف موزمبیق چینل میں واقع ہیں۔ اس کی حیثیت ایک خودمختار ریاست کی ہے۔ یہ چاروں آتش فشاں جزیرے 2236 کلومیٹر رقبے پر واقع ہیں:

1-گرینڈ قمری جزائر (Grande Comore): [بڑا جزیرہ] "عوامی قمری جزیرہ" مورنی کے دارالحکومت کے ساتھ واقع ہے۔

2-ندزوانی (Ndzwani): قمری جزیروں میں سے ایک ہے جو ایک مضبوط جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔

3-موالی (Mwali): قمری جزیروں کا حصہ ہے، لیکن الگ ہونے کو پسند کرتا ہے۔

4-مایوٹی (Mayotte): فرانس کے زیر انتظام ایک جزیرہ ہے۔

مڈغاسکر اور مائیٹی کے درمیان ایک اور جزیرہ "بانک ڈیولیون" تھا جو 1975ء میں ڈوب گیا۔

چھٹی صدی میں یہاں متعدد ملکوں کے باشندے آئے، جن میں سرفہرست انڈونیشین، عرب، پرتگیزی، فرنچ اور انڈین ہیں۔ یہاں اسلام دسویں صدی میں پہنچا، ان جزیروں کا ڈھانچہ زنجبار، پامبو، لاموا اور ان علاقوں اور ٹاؤنز پر مشتمل ہے جو کینیا اور تنزانیہ کے دریا کے کناروں پر ہیں۔

یہ متحد اور ساحلی کلچر والا علاقہ ہے۔ اس زمانے میں طاقت چند مقامی حکمرانوں کے پاس تھی۔ پورے علاقے کی چھان بین کرتے ہوئے پرتگیزیوں نے جزائر قمر دریافت کر لیے۔ 1841ء سے 1912ء کے درمیان فرانسیسیوں نے ان علاقوں میں اپنی کاروائیاں جاری رکھیں اور غیر اخلاقی کام اور دغابازی کو فروغ دیا۔ پہلے وہ یہاں اپنا نائب مقرر کرنے میں کامیاب ہوئے اور پھر اس کو ایک ایسی کالونی بنا دیا جس کو مڈغاسکر کا گورنر جنرل چلاتا تھا۔

اس کالونی کے بنانے کا فیصلہ برلن کانفرنس 85-1884ء کے بعد ہوا جس میں یورپین طاقتوں نے افریقہ کو تقسیم کیا تھا۔

سیاسی طور پر یہ جزائر دو حصوں میں منقسم ہیں: (1) قمرز (Comoros): اس میں بادشاہت ہے۔ (2) میوٹے (Moyotte): فرانس کا سمندر پار حصہ تین شمالی جزیروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے متحدہ کاموروس کے نام سے مشہور ہے۔ انجوین (Anjouan) نامی اور موہلی نامی دو جزیروں نے 1997ء میں

اپنی آزادی کا اعلان کیا، مگر اسے بین الاقوامی طور پر کوئی اہمیت نہیں ملی اور اسے موقوف کر دیا گیا۔

(3) راس:

جب خشکی کا کوئی حصہ پانی کو کاٹتے ہوئے نوک کی شکل میں دور تک چلا جائے تو اسے "راس" کہتے ہیں۔ راس زیادہ تر جنوب کی سمت میں نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر آپ دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ کرۂ خاکی شمال کی طرف چوڑا ہے اور جیسے جیسے جنوب کی طرف جاتا ہے خشکی کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ انتہائے جنوب میں ایک نوک کی شکل میں رہ جاتی ہے۔ جبکہ کرۂ آبی اس کے بالکل برعکس جنوب کی طرف چوڑا ہے اور جیسے جیسے شمال کی طرف آتا ہے سکڑتا جاتا ہے اور کچھ مقامات پر خلیج کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دنیا کی مشہور راس یہ ہیں:

1- راس امید:

راس امید (رأس الرجاء الصالح: Cape of Good Hope) جنوبی افریقہ کے ساحلوں پر واقع ایک راس ہے۔ عام طور پر اسے افریقہ کا جنوبی سرا مانا جاتا ہے، لیکن افریقہ کا جنوبی سرا دراصل یہاں سے 150 کلومیٹر (90 میل) جنوب مشرق میں واقع راس اگولاس ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے پندرھویں صدی کے آخر میں مشہور پرتگیزی ملاح واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا راستہ دریافت کیا تھا۔ ہندوستان میں اپنی تجارت اور اس کے پردے میں اپنی سیاست کو فروغ دینے کے لیے مغربی ممالک مدت سے کسی ایسے راستے کی تلاش میں تھے جو مسلمانوں کی تگ و تاز سے مامون ہو، اس غرض کے لیے انہوں نے مختلف بحری مہمات روانہ کیں، یہاں تک کہ جب 1478ء میں برتلمائی ڈائز افریقہ کے جنوبی سرے تک پہنچ کر واپس آیا تو پرتگال کے بادشاہ جان دوم نے افریقہ کے اس جنوبی سرے کی دریافت کو آئندہ مہمات کے لیے امید افزا سمجھ کر اس کو "راس امید" (Cape of Good Hope) کا نام دیا اور دس سال بعد اسی "راس امید" کے راستے واسکوڈی گاما ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اسی وجہ سے یہ صوبہ اب تک "راس امید" کے نام سے موسوم چلا آتا ہے۔ جنوبی افریقہ کا معروف شہر کیپ ٹاؤن، راس امید سے 30 کلومیٹر شمال میں جزیرہ نما کیپ کے شمالی کونے پر واقع ہے۔ راس امید کا علاقہ اپنے قدرتی حسن کے باعث بھی مشہور ہے۔ چند ماہرین سمجھتے ہیں کہ یورپی جہاز رانوں سے بہت پہلے چینی، عربی یا ہندی اس علاقے کو دریافت کر چکے تھے۔ 1488ء سے قبل تیار ہونے والے چند قدیم نقشے اس امر کے شاہد ہیں۔ اس علاقے میں پہنچنے والا پہلا یورپی پرتگال سے تعلق رکھنے والا جہاز راں "بارتھولومیوڈیاس" تھا، جس نے 1488ء میں اسے راس طوفان (انگریزی: Cape of Storms پرتگیزی: CaboTormentasdas) کا نام دیا۔ بعد ازاں "جان ثانی" از پرتگال نے ہندوستان اور مشرق کے اس نئے راستے سے وابستہ امیدوں کے باعث اسے راس امید (CaboBoada Esperana) کا نام دیا۔ ولندیزی نوآبادیاتی منتظم "جان وان ربیک" نے "ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی" کے لیے 6 اپریل 1652ء میں ایک چھاؤنی قائم کی جو بعد ازاں کیپ ٹاؤن کہلائی۔ برطانیہ نے 1795ء میں کیپ کالونی پر قبضہ کر لیا لیکن 1803ء میں اسے یہ علاقے کھونا پڑے۔ 19 جنوری 1806ء کو برطانوی افواج نے دوبارہ علاقے پر چڑھائی کی اور 1814ء کے اینگلو-ڈچ معاہدے کے تحت یہ علاقہ برطانیہ کو دے دیا گیا۔ برطانیہ کا قبضہ 1910ء میں آزاد اتحاد جنوبی افریقہ کے قیام تک قائم رہا۔ اس جنگ کے دوران یہاں کے مسلمانوں نے اس شرط پر ہالینڈ کی ڈچ افواج کا ساتھ دیا کہ جنگ کے بعد انہیں مسجد بنانے کی اجازت ہوگی۔ ان کی بنائی ہوئی یہ تین سو سالہ قدیم مسجد آج تک یہاں موجود ہے۔ یہ جنوبی افریقہ کی پہلی مسجد تھی جو وہاں کے ابتدائی مسلمانوں کی عظیم قربانیوں سے بنی اور اس کی برکت سے آج جنوبی افریقہ کے مسلمان، مساجد و مدارس کے خادم اور خاصے خوشحال ہیں۔

2- راس ہورن:

راس ہورن (Cape Of Horn) جنوبی چلی کے مجموعۃ الجزائر ''ٹیرا ڈیل فیوگو'' کا آخری سرا ہے جو نیدرلینڈ کے شہر ہورن سے موسوم ہے۔ یہ برّاعظم جنوبی امریکا کا سب سے جنوبی علاقہ ہے اور یہ دنیا کے مشہور ترین راسوں میں سب سے جنوب میں واقع ہے۔ اس راس کے گرد سمندر کی لہریں بہت خطرناک ہیں اور سرد، تند و تیز ہواؤں، تیز لہروں اور سمندر میں تیرتے برفانی تودوں کے باعث یہ علاقہ بحری جہازوں کا قبرستان سمجھا جاتا ہے، تاہم یہ ایک اہم تجارتی گذرگاہ رہی ہے جس کی اہمیت 1914ء میں پاناما نہر کے قیام سے بہت کم ہوگئی۔ لیکن اب بھی اس راس کے گرد چکر کا ٹنا کشتی رانی کے کھیل میں سب سے خطرناک مہم سمجھی جاتی ہے اور اسے کشتی رانی میں وہی حیثیت حاصل ہے جو کوہ پیمائی میں ماؤنٹ ایورسٹ کو حاصل ہے۔ راس پر چلی کی بحریہ کی ایک چھاؤنی بھی قائم ہے، جس میں رہائشی دفتری عمارات کے علاوہ گرجا اور روشن مینار بھی شامل ہیں۔ اس علاقے کا موسم سرد ہے۔ راس ہورن یا ملحقہ جزائر پر کوئی موسمیاتی مرکز قائم نہیں تاہم 1882-1883ء میں کیے گئے ایک تجزیے کے مطابق سالانہ 1357 ملی میٹر (53.42 انچ) بارش ہوتی ہے، جبکہ سال کا اوسط درجہ حرارت 5.2 ڈگری سینٹی گریڈ (41.4 ڈگری فارن ہائٹ) رہتا ہے۔ ہوا کی رفتار اوسطاً 30 کلومیٹر فی گھنٹہ (19 میل فی گھنٹہ) ہے۔ 100 کلومیٹر فی گھنٹہ (62 میل فی گھنٹہ) کی رفتار سے آنے والے طوفان معمول کا حصہ ہیں۔ راس کا سب سے قریبی قصبہ پورٹو ٹورو ہے، جو پورٹو ولیمز سے چند میل جنوب میں واقع ہے۔ یہ دنیا کا سب سے جنوب میں واقع آخری رہائشی علاقہ ہے۔ ہورن اصل میں جنوری 1616ء میں علاقے کی بحری مہم میں شریک ایک بحری جہاز تھا جو ''پیٹاگونیا'' کے قریب تباہ ہوگیا اور جب اس مہم میں شریک دوسرا جہاز ''اینڈ ریچ'' راس ہورن کے مقام پر پہنچا تو اس نے اس راس کو ''ہورن'' سے موسوم کردیا۔ پاناما نہر کی تعمیر کے باعث بحری سفر کے لیے یہ خطرناک علاقہ ویران ہوگیا اور تجارتی سامان سے لدا آخری بحری جہاز یہاں سے 1949ء میں گذرا جس کا نام پامیر تھا۔ یہ بحری جہاز آسٹریلیا سے فن لینڈ جارہا تھا۔ اس کے بعد سے یہ سمندری شاہراہ متروک چلی آرہی ہے۔

(4) صحرا:

صحرا عربی میں ریگستان کو کہتے ہیں جہاں ہر طرف ریت ہی ریت ہو۔ بے آب و گیاہ ریتیلے میدان اور ریتیلے ٹیلے بکثرت ہوں۔ پانی اور سبزہ نایاب ہو۔ براعظم افریقہ میں واقع ''صحرائے اعظم'' دنیا کا سب سے بڑا اور جنوبی امریکا میں واقع ''صحرائے ایٹاکاما'' دنیا کا سب سے خشک صحرا ہے۔ دنیا کے چند مشہور اور بڑے صحرا براعظموں کی ترتیب سے یہ ہیں۔

براعظم ایشیا

1- الربع الخالی:

الربع الخالی دنیا کے عظیم صحراؤں میں سے ایک ہے۔ یہ بنیادی طور پر سعودی عرب میں واقع ہے اور اس کا رقبہ 650,000 مربع کلومیٹر ہے یعنی بیلجیم، نیدرلینڈز اور فرانس کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ۔ اس کے کچھ حصے یمن، متحدہ عرب امارات اور عمان میں بھی ہیں۔ اس میں کوئی آبادی نہیں ہے۔ گرمیوں میں درجہ حرارت 55 ڈگری سینٹی گریڈ سے زیادہ ہوجاتا ہے اور ریت کے طوفان آتے ہیں جن کی بلندی مینار پاکستان سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں اس میں کئی مشہور شہر واقع تھے جو تباہ ہوچکے ہیں، مثلاً ''ارم ذات العماد'' جو ایک ہزار ستونوں کا مشہور شہر تھا۔ اس کے آثار بیسویں صدی میں برآمد ہوئے ہیں اور دنیا کے لیے قرآن کریم کی صداقت کی دلیل اور عبرت کا سامان بنے ہیں۔ قوم عاد کا مسکن اسی کی مغربی جانب میں ریتیلے ٹیلوں کے قریب تھا جسے قرآن کریم نے سورۂ

احقاف اور دیگر متعدد مقامات میں ذکر کیا ہے۔''احقاف'' کا مطلب ریت کے ٹیلے ہیں۔ یہ علاقہ تیل کے وسیع ذخائر رکھتا ہے۔

2-صحرائے گوبی:

صحرائے گوبی چین اور جنوبی منگولیا کا ایک بہت بڑا صحرا ہے۔ صحرا کے شمال میں کوہ التائی اور منگولیا کے میدان، جنوب مغرب میں سطح مرتفع تبت اور جنوب مشرق میں شمالی چین کے میدان ہیں۔ منگولین زبان میں گوبی کا مطلب "بہت بڑا اور خشک" کے ہیں۔ یہ ایشیا کا سب سے بڑا صحرا ہے۔ تاریخ میں گوبی منگول سلطنت کا حصہ ہونے اور شاہراہ ریشم پر متعدد اہم شہروں کے باعث معروف ہے۔ یہ صحرا ان تاتاریوں کے مسکن کے طور پر معروف ہے جنہوں نے بلادِ اسلام پر یورش کی اور مسلمانوں کو فتح کرنے کے بعد بالآخر اسلام کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے۔

3-رن کچھ:

''رن کچھ'' پاکستان کے صوبہ سندھ اور بھارت کی ریاست گجرات کے درمیان صحرائے تھر میں واقع ایک دلدلی علاقہ ہے۔ ''رن'' ہندی زبان میں ''دلدل'' کو کہتے ہیں جبکہ ''کچھ'' اس ضلع کا نام ہے جہاں یہ واقع ہے۔ رن کچھ ''خلیج کچھ'' اور دریائے سندھ کے ڈیلٹائی علاقے کے درمیان تقریباً 10 ہزار مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ بھارتی ریاست راجستھان کا ''دریائے لونی'' رن کے شمال مشرقی علاقے میں گرتا ہے۔ مون سون کے دوران بارشوں کا پانی یہاں کے بیابانی و دلدلی علاقے میں جمع ہو جاتا ہے اور سرد علاقوں سے آنے والے پرندوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ مون سون کے دوران زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ کی صورت میں مغرب میں خلیجِ کچھ اور مشرق میں ''خلیج کھمبے'' آپس میں ایک ہو جاتی ہیں۔ یہ علاقہ قدرتی گیس اور دیگر معدنیات سے مالا مال سمجھا جاتا ہے اور پاکستان اور بھارت کے درمیان ''سر کریک'' جیسے سرحدی تنازعات کا سبب بھی ہے۔

براعظم افریقہ

1-صحرائے اعظم:

یہ دنیا کا سب سے بڑا صحرا ہے، جس کا رقبہ 9,000،000 مربع کلومیٹر (3,000،500 مربع میل) ہے جو تقریباً امریکا کے کل رقبے کے برابر ہے۔ انگریزی میں اسے Sahara کہا جاتا ہے جو دراصل عربی لفظ "صحراء" سے ماخوذ ہے۔ صحرائے اعظم کے مغرب میں بحر اوقیانوس، شمال میں کوہ اطلس اور بحیرہ روم، مشرق میں بحیرہ احمر اور مصر اور جنوب میں دریائے نائیجر کی وادی اور سوڈان واقع ہیں۔ صحرائے اعظم مختلف حصوں میں تقسیم ہے، جن میں وسطی کوہ ہقار، کوہ تبستی، کوہ ایئر، صحرائے تنیر اور صحرائے لیبیا شامل ہیں۔ صحرائے اعظم کی بلند ترین چوٹی ایمی کوسی ہے جس کی بلندی 3415 میٹر ہے اور یہ شمالی چاڈ میں کوہ تبستی کے سلسلے میں واقع ہے۔ صحرائے اعظم میں کل 25 لاکھ افراد رہائش پذیر ہیں جن کی اکثریت مصر، ماریطانیہ، مراکش اور الجزائر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں رہنے والے باشندوں کی اکثریت بربر نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ وہ عظیم لوگ ہیں جنہوں نے ابتدائے اسلام کی فتوحات میں حصہ لیا اور افریقہ سے اسپین تک اسلام کا پرچم بلند کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

2-صحرائے نمیب:

''صحرائے نمیب'' افریقہ کے جنوبی علاقوں میں واقع دنیا کے خشک ترین صحراؤں میں سے ایک ہے۔ اس صحرا کا رقبہ 50 ہزار مربع کلومیٹر ہے اور یہ بحر اوقیانوس کے ساتھ ساتھ نمیبیا کے ساحلوں پر ایک ہزار میل تک پھیلا ہوا ہے۔ شرقاً غرباً یہ صحرا 30 سے 100 میل (50 سے 160 کلومیٹر) چوڑا ہے۔ اس کا کچھ

حصہ جنوب مغربی انگولا میں بھی شامل ہے۔صحرائے نمیب کو دنیا کا قدیم ترین صحرا سمجھا جاتا ہے، جو کم از کم 80 ملین سے موجود ہے۔یہاں سالانہ صرف 10 ملی میٹر بارش ہوتی ہے۔صحرا کا بیشتر حصہ غیر آباد اور نا قابل رسائی ہے۔اس کے چند ریت کے ٹیلوں کی بلندی 340 میٹر تک ہے اور یہ دنیا کے بلند ترین ریت کے ٹیلوں میں شمار ہوتے ہیں۔صحرائے نمیب معدنیات خصوصاً ٹنگسٹن، نمک اور ہیرے کے ذخائر کے لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔جس جگہ یہ صحرا ساحل سمندر سے ملتا ہے وہ علاقہ ''ڈھانچوں کا ساحل'' (Coast Skeleton) کہلاتا ہے۔یہ نام اسے ساحل پر دھند کے باعث چٹانوں سے تباہ ہونے والے بحری جہازوں کے ملبے اور صحرا میں بھٹک کر مرنے والے ان افراد کی نسبت سے ملا جن کی باقیات ڈھانچوں کی صورت میں ہی ملیں۔

براعظم جنوبی امریکا

1-صحرائے ایٹا کاما:

شمالی چلی کا صحرا جو کوہ انڈیز اور بحر اوقیانوس کے درمیان ایک تنگ سی پٹی میں واقع ہے۔یہ دنیا کا خشک ترین مقام ہے اور یہاں چند مقامات ایسے ہیں جہاں کئی صدیوں سے بارش نہیں ہوئی۔یہ صحرا 181300 مربع کلومیٹر (70 ہزار مربع میل) کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے، جس کا بیشتر حصہ چلی میں واقع ہے جبکہ کچھ حصے پیرو، بولیویا اور ارجنٹائن میں بھی آتے ہیں۔یہ کیلی فورنیا کی وادئ موت (Death Valley) سے 100 گنا زیادہ بنجر اور 15 ملین سال قدیم ہے۔صحرائے ایٹا کاما میں آبادی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے اور صحرا کے وسط میں ایک نخلستان میں ''سان پیڈرو ڈی ایٹا کاما'' نامی ایک بستی واقع ہے، جس میں 1577ء میں ہسپانویوں نے ایک گرجا قائم کیا تھا۔اسپین کے قبضے کے دوران 16، 17 اور 18 ویں صدی میں کانوں سے نکلنے والے خام مال کی ترسیل کے لیے اس کے ساحلوں پر بندرگاہیں قائم کی گئیں۔19 ویں صدی میں یہ صحرا بولیویا کے قبضے میں آ گیا اور غیر واضح سرحدوں اور نائٹریٹ کے ذخائر دریافت ہونے کے باعث جلد ہی یہ چلی اور بولیویا کے درمیان متنازعہ علاقہ بن گیا۔جنگ الکاہل (یا جنگ سالٹ پیٹر) میں چلی نے یہ تمام علاقہ بولیویا سے چھین لیا۔صحرائے ایٹا کاما میں تانبے اور دیگر معدنیات کے وسیع ذخائر ہیں اور یہاں سوڈیم نائٹریٹ کے دنیا کے سب سے بڑے ذخائر بھی پائے جاتے ہیں۔

براعظم آسٹریلیا

1-صحرائے سمپسن:

صحرائے سمپسن آسٹریلیا کا ایک وسیع صحرا ہے جو 50 ہزار مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔صحرا میں ریت کے ٹیلوں کے طویل سلسلے اور نمکین جھیلیں ہیں۔یہ جھیلیں قدیم دریاؤں کے آبی بخارات بن کر اڑ جانے سے تشکیل پائیں۔اب یہ موسمی بارشوں سے ہی سیراب ہوتی ہیں۔

(5) پہاڑ

جس طرح اونٹ کی کمر پر کوہان ہوتا ہے اسی طرح زمین کی پشت پر کوہ یا پہاڑ ہیں۔پہاڑ زمین کے نہایت بلند اور پتھریلے قطعات ہیں ان کا قاعدہ (بیس یا بنیاد) نہایت طویل و چوڑا اور چوٹی مختصر اور نوکیلی ہوتی ہے۔ان کے پہلو ناہموار ہوتے ہیں۔یہ مختلف وضع قطع کے حامل ہوتے ہیں۔بعض گنبد نما گول سے ہوتے ہیں اور بعض دیوار کے مانند کم و بیش سیدھے کھڑے نظر آتے ہیں۔کثر پہاڑ مخروطی شکل کے ہوتے ہیں۔ان پہاڑوں کی بیرونی صورت ان کی اندرونی ساخت کا پتہ دیتی ہے اور ماہرین ان کی وضع قطع کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ کس قسم کی چٹانوں سے مرکب ہیں۔دنیا کے مشہور پہاڑ یا پہاڑی سلسلے یہ ہیں:

ایشیا

1-سلسلۂ کوہ پامیر:

سلسلہ کوہ پامیر وسطی ایشیا میں واقع ہے۔ یہ قراقرم، ہندوکش، تیان شان اور کن لن کے پہاڑی سلسلوں کے سنگم پر واقع ہیں۔ پامیر تاجکستان، کرغیزستان، افغانستان اور پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا بڑا حصہ تاجکستان کے علاقے گورنو بدخشاں میں ہے۔ پامیر کی سب سے اونچی چوٹی "اسماعیل سامانی" ہے جو 7490 میٹر یعنی 24590 فٹ بلند ہے جیحون اور سیحون نامی دونوں مشہور دریا اسی سلسلۂ کوہ سے نکلتے ہیں اور آگے جاکر بحیرۂ ارال میں گر جاتے ہیں۔

2-سلسلہ کوہِ ہمالیہ:

سلسلہ کوہ ہمالیہ (ہندی اور سنسکرت میں "ہمالے" بمعنی "برف کا گھر") ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو برصغیر پاک و ہند کو سطح مرتفع تبت سے جدا کرتا ہے۔ بعض اوقات سلسلہ ہمالیہ میں سطح مرتفع پامیر سے شروع ہونے والے دیگر سلسلوں جیسے کہ قراقرم اور ہندوکش کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے۔ ہمالیہ اپنے ذیلی سلسلوں کے ساتھ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑی سلسلہ ہے جس میں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں بشمول "ماؤنٹ ایورسٹ" اور "کے ٹو" موجود ہیں۔ 8,000 میٹر سے بلند دنیا کی تمام چوٹیاں اسی پہاڑی سلسلے کا حصہ ہیں۔ اس سلسلے کی بلندی کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ اس میں 7200 میٹر سے بلند 100 سے زیادہ چوٹیاں ہیں جبکہ اس سے باہر دنیا کی بلند ترین چوٹی "کوہ اینڈیز" میں واقع "اکونکاگوا" ہے جس کی بلندی صرف 6962 میٹر ہے۔ دنیا کے بہت سے بڑے دریا جیسے سندھ، گنگا، برہم پتر، یانگزی، میکانگ، جیحون، سیحون اور دریائے زرد، ہمالیہ کی برف پوش بلندیوں سے نکلتے ہیں۔ ان دریاؤں کی وادیوں میں واقع ممالک افغانستان، بنگلہ دیش، بھوٹان، بھارت، پاکستان، چین، نیپال، برما، کمبوڈیا، تاجکستان، ترکمانستان، ازبکستان، قازقستان، کرغیزستان، تھائی لینڈ، لاؤس، ویتنام اور ملائشیا میں دنیا کی تقریباً آدھی آبادی، یعنی 3 ارب لوگ، بستے ہیں۔

ہمالیہ کا جنوبی ایشیا کی تہذیب پر بھی گہرا اثر ہے۔ اس کی اکثر چوٹیاں ہندومت، بدھ مت اور سکھ مت میں مقدس مانی جاتی ہیں۔ یہ ان مذاہب میں پائے جانے والے اس نظریے کا اثر ہے جس کے تحت بظاہر عظیم یا ناقابل تسخیر سمجھی جانے والی مخلوقات کو الوہی صفات کا حامل مان لیا جاتا ہے ہمالیہ کا بنیادی پہاڑی سلسلہ مغرب میں دریائے سندھ کی وادی سے لیکر مشرق میں دریائے برہمپترا کی وادی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ برصغیر کے شمال میں 2400 کلومیٹر لمبی ایک محراب (کمان کی سی شکل) بناتا ہے جو مغربی کشمیر کے حصے میں 400 کلومیٹر اور مشرقی "اروناچل پردیش" کے خطے میں 150 کلومیٹر چوڑی ہے۔ یہ سلسلہ تہ در تہ پہاڑوں پر مشتمل ہے جن کی اونچائی جنوب سے شمال کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ تبت سے قریب واقع انتہائی شمالی سلسلے کو، جس کی اونچائی سب سے زیادہ ہے، عظیم ہمالیہ یا اندرونی ہمالیہ کہا جاتا ہے۔

3-کوہ قفقاز:

کوہ قفقاز بحیرۂ اسود اور بحیرۂ قزوین کے درمیان "خطہ قفقاز" کا ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو ایشیا اور یورپ کو جدا کرتا ہے۔ عوام کی زبان میں "کوہ قاف" جس کی طرف افسانوی داستانیں منسوب ہیں، اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ چار چھوٹی ریاستیں ہیں جنہیں "قفقاز کی ریاستیں" کہا جاتا ہے۔ چیچنیا، جارجیا، آرمینیا، آذربائیجان۔ کوہ قفقاز کے پہاڑی سلسلے کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ البرس ہے جو 18 ہزار 506 فٹ (5 ہزار 642 میٹر) بلند ہے۔

4-کوہِ طوروس:

کوہِ طوروس (انگریزی: Taurus Mountain، ترکی: TorosDalar) جنوب مشرقی اناطولیہ کا ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس میں سے دنیا کا مشہور دریۂ فرات نکلتا ہے۔اس پہاڑی سلسلے میں 10 سے 12 ہزار فٹ بلند کئی پہاڑی چوٹیاں ہیں جن میں سب سے بلند چوٹی "دمیر کازک" کی ہے جو تقریباً 4 ہزار میٹر بلند ہے۔

افریقہ

1-کوہِ اطلس:

"اطلس" شمال مغربی افریقہ کا ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو مراکش، الجزائر اور تیونس کے درمیان 2400 کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔اس سلسلے کی بلند ترین چوٹی جنوب مغربی مراکش کی جبل توبقال ہے جس کی بلندی 4167 میٹر ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ بحیرۂ روم اور بحر اوقیانوس کو صحرائے اعظم سے جدا کرتا ہے۔اطلس پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ رہنے والی آبادی کی اکثریت مراکش میں بربر اور الجزائر میں عرب نسل سے تعلق رکھتی ہے۔

یورپ

1-کوہِ پائرینیس:

کوہِ پائرینیس جنوب مغربی یورپ کا ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو فرانس اور اسپین کے درمیان قدرتی سرحد ہے۔ یہ جزیرہ نما آئبیریا کو فرانس سے جدا کرتے ہیں۔اور بحر اوقیانوس میں خلیج بسکے سے بحیرۂ روم میں کیپ ڈی کریوس تک 430 کلومیٹر (267 میل) پر پھیلا ہوا ہے۔اس پہاڑی سلسلے کی بلند ترین چوٹی "انیتو یا پک ڈی نیتو" ہے جس کی بلندی 3,404 میٹر (11,168 فٹ) ہے۔

مشہور پہاڑی چوٹیاں

1-ماؤنٹ ایورسٹ (ساگر ماتا: چومولونگ ما):

ماؤنٹ ایورسٹ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ یہ سلسلہ کوہ ہمالیہ میں نیپال اور چین کی سرحد پر واقع ہے۔ اس کی بلندی 8848 میٹر یا 29028 فٹ ہے۔ اسے پہلی بار 29 مئی، 1953ء کو ایڈمنڈ ہلری اور ٹینزنگ نورگے نے سر کیا۔ نذیر صابر پہلا پاکستانی تھا جس نے اسے سر کیا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کا نام شروع سے متنازعہ فیہ رہا ہے۔ اس کے مقامی نام مختلف علاقوں میں مختلف مشہور تھے۔ 1960ء کے شروع میں نیپالی حکومت نے اسے "ساگر ماتا" کا نام دیا۔ تبت زبان میں اس کا نام "چومولونگ ما" (Qomolangma or Chomolangma) مشہور تھا۔ 1951ء میں یہاں ایک برطانوی سروے مہم بھیجی گئی۔ جس کے ذمہ دار "اینڈریوا" (Andrew wauagh) نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ نیپال کی سرحد کے باہر اس کا کوئی متفقہ نام نہیں ہے۔ لہٰذا اسے کوئی نام دینا چاہیے۔ اینڈریوا کی یہ سروے مہم اس "عظیم تکونی سروے مہم" (Great Trignometric Survey) کی تکمیل تھی جس کو 1802ء میں "ولیم لمبٹن" (WilliamLambton) نے انڈیا کے شمال سے جنوب اور نیپال تک پھیلے ہوئے علاقے میں شروع کیا تھا اور جس کے بہت بڑے حصے کی تکمیل "اینڈریوا" کے استاد "جارج ایورسٹ" (Gaurge everest) نے کی تھی۔ 1865ء میں "اینڈریو" کی اس درخواست پر "رویل جغرافیکل سوسائٹی" (Royal Geographical Society) نے اس کا نام جارج ایورسٹ کے نام پر "ماؤنٹ ایورسٹ" ہی رکھ دیا۔ 2002ء میں چین کے ایک اخبار "پیپلز ڈیلی" (People's Daily) نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ مغربی دنیا کو اس انگریزی نام کی اشاعت سے پرہیز کرنا چاہیے اور اسے اس کے تبتی نام ہی کو برقرار رکھنا چاہیے، لیکن ایشیائی اقوام کے دوسرے مطالبات کی طرح اس مطالبہ کو پذیرائی حاصل نہیں ہوسکی اور اب دنیا میں اس پہاڑ کو "ماؤنٹ ایورسٹ" کے نام ہی سے جانا جاتا ہے۔ 1924ء میں جارج میلوری اور اینڈریو اروائن نامی دو برطانویوں نے اسے سر کرنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں واپس نہ آسکے۔ 1934 میں ایک برطانوی ماؤریس ولسن نے چڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ مارا گیا۔ 1938 میں ایک برطانوی مہم 27000 فٹ تک پہنچی لیکن برے موسم کی وجہ سے واپس آنا پڑا۔ 1951 میں ایک برطانوی مہم نے ماؤنٹ ایورسٹ کا سروے کیا۔ 1952 میں متعدد مہمات نے اسے سر کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں برے موسم کی وجہ سے واپس آنا پڑا۔ 1953 کی برطانوی مہم میں اسے سر کرلیا گیا۔ 1996 میں اس پر چڑھتے ہوئے 15 لوگ مارے گئے۔ 2005 میں اس پر ایک فرانسیسی پورو کا پٹر ہیلی کاپٹر اس پر اترا اور کئی منٹ وہاں گزار کر نیچے آیا۔

2-کے ٹو (قراقرم 2):

"کے ٹو" دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے۔ یہ سلسلہ کوہ قراقرم، پاکستان میں واقع ہے۔ اس کی بلندی 8611 میٹر، 28251 فٹ ہے۔ اسے دو اطالوی کوہ پیماؤں لیساڈلی اور کمپانونی نے 31 جولائی 1954 کو سر کیا۔ اسے ماؤنٹ گاڈون آسٹن اور شاہگوری بھی کہتے ہیں۔ 1856 میں اس پہاڑ کا پہلی بار گاڈون

آسٹن نے سر دے کیا۔ تھامس ماؤنٹ گمری بھی اس کے ساتھ تھا اسنے اسکا نام کے ٹو رکھا کیونکہ سلسلہ کوہ قراقرم میں یہ چوٹی دوسرے نمبر پر تھی۔ کے ٹو پر چڑھنے کی پہلی مہم 1902 میں ہوئی جو ناکامی پر ختم ہوئی۔ اسکے بعد 1909ء، 1934ء، 1938ء، 1939ء اور 1953ء والی کوششیں بھی ناکام ہوئیں۔ 31 جولائی 1954 کی اطالوی مہم بالاخر کامیاب ہوئی۔ لیساڈلی اور کمپانونی کے ٹو پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے۔ 23 سال بعد اگست 1977 میں ایک جاپانی کوہ پیما اچیرو یوشیزاوا اس پر چڑھنے میں کامیاب ہوا۔ اسکے ساتھ اشرف امان پہلا پاکستانی تھا جو اس پہ چڑھا۔ 1978 میں ایک امریکی ٹیم اس پر چڑھنے میں کامیاب ہوئی۔ کے ٹو کو ماؤنٹ ایورسٹ کے مقابلے میں زیادہ مشکل اور خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ کے ٹو پر 246 افراد چڑھ چکے ہیں جبکہ ماؤنٹ ایورسٹ پر 2238۔

3-نانگا پربت:

نانگا پربت دنیا کی نویں اور پاکستان کی دوسری سب سے اونچی چوٹی ہے۔ اس کی اونچائی 8125 میٹر/26658 فٹ ہے۔ اسے دنیا کا ''قاتل پہاڑ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس پہ چڑھنے میں سب سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ اسے ایک جرمن آسٹرین ہرمن بہل نے سب سے پہلے 3 جولائی 1953 میں سر کیا۔

''فیری میڈو'' یعنی ''پریوں کا میدان'' نانگا پربت کو دیکھنے کی سب سے خوبصورت جگہ ہے۔ اس جگہ کو یہ نام 1932 کی جرمن امریکی مہم کے سربراہ ولی مرکل نے دیا۔ سیاحوں کی اکثریت فیری میڈو آتی ہے۔ یہ 3300 میٹر، یعنی 10827 فٹ بلند ہے۔ یہ نانگا پربت سے شمال کی جانب دریائے سندھ اور شاہراہ ریشم سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ تاتو، فن توری اور تارڑ جھیل راستے میں آتے ہیں۔ 1895 میں البرٹ ممری نے اسے سر کرنے کی کوشش کی اور وہ قریبا 7000 میٹر کی بلندی پر پہنچا تھا کہ اسکے دو ساتھی گر کر مر گئے اور اسے واپس آنا پڑا۔ 1930 کی دہائی میں جرمنوں نے چھ بار اسے سر کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ ایک جرمن آسٹرین ہرمن بہل 3 جولائی 1953 کو اسے سر کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کے چڑھنے تک 31 لوگ اس کے سر کرنے میں مارے جا چکے تھے۔ ہرمن بہل نے اسے آکسیجن کی مدد کے بغیر سر کیا۔ 1962 کو اسے تین جرمنوں نے سر کیا۔ 1970 میں تیسری بار رائن ہولڈ میسنر اور اسکا بھائی گنتھر اس پر چڑھے۔ اترتے ہوئے گنتھر مارا گیا۔ 1978 میں رائن ہولڈ میسنر نے اسے اکیلے سر کیا۔ نانگا پربت کے ساتھ جرمن بہت متعلق رہے اس لیے اسے جرمن پہاڑ بھی کہتے ہیں۔ نانگا پربت کی چوٹی پر برف نہیں ٹھہرتی۔ یہ ننگی رہتی ہے اس لیے اس کا نام ''نانگا پربت'' ہے۔ اگر آپ نانگا پربت کا نظارہ کرنا چاہیں تو اسلام آباد کے ساتھ پیرودائی بس اڈے سے شاہراہ ریشم کے ذریعے گلگت جانے والی بس میں سوار ہوں اور ''رائے کوٹ برج'' پر جو کہ دریائے سندھ پر ہے، کے قریب اتر جائیں۔ یہ فاصلہ 400 کلومیٹر سے زیادہ بنتا ہے۔ ''رائے کوٹ برج'' سے پیدل روانہ ہوں یا وہاں سے ایک جیپ لے لیں۔ جیپ ''تاتو گاؤں'' تک جائے گی۔ یہ دس کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ وہاں سے پیدل یا گدھوں پر سامان رکھ کر بذریعہ فغوری یا سیدھے ''فیری میڈو'' پہنچ جائیں۔ زمین پر قدرت ساز خطوں میں سے خوبصورت ترین منظر اور قدرت کا شاہکار نانگا پربت کی شکل میں آپ کے سامنے ہوگا۔ نظارہ کیجیے اور اللہ رب العالمین کی قدرت کے یقین سے دل کو لبریز کیجیے۔ ''فیری میڈو'' میں رات گزارنے کے لیے خیمے بھی مل جاتے ہیں اور کھانا بھی۔ فضائی راستے سے آنا چاہیں تو اسلام آباد سے بذریعہ ہوائی جہاز گلگت آئیں اور وہاں سے جیپ یا ویگن لے کر ''رائے کوٹ برج'' تک یا ''تاتو'' تک آئیں اور پھر وہاں سے آگے پیدل اللہ کا نام لے کر روانہ ہوں۔

کرّہ آبی

آبی اجسام سطح زمین پر دو شکلوں میں پائے جاتے ہیں: ساکن اور جاری۔

(1) ساکن کا معنی ہے غیر جاری یعنی حرکت کے باوجود اپنی حدود میں محدود۔ جیسے: سمندر میں موجوں اور لہروں کی حرکت ہوتی رہتی ہے، لیکن پانی سمندر کی حدود سے باہر نہیں جاتا۔ واپس اُسی میں آجاتا ہے۔ اس میں یہ پانچ آبی اجسام آتے ہیں: (1) بحر اعظم (2) بحیرے (3) خلیج (4) سمندری درّے (5) جھیلیں۔

(2) جاری یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف بہنے اور سفر کرنے والا جیسے: (1) دریا (2) آبشار۔

ذیل میں ان دونوں (یا ساتوں) اقسام کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

آب ساکن (غیر جاری)

آب ساکن یا آب غیر جاری کی پانچ بڑی شکلیں ہیں:

(1) بحر اعظم:

خشکی کی طرح تری کے بھی کئی بڑے ٹکڑے ہیں۔ ان ٹکڑوں کو "بحر اعظم" کہتے ہیں۔ یہ تعداد میں پانچ ہیں:

(1) بحر اوقیانوس (2) بحر الکاہل (3) بحر ہند (4) بحر منجمد شمالی (5) بحر منجمد جنوبی۔

یہ پانچوں سمندر ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہونے کی بجائے آپس میں ملے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان کوئی واضح حدود نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پانی بلا روک ٹوک ایک دوسرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ بحروں کے مزید کئی چھوٹے چھوٹے حصے ہیں۔ ان حصوں کو "بحیرے"، "خلیجیں" اور "آبنائیں" کہتے ہیں۔ جغرافیہ دان ان بحروں، بحیروں، خلیجوں اور آبناؤں کو "کرّہ آبی" کے نام سے پکارتے ہیں، جو روئے زمین کے چاروں طرف ہے۔ روئے زمین کا 71 فیصد حصہ سمندر ہے اور 29 فیصد حصہ خشکی پر مشتمل ہے۔ سادہ الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روئے زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی ہے اور صرف ایک چوتھائی حصہ خشکی ہے۔

نقشے یا گلوب پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ تمام براعظم جنوب کی طرف تنگ اور شمال کی جانب شرقاً غرباً چوڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس تمام سمندر جنوب کی طرف شرقاً غرباً چوڑے اور شمال کی طرف تنگ ہوتے جاتے ہیں۔ تمام براعظم شکل میں مثلث نما ہیں۔ ان کے "قاعدے" شمال کی طرف اور "راس" جنوب کی طرف ہیں۔ مگر سمندر شکل میں ان کے برعکس ہیں۔ ان کی شکلیں تو مثلث نما ہیں، لیکن ان کے "قاعدے" جنوب کی طرف اور "راس" شمال کی طرف ہیں۔ صرف براعظم انٹارکٹیکا اور بحر منجمد شمالی ہی ایسے ہیں جو اس اصول سے مستثنیٰ ہیں اور جو مثلث نما ہونے کی بجائے دائرہ نما ہیں۔

نصف کرۂ شمالی میں براعظم یورپ، ایشیا اور شمالی امریکا بحرِ منجمد شمالی کے گرد ایک دوسرے کے بہت قریب پہنچ جاتے ہیں، لیکن نصف کرۂ جنوبی میں بحر الکاہل، بحر اوقیانوس اور بحر ہند براعظم انٹارکٹیکا کے گرد نہ صرف ایک دوسرے کے بہت قریب چلے جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے میں مدغم بھی ہو جاتے ہیں۔
افریقہ کی ''راس امید'' میں ''کیپ، پوائنٹ'' وہ جگہ ہے جہاں بحر ہند اور بحر اوقیانوس دونوں جب ملتے ہیں تو تیز دھوپ میں دونوں سمندروں کے درمیان ایک خط نظر آتا ہے جو "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ" کا منظر پیش کرتا ہے، لیکن قطب جنوبی کے قریب اپنی انفرادی حیثیت ختم کر کے ایک وسیع و عریض اور غیر منقطع سمندر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان پانچ بحر اعظموں کا مفصل حال ذیل میں ترتیب وار درج کیا جاتا ہے:

1-۔بحر الکاہل:

یہ دنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے۔ اس کا کل رقبہ 68 ملین مربع میل ہے۔ یہ بحرِ منجمد شمالی سے لے کر بحرِ منجمد جنوبی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ بحر اوقیانوس سے دو گنا اور بحر ہند سے ڈھائی گنا بڑا ہے۔ یہ زمین کے سارے خشکی کے حصے سے بڑا اور کل روئے زمین کے ایک تہائی حصے پر چھایا ہوا ہے۔ خطِ استوا پر اس کی چوڑائی دس ہزار میل اور آبنائے بیرنگ سے لے کر انٹارکٹک سرکل تک اس کی لمبائی نو ہزار میل ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی صرف چالیس میل رہ جاتی ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی عین جنوب بجائے خطِ استوا کے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ بحر اوقیانوس سے بذریعہ نہر پانامہ ملا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ جنوبی امریکا کے جنوب میں بھی بحر اوقیانوس سے جاملتا ہے۔

اس بحر میں بہت سے بحیرے ہیں جو اس کے کناروں کے قریب واقع ہیں۔ یہ بحیرے زیادہ تر اس کے مغربی جانب ہیں۔ ان کے نام بحیرۂ اخوستک، بحیرۂ جاپان، بحیرۂ زرد، بحیرۂ چین اور بحیرۂ سلیبین ہیں۔ اس بحر پر بہت سے آتش فشانی جزائر کھڑے ہیں۔ بحر الکاہل کی اوسط گہرائی دو سے ڈھائی میل کے درمیان ہے۔ سب سے زیادہ گہرائی جزیرہ منڈاناؤ یا گوام کے قریب پائی گئی ہے جسے ''ماریانہ ٹرینچ'' کہتے ہیں۔ اس بحر میں تمام جزائر قوس نما ہیں۔ اس بحر کے سواحل کے ساتھ اونچے اونچے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں اور وہ زلزلوں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں، چونکہ اس بحر کی وسعت بہت زیادہ ہے اور اس کے سواحل کے ساتھ محفوظ اور قدرتی بندرگاہیں بہت کم ہیں، اس لیے یہ بین الاقوامی تجارت و میل جول کی ایک بہت بڑی شاہراہ نہیں ہے۔

2-۔بحر اوقیانوس:

یہ دنیا کا دوسرا بڑا سمندر ہے۔ اس کا کل رقبہ 35 ملین مربع میل ہے۔ یہ رقبہ میں بحر الکاہل کا تقریباً نصف ہے۔ اس کی شکل انگریزی زبان کے حرف ''S'' سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے مشرقی و مغربی سواحل ایک دوسرے کے عین متوازی ہیں اور ان کے درمیان اوسطاً تین ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ یہ بحر دنیا بھر کی ایک عظیم ترین تجارتی شاہراہ ہے۔ اس کے کنارے (مادی طور پر) دنیا کی ترقی یافتہ اقوام آباد ہیں۔
اس بحر کے ساتھ لاتعداد محفوظ اور قدرتی بندرگاہیں ہیں اور اس کے کناروں پر بسنے والی قومیں کئی قسم کی معدنیات سے مالا مال ہیں۔ اس کے کناروں کے قریب کئی بحیرے اور خلیجیں ہیں۔ ان کے نام بحیرۂ شمالی، بحیرۂ بالٹک، بحیرۂ کیریبین، بحیرۂ روم، خلیج بسکے، خلیج بیلن، خلیج ہڈسن اور خلیج میکسیکو ہیں۔ بحر اوقیانوس کے وسط میں ایک بہت بڑی ''رِج'' ہے۔ اسے ''بحر اوقیانوس کی رِج'' کہتے ہیں۔ (رِج (Ridge) سمندر کی تہہ میں موجود پہاڑی سلسلہ کو کہتے ہیں) یہ ''رِج'' اونٹ کے کوہان کی طرح ابھری ہوئی ہے اور شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی ہے۔ اس پر کئی جزائر مثلاً ''ایزورز''، ''اسنیشن'' اور ''ڈاعنہا'' واقع ہیں۔ یہ جزائر تجارتی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یورپ سے دوسرے ممالک کو جانے والے جہاز یہاں لنگر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

3- بحرِ ہند:

یہ دنیا کا تیسرا بڑا سمندر ہے۔ اس کا کل رقبہ 29 ملین مربع میل ہے۔ یہ شمال کی جانب تنگ اور جنوب کی طرف کھلا ہوتا چلا گیا ہے۔ چونکہ یہ یوریشیا، افریقہ اور آسٹریلیا کے عین وسط میں واقع ہے اور اس کے ساحلی علاقوں پر دنیا کی کل آبادی کا دو تہائی حصہ آباد ہے۔ اس لیے اس کی تجارتی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس بحر کے شمالی کناروں کے ساتھ ساتھ کئی بحیرے اور خلیجیں ہیں۔ ان کے نام بحیرۂ عرب و بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس و خلیج بنگال ہیں۔ خلیج عمان اور عدن بھی اسی میں ہیں۔ اس کے سب سے بڑے جزیرے کا نام "مڈغاسکر" ہے جو افریقہ کے بالکل قریب واقع ہے۔ یہ غالباً کسی غرقاب (زیرِ آب) براعظم کا باقی ماندہ حصہ ہے۔

4- بحرِ منجمد شمالی:

اس کا کل رقبہ 5 ملین مربع میل ہے۔ یہ قطب شمالی کے گرداگرد پھیلا ہوا ہے۔ اس کا بہت سا حصہ سارا سال منجمد رہتا ہے۔ یہ بحر اوقیانوس کے ساتھ گرین لینڈ کی مشرقی اور مغربی آبناؤں کے ذریعے اور بحر الکاہل کے ساتھ آبنائے بیرنگ کے ذریعے ملا ہوا ہے۔ چونکہ یہ سارا سال منجمد رہتا ہے اس لیے یہ زیادہ کارآمد نہیں ہے۔

5- بحرِ منجمد جنوبی:

اس کا کل رقبہ 5 ملین ہے۔ یہ جنوب میں براعظم انٹارکٹیکا کے اردگرد پھیلا ہوا ہے۔ یہ شمال میں بحر ہند، بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ بحر منجمد شمالی سے قدرے بڑا اور گہرا ہے اور اس میں بڑے بڑے آئس برگ تیرتے پھرتے رہتے ہیں۔ بحر منجمد شمالی کی طرح یہ بھی سال بھر منجمد رہتا ہے۔ اس لیے یہ سمندر بھی زیادہ کارآمد نہیں ہے۔

(2) بحیرے:

بحیرہ چھوٹے سمندر کو کہتے ہیں۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں:

(1) بحری بحیرے: سمندر کے ان چھوٹے ساحلی حصوں کو، بحری بحیروں کا نام دیا جاتا ہے جو نسبتاً کم گہرے اور ساحل کے قریب ہوتے ہیں، جیسے بحیرۂ عرب، بحیرۂ کیریبین وغیرہ۔

(2) برّی بحیرے: یہ خشکی میں واقع وہ بڑی بڑی جھیلیں ہیں جنہیں ان کی وسعت اور گہرائی کی وجہ سے "بحیرہ" کہہ دیا جاتا ہے، جیسے بحیرۂ کیاسپین (بحیرۂ قزوین) بحیرۂ ارال (بحیرۂ خوارزم) بحیرۂ میت (بحر مردار) بحیرۂ طبریہ (گلیلی سی)۔

مشہور بحیرے:

جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ بحری بحیرے بڑے سمندر کے چھوٹے اور کم گہرے حصوں کو کہا جاتا ہے، اس اعتبار سے ہر "بحر اعظم" میں چھوٹے چھوٹے بحیرے ہیں جن کے نام بحر اعظم کے ذکر میں گذر چکے ہیں، جیسے: بحر الکاہل میں بحیرۂ جاپان و بحرۂ چین۔ بحر اوقیانوس میں بحیرۂ بالٹک اور بحیرۂ شمال۔ بحر ہند میں بحیرۂ عرب اور بحیرۂ قلزم۔ ان سب کے علاوہ دو برّی بحیرے ایسے ہیں جن کا بطور خاص ذکر ضروری ہے۔

1- بحیرۂ مردار (بحرمیت: Dead Sea):

دنیا کی سب سے زیادہ نمکین جھیل جس کے مغرب میں "مغربی کنارہ" اسرائیل اور "مشرق" میں اردن واقع ہے۔ یہ زمین پر سطح سمندر سے سب سے نچلا

مقام ہے جو 420 میٹر (1385 فٹ) نیچے واقع ہے۔ علاوہ ازیں یہ دنیا کی سب سے گہری نمکین پانی کی جھیل بھی ہے، جس کی گہرائی 330 میٹر (1083 فٹ) ہے۔ یہ جبوتی کی جھیل ''اسال'' کے بعد دنیا کا نمکین ترین ذخیرۂ آب ہے۔ 30 فیصد نمکینی کے ساتھ یہ سمندر سے 8 اعشاریہ 6 گنا زیادہ نمکین ہے۔ اسرائیلی ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ بحیرہ روم سے 9 گنا زیادہ نمکین ہے جس کی نمکینی 3 اعشاریہ 5 فیصد ہے جبکہ مذکورہ ماہرین بحیرۂ مردار کی نمکینی کو 31 اعشاریہ 5 فیصد قرار دیتے ہیں۔ بحیرۂ مردار 67 کلومیٹر (42 میل) طویل اور زیادہ سے زیادہ 18 کلومیٹر (11 میل) عریض ہے۔

بحیرۂ مردار (بحرمیت) ہزاروں سالوں سے بحیرہ روم کے گرد بسنے والے سیاحوں کے لیے انتہائی پرکشش مقام ہے۔ بہت زیادہ نمکینی کے باعث اس میں کسی قسم کے آبی حیوانات اور نباتات نہیں پائے جاتے، جبکہ اس میں کوئی انسان ڈوب بھی نہیں سکتا۔ اس لیے اس کی سطح پر دراز ہو کر لوگ اخبار پڑھتے اور جوس پیتے ہیں۔ اسے انسانی تاریخ میں اس اعتبار سے نمایاں حیثیت حاصل ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اس کے کنارے پر سدوم اور عمورہ نامی شہروں میں رہتی تھی۔

2- بحیرۂ طبریہ (گلیلی سی):

یہ میٹھا بحیرہ دریائے اردن کے شمال میں ''جلیل'' اور ''جولان'' (گولان) کے علاقوں کے درمیان واقع ہے۔ اس کی لمبائی 41 کلومیٹر، چوڑائی 17 کلومیٹر ہے اور کل رقبہ 166 کلومیٹر ہے۔ اس کی سب سے زیادہ گہرائی 46 کلومیٹر ہے۔ یہ ''جبل الشیخ'' کی سفید برف پوش چوٹی سے نکل کر چند چشموں سے ملتے ہوئے دریائے اردن بناتا ہے۔ اس کا عربی نام رومی سپہ سالار ''طیباریوں'' کی طرف منسوب ہے، کیوں کہ اس وقت ''طبریہ شہر'' ہی اس کے ساحل کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس بحیرہ کو ''بحیرۂ جلیل'' بھی کہا جاتا ہے۔ بلکہ آج کل تو انگریزی میں یہی نام استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی تلفظ میں اس کو گلیلی (Galilee) کہتے ہیں۔

یہ بحیرہ سطح سمندر سے 213 میٹر پست ہے اور بحرمیت کے بعد دنیا کا سب سے پست ترین مقام ہے۔ بحیرۂ طبریہ اسرائیل اور فلسطین کا اہم دریا ہے۔ 1964ء میں اسرائیل نے ایک نہر کی تعمیر مکمل کی جو بحیرۂ طبریہ کے پانی کو اسرائیل کے تمام اطراف تک پہنچاتی ہے۔ 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر قبضے کے بعد فلسطین کے بعض شہروں کو بھی اس نہر میں شامل کرلیا، لیکن بعض اوقات ان کا پانی بند کر دیتا ہے۔

جون 1967ء میں بحیرۂ طبریہ کے شامی کنارے سے شام کا تسلط ختم ہوگیا، کیونکہ شام کا اسرائیل کے ساتھ جنگ میں جولان کے بالائی علاقوں (گولان کی پہاڑیوں) سے قبضہ ختم ہوگیا تھا۔ 1999ء کے اواخر اور 2000ء کے اوائل میں امریکہ میں ہونے والے مذاکرات میں شام نے یہ مطالبہ کیا کہ اسرائیل جولان کے بالائی علاقوں سے رابع کے خطوط تک پیچھے ہو جائے تاکہ اس شمال مشرقی ساحل پر شام کا قبضہ لوٹ آئے۔ مطالبوں سے اس طرح کی چیزیں کہاں واپس ملتی ہیں؟ اس لیے اسرائیل کی ضد یہ ہے کہ مملکتِ اسرائیل کی حدود 1923ء سے جولان کے علاقوں تک بغیر کسی اختلاف کے ہیں اور وہ ان سرحدوں سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔

بحیرۂ طبریہ کی تاریخی حیثیت خصوصاً آخری زمانے کے اہم واقعات کے اعتبار سے مسلم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ دجال نے حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ بحیرۂ طبریہ کا پانی ہے یا ختم ہوگیا؟ پھر اس نے کہا کہ یہ جلد ختم ہو جائے گا۔ آج کل یہ سوکھ رہا ہے۔ نیز ایک دوسری حدیث شریف کے مطابق جب دجال کے خاتمے کے بعد یاجوج ماجوج نکلیں گے تو اس بحیرے سے گذریں گے۔ وہ اسے ایسا چٹ کر جائیں گے کہ ان کا آخری فرد جب یہاں پہنچے گا تو کہے گا یوں لگتا ہے جیسے یہاں کبھی پانی تھا۔

(3) خلیج:

پانی جب خشکی کو کاٹتے ہوئے اندر تک چلا جائے تو اسے ''خلیج'' یا ''کھاڑی'' کہتے ہیں۔ دنیا کی مشہور خلیجیں یہ ہیں:

1- خلیج عُمان:

خلیج عُمان بحیرہ عرب اور خلیج فارس سے منسلک کرنے والی ایک آبنائے ہے جو عام طور پر خلیج فارس کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے شمال میں پاکستان اور ایران، جنوب میں متحدہ عرب امارات اور مغرب میں عمان ہے۔

2- خلیج عدن:

خلیج عدن جزیرہ نما عرب میں یمن کے جنوبی ساحلوں اور افریقہ میں صومالیہ کے درمیان ایک خلیج ہے جو بحر ہند کا حصہ ہے۔ شمال مغرب میں یہ آبنائے ''باب المندب'' کے ذریعے بحیرۂ قلزم سے منسلک ہے۔ خلیج عدن، خلیج فارس کے تیل کے ذخائر کی بحری راستے کے ذریعے دنیا کے معاشی مراکز تک رسائی کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ نہر سوئز کے ذریعے ایشیا سے یورپ جانے والے اکثر بحری جہاز یہیں سے گذر کر بحیرہ قلزم (بحر احمر) میں اور پھر نہر سوئز میں داخل ہوتے ہیں۔ اس خلیج کی اہم ترین بندرگاہ عدن ہے۔ مکہ مکرمہ کی بندرگاہ جدہ اور مدینہ منورہ کی بندرگاہ ''ینبوع'' ہے۔

3- خلیج عرب یا خلیج فارس:

دنیا کی اہم ترین اور قدرتی دولت سے مالا مال خلیج ہے۔ اپنے نام کے حوالے سے خلیج عرب ایک متنازعہ اصطلاح ہے جو فارس اور عرب کے درمیان موجود خلیج کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ جزیرہ نما عرب اور ایران کے درمیان واقع ایک خلیج ہے جسے خلیج عرب اور خلیج فارس دونوں ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ یورپی 19 ویں صدی تک بحر احمر کو خلیج عرب کے نام سے پکارتے تھے۔ 1960ء کی دہائی میں مصری صدر جمال عبدالناصر اور ان کے دیگر عرب قوم پرست ساتھیوں نے خلیج فارس کے نام سے مشہور خلیج کو ''خلیج عرب'' کا نام دیا۔

یہ تجارتی اور معدنیاتی نقطہ نظر سے دنیا کے اہم ترین آبی علاقوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ایران، عراق اور بعض عرب ریاستوں کو بحر ہند سے ملاتی ہے۔ خلیج فارس 1980ء سے 1988ء کے درمیان ایران عراق جنگ کے باعث دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بنی، جب دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے تیل کے ذخائر پر حملے کئے۔ 1991ء میں "جنگ خلیج" کے موقع پر خلیج فارس ایک مرتبہ پھر جنگ کی زد میں آئی جب امریکا نے کویت پر عراق کے قبضے کو ختم کرنے کے لئے صلیبی اتحادیوں کی مدد سے عراق پر حملہ کیا۔ اور آج مسلمانوں کا یہ اہم ترین آبی خطہ مغربی قوتوں کے تسلط میں ہے، وہ جتنا چاہیں اور جس قیمت پر چاہیں یہاں کی سیال کالے سونے سے اپنے دیو ہیکل آئل ٹینکر بھر بھر کے لے جاتے ہیں۔

اگر چہ اس کو بظاہر خریداری کا نام دیا جاتا ہے، لیکن ''چوری کے تھان اور بانسوں کے گز'' کے بمصداق وہ جتنی مقدار لے جائیں اور جو قیمت مقرر کریں، انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ خلیج فارس تیل، مچھلیوں اور موتیوں کی دولت سے مالا مال ہے لیکن گزشتہ تین دہائیوں میں جنگوں کے درمیان تیل کے ذخائر میں رساؤ کے باعث آبی حیات کو شدید خطرات لاحق ہیں۔

2 لاکھ 33 ہزار اسکوائر کلومیٹر کی خلیج فارس آبنائے ہرمز کے ذریعے خلیج عمان سے منسلک ہے۔ 989 کلومیٹر طویل یہ خلیج ایران اور سعودی عرب کو جدا کرتی ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان کم از کم فاصلہ آبنائے ہرمز کے مقام پر 56 کلومیٹر ہے۔ خلیج میں پانی زیادہ گہرا نہیں اور زیادہ سے زیادہ گہرائی 90 میٹر ہے جبکہ خلیج کی اوسط گہرائی 50 میٹر ہے۔ خلیج فارس کے ساحلوں کے ساتھ قائم ممالک میں ایران، عمان، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، قطر، بحرین، کویت اور عراق

شامل ہیں۔ علاوہ ازیں خلیج میں کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی ہیں۔

خلیج فارس اور اس کے ساحلی علاقے دنیا میں تیل کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں، اسی لئے تیل سے متعلقہ صنعتیں اسی خطے میں سب سے زیادہ ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی سمندری آئل فیلڈ "السفانیہ" خلیج میں ہی واقع ہے۔ علاوہ ازیں قطر اور ایران میں گیس کے وسیع ذخائر بھی دریافت ہوئے ہیں۔ اس گیس کی بدولت قطر نے بڑی تعداد میں مائع قدرتی گیس (ایل این جی) اور پیٹرو کیمیکل صنعتیں قائم کی ہیں۔

4-خلیج فنڈی:

خلیج فنڈی کینیڈا کے صوبوں نووا اسکوشیا اور نیو برنسوک کے درمیان واقع ایک خلیج ہے۔ یہ خلیج دنیا میں سب سے زیادہ جوار بھاٹے کے باعث معروف ہے۔ کیونکہ یہ خلیج ایک قیف کی شکل کی ہے اس لیے جب بحر اوقیانوس کا پانی اس کے تنگ علاقے میں داخل ہوتا ہے تو اس سے 20 سے 50 فٹ تک کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔

5-خلیج منار:

خلیج منار (Gulf of Mannar) بحر ہند میں کم گہرے پانی کی ایک خلیج ہے جو ہندوستان کے جنوب مشرقی کنارے اور سری لنکا کے مغربی ساحلوں کے درمیان واقع ہے۔ یہ خلیج 160 سے 200 کلومیٹر تک چوڑی ہے۔ خلیج میں چھوٹے چھوٹے جزیرے اور چٹانیں واقع ہیں جنہیں "آدم کا پل" یا "راما کا پل" کہا جاتا ہے، جو اسے "آبنائے پالک" سے جدا کرتا ہے۔ خلیج منار کی اہم بندرگاہوں میں کولمبو (سری لنکا) اور ٹھوٹھوکوڈی (بھارت) شامل ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں بندرگاہیں بڑے بحری جہاز سنبھال سکتی ہیں لیکن آبنائے پالک کے کم گہرے پانی کے سبب یہاں بڑے جہاز داخل نہیں ہو سکتے۔ 2005ء میں حکومت ہندوستان نے خلیج منار اور خلیج بنگال کو آپس میں براہ راست منسلک کرنے کے لیے ایک منصوبہ شروع کیا ہے جس کا مقصد بھارت کے مشرقی اور مغربی علاقوں کو سری لنکا کے گرد چکر کاٹے بغیر براہ راست بحری راستے سے منسلک کرنا ہے۔ ماحولیاتی ماہرین نے اس منصوبے پر شدید تشویش ظاہر کی ہے، کیونکہ اس کے نتیجے میں آبنائے پالک اور خلیج منار میں سمندری حیات اور قدرتی ماحول کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

6-خلیج میکسیکو:

خلیج میکسیکو (Gulf of Mexico) دنیا کے عظیم ترین آبی اجسام میں سے ایک ہے جو براعظم شمالی امریکہ اور کیوبا کے درمیان واقع ہے۔ شمال مشرق، شمال اور شمال مغرب میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساحلوں جنوب مغرب اور جنوب میں میکسیکو اور جنوب مشرق میں کیوبا سے ملحق یہ عظیم خلیج تقریباً دائرے کی شکل میں ہے۔ اس کی چوڑائی 810 بحری میل (1500 کلومیٹر) ہے۔ یہ عظیم خلیج امریکہ اور کیوبا کے درمیان واقع آبنائے فلوریڈا کے ذریعے بحر اوقیانوس سے منسلک ہے اور میکسیکو اور کیوبا کے درمیان واقع رودباد "یوکاتان" کے ذریعے بحیرۂ کیریبین سے منسلک ہے۔ بڑے سمندروں سے زیادہ تعلق نہ ہونے کی وجہ سے خلیج میکسیکو میں بہت چھوٹی لہریں اٹھتی ہیں۔ خلیج کا مدور علاقہ تقریباً 6,15,000 مربع میل (ایک اعشاریہ چھ ملین مربع کلومیٹر) ہے۔ یہ خلیج سب سے زیادہ گہرے مقام پر 14 ہزار 383 فٹ (4 ہزار 384 میٹر) گہری ہے۔ خلیج کے نیم گرم پانیوں کے باعث یہاں طوفان بہت زیادہ آتے ہیں جن میں 2005ء کا "کترینا" طوفان زیادہ معروف ہے جس سے امریکہ میں زبردست جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔

فائدہ 1:

دنیا کی اہم ترین اور مشہور ترین خلیج "خلیج عرب" ہے، جس میں تیل کی سب سے بڑی فیلڈ "السفانیہ" پائی جاتی ہے۔ اس کے ایک طرف ایران ہے اور دوسری

طرف سات عرب ممالک۔تیل کی قدرتی دولت سے مالا مال ان آٹھوں ممالک کو"خلیجی ممالک" کہتے ہیں۔

فائدہ2:

بحر اوقیانوس میں تین اور خلیجیں بھی ہیں۔ایک مشرقی حصے میں فرانس کے ساتھ"خلیج بسکے"اور مغربی جانب کینیڈا میں خلیج ہڈسن اور خلیج بیفن۔ دونوں خلیجوں میں سال کا اکثر حصہ برف جمی رہتی ہے،لہٰذا بہت کم استعمال میں آتی ہیں۔

(4) سمندری درّے

جب سمندر کا کوئی حصہ خشکی کے دو تنگ حصوں کے درمیان حائل ہو کر انہیں جدا کرے اور پانی کے دو حصوں کو ملائے تو اسے ''درّہ'' یعنی تنگ سمندری راستہ کہتے ہیں۔ سمندری درّہ چونکہ آبی گذرگاہ ہوتا ہے جو کم چوڑی اور تنگ ہوتی ہے اور اس سے گذرے بغیر سمندری نقل و حمل مشکل یا ناممکن ہوتی ہے اس لیے بین الاقوامی طور پر اس کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جدید دنیا کی معیشت (اور سیاست بھی) چند سمندری درّوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ آیئے! ان سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

مشہور سمندری درّے

1- آبنائے ہرمز:

آبنائے ہرمز (عربی: مضیق ہرمز، فارسی: تنگۂ ہرمز) خلیج عمان اور خلیج فارس کے درمیان واقع ایک اہم آبنائے ہے۔ اس کے شمالی ساحلوں پر ایران اور جنوبی ساحلوں پر متحدہ عرب امارات اور عمان واقع ہیں۔ اس آبنائے کی کم از کم چوڑائی 21 میل ہے۔ یہ تیل کی دولت سے مالا مال خلیجی ریاستوں کے تیل کی برآمدات کا واحد بحری راستہ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ روزانہ دنیا بھر میں تیل کی کل رسد کا 20 فیصد اس آبنائے سے گذرتا ہے۔ اللہ تعالی نے تیل کی دولت اور اس کی نقل و حمل کی عظیم شاہراہ مکمل طور پر مسلمانوں کو عطا کی تھی، لیکن اب اہل اسلام کی اس دولت پر عالمی طاغوتی غاصبوں کا قبضہ ہے۔ یہاں سے کوئی جہاز ان کی رضامندی کے بغیر نہیں گذر سکتا۔ جبکہ ان کے بڑے بڑے تیل بردار جہاز یہاں سے روزانہ ہزاروں بیرل تیل لے کر بلا خوف و خطر آتے جاتے ہیں۔

2- آبنائے باب المندب:

آبنائے باب المندب ایشیا اور افریقہ کو جدا کرنے والی آبنائے ہے، جس کے ایشیائی جانب یمن اور افریقی جانب جبوتی واقع ہے۔ یہ بحیرۂ قلزم اور بحر ہند (خلیج عدن) کو ملاتی ہے۔ یہ محل وقوع کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور دنیا کی مصروف ترین آبی گذرگاہوں میں سے ایک ہے۔ جزیرہ نما عرب پر ''راس منہلی'' اور افریقہ پر ''راس سیان'' کے درمیان واقع اس آبنائے کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی 20 میل یعنی 30 کلومیٹر ہے۔ آبنائے کے بیچوں بیچ واقع ''پیرم'' کا جزیرہ اس آبنائے کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ جن میں سے مشرقی آبنائے ''باب اسکندر'' کہلاتی ہے جو دو میل چوڑی اور 30 میٹر گہری ہے جبکہ مغربی 16 میل چوڑی اور 310 میٹر گہری ہے۔

3-آبنائے جبل الطارق:

آبنائے جبل الطارق(Strait of Gibraltar) بحراوقیانوس کو بحیرۂ روم سے منسلک کرنے والی ایک انتہائی اہم آبنائے ہے جو اسپین اور مراکش کو جدا کرتی ہے۔اس آبنائے کو یہ نام جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام پر ملا، جہاں 711ء میں بنوامیہ کے عظیم جرنیل طارق بن زیاد اسپین فتح کرنے کے لئے اترے تھے۔آبنائے کے شمال میں جبل الطارق اور اسپین جبکہ جنوب میں مراکش ہے۔یہ آبنائے اہم ترین اور شاندار محل وقوع کے باعث دنیا بھر میں جانی جاتی ہے، جہاں سے بحری جہاز بحیرۂ روم سے بحراوقیانوس اور بحراوقیانوس سے بحیرۂ روم سفر کرتے ہیں۔آبنائے کی گہرائی تقریباً300 میٹر ہے اور اس کی لمبائی کم از کم ۱۴ کلومیٹر ہے۔اسی کے ذریعے عرب ممالک کی بیش قیمت معدنی دولت مضیق ہرمز، باب المندب اور نہر سوئز سے گذرنے کے بعد یورپ اور امریکا جاتی ہے۔

4-آبنائے باسفورس:

باسفورس (انگریزی:Bosporus) ایک آبنائے ہے جو ترکی کے یورپی حصے (رومیلیا) اور ایشیائی حصے (اناطولیہ) کو جدا کر کے یورپ اور ایشیا کے درمیان سرحد قائم کرتی ہے۔اس آبنائے کو"آبنائے استنبول" بھی کہا جاتا ہے۔یہ بین الاقوامی جہاز رانی کے لئے استعمال ہونے والی دنیا کی سب سے تنگ آبنائے ہے جو بحیرۂ اسود کو بحیرۂ مرمرہ سے ملاتی ہے۔آگے چل کر بحیرۂ مرمرہ، درۂ دانیال کے ذریعے بحیرۂ ایجیئن سے منسلک ہے جو بحیرۂ روم سے ملا ہوا ہے۔

استنبولی باشندے اسے صرف Boaz کہتے ہیں، جبکہ Boazii کی اصطلاح آبنائے کے ساتھ ساتھ واقع استنبول کے علاقوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

آبنائے باسفورس پر دو پل قائم ہیں۔1973ء میں مکمل ہونے والا پہلا پل"باسفورس پل" 1074 میٹر طویل ہے۔دوسرا پل"سلطان محمد فاتح پل" 1090 میٹر طویل ہے اور 1988ء میں مکمل ہوا۔یہ پہلے پل سے تقریباً 5 کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔حکومت ترکی کی جانب سے سات مجوزہ مقامات میں سے ایک مقام پر تیسرا پل بھی تعمیر کرنے کا منصوبہ ہے۔اس پل کے مقام کو صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے تاکہ زمینوں کی قیمتوں میں اضافہ نہ ہو۔مرمرے نامی ایک اور زیر آب گذرگاہ زیر تعمیر ہے جو منصوبے کے مطابق 2008ء میں مکمل ہونی تھی۔یہ 13.7 کلومیٹر طویل ریلوے سرنگ ہوگی جو آبنائے کے نیچے 55 میٹر گہرائی سے گذرے گی۔

شاندار محل وقوع کے باعث باسفورس کی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے۔یہ ایشیا سے یورپ میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے اس کے دروازے پر موجود ناکے یعنی قسطنطنیہ شہر کے فتح کرنے والے کے لیے بشارت دی تھی۔اس لیے مسلم مجاہدین اسے پار کر کے قسطنطنیہ فتح کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے تاآنکہ کامیابی کا تاج نوجوان عثمانی خلیفہ سلطان محمد فاتح کے سر پر 1453ء میں سجا۔ماضی قریب میں بھی اس پر قبضے کے لئے کئی جنگیں لڑی جاچکی ہیں جن میں 1877ء کی روس ترک جنگ اور 1915ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران اتحادی قوتوں کا درۂ دانیال پر حملہ بھی شامل ہیں۔قدیم تاریخ میں اس کے محل وقوع کی اہمیت کے باعث ہی رومی بادشاہ قسطنطین نے اس کے کنارے قسطنطنیہ کا شہر آباد کیا تھا۔

5-درۂ دانیال:

درۂ دانیال(Dar danelles) آبنائے باسفورس کا جنوبی حصہ ہے جو بحیرۂ اسود کو بحیرۂ روم سے ملاتا ہے۔یہ آبنائے تقریباً40 میل لمبی اور ایک میل سے چار میل تک چوڑی ہے اور یورپ کو ایشیا سے جدا کرتی ہے۔تاریخ میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔اس سے متعلق سب سے پہلا تاریخی واقعہ وہ ہے جب اردشیر نے اس پر پل باندھا تھا۔انگریز شاعر بائرن نے اسے تیر کر پار کیا۔یہ آبنائے چودھویں صدی میں ترکی کے قبضے میں آئی جب سلطنت عثمانیہ نے اس پر قبضہ کیا۔روس کو چونکہ بحیرہ روم میں داخل ہونے کے لیے اس سے گزرنا پڑتا ہے، لہٰذا روس کی ہر حکومت اس پر قبضے کی خواہشمند رہی۔1833ء میں جب زار روس نے مصر کے باغی حکمران محمد علی پاشا کے خلاف عثمانی سلطان کی مدد کی تو مؤخرالذکر نے روس کو درۂ دانیال میں خاص مراعات دیں اور روسی جہازوں کو یہ حق دیا کہ

وہ جب چاہیں آئیں مگر یورپی طاقتوں کو یہ ناگوار گزرا۔ بالخصوص اس لئے کہ بصورت جنگ انہیں اس آبنائے میں جہاز داخل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے 1840ء میں لندن کنونشن کے ذریعے ترکی پر دباؤ ڈالا اور اس سے روس کے لیے مراعات منسوخ کرالیں۔ 1914ء تک یہ نظام رائج رہا۔

پہلی جنگ عظیم میں اتحادی طاقتوں نے درہ دانیال فتح کرنے کی کوشش کی مگر منہ کی کھائی۔ جنگ کے خاتمے پر اتحادیوں نے گیلی پولی کا ساحل یونان کو دے دیا اور اس آبنائے کو نہتا کر دیا۔ 1922ء میں ترک حکومت نے اسے یونانیوں سے واپس لے لیا۔ 1اگست 1923ء کو اسے معاہدہ "لوزان" کی رو سے بین الاقوامی تحویل میں دے دیا گیا۔ 30 جولائی 1936ء کو مانٹرو کنونشن کی رو سے اس پر ترکی کا اختیار عملاً تسلیم کر لیا گیا۔

6-آبنائے ملاکا:

آبنائے ملاکا انڈونیشیا کے صوبے ساٹرا کو جزیرہ نما ملائشیا سے جدا کرتی اور بحرالکاہل کو بحر ہند سے ملاتی ہے۔ آبنائے ملاکا (انگریزی: Strait of Malacca) جزیرہ نما ملائشیا اور انڈونیشیا کے جزیرے ساٹرا کے درمیان ایک آبی گزرگاہ ہے۔ محل وقوع اور اقتصادی لحاظ سے یہ نہر سویز اور نہر پاناما کی طرح دنیا کی اہم ترین بحری گزرگاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ بحر ہند اور بحرالکاہل کے درمیان بحری جہازوں کے گزرنے کا مرکزی راستہ فراہم کرتی ہے اور اس طرح دنیا کے تین گنجان آباد ترین ممالک بھارت، انڈونیشیا اور چین کو منسلک کرتی ہے۔ اس آبنائے میں سے سالانہ 50 ہزار بحری جہاز گزرتے ہیں جو دنیا کی کل تجارت کا ایک پانچواں یا ایک چوتھائی حصے کے حامل ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں تیل کی ترسیل کا ایک چوتھائی حصہ اس گزرگاہ سے گزرتا ہے اور 2003ء میں اندازاً 11 ملین بیرل تیل روزانہ اس آبنائے سے گزرا۔ 805 کلومیٹر (500 میل) رودبار سنگاپور کے قریب رودبار فلپس کے مقام پر محض 1.5 بحری میل (2.8 کلومیٹر) چوڑی ہے، یہ اس کا تنگ ترین علاقہ ہے۔ اس کی وجہ سے ذرائع نقل و حمل کے لیے دنیا کی اہم ترین تنگ راہ یعنی درہ (Bottleneck) بنتا ہے۔ اس راستے سے گزرنے کے لیے جہاز کے زیادہ سے زیادہ حجم کو "ملاکا میکس" (Malacca max) کہا جاتا ہے۔

7-آبنائے ڈوور:

ڈوور (انگریزی: Dover) نامی یہ آبنائے انگلستان اور فرانس کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے اور انگلش چینل کو بحیرۂ شمال سے ملاتی ہے۔ یہ 36 میل چوڑی ہے اور کم سے کم چوڑائی 21 میل ہے۔ اس کا نام ساحل انگلستان کی بندرگاہ ڈوور پر رکھا گیا ہے اور یہاں سے فرانس کا فاصلہ بہت کم ہے۔ تعمیرات کی عظیم شاہکار "چینل ٹنل" اسی کے نیچے سے سمندر میں گذرتی ہے اور فرانس اور برطانیہ کے درمیان زیر آب زمینی راستے کا کام دیتی ہے۔

8-رودبار انگلستان (انگلش چینل):

رودبار انگلستان یا انگلش چینل، بحر اوقیانوس کا ایک حصہ ہے جو برطانیہ کو شمالی فرانس سے جدا اور بحیرۂ شمال کو بحر اوقیانوس سے منسلک کرتا ہے۔ یہ 563 کلومیٹر (350 میل) طویل اور زیادہ سے زیادہ 240 کلومیٹر (150 میل) چوڑی ہے۔ آبنائے ڈوور اس کا سب سے کم چوڑا مقام ہے جو محض 34 کلومیٹر (21 میل) چوڑا ہے اور رودبار انگلستان کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ رومی سلطنت کے دور میں یہ رودبار Oceanus Britannicus کہلاتی تھی اور 1549ء تک اسے بحیرۂ برٹش کہا جاتا تھا۔ رودبار انگلستان کم گہری ہے جس کی گہرائی 26 میٹر سے 120 میٹر کے درمیان ہے۔

یہ رودبار انگلستان کی قدرتی محافظ ہے اور یہ کئی جنگوں کی شاہد رہ چکی ہے۔ جن میں زمانہ جدید میں نپولین کی جنگیں، دوسری جنگ عظیم میں نازی جرمنی کی جارحیت اور زمانہ قدیم میں رومیوں کی فتح برطانیہ، 1066ء میں نارمن فتوحات اور 1588ء میں ہسپانوی یلغار شامل ہیں۔

برطانیہ اور فرانس کی جانب سے رودبار کے دونوں جانب واقع شہروں کے لئے کشتیوں اور جہازوں کے ذریعے سفری خدمات مہیا کی گئی ہیں جبکہ دونوں

ممالک کے دارالحکومت لندن اور پیرس کے درمیان فاصلہ گھٹانے کے لئے رود بار انگلستان کے نیچے سے ایک سرنگ تعمیر کی گئی جسے "چینل ٹنل" یعنی "رود بار سرنگ" کہا جاتا ہے۔ یہ پہلی بار 1994ء میں کھولی گئی اور اس کے ذریعے پہلی مرتبہ برطانیہ سے کوئی ریل گاڑی فرانس پہنچی۔ پیرس، برسلز اور لندن آجکل "یورو اسٹار" نامی ریل گاڑی کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

(5) جھیلیں:

روئے زمین پر سبھی جگہ چھوٹے بڑے نشیب وفراز یا بلندیاں و پستیاں موجود ہیں۔ بارش کے وقت ان سب نشیبوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ چھوٹے اور اتھلے نشیب تو بارش کے بعد جلد ہی خشک ہو جاتے ہیں، لیکن گہرے اور بڑے نشیبوں میں عرصہ دراز تک پانی موجود رہتا ہے۔ اس قسم کے نشیبوں کو جن میں سالہا سال تک پانی موجود رہتا ہے "غدیر" یا "جھیل" کہتے ہیں۔ گویا کہ: "جھیل ایسا قطعہ آب ہے جو چاروں طرف خشکی سے گھرا ہو"۔

روئے زمین پر جھیلوں کے نمودار ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں:

اول: وسیع اور عمیق نشیب ہوں۔

دوسرے: ان نشیبوں میں کسی بھی قدرتی ذریعے سے اس قدر پانی جمع ہو جائے یا متواتر پہنچتا رہے کہ عرصہ تک خشک نہ ہونے پائیں۔

ڈھولر (کشمیر) سانبھر نینی تال (ہندوستان) اور سیف الملوک (کاغان) مشہور جھیلیں ہیں۔ کراچی والوں کے لیے جھیل ڈھابیجی کی بہت اہمیت ہے۔

جھیلوں کی قسمیں:

جھیلوں کو کئی طرح تقسیم کیا جاتا ہے۔ مثلاً: بعض جھیلوں کا پانی شیریں ہوتا ہے اور بعض کا پانی نمکین ہوتا ہے۔ بعض جھیلیں کوہستانوں میں واقع ہیں اور بعض میدانوں میں پائی جاتی ہیں۔ بعض جھیلوں سے دریا جاری ہوتے ہیں اور بعض میں آ کر گرتے ہیں۔ بعض جھیلیں قدرتی ہوتی ہیں اور بعض مصنوعی۔ یعنی ڈیم بنا کر پانی روکنے سے وجود میں آجاتی ہیں۔

قدرتی مناظر میں جھیلوں کی دل آویزی خصوصیت سے ضرب المثل ہے، چنانچہ جھیلوں کے دل فریب مناظر کے بدولت سکاٹ لینڈ اور سوئزرلینڈ دنیا بھر میں مشہور ہیں، کشمیر کے قدرتی مناظر کی دل فریبی جھیل "ڈل" اور ڈھولر" کی وجہ سے دو بالا ہوگئی ہے۔ پاکستان کی وادئ کاغان میں پیالہ نما جھیل "سیف الملوک" قدرتی حسن کا شاہکار ہے جسے دیکھ کر انسان احسن الخالقین کی کمال صناعی کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بعض بڑی جھیلوں میں جہاز رانی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے امریکہ کی پانچ بڑی جھیلیں دنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ان کے بدولت جھیلوں کا چوطرفہ علاقہ ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ ان جھیلوں سے دریائے سینٹ لورینس اور بحر اوقیانوس کے درمیان رابطہ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے جہاز براعظم شمالی امریکہ کے اندرونی حصوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

دنیا کی بڑی جھیلیں:

یوں تو روئے زمین پہ جابجا چھوٹی یا درمیانی جھیلیں پائی جاتی ہیں، لیکن کچھ جھیلیں ایسی ہیں جو بہت بڑی اور گہری ہیں۔ یہاں مختلف براعظموں کی بڑی بڑی جھیلوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

امریکا کی بڑی جھیلیں:

براعظم شمالی امریکا میں ریاستہائے متحدہ امریکا اور کینیڈا کی سرحدوں کے قریب واقع 5 بہت بڑی جھیلیں روئے زمین پر تازہ پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ

ہیں۔دریائے سینٹ لارنس کو ملا کر یہ دنیا میں میٹھے پانی کا سب سے بڑا نظام تشکیل دیتی ہیں۔بعض مرتبہ انہیں خشکی کے اندر سمندر بھی قرار دیا جاتا ہے۔ان میں مندرجہ ذیل جھیلیں شامل ہیں:

(1) جھیل سپیریئر:ان جھیلوں میں سب سے بڑی جھیل ''سپیریئر'' ہے جو حجم اور گہرائی کے اعتبار سے بھی سب سے بڑی ہے۔

(2) جھیل مشی گن: یہ اس سلسلے کی وہ واحد جھیل ہے جو مکمل طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں واقع ہے۔مقامی ریڈ انڈین قبائل کی زبان میں ''مشی گان'' کا معنی ہے: بڑا پانی۔

(3) جھیل ہیورون: رقبے کے لحاظ سے دوسری سب سے بڑی جھیل ہے۔

(4) جھیل ایری: حجم کے لحاظ سے سب سے چھوٹی اور کم گہری ہے۔

(5) جھیل اونٹاریو: رقبے کے لحاظ سے سب سے چھوٹی جھیل ہے۔

جھیل ہیورون اور جھیل ایری کے درمیان ایک چھٹی اور چھوٹی سی جھیل ''سینٹ کلیئر'' بھی واقع ہے جو ان عظیم جھیلوں کے نظام کا تو حصہ ہے، لیکن عظیم جھیلوں میں شمار نہیں ہوتی۔جھیلوں کے اس نظام میں ان جھیلوں کو ایک دوسرے سے ملانے والے دریا بھی شامل ہیں۔جن میں جھیل سپیریئر اور جھیل ہیورون کو ملانے والا دریائے سینٹ میریز، جھیل ہیورون اور جھیل سینٹ کلیئر کو ملانے والا دریائے سینٹ کلیئر، جھیل سینٹ کلیئر اور جھیل ایری کو ملانے والی دریائے ڈیٹرائٹ اور جھیل ایری اور جھیل اونٹاریو کے درمیان دریائے نیاگرا اور نیاگرا آبشار شامل ہیں۔(جھیل مشی گن آبنائے میکیناک کے ذریعے جھیل ہیورون سے منسلک ہے)

جھیل مشی گن کے علاوہ تمام جھیلیں امریکہ اور کینیڈا کی سرحدوں پر واقع ہیں۔دریائے سینٹ لارنس امریکہ اور کینیڈا کے درمیان بین الاقوامی سرحد کا کام دیتا ہے۔دنیا بھر میں میٹھے پانی کے ذخائر کا کل 20 فیصد ان 5 عظیم جھیلوں میں ہے جو مجموعی طور پر 5،473 مکعب میل (22،812 مکعب کلومیٹر) ہے۔ان جھیلوں میں پانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اسے پورے امریکہ پر چھوڑ دیا جائے تو ہر جگہ 9.5 فٹ پانی کھڑا ہوگا۔ان جھیلوں کا مشترکہ سطحی رقبہ 94،250 مربع میل (244،100 مربع کلومیٹر) ہے۔

دریائے سینٹ لارنس کے ذریعے بڑے بڑے بحری جہاز ان جھیلوں کے اندر سفر کر سکتے ہیں اور یہاں سے بحر اوقیانوس تک جا سکتے ہیں۔اپنے بڑے حجم کے باوجود سردیوں کے موسم میں ان جھیلوں پر برف کی تہیں جم جاتی ہیں اور اس موسم میں ان میں جہاز رانی ممکن نہیں۔

جھیل میڈ:

جھیل میڈ (انگریزی: Lake Mead) دنیا کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل ہے جو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں واقع ہے۔یہ جھیل لاس ویگاس سے 30 میل جنوب مشرق میں نیواڈا اور ایریزونا کی ریاستوں کے درمیان واقع ہے۔یہ جھیل اس وقت وجود میں آئی جب 1936ء میں دنیا کے موجودہ سب سے بڑے بند ''ہوور'' کی تعمیر مکمل ہوئی۔اس جھیل میں اندازاً 28 اعشاریہ 5 ملین ایکڑ فٹ (35 مکعب کلومیٹر) پانی ہے جو بند کے پیچھے 110 میل یعنی 180 کلومیٹر) کے علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔یہ جھیل ''ایلووڈ میڈ'' کے نام سے موسوم ہے جو 1924ء سے 1936ء کے دوران اس بند اور جھیل کی تعمیر کے دوران امریکی ادارہ برائے بحالی کے کمشنر تھے۔

اس بند کی تعمیر سے پانی کا جو عظیم ذخیرہ جمع ہوا وہ کئی مقامی آبادیوں کی منتقلی کا باعث بنا، جس میں سب سے زیادہ معروف سینٹ تھامس، نیواڈا کی آبادی تھی۔اس قصبے کے آخری مکین 1938ء میں یہ علاقہ چھوڑ گئے۔کبھی کبھار جب جھیل میڈ میں پانی کی سطح نیچے ہو جاتی ہے تو اس قصبے کے آثار نظر آتے ہیں۔

جھیل نکاراگوا:

نکاراگوا میں واقع تازہ پانی کی ایک بہت بڑی جھیل ہے جس میں تقریباً 400 جزائر واقع ہیں۔ ان میں سے چند جزائر اصل میں آتش فشانی ہیں جن میں کوچشن قابل ذکر ہے۔ یہ دنیا کی واحد جھیل ہے جس میں نایاب میٹھے پانی کی شارک مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ 8264 مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلی یہ جھیل لاطینی امریکہ کی دوسری سب سے بڑی جھیل ہے اور دنیا کی بڑی جھیلوں میں اس کا نمبر 20واں ہے۔ سطح سمندر سے 32 میٹر (105 فٹ) بلند یہ جھیل 26 میٹر (84 فٹ) گہری ہے۔

جھیل ٹیٹیکاکا:

جنوبی امریکہ میں واقع دنیا کی سب سے بلند جھیل جو جہاز رانی کے قابل ہے۔ یہ جھیل کوہ انڈیز کے سلسلے کے ساتھ بولیویا اور پیرو کے درمیان سرحد پر واقع ہے۔ یہ جھیل سطح سمندر سے 12,507 فٹ بلند ہے۔ جھیل کا کل سطحی رقبہ 8,372 مربع کلومیٹر ہے۔ جھیل 190 کلومیٹر طویل اور 80 کلومیٹر چوڑی ہے۔ اس کی اوسط گہرائی 107 اور زیادہ سے زیادہ گہرائی 281 میٹر ہے۔ 25 سے زائد چھوٹے بڑے دریا اس جھیل میں گرتے ہیں، جبکہ جھیل میں کل 41 جزائر ہیں جن میں سے چند انتہائی گنجان آباد ہیں۔

افریقہ کی بڑی جھیلیں

افریقہ میں ''وادی شق'' کے گرد پھیلا جھیلوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ ان جھیلوں میں جھیل وکٹوریہ اور جھیل ٹانگانیکا جیسی بڑی جھیلوں کے علاوہ جھیل البرٹ، جھیل ایڈورڈ، جھیل کیوو اور جھیل ملاوی شامل ہیں۔ چند ماہرین صرف وکٹوریا، البرٹ اور ایڈورڈ کو افریقہ کی عظیم جھیلیں قرار دیتے ہیں، کیونکہ انہی تین جھیلوں کا پانی نیل ابیض میں شامل ہوتا ہے۔ انگریز کی حرص و ہوس دیکھیے کہ دوسرے براعظم میں واقع جھیلوں میں سے ہر ایک کا نام اپنے کسی بادشاہ، شہزادے یا ملکہ کے نام پر رکھا ہے، گویا بنی آدم میں کوئی اور کسی قدرتی ذخیرے کا نام اپنے نام پر رکھے جانے کا استحقاق ہی نہیں رکھتا۔

بڑی جھیلوں کا خطہ:

یہ علاقہ دنیا کے گنجان آباد ترین علاقوں میں سے ایک ہے اور ایک اندازے کے مطابق ان جھیلوں کے علاقے میں 107 ملین افراد رہتے ہیں۔ ماضی میں یہ خطہ دنیا کا بہترین زرعی علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقے کی بلندی اسے خط استوا کے قریب ہونے کے باوجود ایک معتدل موسم دیتی ہے۔ دریائے نیل کا منبع تلاش کرنے کی یورپیوں کی قدیم خواہش انہیں اس علاقے تک لے آئی اور پھر عیسائی مبلغین ان علاقوں میں آ پہنچے۔ حالانکہ ان کے مقامی آبادی سے زیادہ روابط نہیں رہے، لیکن ان کی آمد و رفت نے اس علاقے کو غلامی کے طویل دور میں چلے جانے کی راہ ہموار کی۔ دنیا کے دیگر حصوں سے بڑھتا ہوا تعلق اس خطے کے لیے تباہ کن ثابت ہوا اور سفید فاموں کی غاصبانہ سیاست اور قتل و غارت کی عادت کے سبب علاقے کے چند حصوں میں آبادی 60 فیصد تک گر گئی۔ قبل از نو آبادیاتی دور کی آبادی 1950ء کی دہائی میں بحال ہوئی۔ غلامی سے آزادی کے بعد زرخیزی کے باعث علاقے کی ترقی کے امکانات بہت روشن تھے لیکن خانہ جنگیوں اور پرتشدد سرگرمیوں نے علاقے کو غربت میں دھکیل دیا۔ لہٰذا اب صرف کینیا اور تنزانیہ اس خطے کے خوشحال ممالک ہیں۔ اس خطے کی بڑی جھیلیں یہ ہیں۔

جھیل وکٹوریہ:

جھیل وکٹوریا افریقہ کی عظیم جھیلوں میں سے ایک ہے۔ 68،800 مربع کلومیٹر (26،560 مربع میل) پر پھیلی ہوئی یہ جھیل براعظم افریقہ اور استوائی علاقے کی سب سے بڑی اور سطحی حجم کے اعتبار سے دنیا میں تازہ پانی کی دوسری سب سے بڑی جھیل ہے۔ جھیل کی زیادہ سے زیادہ گہرائی 84 میٹر (276 فٹ) اور اوسط گہرائی 40 میٹر (131 فٹ) ہے۔ یہ جھیل دریائے نیل کی بڑی شاخ نیل ابیض کا منبع ہے۔ جھیل افریقہ میں تنزانیہ، یوگنڈا اور کینیا کے درمیان وادی صدع العظیم (Great Rift Valley) کے مغربی حصے میں ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ جھیل کے ساحلوں کی لمبائی 3،440 کلومیٹر (2138 میل) ہے، جبکہ اس میں تین ہزار سے زائد جزیرے بھی ہیں جن میں سے اکثر غیر آباد ہیں۔ جھیل کے شمال مغرب میں واقع کئی جزائر کا مجموعہ مشہور سیاحتی مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ میں جھیل کے بارے میں پہلی باقاعدہ معلومات عرب تاجروں کی جانب سے ملتی ہیں جو سونے، ہاتھی دانت اور دیگر اشیاء کے حصول کے لئے افریقہ کے اندرونی راستوں پر جاتے تھے۔ معروف مسلمان جغرافیہ دان ادریسی نے 1160ء کی دہائی میں جو نقشہ ترتیب دیا اس میں جھیل وکٹوریہ کو دکھایا گیا ہے اور اسے دریائے نیل کا منبع بھی قرار دیا گیا ہے، لیکن امریکا کی دریافت کی طرح اس جھیل کا انکشاف بھی گورے مہم جوؤں نے اپنے نام کروالیا جب یورپیوں نے پہلی مرتبہ 1858ء میں اس جھیل کو دیکھا اور برطانیہ کے مہم جو جون ہیننگ اسپیک اس کے جنوبی ساحلوں پر پہنچا۔ انہوں نے اس جھیل کو برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کے نام سے موسوم کیا۔ گویا ملکہ محترمہ کے پھاؤڑا لے کر کھودنے یا بال نچوڑنے سے یہ وجود میں آئی تھی۔

یہ جھیل 20ویں صدی سے یوگنڈا، تنزانیہ اور کینیا کے درمیان بحری سفر میں اہم حیثیت رکھتی ہے۔ 21 مئی 1996ء کو ایک بحری جہاز کے ڈوبنے سے ایک ہزار سے زائد افراد ہلاک ہوئے جو افریقہ کی تاریخ کے بدترین بحری حادثات میں سے ایک ہے۔

جھیل ٹانگانیکا:

جھیل ٹانگانیکا (انگریزی: Lake Tanganyika) وسطی افریقہ کی ایک عظیم جھیل ہے جو حجم اور گہرائی کے اعتبار سے دنیا کی دوسری سب سے بڑی جھیل ہے، جبکہ حجم اور گہرائی کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی جھیل روس کی جھیل بیکال ہے۔ جھیل ٹانگانیکا چار ممالک برونڈی، عوامی جمہوریہ کانگو، تنزانیہ اور زیمبیا میں تقسیم ہے۔ عوامی جمہوریہ کانگو 45 فیصد اور تنزانیہ 41 فیصد کے ساتھ اس جھیل کے بیشتر حصے کے ساحل ہیں۔

یہ جھیل عظیم وادئ شق کے مغربی حصے میں واقع ہے اور اس وادی کی پہاڑی دیواروں سے تشکیل پائی ہے۔ یہ افریقہ کی سب سے بڑی شقی جھیل اور سطح کے رقبے کے اعتبار سے براعظم کی دوسری سب سے بڑی جھیل ہے۔ یہ براعظم کی سب سے گہری جھیل ہے، جس میں تازے پانی کی بہت بڑی مقدار موجود ہے۔ یہ شمالاً جنوباً 673 کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کی اوسط چوڑائی 50 کلومیٹر ہے۔ ٹانگانیکا 32 ہزار 900 مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کا ساحل 1828 کلومیٹر طویل ہے۔ جھیل کی اوسط گہرائی 570 میٹر اور زیادہ سے زیادہ گہرائی 1470 میٹر (4823 فٹ) ہے۔

جھیل کو دریافت کرنے والے پہلے معلوم یورپی باشندے رچرڈ برٹن اور جان اسپیک تھے جنہوں نے اسے 1858ء میں دیکھا۔ ان دونوں کو یہ جھیل دریائے نیل کا منبع تلاش کرنے کی مہم کے دوران ملی۔

جھیل ناصر:

جھیل ناصر (عربی: بحیرۂ ناصر) جنوبی مصر اور شمالی سوڈان کا ایک عظیم آبی ذخیرہ ہے۔ اس کا 83 فیصد حصہ مصر میں ہے۔ جہاں اسے "جھیل ناصر" کہا جاتا

ہے جبکہ سوڈان میں اسے ''جھیل نوبیا'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ جھیل 1958ء سے 1970ء کے دوران دریائے نیل پر تعمیر کئے جانے والے اسوان بند کے نتیجے میں بنی۔ جھیل ناصر 550 کلومیٹر طویل اور خط سرطان کے قریب زیادہ سے زیادہ 35 کلومیٹر چوڑی ہے۔ اس کا کل سطحی رقبہ 5،250 مربع کلومیٹر اور پانی کے ذخیرے کی گنجائش 157 مکعب کلومیٹر ہے۔

1960ء کی دہائی میں بند کی تعمیر کے دوران اردگرد کے کئی علاقوں سے افراد کو منتقل کر دیا گیا، جبکہ سوڈان کی دریائی بندرگاہ وادی حلفا مکمل طور پر زیر آب آ گئی اور نیا شہر اس جھیل کے کنارے بسایا گیا۔ یہ جھیل سابق مصری صدر جمال عبدالناصر کے نام سے موسوم ہے جو اس متنازعہ بند کے منصوبے کے خالق تھے۔ 1990ء کی دہائی میں جھیل میں ذخیرہ آب حد سے زیادہ بڑھنے کے بعد پانی مغربی صحرا کی جانب سفر کرنے لگا جس سے 1998ء کے اوائل میں توشکا جھیلیں تشکیل پائیں۔

جھیل ٹانا:

جھیل ٹانا ''نیل ازرق'' کا منبع اور ایتھوپیا کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ یہ تقریباً 84 کلومیٹر طویل اور 66 کلومیٹر عریض ہے اور ملک کے شمال مغربی پہاڑی علاقے میں واقع ہے۔ جھیل کی زیادہ سے زیادہ گہرائی 15 میٹر ہے اور یہ سطح سمندر سے 1840 میٹر بلندی پر واقع ہے۔ جھیل ٹانا میں دریائے ریب اور دریائے گومارا کا پانی گرتا ہے۔ اس جھیل میں کئی جزائر واقع ہیں، جن کا انحصار جھیل میں سطح آب کی بلندی پر ہے۔ جو ایک اندازے کے مطابق گذشتہ 400 سال میں 6 فٹ گر چکی ہے۔

ایشیا کی بڑی جھیلیں

جھیل بیکال:

جھیل بیکال جنوبی سائبیریا، روس میں واقع دنیا کی سب سے گہری اور میٹھے پانی کی بڑی جھیلوں میں سے ایک ہے۔ 12,500 مربع میل کے رقبے پر پھیلی اس جھیل کی زیادہ سے زیادہ گہرائی 369 میٹر (1637 فٹ) ہے۔ یہ 336 چھوٹے بڑے دریاؤں سے فیضیاب ہوتی ہے اور دنیا کے کل میٹھے پانی کے 20 فیصد کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جبکہ روس کے کل میٹھے پانی کا 90 فیصد اسی جھیل میں ہے۔

جھیل بیکال کی زیادہ سے زیادہ لمبائی 636 کلومیٹر اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی 80 کلومیٹر ہے۔ اس کا سطحی رقبہ 31,494 مربع کلومیٹر (2,159 میل) ہے۔ جھیل کی اوسط گہرائی 487 میٹر (758, فٹ) ہے۔ اس کے پانی کے حجم کا اندازہ 23,600 مکعب کلومیٹر لگایا گیا ہے۔

اس حسین جھیل کو ''سائبیریا کی نیلی آنکھ'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عالمی ثقافتی ورثے کا حصہ ہے۔ اس جھیل میں کل 22 جزیرے ہیں جن میں سے جزیرہ ''اولخون'' دنیا کی کسی بھی جھیل میں واقع دوسرا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ (سب سے بڑا جزیرہ جھیل ہرون کا جزیرہ مینیٹولن ہے)۔

جھیل وان:

جھیل وان (ترک: Gl Van، آرمینیائی کرد: Gola Wan) ترکی کی سب سے بڑی جھیل ہے جو مشرقی اناطولیہ میں واقع ہے۔ یہ جھیل 120 کلومیٹر طویل، 80 کلومیٹر چوڑی اور 457 میٹر گہری ہے۔ یہ مجموعی طور پر 3،755 مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلی ہوئی ہے اور سطح سمندر سے 1719 میٹر بلند ہے۔ ترکی سے ایران جانے والی ریل گاڑی اس جھیل کے درمیان سے فیری کے ذریعے گذرتی ہے۔ اس ٹرین فیری سروس کا آغاز 1970ء کی دہائی میں ہوا۔

اس جھیل کے شمال میں واقع شہر ملازکرد میں 26 اگست 1071ء کو سلجوقی اور بازنطینی سلطنتوں کے درمیان مشہور جنگ لڑی گئی جس میں سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے بازنطینی حکمران رومانوس چہارم کو شکست دے کر رومیوں کو ہمیشہ کے لئے اناطولیہ سے نکال دیا۔ یہ جنگ تاریخ عالم میں "جنگ ملازکرد" کے نام سے مشہور ہے اور تاریخ کی فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔

یورپ کی جھیلیں

جھیل کونسٹانس:

جھیل کونسٹانس جرمنی، آسٹریا اور سوئزرلینڈ کے درمیان واقع ایک جھیل ہے جو جرمنی کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ یہ جھیل 210 مربع میل کے علاقے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی 63 کلومیٹر اور چوڑائی 14 کلومیٹر ہے۔ اس کا سطحی رقبہ 571 مربع کلومیٹر ہے۔ اس جھیل کی اوسط گہرائی 90 میٹر اور زیادہ سے زیادہ گہرائی 254 میٹر ہے۔ یہ سطح سمندر سے 395 میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ وسطی یورپ کی تیسری سب سے بڑی جھیل ہے اور دریائے رائن پر واقع ہے۔ (جبکہ وسطی یورپ کی پہلی بڑی جھیل "جھیل بالاٹون" ہے۔ یہ ہنگری میں ہے۔ اس کا رقبہ 592 مربع کلومیٹر ہے اور دوسری بڑی جھیل "جنیوا" ہے۔ یہ سوئزرلینڈ اور فرانس کے درمیان ہے۔ اس کا رقبہ 581 مربع کل میٹر ہے) تاریخ میں متعدد بار یہ جھیل منجمد ہو چکی ہے اور آخری بار 1963ء میں مکمل طور پر منجمد ہوئی۔ یہ جنوب مغربی جرمنی کے لیے پینے کے پانی کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

آب جاری

پہلے بتایا جاچکا ہے ''آب جاری'' اس بہتے پانی کو کہتے ہیں جو ایک جگہ سے بہہ کر دوسری جگہ جارہا ہو۔ جیسے: ندی، نالہ، دریا اور آبشار۔ ذیل میں آب جاری کی مؤخر الذکر دو مشہور شکلوں کو بیان کیا جاتا ہے۔

(1) دریا

تعریف:

دنیا میں شاید ہی کوئی جگہ ایسی ہو جہاں بارش نہ ہوتی ہو۔ سرد علاقوں میں اور بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر بارش کے علاوہ برف باری بھی ہوتی ہے۔ بارش یا برف باری سے جو پانی زمین پر نازل ہوتا ہے اس میں سے کچھ حصہ تو بہہ کر جھیلوں، تالابوں وغیرہ میں چلا جاتا ہے۔ کچھ زمین میں جذب ہو کر چشموں وغیرہ کی صورت میں سطح زمین پر دوبارہ نمودار ہو جاتا ہے۔ باقی ماندہ زمین کی سطح پر ندی نالوں کی صورت میں بہنے لگتا ہے اور آگے جا کر ایک بڑے متحرک اور جاری آبی وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور بالآخر کسی جھیل یا سمندر میں گر جاتا ہے۔ اسی کو ''دریا'' کہتے ہیں۔

اقسام:

دریاؤں میں پانی کا تمام تر انحصار بارش ہی پر نہیں، بلکہ اور بھی ایسے ذرائع ہیں جو دریاؤں کو کچھ نہ کچھ پانی متواتر بہم پہنچاتے رہتے ہیں، مثلا: برف باری، پہاڑوں پر برف کا پگھلنا۔ دریا کی تہہ میں زمین دوز پانی کا پھوٹنا بھی عموما دریا کو مستقل روانی بخشتا ہے۔ پانی کا تقریبا نصف حصہ اسی ذریعے سے حاصل ہوتا ہے ، دوسرے ذریعوں مثلا بارش سے دریا کو وقتی طور پر طغیانی اور جولانی حاصل ہوتی ہے۔ پس بہاؤ کے اعتبار سے دریا کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(1) مستقل دریا (Permanent Rivers):

ایسے دریا جھیل یا گلیشیئر سے برآمد ہوتے ہیں یا زمین کی تہہ سے پھوٹنے والے پانی سے نمودار ہوتے ہیں یا بکثرت و متواتر بارش سے وجود پاتے ہیں۔

(2) نوبتی دریا (IntermittentRivers):

جن دریاؤں کا سرمایۂ آب گاہے گاہے منقطع ہو جاتا ہے وہ ''نوبتی دریا'' کہلاتے ہیں۔ ان میں چشموں سے برآمد ہونے والے اور بالائے زمین پانی سے جاری ہونے والے دونوں قسم کے دریا شامل ہیں۔

(3) برساتی دریا:

یہ دریا نیم خشک یا ریگستانی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بارش کے وقت تو جاری ہو جاتے ہیں، لیکن بارش کے بعد خشک ہو جاتے ہیں۔

نظام دریا:

دنیا کے نقشے سے یہ بات واضح ہے کہ روئے زمین پر دریاؤں کا جال سا بچھا ہوا ہے۔ بعض علاقوں کے دریا ایک ہی سمت بہتے ہیں اور بعض جگہ مختلف سمتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں ایک دریا تن تنہا بہتا ہوا سمندر میں جا داخل ہوتا ہے اور کچھ ایسے بھی خطے ہیں جن میں سب دریا ایک دوسرے سے مل جل کر بہتے ہیں اور متحد ہو کر سمندر میں گرتے ہیں۔ ایسے دریاؤں کو جو مل جل کر سمندر میں گرتے ہیں "نظام دریا" (River system) کہتے ہیں۔ یہ نظام عموماً سب سے بڑے یا سب سے اہم دریا کے نام سے معروف ہوتا ہے، مثلاً: پنجاب کے دریاؤں کا نظام "دریائے سندھ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس نظام کے باقی دریا جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج دریائے سندھ کے معاون دریا (Truvytarues iraflkyebts) کہلاتے ہیں۔

دریا کا طاس:

وہ تمام علاقہ جس کا پانی کسی نہ کسی ذریعے سے بہتا ہوا کسی ایک دریا میں شامل ہوتا ہے اس دریا کا "طاس" کہلاتا ہے۔ چونکہ کشمیر، پنجاب (مغربی و شرقی) اور سندھ کے علاقے کا تمام پانی دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں میں شامل ہوتا ہے اس لیے یہ سب علاقے دریائے سندھ کے "طاس" میں شامل ہیں۔

دریا کا منبع، دہانہ اور ڈیلٹا:

وہ مقام جہاں سے دریا کا پانی جاری ہوتا ہے دریا کا منبع یا مخرج (SOURCE) کہلاتا ہے۔ یہ عموماً بلند پہاڑ پر چشمے یا جھیل کی شکل میں واقع ہوتا ہے۔ دریا کا دہانہ (MOUTH) وہ مقام ہے جہاں دریا اپنا طویل سفر ختم کرتا ہے۔ یہ عموماً سمندر یا جھیل میں واقع ہوتا ہے اور ساحل سے اس طریق پر ملتا ہے کہ الگ پہچانا جاتا ہے، لیکن بعض اوقات دریا سمندر کے تنگ مدخل یا کھاڑی (INLET) میں اس طریق پر گرتا ہے کہ سمندر کا کٹاؤ قیف نما ہوتا ہے اور "قیف" کا منہ یعنی چوڑا حصہ سمندر کی جانب اور تنگ حصہ دریا کے دہانے میں مل جاتا ہے، چنانچہ بحری موجیں آسانی سے دریا کے دہانے میں داخل ہو جاتی ہیں اور دریا کے بہاؤ کے خلاف خشکی میں دور تک پہنچ جاتی ہیں۔ دریا کے ایسے کشادہ دہانے کو "خور" (ایسچوری: ESTUARY) کہتے ہیں۔ دریائے ٹیمز کی ایسچوری دنیا بھر میں مشہور ہے اس میں، بحری موجوں کے داخلے کے وقت بڑے بڑے جہاز لندن تک پہنچ جاتے ہیں اسی وجہ سے لندن کی بندرگاہ کا دنیا کی اعلیٰ ترین بندرگاہوں میں شمار ہے۔

بعض اوقات دریا ایک دہانے کے بجائے بہت سے دہانوں کے ذریعے سمندر میں داخل ہوتا ہے یعنی سمندر میں گرنے سے پیشتر وہ بہت سی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ہر دو شاخوں کے درمیان تکون شکل کی زمین محصور ہو جاتی ہے اس کو "ڈیلٹا" کہتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جن سمندروں میں دریا ڈیلٹا بناتے ہوئے گرتے ہیں وہ بحری موجوں اور مد و جزری لہروں سے کم و بیش مبرا ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسچوری ایسے دریاؤں کی خصوصیت ہے جن کے دہانے تنگ مدخل (کٹاؤ) میں ہوتے ہیں۔

دنیا کے چند مشہور دریا:

یوں تو سطح زمین پر بے شمار چھوٹے بڑے دریا پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مستقل دریا ہیں اور کچھ معاون دریا ہیں۔ کچھ الگ بہتے ہیں اور کچھ اپنی جوڑی کے ساتھ مل کر جیسے: دجلہ و فرات اور گنگا و جمنا، لیکن یہاں ہم صرف بڑے اور مشہور دریاؤں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ابتدا جوڑی دار دریاؤں سے کی جاتی ہے۔

1-سیحان وجیحان:

سیحان اور جیحان یہ دونوں دریائے سیحون اور جیحون کے علاوہ ہیں اور شام کے خطے میں واقع ہیں۔ جیحان ''مصیصہ'' شہر کا دریا ہے اور سیحان ''اذنہ'' شہر کا دریا ہے۔ جمہور مؤرخین کا کہنا ہے کہ سیحان، سیحون کے علاوہ اور جیحان جیحون کے علاوہ دریا ہے۔ صرف قاضی عیاض نے ان کو ایک قرار دیا ہے، لیکن مؤرخین نے ان کے اس قول کی تردید کی ہے۔

2-دریائے جیحون وسیحون:

جیحون وسطِ ایشیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ یہی دریا ''آمو'' بھی کہلاتا ہے۔ پامیر کے پہاڑوں سے نکلنے والے اس دریا کی کل لمبائی 2400 کلومیٹر (1500 میل) ہے اور یہ افغانستان، تاجکستان، ترکمانستان اور ازبکستان سے ہوتا ہوا بحیرۂ ارال میں گرتا ہے۔ گویا کہ ان دونوں دریاؤں کا منتہی ایک ہی ہے، یعنی ''بحیرۂ ارال'' جسے ''بحیرۂ خوارزم'' کہتے ہیں۔ اس میں پانی کا سالانہ اخراج 55 مکعب کلومیٹر ہے۔ اس دریا کو افغانستان اور تاجکستان، افغانستان اور ازبکستان اور افغانستان اور ترکمانستان کے درمیان سرحد قرار دیا گیا ہے۔

دریائے سیحون وسط ایشیا کا ایک اہم دریا ہے۔ یہ دریا کرغزستان اور ازبکستان کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مغربی اور شمال مغربی ازبکستان اور جنوبی قازقستان میں 2220 کلومیٹر (1380 میل) کا سفر طے کرنے کے بعد بحیرۂ ارال میں جا گرتا ہے۔ دریا کا سالانہ بہاؤ 28 مکعب کلومیٹر ہے جو اس کے ساتھی دریا دریائے جیحون کا نصف ہے۔

علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:

قَوْله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''سَيْحَان وَجَيْحَان وَالْفُرَات وَالنِّيل كُلّ مِنْ أَنْهَار الْجَنَّة.''

"اِعْلَمْ أَنَّ سَيْحَان وَجَيْحَان غَيْر سَيْحُون وَجَيْحُون، فَأَمَّا سَيْحَان وَجَيْحَان الْمَذْكُورَانِ فِي هَذَا الْحَدِيث اللَّذَانِ هُمَا مِنْ أَنْهَار الْجَنَّة فِي بِلَاد الْأَرْمَن، فَجَيْحَان نَهَر الْمُصَيِّصَة، وَسَيْحَان نَهَر إِذَنَة، وَهُمَا نَهْرَانِ عَظِيمَانِ جِدًّا أَكْبَرهمَا جَيْحَان، فَهَذَا هُوَ الصَّوَاب فِي مَوْضِعهمَا، وَأَمَّا قَوْل الْجَوْهَرِيّ فِي صِحَاحه جَيْحَان نَهَر الشَّام، فَغَلَط أَوْ أَنَّهُ أَرَادَ الْمَجَاز مِنْ حَيْثُ إِنَّهُ بِبِلَادِ الْأَرْمَن، وَهِيَ مُجَاوِرَة لِلشَّامِ، قَالَ الْحَازِمِيّ: سَيْحَان نَهَر عِنْد الْمُصَيِّصَة، قَالَ: وَهُوَ غَيْر سَيْحُون، وَقَالَ صَاحِب نِهَايَة الْغَرِيب: سَيْحَان وَجَيْحَان نَهْرَانِ بِالْعَوَاصِمِ عِنْد الْمُصَيِّصَة وَطَرَسُوس، وَاتَّفَقُوا كُلّهمْ عَلَى أَنَّ جَيْحُون بِالْوَاوِ نَهَر وَرَاء خُرَاسَان عِنْد بَلْخ، وَاتَّفَقُوا عَلَى أَنَّهُ غَيْر جَيْحَان، وَكَذَلِكَ سَيْحُون غَيْر سَيْحَان، وَأَمَّا قَوْل الْقَاضِي عِيَاض: هَذِهِ الْأَنْهَار الْأَرْبَعَة أَكْبَر أَنْهَار بِلَاد الْإِسْلَام فَالنِّيل بِمِصْرَ، وَالْفُرَات: بِالْعِرَاقِ، وَسَيْحَان وَجَيْحَان، وَيُقَال: سَيْحُون وَجَيْحُون بِبِلَادِ خُرَاسَان، فَفِي كَلَامه إِنْكَار مِنْ أَوْجُه أَحَدهَا: قَوْله: سَيْحَان وَجَيْحَان، وَيُقَال: سَيْحُون وَجَيْحُون فَجَعَلَ الْأَسْمَاء مُتَرَادِفَة، وَلَيْسَ كَذَلِكَ بَلْ سَيْحَان غَيْر سَيْحُون، وَجَيْحَان غَيْر جَيْحُون، بِاتِّفَاقِ النَّاس كَمَا سَبَقَ. وَالثَّانِي: أَنَّهُ بِبِلَادِ خُرَاسَان، وَأَمَّا سَيْحَان وَجَيْحَان بِبِلَادِ الْأَرْمَن بِقُرْبِ الشَّام. وَاَللَّه أَعْلَم." **(شرح النووی علی مسلم 222/9)**

قوله: بـلاد الأرمن: الأرمن بالأرمنية شعب ينتمي الى العرق الآري (الهند اوروبی)، ويعود وجودهم فی أرضا أرمينيا التاريخية (الهضبة الأرمنية) أرض أرمينيا العظمیٰ والصغریٰ) الممتدة فی الأجزاء الوسطیٰ والشرقيةمن آسيا الصغریٰ تقع حاليا فی تركيا.

فائدہ:

وہ نہریں جن کے بارے میں احادیث مبارکہ میں جنت کی نہروں میں سے ہونے کا ذکر ہے کل پانچ ہیں: دجلہ، فرات، نیل، جیحان اور سیحان۔

جنت کی نہروں میں سے ہونے کے دو مطلب ہیں:

1) ان نہروں کے آس پاس رہنے والے ایسے کارنامے سرانجام دیں گے جو دخول جنت کا باعث بنیں گے۔

2) دوسرا قول راجح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اپنے ظاہر پر محمول ہے اور ان نہروں کا جنت سے غیر مرئی تعلق ہے اس لیے کہ جنت اہل سنت کے نزدیک آج بھی مخلوق اور موجود ہے۔

3-دریائے فرات ودجلہ:

فرات کا نام قدیم فارسی کے لفظ hu-perethuua سے ماخوذ ہے۔ چند ماہرین کا کہنا ہے کہ فرات کا لفظ کرد زبان سے نکلا ہے۔ کرد زبان میں "فر" کا مطلب "چوڑا"، "ری" کا مطلب بہتا پانی اور "ہات" کا مطلب بہنا ہے۔ اس طرح "فرریہات" کا مطلب وسیع پیمانے پر بہتا پانی ہوا۔ کرد زبان میں دریا کا جدید نام فرات اسی پرانے لفظ سے نکلا ہے۔ دریائے فرات تقریباً دو ہزار 780 کلومیٹر (ایک ہزار 730 میل) طویل ہے۔ یہ دو شاخوں کارا (مغربی فرات) اور مراد (مشرقی فرات) سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ "کارا" موجودہ مشرقی ترکی میں "ارضروم" کے شمال میں آرمینیائی سطح مرتفع سے، جبکہ "مراد" جھیل وان کے شمال میں "کوہ ارارات" کے جنوب مغرب سے نکلتا ہے۔ دریائے فرات کھائیوں اور گھاٹیوں میں سے ہوتا ہوا جنوب مشرقی شام سے عراق میں داخل ہوتا ہے۔ "خبور" اور "بلخ" کے دریا مشرقی شام میں دریائے فرات میں گرتے ہیں۔ اس سے نیچے آتے ہوئے دریائے فرات میں کوئی مزید دریا نہیں گرتا۔ جنوبی عراق کے شہر بصرہ کے شمال میں دریائے فرات دریائے دجلہ میں گرتے ہوئے "شط العرب" نامی ڈیلٹا بناتا ہے اور دونوں دریا خلیج فارس میں گرتے ہیں۔ اس وسیع ڈیلٹا کے باعث یہ ایک بہت بڑے دلدلی علاقے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

4-شط العرب:

شط العرب (فارسی: اروندرود) 200 کلومیٹر طویل یہ دریا جنوبی عراق میں "القرنہ" کے مقام پر دریائے فرات اور دریائے دجلہ کے ملنے سے تشکیل پاتا ہے۔ اس دریا کا جنوبی ساحل عراق اور ایران کے درمیان سرحد بناتا ہے اور یہ خلیج فارس میں جا گرتا ہے۔ اس کی چوڑائی بصرہ کے مقام پر 760 فٹ (232 میٹر) سے لے کر سمندر میں گرنے کے مقام پر نصف تک ہے۔ اس خطے میں جہاز رانی کے تنازعے پر ہی ایران اور عراق کے درمیان 80ء کی دہائی میں معروف جنگ ہوئی۔ عراق کے مشہور شہر بصرہ اور ام قصر اسی دریا کے کنارے واقع ہیں۔ اس کے علاوہ ایران کے شہر ابادان اور خرم شہر بھی اس کے دوسری جانب واقع ہیں۔ یہ چاروں شہر خلیج فارس کی مشہور بندرگاہیں ہیں۔

5-گنگا وجمنا:

گنگا شمالی بھارت اور بنگلہ دیش کا ایک دریا ہے۔ دریائے گنگا ہندو مذہب میں اہم حیثیت رکھتا ہے اور زمانۂ جاہلیت کی شرکیہ روایات کے مطابق مقدس سمجھتے ہوئے اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ دریاءے گنگا کی کل لمبائی 2 ہزار 510 کلومیٹر (1 ہزار 557 میل) ہے۔ یہ دریائے جمنا کے ساتھ مل کر ایک عظیم اور زرخیز خطہ تشکیل دیتا ہے جو شمالی بھارت اور بنگلہ دیش پر مشتمل ہے۔ اس علاقے میں آبادی کی کثافت دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ بے پناہ آبادی، آلودگی اور ماحولیات کی تباہی دریا کیلئے ایک تشویشناک صورتحال ہے۔

6-دریائے نیل:

دریائے نیل دنیا کا سب سے طویل دریا ہے جو براعظم افریقہ میں واقع ہے۔ یہ دو دریاؤں نیل ابیض اور نیل ازرق سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ آخرالذکر دریائے نیل کے بیشتر پانی اور زرخیز زمینوں کا سبب ہے لیکن طویل اول الذکر دریا ہے۔ نیل ابیض وسطی افریقہ میں عظیم جھیلوں کے علاقے میں تنزانیہ، یوگینڈا اور جنوبی سوڈان سے نکلتا ہے جبکہ نیل ازرق ایتھوپیا میں جھیل ٹانا سے شروع ہوتا ہوا جنوب مشرق کی سمت سفر کرتے ہوئے سوڈان سے گذرتا ہے۔ یہ دونوں دریا سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے قریب آپس میں ملتے ہیں۔

دریائے نیل کا شمالی حصہ سوڈان سے مصر تک مکمل طور پر صحرا سے گزرتا ہے۔ جنوبی مصر میں اس دریا پر مشہور اسوان بند تعمیر کیا گیا ہے جو 1971ء میں مکمل ہوا۔ اس بند کے باعث ایک عظیم مصنوعی جھیل تشکیل پائی جو جھیل ناصر کہلاتی ہے۔ یہ جھیل مصر اور سوڈان کی سرحد پر واقع ہے۔

جھیل کا 83 فیصد حصہ مصر میں واقع ہے جبکہ 17 فیصد حصہ سوڈان میں ہے جہاں اسے ''جھیل نوبیا'' کہا جاتا ہے۔ جھیل ناصر 550 کلومیٹر طویل اور زیادہ سے زیادہ 35 کلومیٹر چوڑی ہے۔ اس کا کل رقبہ 5،250 مربع کلومیٹر ہے۔ مصر کی آبادی کی اکثریت اور تمام شہر اسی دریا کے کنارے آباد ہیں۔ مصر کا موجودہ دارالحکومت قاہرہ دریائے نیل کے کنارے اور اس کے جزائر پر عین اس مقام پر واقع ہے جہاں دریا صحرائی علاقے سے نکل کر دو شاخوں میں تقسیم ہو کر ڈیلٹائی خطے میں داخل ہوتا ہے۔ دریائے نیل 6،695 کلومیٹر (4،160 میل) کا سفر طے کرنے کے بعد اس ڈیلٹائی علاقے سے ہوتا ہوا بحیرہ روم میں گرتا ہے۔ قدیم مصر کے تمام آثار قدیمہ بھی دریائے نیل کے کناروں کے ساتھ ملتے ہیں کیونکہ 4 ہزار سال قبل مسیح میں صحرائے اعظم جو مراکش سے مغرب میں واقع ہے، کی وسعت گیری اور خشک سالی کے باعث مقامی باشندے دریائے نیل کی جانب ہجرت کر گئے جو عظیم مصری تہذیب کا پیش خیمہ بنی۔

دریائے نیل میں گرنے والے اہم معاون دریا نیل ابیض اور نیل ازرق ہیں جن میں سے نیل ابیض وکٹوریہ اور نیل ازرق ایتھوپیا سے نکلتا ہے۔ ایک اور کم اہمیت کا حامل دریا ''اتبارا'' بھی دریائے نیل میں گرتا ہے، لیکن اس میں صرف اسی وقت پانی ہوتا ہے جب ایتھوپیا میں بارش ہو۔ عام طور پر جھیل وکٹوریہ کو نیل ابیض کا دہانہ مانا جاتا ہے، تاہم ماہرین کا کہنا ہے کہ نیل ابیض کا دہانہ روانڈا کے جنگلات میں ہے۔ جس کے بعد یہ جھیل وکٹوریہ سے سفر کرتا ہوا یوگنڈا میں اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ 500 کلومیٹر کے سفر کے بعد یہ ''جھیل کیوگا'' اور بعد ازاں ''جھیل البرٹ'' پہنچتا ہے جس کے بعد یہ سوڈان پہنچتا ہے۔ اس مقام پر یہ بحر الجبل (یعنی کوہستانی دریا) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بحر الغزال کے ملاپ کے بعد یہ دریا بحر الابیض یعنی سفید دریا کہلاتا ہے جسے دنیا نیل ابیض کے نام سے جانتی ہے۔ نیل ازرق ایتھوپیا کے پہاڑوں میں واقع جھیل ٹانا سے نکلتا ہے۔ یہ 1400 کلومیٹر کا سفر کرنے کے بعد سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے قریب نیل ابیض میں مل جاتا ہے اور دریائے نیل تشکیل دیتا ہے۔

جب مصر فتح ہوا تو اہل مصر نے فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ ہمارے ملک میں کاشتکاری کا دارومدار دریائے نیل پر ہے، ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ ہر سال ایک حسین و جمیل کنواری لڑکی دریا میں ڈالی جاتی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو دریا خشک ہو جاتا ہے اور قحط پڑ جاتا ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں اس رسم سے روک دیا۔ جب دریا سوکھنے لگا تو حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ خلیفہ وقت امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھ بھیجا۔ جواب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تحریر فرمایا کہ دین اسلام ایسی وحشیانہ و جاہلانہ رسموں کی اجازت نہیں دیتا ۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خط دریائے نیل کے نام لکھ بھیجا اور حضرت عمر بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسے دریا میں ڈالنے کی ہدایت کی ۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ یہ خط اللہ کے بندے عمر بن خطاب کی طرف سے نیل مصر کے نام ہے۔ اگر تو اپنے اختیار سے جاری ہے تو ہمیں تجھ سے کوئی کام

نہیں اور اگر تو اللہ کے حکم سے جاری ہے تو اب اللہ کے نام پر جاری رہنا''۔

اس خط کے ڈالتے ہی دریائے نیل بڑھنا شروع ہوا، پچھلے سالوں کی بنسبت چھ گز زیادہ بڑھا اور اس کے بعد سے آج تک نہیں سوکھا۔ تاریخ میں یہ ایمان کے کمال، عقیدے کے رسوخ اور توہم پرستی کے بطلان کی یادگار مثال سمجھی جاتی ہے۔

7-نیلِ ابیض:

نیل ابیض افریقہ کا ایک دریا ہے جو دریائے نیل کے دو معاون دریاؤں میں سے ایک ہے۔ یہ جھیل وکٹوریہ سے نکلتا ہے جہاں اسے وکٹوریہ نیل کہا جاتا ہے جہاں سے یہ شمال اور مغرب کی جانب سفر کرتا ہوا یوگنڈا، جھیل کیوگا اور جھیل البرٹ سے گذرتا ہے۔ مزید شمال کی جانب سفر کرتا ہوا یہ سوڈان میں داخل ہوتا ہے اور میدانی علاقوں سے گذرتے ہوئے سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے مقام پر نیل ازرق سے مل کر دریائے نیل تشکیل دیتا ہے۔ جھیل وکٹوریہ سے خرطوم تک اس دریا کی لمبائی تقریباً 3700 کلومیٹر (2300 میل) ہے۔ 19 ویں صدی میں دریائے نیل کے منبع کی تلاش کے کام میں تمام تر توجہ اسی دریا پر مرکوز رہی۔

8-نیلِ ازرق:

نیل ازرق ایتھوپیا کی جھیل ٹانا سے نکلنے والا ایک دریا ہے، جسے ایتھوپیا میں ''ابے'' اور سوڈان میں نیل ازرق کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ نیل ازرق سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے قریب نیل ابیض سے مل کر دریائے نیل تشکیل دیتا ہے جو سوڈان اور مصر سے گذرتا ہوا اسکندریہ کے مقام پر بحیرہ روم میں گرتا ہے۔ نیل ازرق جھیل ٹانا سے نکلنے کے بعد شمال مغرب کی جانب اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے اور صرف 30 کلومیٹر کے فاصلے کے بعد ایک عظیم گھاٹی میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ علاقہ ایتھوپیا میں سیاحت کے حوالے سے معروف ہے۔ جون سے ستمبر کے بارش کے موسم میں نیل ازرق میں سطح آب بہت بڑھ جاتی ہے اور دریائے نیل کو دو تہائی پانی فراہم کرتا ہے۔ یہی دریا، ایتھوپیا کے دریائے اتبارا کے ساتھ مل کر دریائے نیل میں سیلاب کا باعث بنتا رہا لیکن 1970ء میں اسوان ڈیم کی تعمیر کے ساتھ ہی اس سلسلے کا خاتمہ ہو گیا۔ نیل ازرق نیل ابیض سے لمبائی میں چھوٹا ہے لیکن اس کے باوجود مصر پہنچنے والا 56 فیصد پانی یہی دریا فراہم کرتا ہے۔ یہ دریا سوڈان کے لئے یکساں اہمیت کا حامل ہے جہاں اس پر قائم دو ڈیم ملک کی 80 فیصد بجلی پیدا کرتے ہیں۔ انہی ڈیموں کی بدولت اس علاقے میں دنیا کی بہترین کپاس پیدا ہوتی ہے۔

9-دریائے وولگا:

وولگا روس کا قومی دریا سمجھا جاتا ہے۔ یہ یورپ کا طویل ترین دریا ہے۔ یہ دریا ماسکو کے شمال مغرب اور سینٹ پیٹرز برگ کے جنوب مغرب میں 320 کلومیٹر دور کوہ ولدائی سے نکلتا ہے جہاں سے یہ مشرق کی جانب سفر کرتا ہوا استراخان کے قریب سطح سمندر سے 28 میٹر نیچے بحیرہ کیسپین میں جا گرتا ہے۔ کیسپین میں گرنے سے قبل وولگوگراڈ (سابق اسٹالن گراڈ) کے قریب یہ دریائے ڈون کی طرف موڑ کاٹتا ہے جہاں "ڈون۔ وولگا نہر" تعمیر کر کے اسے ڈون سے ملا دیا گیا ہے۔ بحیرہ کیسپین سے بحیرہ اسود اور دنیا کے دیگر سمندروں کو جانے والے جہاز دریائے وولگا اور ڈون۔ وولگا نہر سے گذر کر دریائے ڈون اور بعد ازاں آبنائے کرچ سے ہوتے ہوئے بحیرہ اسود میں پہنچتے ہیں۔ اس طرح یہ کیسپین کو دنیا بھر سے منسلک کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس دریا کا ڈیلٹا 160 کلومیٹر طویل ہے۔ ڈون۔ وولگا نہر کے علاوہ ماسکو نہر اور ماریئنسک نہر کا نظام ماسکو کو بحیرہ ابیض، بحیرہ بالٹک، بحیرہ کیسپین، بحیرہ ازوف اور بحیرہ اسود سے منسلک کرتا ہے۔ اس دریا کے ڈیلٹائی علاقے میں قائم مسلمانوں کی حکومتیں خانان سرائے اور خانان استراخان تھیں جن پر 16 ویں صدی میں سلطنت روس نے قبضہ کر لیا۔

10-دریائے ڈینیوب:

دریائے ڈینیوب (The Danube River) یورپ کا دوسرا سب سے لمبا اور یورپی یونین کا سب سے لمبا دریا ہے۔ یہ جرمنی کے جنوب مغربی صوبہ بادن ورتمبرگ کے کالے جنگلات (Black Forest) کی مشرقی ڈھلانوں سے نکلتا ہے اور 2,860 کلومیٹر (1780 میل) کا فاصلہ طے کرتے ہوئے رومانیہ کے علاقے میں بحیرہ اسود میں جا گرتا ہے۔

ڈینیوب دس ملکوں جرمنی، آسٹریا، سلوواکیہ، ہنگری، کروشیا، سربیا، بلغاریہ، رومانیہ، مالدووا اور یوکرین سے گزرتا ہے۔ اسکے علاوہ یہ کئی دوسرے ملکوں کا بارڈر بھی شامل کرتا ہے۔ یورپی تاریخ میں ڈینیوب کی خاص اہمیت ہے۔ رومانیہ کے علاقے میں اس میں جہاز رانی بھی ہوتی ہے۔ اس کے کنارے یورپ کے بڑے مشہور شہر آباد ہیں جن میں ویانا، براٹسلاوا، بوداپست، بلغراد، بریلا اور گلاٹی شامل ہیں۔

11-دریائے ٹیمز:

دریائے ٹیمز (انگریزی: Thames) انگلستان کا ایک دریا ہے جس کے کنارے دارالحکومت لندن آباد ہے۔ یہ دریا ''کاٹس والڈ'' کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے۔ اور اس کی ابتدائی شاخیں لیک لیڈ کے مقام پر مجتمع ہوتی ہیں۔ دریا پر پندرہ پل ہیں جن میں لندن پل، ویسٹ منسٹر پل، واٹرلو پل اور ٹاور پل قابل ذکر ہیں۔ دریا کے نیچے دو بڑی سرنگیں ہیں اور پیدل چلنے والوں کے لیے دو چھوٹی سرنگیں ہیں۔ دریا کو عبور کرنے کے لیے دو پل وول وچ اور گریوسینڈ بنے ہوئے ہیں۔ ٹیمز میں جہازوں کی آمدورفت کے علاوہ کشتیوں کی دوڑ کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ لمبائی منبع سے دہانے تک 210 میل ہے۔

12-دریائے مسی سپی:

دریائے مسی سپی (انگریزی: Mississippi River) ریاستہائے متحدہ امریکہ میں واقع دنیا کا تیسرا سب سے بڑا دریا ہے، جو تقریباً 3800 کلومیٹر طویل ہے۔ یہ امریکہ کی ریاستوں الینوائے، آرکنساس، ٹینیسی، لوزیانا اور مسیسپی میں بحری آمدورفت کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ دریا خلیج میکسیکو میں گرتا ہے۔

13-دریائے ایمیزون:

دریائے ایمیزون جنوبی امریکہ کا ایک عظیم دریا ہے جو حجم کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ اس میں پانی کے بہاؤ کا اندازہ اس بات سے لگا جا سکتا ہے کہ ایمیزون کے بعد حجم کے اعتبار سے دوسرے سے چھٹے نمبر پر آنے والے تمام دریاؤں میں مل کر بھی اس کے حجم کے برابر پانی نہیں۔ یہ افریقہ کے دریائے نیل کے بعد دنیا کا دوسرا طویل ترین دریا ہے۔ ایمیزون کی ابتدا جنوبی امریکہ کے ملک پیرو کے مقام ''نیواڈو مسمی'' سے ہوتی ہے۔ برازیل میں ایمیزون کا طاس جسے ایمیزون طاس کے نام سے جانا جاتا ہے، دنیا کا سب سے بڑا طاس ہے جو رقبے کے اعتبار سے پورے بھارت سے دوگنا ہے۔ دریائے ایمیزون کا پانی بحر اوقیانوس میں گرتا ہے اور بارش کے موسموں میں سمندر میں گرنے والا پانی 300،000 مکعب میٹر فی سیکنڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ دنیا بھر میں سمندر میں گرنے والے میٹھے پانی کے کل حجم کا پانچواں حصہ دریائے ایمیزون سے گرتا ہے۔ دریائے ایمیزون 6,400 کلومیٹر (4,000 میل) طویل ہے۔ یہ دریا کوہ انڈیز کے مشرق میں واقع ایمیزون کے جنگلات سے گذرتا ہے جو دنیا کے سب سے بڑے جنگلات ہیں۔ دریائے ایمیزون کے معاون دریاؤں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔

14۔ دریائے اردن:

یہ دریا شام کے علاقوں میں بہتا ہے۔ اس کی لمبائی 80 کلومیٹر ہے۔ یہ تین چھوٹی نہروں اور بحیرۂ طبریہ (جو کہ ایک پہاڑی وادی کے پھٹنے کی وجہ سے وجود میں آیا ہے) مل کر بنتا ہے۔ پہلی چھوٹی نہر "بانیاس" ہے جو شام سے آتی ہے۔ دوسری "الدان" جو کہ شمالی فلسطین سے آتی ہے اور تیسری "حاصبانی" جو کہ لبنان سے آتی ہے۔ بحیرۂ کے شمالی کنارے سے بہت سے دریا اور نہریں وجود میں آتے ہیں، ان کنارے بہت سی چھوٹی نہریں دریائے اردن میں گرتی ہیں مثلاً نہر یرموک، نہر زرقا، نہر وادی کفرنجہ، نہر جالوت۔ دریائے اردن، فلسطین اور اردن کے درمیان حائل ہوتے ہوئے بحر میت میں جا گرتا ہے جو کہ اپنے کھارے پانی کے لیے مشہور ہے۔

مارچ 1921ء میں برطانیہ نے دریائے اردن کی حدود مشرقی اردن کے درمیان مقرر کیں اور ساتھ ہی فلسطین کو اپنی نگرانی (اسے "انتداب" کہتے ہیں) میں لینے کا بھی اعلان کیا۔ آج کل دریائے اردن، فلسطین اور اردن کو "مرج بلیسان" کے علاقے میں جدا کرتا ہے۔ اس علاقے میں دو پل ہیں جو ملکی گذرگاہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں: "ملک حسین پل" یہ اسرائیل اور اردن کے درمیان "بلیسان" کے قریب بنایا گیا ہے۔ بلیسان وہی جگہ ہے جس کے بارے میں دجال نے حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ اس کے باغات میں کھجوریں آتی ہیں یا نہیں؟ آج کل اسرائیل کی چیرہ دستیوں کے باعث اس کے باغات اجڑتے جارہے ہیں۔ اور دوسرا "ملک حسین پل" جو کہ اردن اور مغربی کنارے کے درمیان بنایا گیا ہے۔ یہ دنیا کا ایسا پل ہے جس کی تین قوتوں اردن فلسطین اور یہودی استعمار کی طرف سے نگرانی کی جاتی ہے۔

دریائے اردن کے کنارے بہت معرکے ہوئے ہیں، مثلاً: معرکۂ یرموک جو رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان شمالی اردن میں یرموک کے علاقے میں ہوا تھا اور مسلمانوں کو عظیم فتح نصیب ہوئی تھی اور بیسویں صدی کی آخری تہائی میں بڑے معرکے ہوئے ہیں جیسے "معرکہ کرامہ" جو اردنی اور اسرائیلی فوج کے درمیان ہوا تھا اور اردن کو فتح نصیب ہوئی تھی۔

امام بزار نے سند حسن کے ساتھ اور طبرانی وابن مندہ نے کتاب معرفۃ الصحابۃ میں اور ہیثمی نے مجمع الزوائد میں ایک حدیث ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ بزار کے رجال ثقہ ہیں۔

"عن نهيك بن صريم السكوني، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لتقاتلن المشركين حتى يقاتل بقيتكم الدجال على نهر الأردن، أنتم شرقيّه وهم غربيّه". (مجمع الزوائد: 303/7)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم لوگ مشرکوں سے قتال کروگے یہاں تک کہ تمہارے بعد کے لوگ دجال سے دریائے اردن کے کنارے پر قتال کریں گے۔ تم مشرقی جانب ہوگے اور وہ لوگ مغربی جانب"۔

سبحان اللہ! حضور ﷺ کی یہ پیش گوئی سچ ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ دریائے اردن کے غربی کنارے دجالی ریاست (اسرائیل) وجود میں آچکی ہے، جو کہ آخر زمانے میں رحمانی اور دجالی قوتوں کے درمیان عظیم معرکہ "الملحمۃ الکبری" کا میدان ہوگی۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دام ظلہم جب اس دریا کے کنارے پہنچے تو بڑی دلسوزی کے ساتھ عجیب انداز میں تذکرہ فرمایا۔ اپنے مشہور سفرنامے میں جو "ادبی اعزاز" دیے جانے کے قابل ہے، آپ فرماتے ہیں:

"دریائے اردن:

"بحر میت کی سیاحت کے بعد ہمیں منتظمین دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر لے گئے جو آج کل اردن اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی لائن کے

طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ دریائے اردن بڑا قدیم دریا ہے۔ یہ لمبائی میں 319 کلومیٹر کے علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا کچھ حصہ کنعان اور کچھ فلسطین اور سوریا میں ہے۔ اس کا تذکرہ قدیم ترین کتابوں میں پڑھتے آئے تھے۔ بائبل کے بہت سے صحیفوں میں جا بجا اس دریا اور اس کے کنارے پیش آنے والے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی کم از کم دو مقامات پر اس دریا کا نام لیے بغیر تذکرہ کیا گیا ہے۔ پہلا ذکر سورہ بقرہ میں ہے۔ جہاں حضرت طالوت کے عمالقہ کے ساتھ جہاد کا واقعہ بیان ہوا ہے، وہاں قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت طالوت نے اپنے رفقا سے کہا تھا کہ: "قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ." "بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک دریا سے آزمائے گا، پس جو شخص اس دریا کا پانی پیے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ بلاشبہ میری جماعت سے ہے، سوائے اس کے جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے لے لے۔" مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد دریائے اردن ہے۔

قرآنِ کریم نے دوسری بار دریائے اردن کی طرف سورہ روم میں ارشاد فرمایا ہے یعنی اس جگہ جہاں ایرانی لشکر کے ہاتھوں رومیوں کی شکست کا تذکرہ ملتا ہے: "الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ." "الٓمّٓ۔ روم کے لوگ نزدیک ترین زمین میں مغلوب ہو گئے۔" مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں "نزدیک ترین زمین" سے مراد دریائے اردن کی وادی ہے، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں ایران کے بادشاہ "خسرو پرویز" کے لشکر نے روم کے لشکر کو شکست فاش دی تھی۔ دریائے اردن کی وادی مختلف اقوام اور تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ اسی کے کناروں پر سینکڑوں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے اور تاریخ کے نہ جانے کتنے ابواب لکھے گئے۔ اس کے مغربی کنارے سے فلسطین کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے جسے قرآن کریم نے ہر جگہ "ارضِ مقدسہ"، "ارضِ مبارکہ" وغیرہ کے ناموں سے تعبیر فرمایا ہے۔

کتابوں میں دریائے اردن اور اس سے وابستہ تاریخی واقعات کے بارے میں جو کچھ پڑھ رکھا تھا، اس کی بنا پر ذہن میں یہ تاثر تھا کہ یہ کوئی بڑا اسا دریا ہوگا، لیکن یہاں پہنچ کر دیکھا تو یہ چوڑائی میں اتنا چھوٹا ہے کہ اس کے لیے "دریا" کے بجائے "نالے" کا لفظ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی ہمارے پاکستان کے "دریائے سوات" یا "دریائے کنہار" کے برابر ہوگی اور بہت سی جگہوں پر اس سے بھی کم، اور سردی کے موسم کی وجہ سے اس میں پانی بھی بہت کم تھا۔

دریا پر ایک ایسا پل بنا ہوا تھا جس کے مشرقی حصے پر اردن کی چوکی اور ایک بڑا اسا دفاعی مورچہ بنا ہوا ہے۔ پل کا تقریباً دو تہائی حصہ اردن کے قبضے میں ہے اور باقی ایک تہائی حصہ اسرائیل کے تسلط میں، دونوں حصوں کو ممتاز کرنے کے لیے بیچ میں ایک بڑا سا ڈرم رکھا ہوا ہے۔ ہم اس ڈرم تک گئے۔ اس سے آگے اسرائیلی فوجی پہرہ دے رہے تھے اور پل کے مغربی کنارے پر ان کی چوکی نظر آ رہی تھی۔ بیت المقدس یہاں سے بارہ پندرہ میل سے زیادہ دور نہیں تھا، لیکن بیت المقدس تو کجا، ہمارے لیے اسرائیل کا ممنونِ احسان ہوئے بغیر دریا پار کرنا بھی ممکن نہ تھا... ہماری بداعمالیوں کی پاداش مغربی کنارے پر اسرائیل کے لہراتے ہوئے پرچم کی صورت میں ہمارے سامنے تھی۔ دل تھا کہ حسرت وندامت سے اور یاس و اضطراب کے جذبات سے پسا جا رہا تھا، لیکن ہمارے پاس اپنی بے بسی کا ماتم کرنے کے سوا اس صورتِ حال کا کوئی علاج نہ تھا۔ تمام رفقا خاموش اور دم بخود تھے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ شاید سب اسی قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جب لوٹ کر واپس گاڑی میں بیٹھنے لگے تو ہمارے ایک رفیق نے سکوت توڑتے ہوئے کہا: "یہ جگہ تو سیاحت کے لیے نہیں، جہاد کے لیے آنے کی تھی"۔ ہم سب یہ نشتر بھی سہہ گئے اور تھوڑی دیر میں گاڑی مشرق کی طرف روانہ ہو گئی۔"

(جہانِ دیدہ: 246-245-244)

(2) آبشار

آبشار کیا ہے؟

جب دریا کے راستے میں نرم وسخت چٹانوں کی افقی تہیں یکے بعد دیگرے واقع ہوں نیز ان کی موٹائی بھی زیادہ نہ ہو تو دریا نرم چٹانوں کو پہلے کاٹ ڈالتا ہے۔ چنانچہ نرم وسخت چٹانوں کا سیڑھی دار سلسلہ وجود پذیر میں آتا ہے جس پر دریا کچھ دور بہتا، پھر کودتا اور پھر بہتا ہے۔ دریا کے اس طرح کے بہاؤ کو "آبشیب" کہتے ہیں۔ اگر چٹانوں کی موٹائی زیادہ ہو اور نرم چٹانیں کٹ جائیں اور سخت چٹانیں اپنی جگہ باقی رہیں تو پانی ایک چادر کی شکل میں بلندی سے گرتا ہے۔ اسے آبشار (انگریزی: Waterfalls، عربی: شلال) کہا جاتا ہے۔ کسی دریا کے سفر میں یکے بعد دیگرے کئی آبشار بھی آجاتے ہیں۔ جو سلسلۂ آبشار یا آب شرشر کہلاتے ہیں۔ جس جگہ پر آبشار گرتا ہے وہاں گڑھا بن جاتا ہے اسے "ظرف گڑھا" (Pot Hole) کہا جاتا ہے۔

دنیا کی چار مشہور آبشاریں:

(1) اینجل آبشار: وینیزویلا میں واقع دنیا کی بلند ترین آبشار۔

(2) اگوازو آبشار: برازیل اور ارجنٹائن کی سرحد پر واقع ایک بلند اور وسیع آبشار۔

(3) نیاگرا آبشار: امریکہ اور کینیڈا کے درمیان واقع براعظم شمالی امریکہ کی سب سے بڑی اور دنیا کی مشہور آبشار۔

(4) وکٹوریہ آبشار: زمبابوے اور زمبیا کے درمیان دریائے زمبیزی پر واقع دنیا کی سب سے بڑی آبشار۔ (یہ سب سے بڑی ہے۔ سب سے بلند ترین اینجل آبشار ہے)

اینجل آبشار:

اینجل آبشار دنیا کی سب سے بلند آبشار ہے جو مشہور عالم نیاگرا آبشار سے تقریباً 20 گنا بلند ہے۔ یہ وینیزویلا میں واقع ہے اور 979 میٹر (3212 فٹ) بلند ہے۔ یہ دریائے چورون پر واقع ہے۔ 20 ویں صدی کے اوائل میں ارنسٹو سانچیز لا کروز کی جانب سے دیکھے جانے کے باوجود مغربی دنیا 1935ء تک اس آبشار سے ناواقف رہی جب امریکی ہواباز "جیمز کرافورڈ اینجل" نے پرواز کے دوران اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ 1936ء میں وہ اس علاقے میں واپس آیا اور آبشار کے اوپر اپنا جہاز اتارا۔ آبشار کا نام اسی سے موسوم ہو کر "اینجل آبشار" کہلاتا ہے۔

اس آبشار کی اونچائی 1949ء میں نیشنل جیوگرافک سوسائٹی نے ناپی۔ یہ آبشار وینیزویلا کے سیاحتی مقامات میں سب سے زیادہ مقبولیت رکھتی ہے۔ یہ آبشار ایک جنگل میں واقع ہے، اس لیے یہاں جانا اتنا آسان نہیں اور سیاح دارالحکومت کراکاس سے بذریعہ ہوائی جہاز یہاں پہنچتے ہیں۔

اگوازو آبشار:

برازیل اور ارجنٹائن کی سرحد کے قریب "دریائے اگوازو" پر واقع ایک عظیم آبشار ہے۔ یہ اس مقام پر تشکیل پاتی ہے جہاں دریا اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے۔ 262 میٹر کی بلندی سے گرنے والا پانی اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس سے ہر سیکنڈ میں اولمپک کھیلوں میں استعمال ہونے والے تیراکی کے کھیل میں استعمال ہونے والے 6 حوض بھرے جا سکتے ہیں۔ آبشاروں کا یہ عظیم نظام صرف 2.7 کلومیٹر کے رقبے پر تقریباً 270 آبشاروں پر مشتمل ہے۔ چند آبشاریں 82 میٹر (269 فٹ) تک بلند ہیں جبکہ اکثر آبشاروں کی اونچائی 64 میٹر (210 فٹ) ہے۔ 150 میٹر چوڑی اور 700 میٹر طویل انگریزی حرف "U" کی شکل کی ایک

اس سلسلے کی بیشتر آبشاریں ارجنٹائن میں واقع ہیں لیکن ڈھلوان جسے شیطان کا حلق (Devil's Throat) کہا جاتا ہے، ان میں سب سے زیادہ متاثر کن ہے۔ یہ مشہور زمانہ نیاگرا آبشار سے کہیں زیادہ بڑی ہے اور اس کا مقابلہ صرف افریقہ کی وکٹوریہ آبشار کر سکتی ہے جو زمبابوے اور زمبیا کی سرحد پر واقع ہے۔ ان کا بہترین نظارہ برازیل کی جانب سے کیا جا سکتا ہے۔ اس آبشار کے علاقے کو دونوں ممالک میں قومی پارک کا درجہ دیا گیا ہے جو برازیل اور ارجنٹائن دونوں میں ''اگوازو نیشنل پارک'' کہلاتے ہیں۔ دونوں پارک یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے کا حصہ ہیں۔

نیاگرا آبشار:

براعظم شمالی امریکہ میں کینیڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سرحد پر واقع دنیا کی مشہور ترین آبشار، جسے اللہ رب العالمین کے تخلیق کردہ حسن فطرت کا عظیم شاہکار اور دنیا کے قدرتی عجائبات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ یہ آبشار کینیڈا کے صوبہ اونٹاریو اور امریکہ کی ریاست نیویارک کے درمیان واقع ہے۔ اسے پہلی بار 1678ء میں لوئس ہپی پن نے دریافت کیا۔ 1759ء میں سیورڈی لاسالی نے یہاں ایک قلعہ "فورٹ کاؤنٹی" قائم کیا جس کا نام بعد ازاں "فورٹ نیاگرا" ہوگیا۔ انگریزوں نے سر ولیم جانسن کی زیر قیادت جنگ میں یہ قلعہ فرانسیسیوں سے چھینا۔ 1819ء میں دریائے نیاگرا کو امریکہ اور کینیڈا کے درمیان سرحد تسلیم کیا گیا اور 1848ء میں نیاگرا کو قصبے کا درجہ دے دیا گیا۔ یہی قصبہ 1892ء میں شہر کا روپ اختیار کر گیا۔

امریکہ اور کینیڈا سے بذریعہ ہوائی جہاز، سڑک یا ریل گاڑی نیاگرا پہنچا جا سکتا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان بذریعۂ نیاگرا رابطہ ریل سے ہی ہے جہاں دریائے نیاگرا پر دو پل واقع ہیں جن میں سے "قوس قزح پل" بہت مقبول ہے جو 1941ء میں تعمیر ہوا اور اس کا تعمیراتی حسن آج بھی برقرار ہے۔ قوسی شکل میں تعمیر کردہ یہ پل امریکہ اور کینیڈا کے درمیان مصروف ترین گذرگاہ ہے۔

آبشار کا زیادہ حسین حصہ کینیڈا کی جانب ہے جس کے لیے قوس قزح پل سے بذریعہ گاڑی یا پیدل کینیڈا میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ امریکا اور کینیڈا کے شہریوں کو سرحد عبور کرنے کے لیے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ دیگر ممالک کے باشندوں کے لیے ویزا لازمی ہے۔

دریائے نیاگرا براعظم شمالی امریکہ کی عظیم جھیلوں میں سے دو جھیلوں ایری اور اونٹاریو کو ملاتا ہے۔ اس دریا میں واقع جزیرہ گوٹ دریائے نیاگرا کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے جس سے نیاگرا کی عظیم آبشاریں جنم لیتی ہیں۔ دراصل نیاگرا آبشار کے تین بڑے حصے ہیں جن میں سب سے بڑا اور متاثر کن کینیڈین حصے کی جانب ہے اور گھوڑے کی نعل کی شکل میں ہونے کے باعث ہارس شو (Horse Shoe) کہلاتا ہے۔ اس آبشار کی لمبائی 173 فٹ اور چوڑائی 2500 فٹ ہے۔ امریکا کی جانب بہنے والی آبشار کو امریکی آبشار کہتے ہیں جس کی لمبائی 182 فٹ ہے چوڑائی 1100 فٹ ہے۔ تیسری نسبتاً چھوٹی آبشار برائڈل ویل (Bridal Veil) کہلاتی ہے۔ ان تینوں آبشاروں سے فی سیکنڈ 202،000 مکعب فٹ پانی نیچے گرتا ہے یعنی ایک منٹ میں تقریباً ساٹھ لاکھ مکعب فٹ پانی 180 فٹ کی بلندی سے نیچے آتا ہے اور اسی عظیم نظارے کو دیکھنے کے لیے ہی دنیا بھر سے اندازاً 40 لاکھ سیاح ہر سال نیاگرا کا رخ کرتے ہیں۔ بذریعہ کشتی سیاح نیاگرا آبشار کا بہت قریب سے نظارہ بھی کر سکتے ہیں۔ جبکہ آبشار کے پانی سے بننے والی حسین قوس قزح کا فضائی نظارہ کروانے کے لیے ہیلی کاپٹروں کی پروازیں بھی ہوتی ہیں۔

نیاگرا آبشار کا علاقہ دونوں ممالک میں قومی پارک کا درجہ رکھتا ہے اور امریکہ میں ''نیاگرا ریزرویشن اسٹیٹ پارک'' اور کینیڈا میں ''ملکہ وکٹوریا نیاگرا پارک'' کہلاتا ہے۔ ''نیاگرا ریزرویشن اسٹیٹ پارک'' ریاستہائے متحدہ امریکہ کے قدیم ترین پارکوں میں سے ایک ہے جو 1885ء میں امریکی حکومت نے اپنے زیر انتظام لیا تھا۔ یہ پارک 107 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ جبکہ ''ملکہ وکٹوریا نیاگرا پارک'' 154 ایکڑ رقبے پر محیط ہے۔ اپنے شاندار حسن کی بدولت اہم ترین سیاحتی مقام ہونے کے علاوہ یہ آبشار اونٹاریو اور نیویارک کے لیے پن بجلی کے بڑے وسیلے کا باعث بھی ہے۔

وکٹوریہ آبشار:

وکٹوریہ آبشار زمبابوے میں واقع دنیا کی بڑی آبشاروں میں سے ایک ہے جو دریائے زمبیزی پر واقع ہے۔ جب دریائے زمبیزی، زیمبیا سے زمبابوے میں داخل ہوتا ہے تو اسی مقام پر وہ 420 فٹ کی ایک پہاڑی سے نیچے گرتا ہے۔ اتنی بلندی سے گرنے کے باعث اس کے پانی کی پھوار یں 1600 فٹ تک جا پہنچتی ہیں۔ اس آبشار سے پیدا ہونے والا شور 25 میل دور سے سنا جاسکتا ہے۔ قدرت کی ایسی نشانیاں دیکھ کر انسان کی زبان پر بے ساختہ سبحان اللہ کا ورد جاری ہو جاتا ہے۔

(3) تین مصنوعی نہریں

دنیا میں مصنوعی نہریں تو بہت سی ہیں، جو فراہمی آب کے لیے جا بجا بنائی جاتی ہیں۔ یہ نہریں عموماً میٹھے پانی کی ہوتی ہیں اور دریا سے نکالی جاتی ہیں، تاکہ زمین کو سیراب کیا جا سکے، لیکن تین نہریں دنیا میں ایسی ہیں جو کھاری پانی کی ہیں اور یہ دریا سے لے کر زمینوں تک نہیں بلکہ ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک کھودی گئی ہیں تاکہ بحری آمد و رفت اور نقل و حمل میں آسانی ہو سکے۔ ان نہروں نے جہاں سمندری مسافت میں ہزاروں میل کی کمی کر دی ہے وہیں یہ دنیا کی تجارتی شہ رگ کی حیثیت بھی حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں سے ایک نہر عالم اسلام میں اور دو دنیائے کفر میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اہم ترین اور مصروف ترین وہی نہر ہے جس کے کنارے اسلامی ممالک واقع ہیں، لیکن اس سے استفادہ اور اس پر قبضہ عالمی کفریہ طاقتوں کا ہے۔ ان کے جنگی بحری جہاز اور آبدوزیں اس کی نگرانی کے لیے ہمہ وقت یہاں موجود رہتے ہیں۔ ذیل میں ان تین نہروں کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

(1) نہر سوئز:

نہر سوئز صحرائے سینا کے ساتھ مصر میں واقع ہے اور دنیا کی اہم ترین سمندری گذرگاہ ہے۔ یہ بحیرۂ روم کو بحیرۂ قلزم سے ملاتی ہے۔ اس کے بحیرۂ روم کے کنارے پر پورٹ سعید اور بحیرہ قلزم کے کنارے پر سوئز شہر موجود ہے۔ یہ نہر 163 کلومیٹر (101 میل) طویل اور کم از کم 300 میٹر چوڑی ہے۔ اس نہر کی بدولت بحری جہاز افریقہ کے گرد چکر لگائے بغیر یورپ اور ایشیا کے درمیان آمد و رفت کر سکتے ہیں اور ہزاروں میل کے سمندری سفر کی مشقت سے بچ جاتے ہیں۔ 1869ء میں نہر کی تعمیر سے قبل اس علاقے سے بحری جہاز ایک جانب سامان اتارتے تھے اور بحیرۂ قلزم تک اسے بذریعہ سڑک لے جایا جاتا تھا۔ پہلے اس نہر پر برطانیہ، امریکہ اور فرانس کا قبضہ تھا مگر جمال عبدالناصر نے اس نہر کو قومی ملکیت میں لے لیا جس پر برطانیہ، امریکہ اور اسرائیل نے مصر سے جنگ چھیڑ دی۔ مصری صدر اسے اسلامی ملکیت میں لیتا تو تمام اسلامی دنیا اس کا ساتھ دیتی، لیکن اس نے تو عرب قومیت کے نام پر جنگ چھیڑی تھی، لہٰذا بظاہر اس پر مصر کا کنٹرول ہے، لیکن حقیقت میں اس پر عالمی ساہوکاروں کی تکون یعنی امریکا، برطانیہ اور فرانس کا قبضہ ہے۔

(2) نہر پاناما:

نہر پاناما (Panama Canal) وسطی امریکہ کے ملک پاناما میں واقع ایک بحری نہر ہے جس کے ذریعے بحری جہاز بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کے درمیان سفر کر سکتے ہیں۔ اس نہر کی تیاری انجینئرنگ کے منصوبہ جات کی تاریخ کا سب سے بڑا اور مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اس کی تعمیر سے علاقے میں جہاز رانی پر انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوئے کیونکہ اس سے قبل جہاز براعظم جنوبی امریکہ کے گرد چکر لگا کر راس ہارن (Cape Of Horn) سے بحر الکاہل میں داخل ہوتے تھے۔ اس نہر کی تعمیر سے نیویارک سے سان فرانسسکو کے درمیان بحری فاصلہ 9 ہزار 500 کلومیٹر (6 ہزار میل) ہو گیا جو راس ہارن کے گرد چکر لگانے پر 22 ہزار

500 کلومیٹر(14 ہزار میل) تھا۔

اس جگہ نہر کی تعمیر کا منصوبہ 16 ویں صدی میں سامنے آیا تاہم اس پر تعمیر کا آغاز فرانس کی زیر قیادت 1880ء میں شروع ہوا۔ اس کوشش کی ناکامی کے بعد اس پر امریکہ نے کام مکمل کیا اور 1914ء میں اس نہر کو کھول دیا گیا۔ 77 کلومیٹر (48 میل) طویل اس نہر کی تعمیر میں کئی مسائل آڑے آئے جن میں ملیریا اور یرقان کی وبا اور زمینی تودے گرنا شامل ہیں۔ اس نہر کی تعمیر کے دوران اندازاً 27 ہزار 500 مزدور ہلاک ہوئے۔ جس میں 1881ء سے 1889ء تک جاری رہنے والا ناکام فرانسیسی منصوبہ بھی شامل تھا جس میں 22 ہزار مزدور کام آئے۔ تمام تر احتیاطی اقدامات کے باوجود 1904ء سے 1914ء تک جاری رہنے والے امریکی منصوبے کے دوران بھی 5 ہزار 609 کارکن ہلاک ہوئے۔ اس طرح نہر کی تعمیر کے دوران ہلاک ہونے والے کارکنوں کی تعداد 27 ہزار 500 کے قریب ہوگئی۔

آج نہر پانامہ دنیا کے اہم ترین بحری راستوں میں سے ایک ہے جہاں سے ہر سال 14 ہزار سے زائد بحری جہاز گذرتے ہیں جن پر 203 ملین ٹن سے زیادہ سامان لدا ہوتا ہے۔ 2002ء تک اس نہر سے 8 لاکھ جہاز گزر چکے تھے۔ اس نہر سے گذرنے کا دورانیہ تقریباً 9 گھنٹے ہے۔ 2005ء میں اس نہر سے 278.8 ملین ٹن سامان سے لدے 14 ہزار 11 بحری جہاز گذرے، جس سے روزانہ کا اوسط 40 بحری جہاز بنتا ہے۔ جھیل کیونکہ سطح سمندر سے بلند ہے اس لئے اس جھیل کے دونوں جانب دروازے نصب کئے گئے ہیں جن میں پانی کو کم یا زیادہ کر کے بحری جہاز کو جھیل کی سطح پر لایا جاتا ہے۔ اس طرح جہاز جھیل عبور کر کے دوبارہ نہر اور بعد ازاں سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔

یہ سب کچھ کس طرح انجام پاتا ہے؟ یہ کیفیت اور اس کے علاوہ اور بھی مفید جغرافیائی معلومات آپ ایک مشہور سفر نامہ سے لیے گئے درج ذیل اقتباس میں پڑھ سکتے ہیں:

''پانامہ کینال:

''پانامہ کی ایک اہم خصوصیت جو عالمی شہرت رکھتی ہے، ''پانامہ کینال'' ہے جسے دنیا کے عجائب میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس ملک میں آنے کے بعد یہ عجوبہ دیکھے بغیر جانا بڑی بدذوقی ہوتی، اس لیے میرے میزبانوں نے کینال دکھانے کا انتظام بھی پروگرام میں شامل کیا ہوا تھا۔ جناب اسلم پٹیل صاحب میرے قیام کے دوران اکثر اوقات بڑی محبت سے میرے ساتھ رہے تھے، وہی ہمیں اس کینال کے نظارے کے لیے لے گئے۔

اگر آپ دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو دنیا کے دو بڑے سمندروں، بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کے درمیان شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے دو بڑے براعظم حائل ہیں اور اس طرح دونوں سمندروں کے درمیان زیادہ تر مقامات پر سینکڑوں اور بعض جگہوں پر ہزاروں میل کا فاصلہ ہے، لیکن شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیان خشکی کی ایک پتلی سی بل کھاتی ہوئی پٹی نظر آتی ہے جو شمال سے جنوب کی طرف جاتے ہوئے بتدریج پتلی ہوتی گئی ہے۔ یہ میکسیکو سے شروع ہوتی ہے اور پانامہ پر ختم ہو کر جنوبی امریکہ کے براعظم سے مل جاتی ہے۔ اس خشک پٹی پر جا کر بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کا درمیانی فاصلہ کم ہو گیا ہے اور پانامہ میں ایک مقام پر یہ فاصلہ صرف پچاس میل رہ گیا ہے۔ بیسویں صدی سے پہلے اگر کوئی سمندری جہاز امریکہ کے مشرقی جانب سے مغرب کے کسی ملک جانا چاہتا تو اُسے اس چھوٹے سے خشک فاصلے کی وجہ سے پورے جنوبی امریکہ کا چکر لگا کر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا، تب وہ امریکہ کے مغربی ساحل تک پہنچ پاتا تھا۔ جن ملکوں کو امریکہ کے مغربی ساحل میں تجارتی سفر کرنے پڑتے تھے، ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر اس پچاس میل کی پٹی کو کسی طرح جہاز رانی کے قابل پانی میں تبدیل کر دیا جائے تو بحر اوقیانوس سے براہ راست بحر الکاہل میں اترنے کا آسان راستہ نکل آئے گا۔ اس وقت پانامہ کا علاقہ کولمبیا کے ماتحت تھا۔ 1869ء میں فرانس کے ایک انجینئر ''فرڈیننڈ'' نے بحر احمر اور بحر متوسط کو ملانے کے لیے نہر سوئز تعمیر کی تھی، (جو آج کل مصر کے پاس ہے) اس کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے کولمبیا کی

حکومت نے 1878ء میں فرانس کی ایک کمپنی کو یہ علاقہ جہاں دونوں سمندروں کے درمیان نہر بنائی جاسکتی تھی، ننانوے سال کی لیز پر دے کر اسے نہر تعمیر کرنے کا حق (Concession) دیا۔ اس کمپنی نے ''فرڈیننڈ'' کی مدد سے 1884ء میں اس علاقے میں کام شروع کیا جس میں سترہ ہزار مزدور کھدائی پر مامور کیے گئے۔ یہ مزدور زیادہ تر ویسٹ انڈیز کے تھے، لیکن یہ منصوبہ جس کے لیے انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو کام پر لگا دیا گیا تھا اور جس میں نہر سوئز کی کامیابی کے پیش نظر فرانس کے بڑے بڑے سرمایہ داروں نے کمپنی کے حصص خرید کر اندھا دھند سرمایہ لگا دیا تھا، آخر کار ناکام ہوا۔ اس لیے کہ یہ علاقہ جس میں کام ہو رہا تھا، نہر سوئز کی طرح خشک علاقہ نہیں تھا، یہاں بارشیں بہت ہوتی تھیں اور چند گھنٹوں کی بارش مہینوں کے کام کو تہس نہس کر ڈالتی تھی۔ دوسرے اس علاقے میں زرد بخار (Yellow Fever) کی وبائیں پھیل گئیں تھیں۔ بار بار انسانوں کو دفن کرنا پڑا اور آخر کار اس فرانسیسی کمپنی نے ہتھیار ڈال کر یہاں کام بند کر دیا۔

1903ء میں پانامہ کولمبیا سے آزاد ہو کر ایک مستقل ملک بن گیا، لیکن دونوں سمندروں کو ملانے کی کوشش فرانس کی ناکامی پر ختم نہیں ہوئی، بلکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے 1906ء میں پانامہ کی حکومت سے ایک معاہدے کے تحت یہاں نہر تعمیر کرنے کے لیے متعلقہ زمین لیز پر حاصل کی اور فرانسیسی تجربے کی ناکامی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ فرانسیسی کمپنی کا منصوبہ یہ تھا کہ یہاں ایک خندق کھود کر دونوں سمندروں کے پانی ایک دوسرے میں مدغم کر دیے جائیں، لیکن چونکہ یہ منصوبہ ناکام ہوا، اس لیے امریکہ نے ایک اور پلان بنایا وہ یہ کہ دونوں سمندروں کو مدغم کرنے کے بجائے یہاں میٹھے پانی کی ایک مصنوعی نہر تعمیر کی جائے۔ اس علاقے میں ایک قدرتی دریا (Chagres River) پہلے سے موجود تھا، امریکیوں نے اس دریا پر بندھ باندھ کر ایک مصنوعی نہر تعمیر کی لیکن مسئلہ یہ تھا جس علاقے میں یہ نہر تعمیر کی گئی، وہ دونوں سمندروں کی سطح سے 26 میٹر بلند تھا، لہٰذا جہاز اگر بحیرۂ اوقیانوس میں ہے تو اسے اس نہر میں لانے کے لیے 26 میٹر اونچا کیسے کیا جائے اور جب وہ نہر عبور کر کے بحر الکاہل کے پاس پہنچے تو اسے نیچے کر کے سمندر کی سطح تک کیسے لایا جائے؟ یہی مسئلہ ان جہازوں کے لیے بھی تھا جو بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس میں جانا چاہیں۔ اس مسئلے کا جو حل نکالا گیا وہ ہی پانامہ کینال کا عجوبہ سمجھا جاتا ہے۔ حل یہ نکالا گیا کہ جب جہاز بحر اوقیانوس میں اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں سے نہر تعمیر شروع ہوتی ہے تو وہاں اسے ایک لمبے چوڑے حوض میں داخل کر دیا جاتا جس کے دونوں طرف بڑے بڑے مضبوط گیٹ لگے ہوئے ہیں۔ جب سمندر سے جہاز اس حوض میں آ جاتا ہے تو دونوں گیٹ بند کر دیے جاتے ہیں اور اُس حوض میں اتنا پانی بھرا جاتا ہے کہ وہ نہر کی سطح کے برابر ہو جائے۔ اس نئے پانی کے سہارے جہاز خود بخود بلند ہو کر نہر کی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت نہر کی طرف کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور جہاز نہر عبور کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ بحر الکاہل کے قریب پہنچتا ہے تو وہاں پھر ایک حوض میں داخل ہوتا ہے جو داخلے کے وقت نہر کی اس سطح کے برابر اور سمندر کی سطح سے بلند ہوتا ہے۔ یہاں دونوں طرف کے گیٹ بند کر کے اس حوض سے پانی نکالا جاتا ہے جس کے ذریعے جہاز نیچے جانا شروع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ سمندر کی سطح پر آ جاتا ہے تو سمندر کی طرف کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور جہاز بحر الکاہل میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاز کے کبھی اوپر اور کبھی نیچے ہونے کا یہ عمل تین مختلف مقامات پر تین مرحلوں میں مکمل ہوتا ہے اور ہر مرحلے پر وہ کسی بڑے حوض میں داخل ہو کر پانی بھرنے یا نکلنے کا انتظار کرتا ہے جس کے ذریعے اس کی سطح اونچی یا نیچی ہوتی رہتی ہے۔ ان تینوں مرحلوں سے ہر اس جہاز کو گزرنا پڑتا ہے جو بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل میں جانا چاہتا ہو یا بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس میں۔ اس طرح پچاس میل کا یہ فاصلہ اس مصنوعی نہر کے ذریعے اوسطاً 24 سے 30 گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے، حالانکہ اگر یہ نہر نہ ہوتی تو دوسرے سمندر تک پہنچنے کے لیے اُسے پورے جنوبی امریکہ کا چکر لگا کر تقریباً ایک مہینہ خرچ کرنا پڑتا۔

چونکہ یہ نہر جس کا افتتاح نومبر 1914ء میں ہوا، امریکہ نے خاص معاہدے کے تحت بنائی تھی، اس لیے وہی 1999ء تک اس پر قابض رہا۔ گزرنے والے تمام جہازوں سے نہر کے استعمال کی بھاری فیس وہی وصول کرتا اور پانامہ کو معمولی رائلٹی دیتا تھا۔ پانامہ کی حکومت اور امریکہ کے درمیان اس نہر پر کنٹرول حاصل کرنے کے سلسلے میں عرصے تک تنازعہ چلتا رہا، یہاں تک کہ ایک موقع پر دونوں ملکوں نے سفارتی تعلقات بھی توڑ لیے اور پھر مصالحتی کوششوں کے نتیجے

میں امریکہ کو قبضہ چھوڑنے کے لیے 13 دسمبر 1999ء کی حتمی تاریخ دے دی گئی اور اس کے بعد سے ہی نہر، پانامہ ہی کے کنٹرول میں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک جہاز سے نہر عبور کرنے کا کرایہ دو لاکھ ڈالر وصول کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ طلسماتی گزرگاہ پانامہ کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

سیاحوں کو اس نہر میں جہازوں کو اوپر اٹھنے اور نیچے جانے کا یہ عمل دکھانے کے لیے نہر کے بیچ والے حوض کے اوپر ایک پلیٹ فارم بنا دیا گیا ہے جہاں سے نہر کا منظر بھی دور تک نظر آتا ہے اور وہ حوض بالکل سامنے ہوتے ہیں جن میں جہازوں کو دونوں طرف سے بند لگا کر اوپر اٹھایا جاتا ہے یا نیچے لایا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک جہاز اس حوض میں آیا جس کی سطح نہر کے اگلے حصے سے نیچی تھی۔ حوض میں کھڑے ہونے کے بعد دونوں کے دروازے بند کر دیے گئے اور حوض میں کئی نالوں کے ذریعے پانی بھرنا شروع کیا گیا، تقریباً آدھے گھنٹے میں اور دیکھتے ہی دیکھتے حوض کی سطح بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جہاز اوپر اٹھتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ نہر کے اگلے حصے کے برابر آ گیا۔ اس موقع پر اُس طرف کا دروازہ کھول دیا گیا جہاز پھر روانہ ہو گیا۔ یہاں ایک میوزیم بھی بنایا گیا ہے جس میں اس نہر کی مکمل پوری تاریخ بتائی گئی ہے اور ایک مقام پر سیاحوں کو ایک جہاز کے ماڈل میں سوار کر کے مصنوعی طور پر اُسے نہر سے گزارنے اور جہاز کو اوپر نیچے لانے کا عمل دکھایا جاتا ہے اور انسان ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ خود جہاز کے ذریعے اس عمل میں شریک ہے۔" (سفر در سفر)

(3) نہر کیل:

جرمنی میں واقع اس مصنوعی کھاری نہر کی لمبائی 98 کلومیٹر ہے۔ یہ بحر شمال اور بحیرۂ بالٹک کے درمیان واقع ہے۔ 519 کلومیٹر کی طویل مسافت اس نہر کے ذریعے 98 کلومیٹر رہ گئی ہے۔ 1784ء میں جب پہلی مرتبہ اس کی تعمیر مکمل ہوئی تو اس کی لمبائی 43 کلومیٹر چوڑائی 29 کلومیٹر اور گہرائی 3 میٹر تھی۔ جس کی وجہ سے اسے وہی بحری جہاز عبور کر سکتے تھے جن کا وزن 300 ٹن سے زیادہ نہ ہو۔ لہٰذا جرمنی نے اس کی گہرائی کو بحر شمال اور بحیرۂ بالٹک کے مساوی کرنا چاہا تاکہ ڈنمارک کے گرد گھومنا نہ پڑے پس اس کی نئی تعمیر 1887ء میں شروع ہو گئی۔ 8 سال تعمیر جاری رہی اور اس میں 9000 ہزار افراد شریک ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک معاہدے کے تحت اسے بین الاقوامی تجارت کے لیے کھول دیا گیا لیکن اس پر بدستور جرمنی کا قبضہ تھا۔ 1936ء میں ہٹلر نے اسے بین الاقوامی آمد و رفت کے لیے بند کر دیا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد اسے پھر عام آمد و رفت کے لیے کھول دیا گیا۔

کرۂ خاکی کے بارے میں دلچسپ معلومات

طبعی جغرافیائی معلومات

۱-زمین پر سب سے اونچا مقام:

زمین پر سب سے اونچا مقام ہمالیہ پہاڑ پر "ماؤنٹ ایوریسٹ" نامی چوٹی ہے۔ یہ 8,848 میٹر (تقریباً نو ہزار میٹر کے لگ بھگ) اونچی ہے۔

۲-زمین پر سب سے نیچا مقام:

زمین پر سب سے پست مقام "بحرمیت" ہے جو سطح زمین سے 420 میٹر (1,385 فٹ) نشیب میں ہے۔

۳-زمین پر سب سے زیادہ گرم مقام:

سب سے زیادہ گرمی لیبیا میں "العزیزیہ" کے مقام پر ہوتی ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ گرمی تقریباً 58 سینٹی گریڈ ہوتی ہے۔ جبکہ کم سے کم درجۂ حرارت 14 سینٹی گریڈ نوٹ کیا گیا ہے۔

4-سب سے زیادہ سرد مقام:

سب سے زیادہ سردی انٹارکٹیکا کے مقام "وسٹوک اسٹیشن" پر ہوتی ہے۔ جہاں مائنس 89.6 ڈگری (یعنی تقریباً منفی 90 درجہ) سردی ہوتی ہے۔

5-سب سے زیادہ خشک جگہ:

سب سے زیادہ خشک خطہ جنوبی امریکا کے صحرا صحرائے ایٹاکاما میں "اریکا" نامی جگہ ہے۔ یہ چلی میں ہے۔

6-سب سے بڑا صحرا:

دنیا کا سب سے بڑا صحرا افریقہ کے شمال میں ہے جس کا رقبہ 350 ملین مربع میل ہے۔ اس کا نام ہی "صحرائے اعظم" ہے۔

7-دنیا کا سب سے بڑا جنگل:

دنیا کا سب سے بڑا جنگل "ایمزون جنگل" ہے جو جنوبی امریکا کے ملک برازیل میں واقع ہے۔

8-سب سے طویل پہاڑی سلسلہ:

سب سے طویل پہاڑی سلسلہ جنوبی امریکہ میں "کوہ انڈیز" کا ہے۔

9-سب سے بلند پہاڑی سلسلہ:

سب سے بلند پہاڑی سلسلہ ایشیا میں ''کوہ ہمالیہ'' کا ہے۔

10-سب سے بڑی چٹان:

دنیا کی سب سے بڑی چٹان ''ماؤنٹ اگسٹس'' آسٹریلیا میں ہے۔

11-سب سے بلند برفانی چوٹی:

سب سے بلند برفانی چوٹی ''گرین لینڈ'' کی برفانی چوٹی ''گیون بجورن'' (Gunnbjorn) ہے، اس کی بلندی 3,700 میٹر (12,139 فٹ) ہے

12-سب سے بڑا جزیرہ:

سب سے بڑا جزیرہ ''گرین لینڈ'' ہے اس کا کل رقبہ 2.2 ملین مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے بعد ''نیو گنی'' ہے۔

13-سب سے بڑا جزیرہ نما:

سب سے بڑا جزیرہ نما ''جزیرہ نمائے عرب'' ہے۔ اس کا رقبہ 260,000,0 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے بعد اناطولیہ (ترکی) ہے۔

14-سب سے بڑا مجمع الجزائر:

دنیا کا سب سے بڑا مجمع الجزائر انڈونیشیا ہے۔ اس میں 17,508 جزائر ہیں۔

15-سب سے لمبی سرنگ:

دنیا کی سب سے لمبی سرنگ جنوبی افریقہ میں ہے اور ''دریائے اورنج'' اور ''فیشی'' کو ملاتی ہے اس کی لمبائی 5.3 کلومیٹر ہے۔

سیاسی جغرافیائی معلومات

1- دنیا کا سب سے بڑا ملک:

دنیا کا سب سے بڑا ملک ''روس'' ہے جس کا کل رقبہ 17,075,400 کلومیٹر ہے۔

2- دنیا کا سب سے چھوٹا ملک:

دنیا کا سب سے چھوٹا ملک ''ویٹی کن سٹی'' ہے۔ عیسائیوں کا یہ عالمی مرکز اٹلی کے شہر ''روم'' میں واقع ہے۔

3- سب سے چھوٹا عرب ملک:

''بحرین'' عرب ممالک میں سب سے چھوٹا ملک ہے۔ اس کا کل رقبہ 629 کلومیٹر اور آبادی تقریباً ساڑھے چھ لاکھ ہے۔

4- سب سے زیادہ گنجان آبادی والا ملک:

سب سے زیادہ گنجان آبادی والا ملک ''سنگاپور'' پھر بنگلہ دیش اور اس کے بعد ''مالٹا'' ہے۔

5- سب سے زیادہ گنجان آبادی والا شہر:

سب سے زیادہ گنجان آباد شہر جاپان کا دارالحکومت ''ٹوکیو'' ہے۔

6- براعظم افریقہ کا سب سے بڑا شہر:

براعظم افریقہ کا سب سے بڑا شہر مصر کا دارالحکومت ''قاہرہ'' ہے

7- امریکا کی سب سے بڑی ریاست:

امریکا کی سب سے بڑی ریاست ''الاسکا'' ہے جو ریاستہائے متحدہ امریکا کے شمال مغرب میں واقع ہے۔

8- سب سے بلند شہر:

سطح سمندر سے سب سے زیادہ بلند شہر ''لاپاز'' ہے۔ یہ جنوبی امریکا کے ملک ''بولیویا'' کا دارالحکومت ہے۔

9- سب سے زیادہ پٹرول:

دنیا میں سب سے زیادہ پٹرول ''سعودی عرب'' میں ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی آئل فیلڈ ''السفانیہ'' یہیں ہے۔

10۔سب سے بڑی آئل ریفائنری:

دنیا کی سب سے بڑی آئل ریفائنری بھی سعودی عرب میں ہے۔

کرۂ آبی کی دلچسپ معلومات

1-سب سے زیادہ گہرا سمندر:

پیسفک سمندر(بحر الکاہل) میں گوام (Guam) کے مقام پر" ماریانا ٹرینچ" سمندر کا سب سے زیادہ گہرا مقام ہے۔وہ سطح سمندر سے 11,033 میٹر(تقریبا 11 ہزار میٹر) گہرا ہے۔

2-سب سے لمبی ندی:

سب سے لمبی ندی "سٹالین ندی" ہے جو کہ روس میں ہے۔اس کی لمبائی 41 میل ہے۔

3-سب سے طویل دریا:

سب سے طویل دریا "دریائے نیل" ہے یہ سات ہزار میل لمبا ہے اور سات ملکوں میں بہتا ہے۔کینیا،تنزانیہ،یوگنڈا،ایتھوپیا،کانگو،سوڈان،مصر۔

4-دنیا کا سب سے بڑا دریا:

پانی کے حجم کے اعتبار سے سب سے بڑا دریا "دریائے ایمیزون" ہے جو برازیل،جنوبی امریکا میں واقع ہے۔

5-گرم پانی کا سب سے بڑا چشمہ:

گرم پانی کا سب سے بڑا چشمہ "نیوزی لینڈ" میں ہے۔اس کا نام "ایمانجون" ہے۔

6-سب سے بڑا بحیرہ:

سب سے بڑا بحیرہ یا نمکین پانی کی سب سے بڑی جھیل "بحیرۂ کیا سپین" ہے، جسے "بحیرۂ قزوین" بھی کہتے ہیں۔

7-میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل:

میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل "سپیریئر" ہے جو امریکا اور کینیڈا کی سرحد پر واقع پانچ بڑی جھیلوں میں سے ایک ہے۔اس کا رقبہ 82,350 کلومیٹر ہے۔

8-سب سے بلند جھیل:

دنیا کی سب سے بلند جھیل "ٹیٹی کا کا" ہے جو جنوبی امریکا میں بولیویا اور پیرو کے درمیان سرحد پر واقع ہے۔یہ سطح سمندر سے 507,12 فٹ بلند ہے۔

9-سب سے بلند آبشار:

سب سے بلند آبشار ''اینجل'' کے آبشار ہیں۔ یہ جنوبی امریکا کی ریاست ''وینزویلا'' میں ہیں۔ اس کی بلندی 979 میٹر ہے۔ اس کے بعد جنوبی افریقہ کا آبشار ہے جس کا نام ''توجیلا آبشار'' (FallsTugela) ہے اور یہ ''ناتال'' (KwaZulu-Natal) میں ہے۔

10-سب سے اونچی لہریں اور بحری بگولے:

تیز ترین بحری بگولے کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقا) میں ہوتے ہیں وہاں پانی 40 میٹر تک بلند ہوتا ہے۔

11-سب سے گہرا کنواں:

دنیا کا سب سے گہرا کنواں ''یوکرائن'' میں پایا جاتا ہے۔ اس کی گہرائی 96 میٹر ہے۔

12-دنیا کا ایک عجوبہ ''مثلث برمودا'':

مثلث برمودا، بحر اوقیانوس میں واقع ایک تکونی خطے کو کہا جاتا ہے۔ اس مقام سے وابستہ چند واقعات ایسے ہیں جن کے باعث اسکو ''شیطانی مثلث'' بھی کہا گیا ہے۔ ان میں انسانوں کا غائب ہو جانا، بحری اور فضائی جہازوں کا کھو جانا جیسے غیر معمولی اور مافوق الفطرت (paranormal) واقعات شامل ہیں۔ ان ماوراء الطبیعات واقعات کی توجیہ کے لیے جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں بھی اکثر غیر معمولی اور مسلمہ سائنسی اصولوں سے ہٹ کر ایسی ہیں جن کے لیے کم از کم موجودہ سائنس میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔ ان تفاسیر میں طبیعیات کے قوانین کا معلق و غیر مؤثر ہو جانا اور ان واقعات میں بیرون ارضی حیات (extraterrestrial Life) کا ملوث ہونا جیسے خیالات اور تفکرات بھی پائے جاتے ہیں۔ ان گمشدگی کے واقعات میں سے اکثر یا تقریباً تمام ہی ایسے ہیں جن کے ساتھ ایک مُعَمّہ کی خصوصیت وابستہ ہو چکی ہے اور ان کو انسانی عمل دخل سے بالا پیش آنے والے حوادث کی حیثیت دی جاتی ہے۔ بہت سی دستاویزات ایسی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ''برمودا ٹرائی اینگل'' کو تاریخی اعتبار سے ملاحوں کے لیے ایک یا افسانوی مقام کی سی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں سے اڑن طشتریاں (پراسرار مخلوق کی پراسرار سواری) بھی آتی جاتی دیکھی گئی ہیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ مختلف مصنفین اور ناول نگاروں نے بھی اس مقام کے بیان کو الفاظ کے بامہارت انتخاب اور انداز و بیان کی آرائش و زیبائش سے مزید پیچیدہ بنانے، حقیقت کو افسانے میں اور خلط ملط کر کے اصلیت پر پردہ ڈالنے میں کردار ادا کیا ہے۔

برمودا کے بارے میں بعض مفکرین کا خیال ہے اصل میں یہاں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کچھ برطانوی اور امریکی فوجی اڈے تھے۔ لوگوں کو ان سے دور رکھنے کے لیے برمودا کی مثلث کے افسانے مشہور کیے گئے، جن کو قصص یا فکشن (بطور خاص سائنسی قصص) لکھنے والوں نے اپنے ناولوں میں استعمال کیا، لیکن یہ رائے اتنی مضبوط نہیں ہے، امریکی یا برطانوی اڈے بہت سے دور افتادہ جزیروں مثلاً ڈیگوگارشیا وغیرہ میں واقع ہیں، کچھ ویران جزائر میں ایٹمی اسلحہ ذخیرہ کیا گیا ہے یا خفیہ ترین تنصیبات نصب کی گئی ہیں، کیا وجہ ہے کہ صرف برمودا جزائر کے بارے میں ہی ''پراسرار کہانیاں'' سننے میں آئیں جو دنیا کے کسی اور خطے کے بارے میں مشہور نہیں کی گئیں؟ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

چونکہ امریکا اور برطانیہ دنیا کی وہ ترقی یافتہ طاقتیں ہیں جن کی رگِ جاں، پنجۂ یہود میں ہے اور یہودی اپنے مسیحائے منتظر یعنی ''دجال اکبر'' کے ذریعے پوری دنیا پر حاکمیت قائم کرنے کے لیے سائنس اور سحر و طلسم دونوں سے یکساں طور پر کام لینے میں مگن ہیں۔ اس سے بعض مسلم زعماء کے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اس علاقے میں دجالی گروہ کا سربراہ اعظم پوشیدہ ہے اور دنیا کو اس سے دور رکھنے کے لیے قسما قسم پراسرار واقعات مشہور کیے جاتے ہیں اور جو محققین چاہے وہ مغرب سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں، اس موضوع پر تحقیق کریں، ان کے کام میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں، حتی کہ ان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ اس کی تفصیل ''مثلث برمودا'' کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بعض ممالک اور جگھوں کی دلچسپ وجہ تسمیہ

شام کی وجہ تسمیہ:

شام کو شام اس لیے کہا جاتا ہے کہ "سام بن نوح علیہ السلام" اس خطے میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ ان کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کو شام کہا جاتا ہے۔ سریانی زبان میں سین کا تلفظ شین کے ساتھ کیا جاتا تھا، اس لیے یہ شام بن گیا۔

بحر میت (بحر مردار) کی وجہ تسمیہ:

یہ شدید کھارے پانی کا سمندر ہے جس کی کڑواہٹ کی وجہ سے اس میں مچھلیاں زندہ نہیں رہ سکتیں۔ اس کی لمبائی 79 کلومیٹر اور چوڑائی 5 سے لے کر 16 کلو میٹر تک ہے۔ اس کی گہرائی 349 میٹر ہے۔ اس کو "بحر میت" کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں کوئی زندہ یا ذی روح نہیں رہ سکتا۔ اس کا کھارا پن سمندر کے پانی سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ یہ غیر متحرک ہے۔ عرب اس کو "بحیرۂ لوط" کہا کرتے تھے اور بحر احمر کو "بحر قلزم" اور "بحر متوسط" کو "بحر روم" کے نام سے ذکر کرتے تھے۔

بحر احمر کی وجہ تسمیہ:

بحر احمر کو "بحر احمر" اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے پانی کی سطح پر سرخ رنگ کی نباتات اور کائی وغیرہ تیرتی رہتی ہے۔

دمشق کی وجہ تسمیہ:

دمشق کو دمشق اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ دمشق کا معنی ہے "جلدی کرنا" اور اہل دمشق نے اس شہر کی تعمیر بہت جلدی مکمل کرلی تھی۔ (لِأَنَّهُمْ دَمْشَقُوْا أَيْ أَسْرَعُوْا فِي بِنَائِهَا)

افریقہ کی وجہ تسمیہ:

افریقہ کو افریقہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس پر سب سے پہلے حکومت کرنے والے عرب بادشاہ کا نام "افریقی بن قیس" تھا۔

آسٹریلیا کی وجہ تسمیہ:

لاطینی زبان میں آسٹریلیا کا مطلب ہوتا ہے "جنوب"، چونکہ یہ کرۂ ارض کے انتہائی جنوب میں واقع ہے لہٰذا یہاں آنے والے یورپیوں نے اس کا نام آسٹریلیا یعنی جنوب ہی رکھ دیا۔

چین کی وجہ تسمیہ:

چین کا نام اس کے پہلے بادشاہ "تسین شیھوانگ تی" کے نام کی مناسبت سے چین پڑ گیا۔

دریائے اصفر (دریائے زرد) کی وجہ تسمیہ:

چین میں واقع "دریائے ہوانگ ہو" کو "دریائے زرد" (النہر الاصفر) کہا جاتا ہے کیونکہ بہت بڑی مقدار میں چکنی پیلی مٹی اس میں گرنے کی وجہ سے اس کی رنگت ہی زرد یعنی پیلی ہوگئی ہے۔

بعض ناموں کے دلچسپ معنی

افغانستان کا قدیم نام اور معنی:

افغانستان کا قدیم نام "خراسان" تھا۔ فارسی زبان میں اس کا مطلب ہے: "وہ سرزمین جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے"۔

ماوراء النہر کا مطلب:

عربی زبان میں "ماوراء النہر کے شہروں" سے مراد دریائے آمو کے پار کے بڑے شہر "سمرقند اور تاشقند" ہوتے ہیں۔

غزہ کا معنی:

فلسطین کے مشہور شہر "غزہ" کا معنی "طاقت اور قوت" ہے۔ باشندہ اس خطے کے باسیوں نے باطل کی یلغار کا سامنا کرنے میں بے پناہ قوت برداشت اور غیر معمولی حمیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

کویت کا معنی:

مشہور خلیجی ملک کویت "الکوت" کی تصغیر ہے جس کا معنی "قلعہ" ہے۔

استنبول کا معنی:

ترکی کے سابقہ دارالحکومت استنبول کا اصل لفظ "اسلام بول" تھا، بگڑ کر استنبول بن گیا۔ اس کا معنی "مدینۃ السلام" (سلامتی کا شہر) ہے۔

لبنان کا معنی:

شام کا دارالحکومت "لبنان" ہے۔ شامی زبان میں لبنان کا معنی ہے "سفید"۔

انڈونیشیا کا معنی:

انڈونیشیا کا یونانی زبان میں معنی ہے: "سمندر اور جزائر"۔ اسے "جزائر شرق الہند" بھی کہتے ہیں۔

ارجنٹائن کا معنی:

ہسپانوی زبان میں ارجنٹائن کا مطلب "چاندی" ہے۔

قبرص کا معنی:

لاطینی زبان میں قبرص کا معنی "پیتل" ہے۔

مونٹی نیگرو کا معنی:

اس کا معنی ہے: "کالا پہاڑ"۔

ایتھوپیا کا معنی:

یونانی زبان میں ایتھوپیا کا مطلب "جلا ہوا چہرہ" ہے۔

جاپان کا معنی:

جاپان کا مطلب "روشن سورج کے شہر" ہے۔

کوپن ہیگن کا معنی:

ڈنمارک کے دارالحکومت "کوپن ہیگن" کا مطلب "تاجروں کا ٹھکانہ" ہے۔

کوسٹاریکا کا معنی:

اسپینی زبان میں کوسٹاریکا کا مطلب "وسیع ساحل" ہے۔

لائبیریا کا معنی:

لائبیریا کا مطلب "آزادی" ہے۔ اس ملک کے افریقی باشندوں نے امریکا کی غلامی سے آزادی حاصل کر کے افریقہ میں پناہ حاصل کی تھی تاکہ اپنے لیے ایک آزاد ملک قائم کر سکیں۔ اس لیے اس کا نام "لائبیریا" پڑ گیا۔"

بعض حیرت انگیز نام

روٹی کا گھر:

''بیت اللحم'' عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ''روٹی کا گھر'' ہے۔

جزیرۂ حسن:

فرانسیسی جزیرے ''کورسیکا'' کو حسن کا جزیرہ (جزیرۃ الجمال) کہا جاتا ہے۔

جزیرۂ زمرد:

آئرلینڈ کو اس کی زرخیزی اور شادابی کی بنا پر ''جزیرۂ زمرد'' کہا جاتا ہے۔

جرائم کا شہر:

جنوبی افریقہ کے شہر ''کیپ ٹاؤن'' کو ''جرائم کا دارالحکومت'' (شہر) بھی کہا جاتا ہے۔

حسین شہر:

یونانی میں ''گیلی پولی'' کا معنی ہے ''حسین شہر''۔ یہ ترکی کا سب سے مشہور جزیرہ ہے۔

باغی نہر:

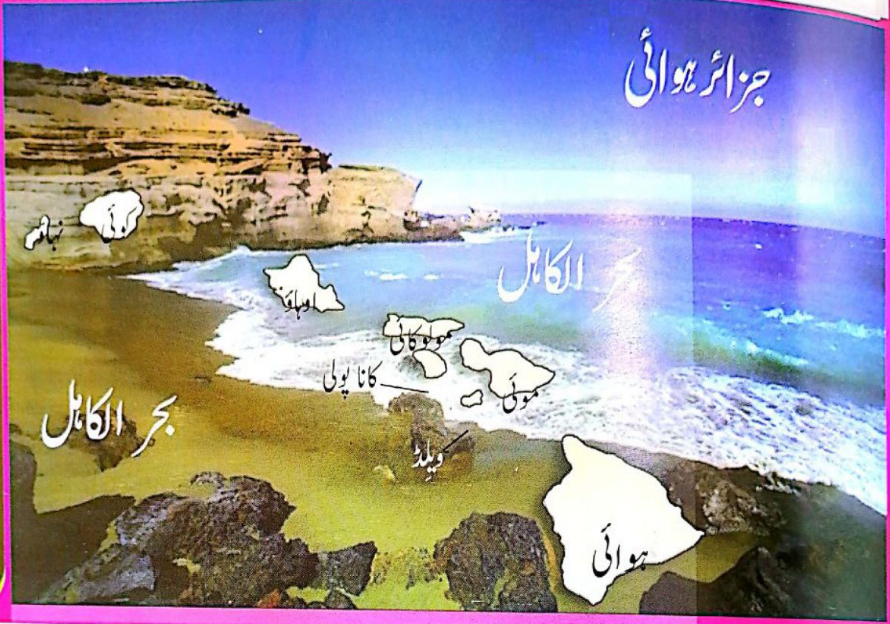
یونان کی ''نہر عاصی'' (باغی) کو اس لیے اس نام سے موسوم کیا گیا ہے کہ یہ دنیا کی تمام نہروں کے برعکس جنوب سے شمال کی طرف بہتی ہے۔

موت کا پھندا:

خلیج میکسیکو کو ''موت کا پھندا'' کہا جاتا ہے۔

پانی کی گرج:

مشہور آبشار ''نیاگرا'' کا لفظ ''ریڈ انڈین'' زبان کا ہے جس کا مطلب ہے ''پانیوں کی گرج''۔



ہوائی بحر الکاہل کا ایک جزیرہ اور ریاستہائے متحدہ امریکا کی 50 ویں ریاست ہے۔جزائر کی یہ کڑی آتش فشانوں کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔اس میں کل 18اہم جزائر ہیں۔ ہوائی کی سب سے اہم صنعت سیاحت ہے۔ ایک تہائی آبادی کا روزگار سیاحت ہے۔پرل ہاربر پر واقع مشہور فوجی بندر گاہ بھی ملازمت کا بڑا ذریعہ ہے۔

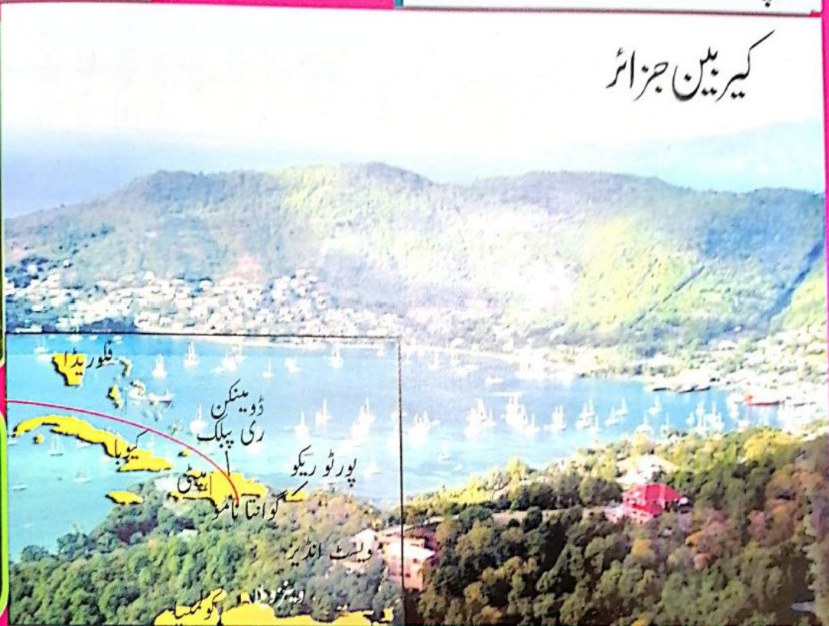


بحر الکاہل کے مغربی حصے میں واقع گوام کا رقبہ 541.3 مربع کلو میٹر ہے۔ 1561ء تک یہ اسپین کے قبضے میں رہا، پھر 1898 میں اسپین امریکا جنگ کے بعد اسپین اس سے دستبردار ہوگیا اور اس وقت سے اب تک یہ امریکا کی تحویل میں ہے۔اس کے قریب بحر الکاہل کا "ماریانہ ٹرینچ" نامی وہ مقام ہے جسے سمندر کی سب سے پست ترین جگہ قرار دیا جاتا ہے۔

طبعی جغرافیہ
(پانی سے گھرے خشک قطعے)

2

بحر اوقیانوس کے اہم جزائر



یہ بحر اوقیانوس کے جزیرے ہیں۔ بحیرہ کیریبین، اس سے ملحقہ جزائر اور ساحلوں کا علاقہ کیریبین کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ شمالی امریکا کے جنوب مشرق، وسطی امریکا کے مشرق اور جنوبی امریکا کے شمال اور مغرب میں واقع ہے۔ اسے "غرب الہند" بھی کہا جاتا ہے۔ برصغیر میں اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ کرکٹ کا کھیل ہے جس میں ویسٹ انڈیز دو مرتبہ عالمی اعزاز حاصل کر چکا ہے۔

گوانتا نامو کیوبا کے پندرہ صوبوں میں سے انتہائے مشرق میں واقع ایک صوبہ ہے۔ اس نے سقوطِ امارت اسلامیہ افغانستان کے بعد گرفتار شدہ مجاہدین کے عقوبت خانے کی حیثیت سے مجاہدین کی استقامت کا گواہ بن کر عالمی شہرت پائی۔ ہیٹی سے 80 کلومیٹر دور ہے۔



برمودا بحر اوقیانوس میں واقع چند جزائر کے مجموعے کا نام ہے جو ریاستہائے متحدہ امریکا کے مشرقی ساحل کے قریب واقع ہے۔ اس ملک کا دارالحکومت ہملٹن ہے۔ یہ 53.2 مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلے ہوئے 123 جزائر پر مشتمل ہے۔ برمودا سے بہاماس نامی جزائر کے بیچ میں سطح سمندر پر پراسرار خطہ ہے جس میں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن کی کوئی عقلی تشریح یا سائنسی توجیہ ابھی تک نہیں کی جا سکی۔ یہ خطہ حیرت انگیز طور پر مثلث ہے۔ اس سے ذہن خود بخود دنیا کے اس ترقی یافتہ انسانی گروہ کے مسیحائے غائب ومقید کی طرف جاتا ہے جو تکون تکون میں مقید آنکھ کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے۔ اور اس مسیحائے منتظر یعنی دجال اکبر کے خروج پر راندۂ درگاہ قوم بنی اسرائیل کی کرۂ ارض پر بلاشرکت غیرے حکمرانی کا امید وار ہے۔

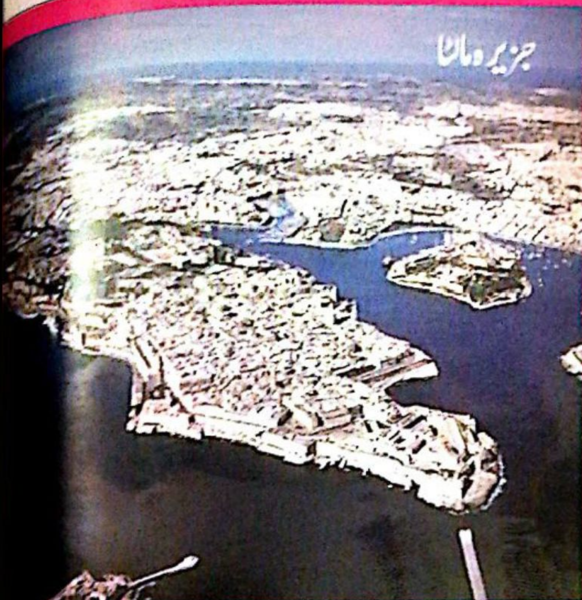
یہ تقریباً دو سو جزائر کا مجموعہ ہے جو خلیج بنگال میں واقع ہیں۔ یہ شمال سے جنوب کی طرف ایک لکیر کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان جزائر کو برصغیر کے جہادِ آزادی میں اس اعتبار سے ناقابلِ فراموش تاریخی حیثیت حاصل ہے کہ انگریز مجاہدینِ آزادی کو یہاں لاکر قید وبند کی صعوبتوں سے گذارتا تھا۔ اسے حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور یعنی سمندر پار عمر قید کہتے تھے۔ ہندوستان کے علما ومجاہدین کی قربانیوں نے ان جزائر کو مجاہدینِ برصغیر کی جگمگاتی تاریخ میں انمٹ حیثیت فراہم کی ہے۔



آتش فشاں کے مجمع الجزائر قمری جزیرے افریقہ کے جنوب مشرقی ساحل پر تنزانیہ کے مشرق اور مڈغاسکر کے جنوب مغرب کی طرف موزمبیق چینل میں واقع ہیں۔ چھٹی صدی میں یہاں مختلف ممالک کے باشندے آئے جن میں سر فہرست انڈونیشین، عرب، پرتگیز، فرنچ اور بھارتی شامل ہیں۔ یہاں اسلام دسویں صدی میں پہنچا۔

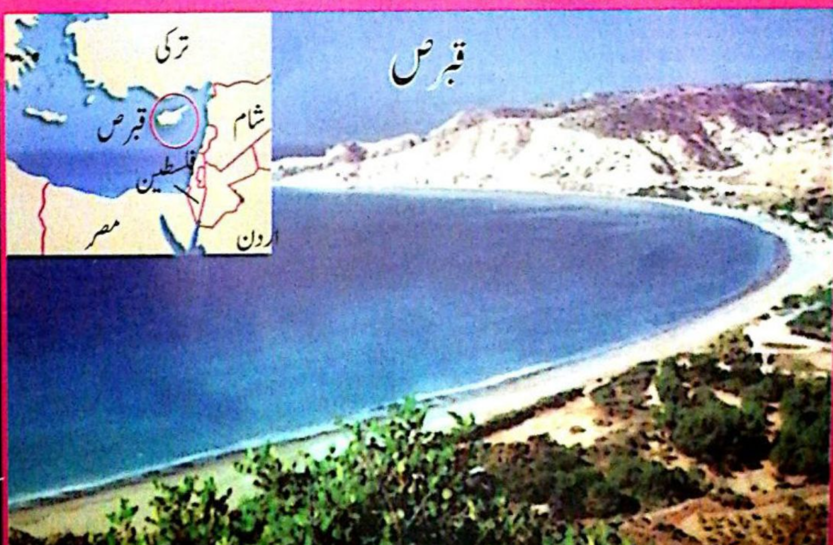


بحر متوسط کے اہم جزائر





مالٹا ایک یورپی ریاست ہے جو بحر متوسط میں واقع ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے بر اعظم افریقہ میں شمار ہوتا ہے اور سیاسی اعتبار سے یورپ میں۔ رقبہ چھوٹا ہونے کے باوجود زیادہ آبادی والے ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ تحریک ریشمی رومال کی قیادت کو انگریز سامراج نے یہاں قید رکھا تھا۔ یہاں ان کے صبر واستقامت کے عظیم مظاہرے بر صغیر کے مسلمانوں اور علمائے حق کے فرزندوں کے لیے ہمیشہ قابلِ فخر رہیں گے۔



قبرص مشرقی بحیرہ روم کا ایک جزیرہ اور ملک ہے جو جزیرہ نما ترکی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کا دارالحکومت نکوسیا ہے۔ 395 میں رومی سلطنت کی تقسیم کے بعد بازنطینی سلطنت کا حصہ بنا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں اسے مسلمانوں نے فتح کیا۔ 1571 میں اسے عثمانی فوج نے فتح کیا۔ 1974 میں جمہوریہ قبرص 2004 میں یورپی یونین کا رکن بنا۔

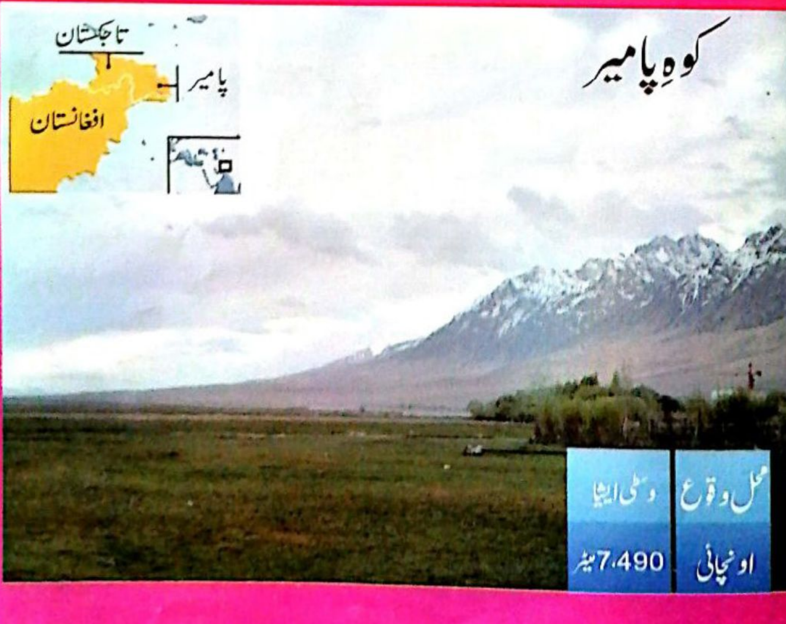
طبعی جغرافیہ
(پہاڑ)

کوہ ہمالیہ

سلسلہ کوہ ہمالیہ ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو برصغیر پاک و ہند کو سطح مرتفع تبت سے جدا کرتا ہے۔ یہ اپنے ذیلی سلسلوں کے ساتھ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑی سلسلہ ہے، جس میں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں بشمول ماؤنٹ ایورسٹ اور کے ٹو موجود ہیں۔ 8,000 میٹر سے بلند دنیا کی تمام چوٹیاں اسی پہاڑی سلسلے کا حصہ ہیں۔ دنیا کے بہت بڑے دریا جیسے سندھ، گنگا، برہم پتر، یانگزی، میکانگ، جیحون، سیحون اور دریائے زرد ہمالیہ کی برف پوش بلندیوں سے نکلتے ہیں۔ ان دریاؤں کی وادیوں میں واقع ممالک دنیا کی تقریباً آدھی آبادی یعنی 3 ارب لوگ بستے ہیں۔



کوہِ پامیر



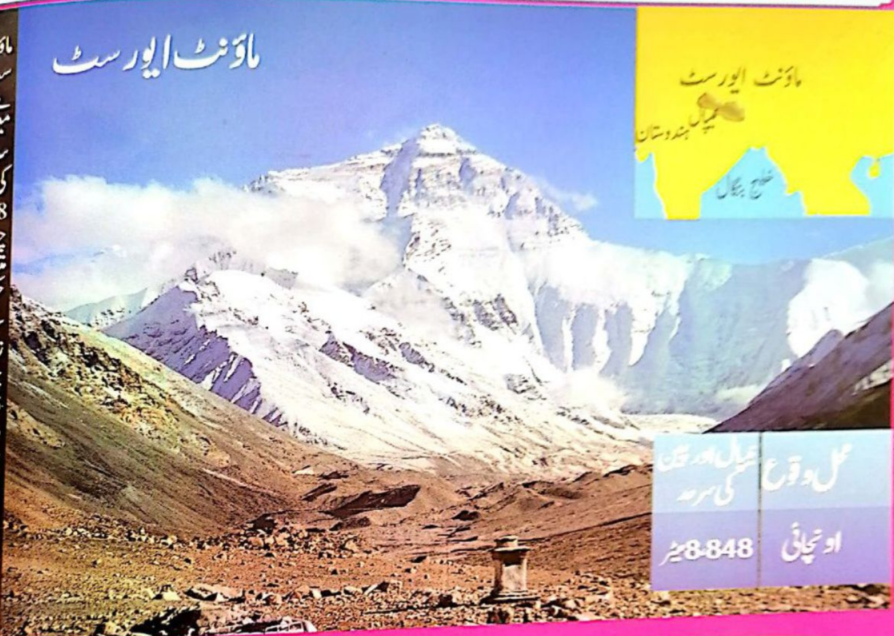
سلسلہ کوہ پامیر وسطی ایشیا میں واقع ہے۔ یہ قراقرم، ہندوکش، تیان شان اور کن لن پہاڑی سلسلوں کے سنگم پر واقع ہیں۔ ان میں سب سے اونچی چوٹی اسماعیل سمانی ہے۔ جو 7490 میٹر (24590 فٹ) بلند ہے۔

جیحون اور سیحون نامی دونوں مشہور دریا اس سلسلہ کوہ سے نکلتے ہیں اور آگے جا کر بحیرہ ارال میں گر جاتے ہیں۔

دنیا کی اونچی چوٹی

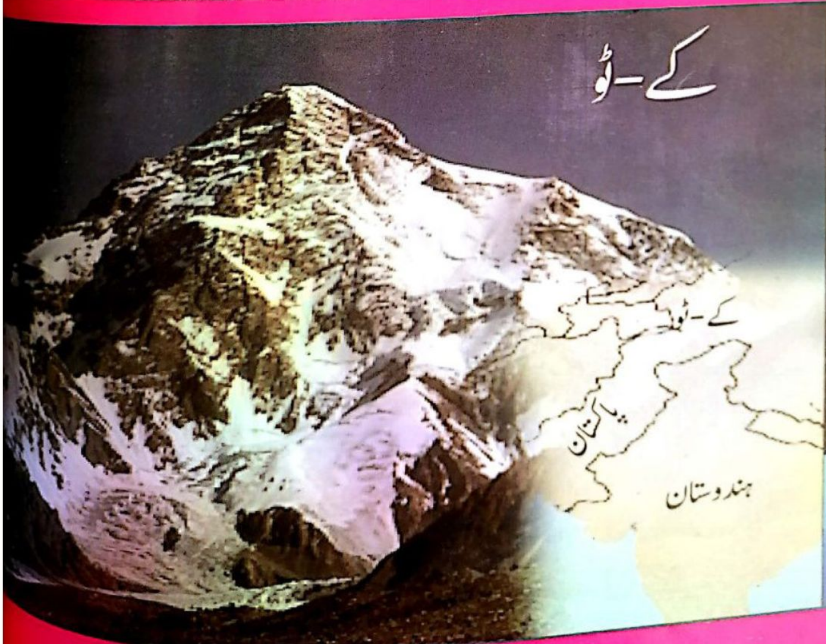
(زمین گڑی پتھر کی کیلیں)

ماؤنٹ ایورسٹ، کے ٹو



محل وقوع	نیپال اور چین کی سرحد
اونچائی	8.848 میٹر

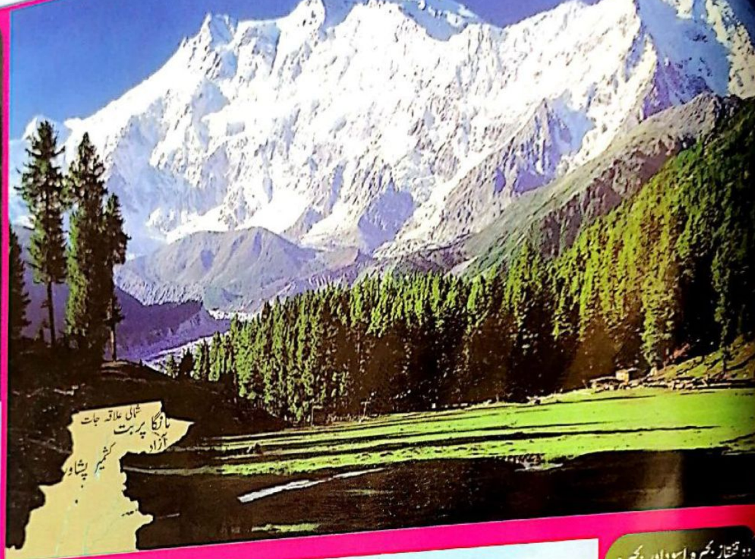
ماؤنٹ ایورسٹ دنیا کی سب سے بڑی چوٹی ہے۔ یہ سلسلہ کوہ ہمالیہ میں نیپال اور چین کی سرحد پر واقع ہے۔ اس کی بلندی 8848 میٹر یا 29028 فٹ ہے۔ اس چوٹی کا نام شروع سے متنازع فیہ رہا۔ نیپالی حکومت نے اسے ساگرماتا کا نام دیا۔ تبت زبان میں اس کا نام چومولونگ ما مشہور تھا۔ 1865ء میں اینڈریو کی درخواست پر رویل جغرافیکل سوسائٹی نے اس کا نام جارج ایورسٹ کے نام پر ماؤنٹ ایورسٹ رکھ دیا۔ نذیر صابر پہلا پاکستانی تھا جس نے اسے سر کیا۔



کے-ٹو دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے۔ یہ سلسلہ کوہ قراقرم پاکستان میں واقع ہے۔ اس کی بلندی 8611 میٹر یا 28251 فٹ ہے۔ اسے ماؤنٹ گڈون آسٹن اور شاگوری بھی کہتے ہیں۔ اس کو ماؤنٹ ایورسٹ کے مقابلے میں زیادہ مشکل اور خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر 2238 افراد چڑھ چکے ہیں جبکہ کے-ٹو پر 246 افراد

محل وقوع	پاکستان
اونچائی	8.611 میٹر

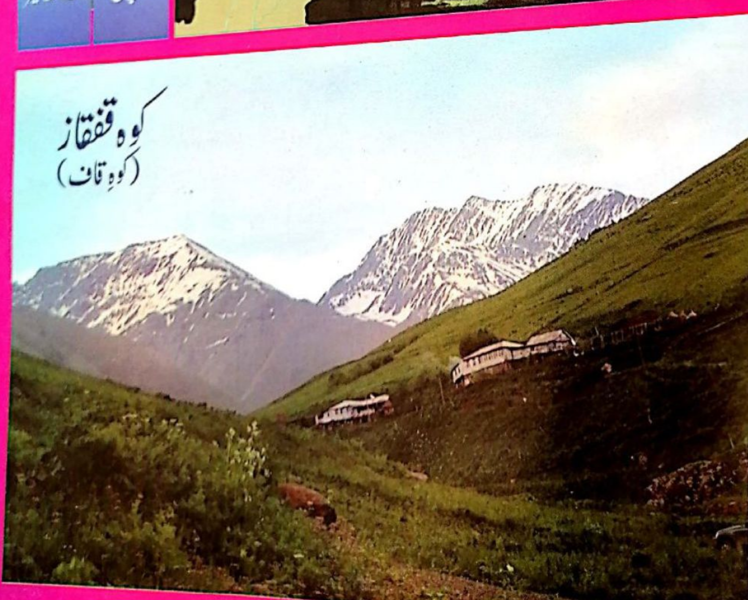
نانگا پربت



نانگا پربت دنیا کی نویں اور پاکستان کی دوسری سب سے اونچی چوٹی ہے۔ اس کی اونچائی 8125 میٹر یا 26658 فٹ ہے۔ اسے دنیا کا قاتل پہاڑ بھی کہا جاتا ہے۔ اس پر چڑھنے میں سب سے زیادہ لوگ مارے گئے ہیں۔ فیری میڈو نانگا پربت کو دیکھنے کی سب سے خوبصورت جگہ ہے۔ اسے جرمن پہاڑ بھی کہتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر برف نہیں ٹھہرتی اس لیے اسے نانگا پربت کہتے ہیں۔

محل وقوع	پاکستان
اونچائی	8،125 میٹر

کوہ قفقاز
(کوہِ قاف)



کوہ قفقاز بحیرہ اسود اور بحیرہ کیسپین کے درمیان خطہ قفقاز کا ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو ایشیا اور یورپ کو جدا کرتا ہے۔ عوام کی زبان میں کوہ قاف جس کی طرف افسانوی داستانیں منسوب ہیں، اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ چار چھوٹی ریاستیں ہیں، جنہیں قفقاز کی ریاستیں کہا جاتا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ البرس ہے جو 18 ہزار 506 فٹ (5 ہزار 642 میٹر) بلند ہے۔

محل وقوع	خطہ قفقاز
اونچائی	5،642 میٹر



محل وقوع	شمال سے جنوب
وسعت	68 ملین مربع میل
گہرائی	11.03 کلومیٹر

یہ دنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے۔ اس کا کل رقبہ 68 ملین مربع میل ہے۔ یہ بحر منجمد شمالی سے لے کر بحر منجمد جنوبی تک پھیلا ہوا ہے۔ بحر اوقیانوس سے دوگنا اور بحر ہند سے ڈھائی گنا بڑا ہے۔ یہ زمین کے سارے خشکی کے حصے سے بڑا کل روئے زمین کے تہائی حصے پر چھایا ہوا ہے۔ خط استوا پر اس کی چوڑائی دس ہزار میل ہے۔ یہ بحر اوقیانوس سے بذریعہ نہر پانامہ ملا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ امریکا کے جنوب میں بھی بحر اوقیانوس سے جاملتا ہے۔



محل وقوع	شمال سے جنوب
وسعت	35 ملین مربع میل
گہرائی	8,605 میٹر

یہ دنیا کا دوسرا بڑا سمندر ہے۔ اس کا کل رقبہ 35 ملین مربع میل ہے۔ رقبے میں تقریباً بحر الکاہل کا نصف ہے۔ اس کی شکل انگریزی زبان کے حرف S سے ملتی جلتی ہے۔ یہ بحر دنیا کی عظیم ترین تجارتی شاہراہ ہے۔ اس کے کنارے دنیا کے مہذب ترین لوگ آباد ہیں۔ اس کے وسط میں ایک بہت بڑی رج ہے۔ رج Ridge سمندر کی تہہ میں موجود پہاڑی سلسلے کو کہتے ہیں۔ یہ اونٹ کے کوہان کی طرح ابھری ہوئی اور شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی ہے۔ اس پر کئی جزائر واقع ہیں جو تجارتی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

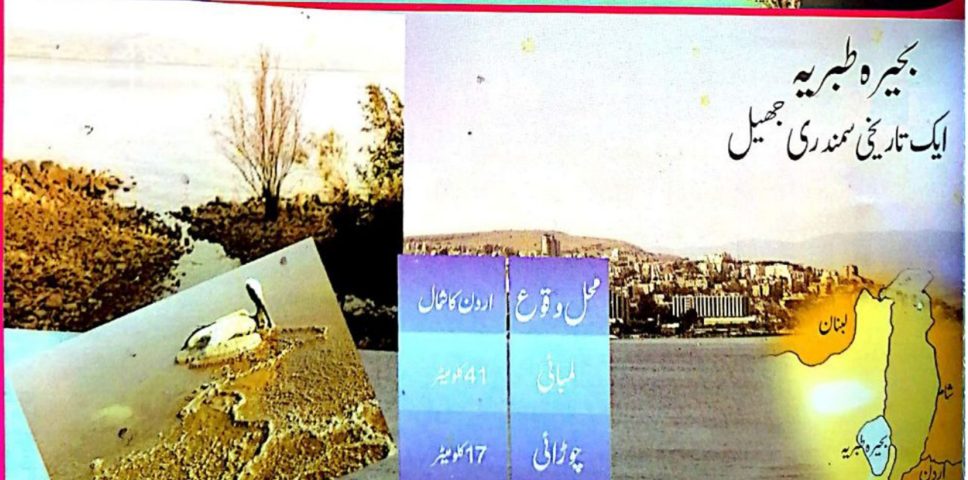
طبعی جغرافیہ
(سمندر، بحیرے)

دنیا کا تیسرا بڑا سمندر ہے۔ کل رقبہ 29 ملین مربع میل ہے۔یہ شمال کی جانب تنگ اور جنوب کی طرف کھلا ہے۔چونکہ یہ یوریشیا، افریقہ اور آسٹریلیا کے عین وسط میں واقع ہے اور اس کے ساحلی علاقوں پر دنیا کی کل آبادی کا دوتہائی حصہ آباد ہے۔اس لیے اس کی تجارتی اہمیت بہت زیادہ ہے۔اس کے شمالی کناروں کے ساتھ کئی بحیرے اور خلیجیں ہیں۔ان کے نام بحیرۂ عرب، بحیرۂ قلزم، خلیج فارس، خلیج بنگال ہیں۔ خلیج عمان اور عدن بھی اسی میں ہیں۔ اس کے سب سے بڑے جزیرے کا نام مڈغاسکر ہے۔



محل وقوع	یوریشیا، افریقہ اور آسٹریلیا کا عین وسط
وسعت	29 ملین مربع میل
گہرائی	7,258 میٹر

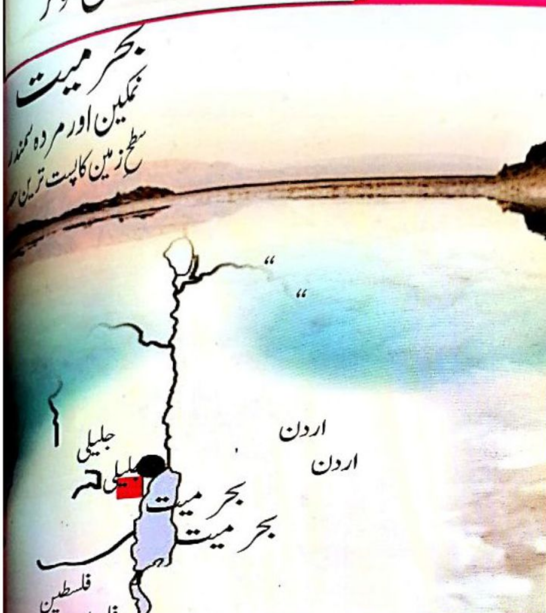
بحیرہ طبریہ
ایک تاریخی سمندری جھیل



محل وقوع	اردن کا شمال
لمبائی	41 کلومیٹر
چوڑائی	17 کلومیٹر

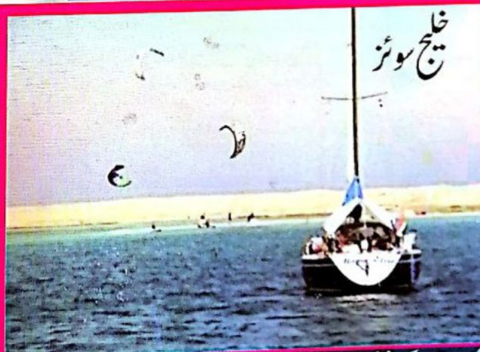
یہ میٹھا بحیرہ دریائے اردن کے شمال میں جلیل اور جولان کے علاقوں کے درمیان واقع ہے۔اس کی لمبائی 41 کلومیٹر، چوڑائی 17 کلومیٹر اور کل رقبہ 166 کلومیٹر ہے۔اس کی سب سے زیادہ گہرائی 46 کلومیٹر ہے۔یہ جبل الشیخ کی سفید برف پوش چوٹی سے نکل کر چند چشموں سے ملنے [illegible] دریائے اردن بناتا ہے۔یہ بحرمیت کے بعد دنیا کا سب سے پست ترین مقام ہے۔حدیث شریف کے مطابق جب دجال کے خاتمے کے بعد یاجوج ماجوج [illegible] تو اس بحیرے سے گذریں گے وہ اسے ایسا چٹ کر جائیں گے کہ ان کا آخری فرد جب یہاں پہنچے گا تو کہے گا یوں لگتا ہے یہاں کبھی پانی تھا۔

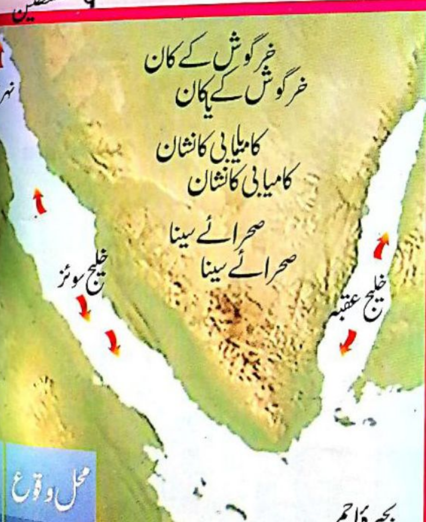
بحر میت اور خلیج سوئز



محل وقوع	اردن کے مغرب میں
لمبائی	67 کلومیٹر
گہرائی	330 میٹر
سطح سمندر سے پستی	420 میٹر 1385 فٹ

دنیا کی سب سے زیادہ نمکین جھیل جس کے مغرب میں مغربی کنارہ فلسطین اور مشرق میں اردن واقع ہے۔ یہ زمین پر سطح سمندر سے سب سے نچلا مقام ہے، جو 420 میٹر (1385 فٹ) نیچے واقع ہے۔ یہ دنیا کی سب سے گہری نمکین پانی کی جھیل بھی ہے، جس کی گہرائی 330 میٹر (1083 فٹ) ہے۔ بحیرۂ مردار 67 کلومیٹر طویل اور زیادہ سے زیادہ 18 کلومیٹر عریض ہے۔ بہت زیادہ نمکینیت کے باعث اس میں کوئی انسان نہیں ڈوبتا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اس کے کنارے پر سدوم اور عمورہ نامی شہروں میں رہتی تھی۔





محل وقوع	مصر
لمبائی	175 میل

بحیرہ احمر کے شمالی حصے میں جزیرہ نما سینا کے دونوں جانب خرگوش کے کانوں کی شکل میں دو خلیجیں واقع ہیں۔ مشرق والی خلیج سوئز اور مغرب والی خلیج عقبہ کہلاتی ہے۔ خلیج سوئز 175 میل طویل ہے جو شمال سے شمال مشرق کی جانب پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا اختتام مصر کے شہر سوئز پر ہوتا ہے جہاں سے آگے خشکی کو کاٹ کر بنائی گئی مصنوعی نہر "نہر سوئز" شروع ہوتی ہے۔ بر اعظم ایشیا اور بر اعظم افریقہ کی سرحد اس خلیج کے درمیان سے گذرتی ہے۔ محققین کے مطابق فرعونی لشکر یہیں غرق ہوا تھا۔

طبعی جغرافیه

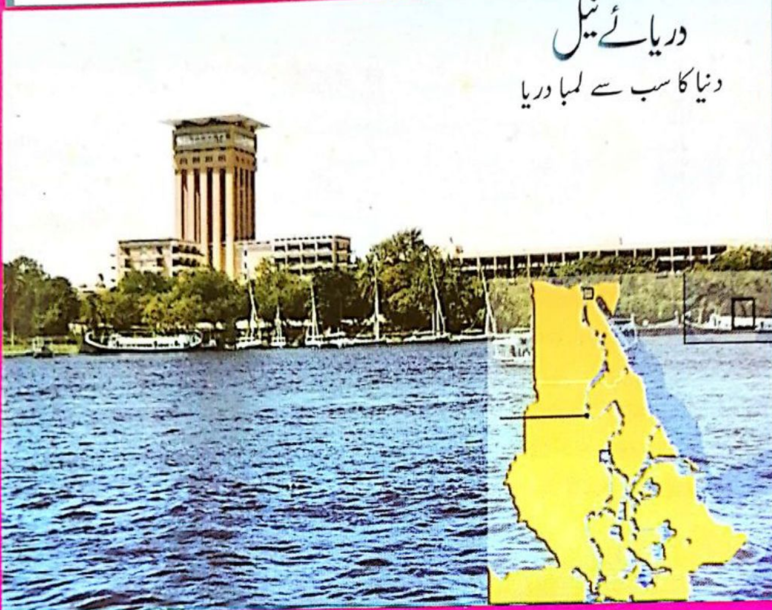
دریا

11

دریائے نیل، امیزون

دریائے نیل

دنیا کا سب سے لمبا دریا



دریائے نیل دنیا کا سب سے طویل دریا ہے جو بر اعظم افریقہ میں واقع ہے۔ یہ دو دریاؤں نیل ابیض اور نیل ازرق سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ نیل ازرق ہی دریائے نیل کے بیشتر پانی اور زرخیز زمینوں کا سبب ہے۔ یہ دونوں دریا سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے قریب آپس میں ملتے ہیں۔ دریا کا شمالی حصہ سوڈان سے مصر تک مکمل طور پر صحرا سے گذرتا ہے۔ یہ وہی دریا ہے جس کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خط لکھا تھا اور خط کے ڈالتے ہی یہ بہنا شروع ہو گیا تھا۔

محل وقوع	مصر
لمبائی	6،650 کلومیٹر

دریائے امیزون

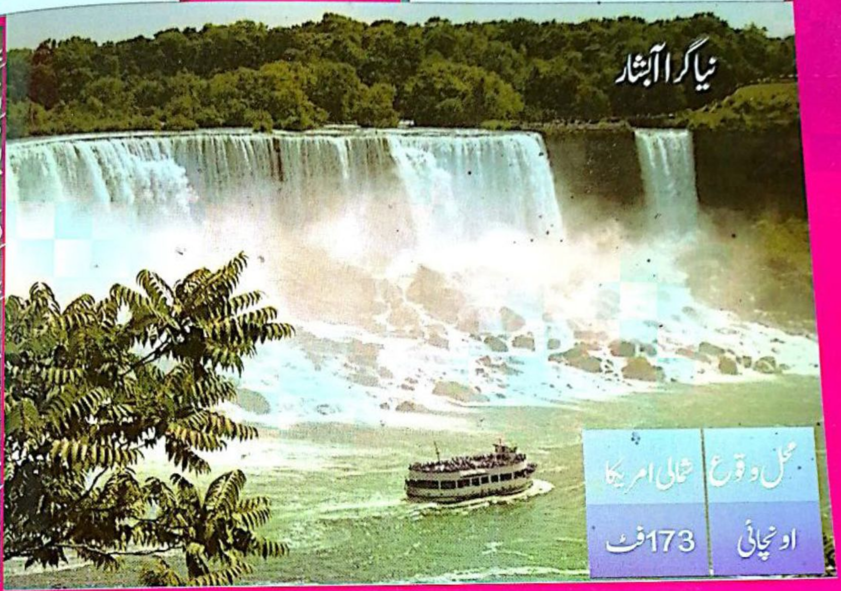
دنیا کا سب سے بڑا دریا



دریائے ایمیزون جنوبی امریکا کا ایک عظیم دریا ہے جو حجم کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ یہ افریقہ کے دریائے نیل کے بعد دنیا کا دوسرا طویل ترین دریا ہے۔ دریائے ایمیزون 6400 کلومیٹر طویل ہے۔ اس کے معاون دریاؤں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ دنیا بھر میں سمندر میں گرنے والے میٹھے پانی کے کل حجم کا پانچواں حصہ دریائے ایمیزون سے گرتا ہے۔

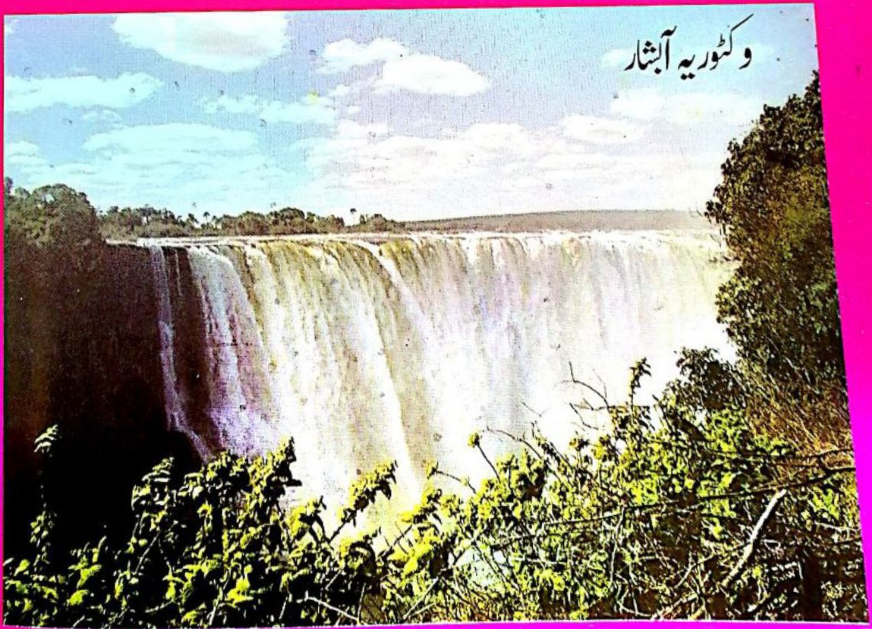
محل وقوع	جنوبی امریکا
لمبائی	6،400 کلومیٹر

نیاگرا آبشار، وکٹوریہ آبشار



محل وقوع	شمالی امریکا
اونچائی	173فٹ

براعظم شمالی امریکا میں کینیڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکا کی سرحد پر واقع دنیا کی مشہور ترین آبشار ہے۔ اسے دنیا کے قدرتی عجائبات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ دنیا بھر سے ہر سال 40لاکھ سیاح نیاگرا کا رخ کرتے ہیں۔ اس کے تین بڑے حصے ہیں: سب سے بڑا کینیڈین حصے کی جانب ہے اور گھوڑے کی نعل کی شکل میں ہونے کے باعث ہارس شو کہلاتا ہے۔ امریکا کی جانب سے بہنے والی آبشار کو امریکی آبشار کہتے ہیں۔ تیسری آبشار برائیڈل ویل کہلاتی ہے۔ ان تینوں سے 202،000 مکعب فٹ پانی نیچے گرتا ہے۔



وکٹوریہ آبشار زمبابوے میں واقع دنیا کی بڑی آبشاروں میں سے ایک ہے جو دریائے زمبیزی پر واقع ہے۔ جب دریائے زمبیزی، زیمبیا سے زمبابوے میں داخل ہوتا ہے تو اسی مقام پر وہ 420فٹ کی ایک پہاڑی سے نیچے گرتا ہے۔ اتنی بلندی سے گرنے کے باعث اس کے پانی کی پھوار 1600فٹ تک جا پہنچتی ہیں۔ اس کا شور 25میل دور سے سنا جاسکتا ہے۔

محل وقوع	زمبابوے
اونچائی	420فٹ

نیل وفرات، سیحان جیحان

دریائے فرات دو ہزار سات سو اسی کلو میٹر طویل ہے۔یہ دو شاخوں: کارا(مغربی فرات)اور مراد (مشرقی فرات) سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔یہ گھاٹیوں اور گھاٹیوں میں سے ہوتا ہوا جنوب مشرقی شام سے عراق میں داخل ہوتا ہے۔جنوبی عراق کے شہر بصرہ کے شمال میں دریائے فرات دریائے دجلہ میں گرتے ہوئے "شط العرب" نامی ڈیلٹا بناتا ہے۔اور دونوں خلیج فارس میں گرتے ہیں۔



جڑواں دریا

محل وقوع	عراق
لمبائی	2،780 کلومیٹر

حیرت انگیز: دجلہ وفرات کا منبع ترکی میں ہے اور سیحان وجیحان تو بہتے ہی ترکی میں ہیں۔



سیحان

ترکی کا سب سے لمبا دریا

محل وقوع	ترکی
لمبائی	560 کلومیٹر

جیحان

محل وقوع	ترکی
لمبائی	509 کلومیٹر

حدیث شریف میں جن چار نہروں کے جنت میں سے ہونے کا تذکرہ آتا ہے، ان میں سے نیل وفرات کے بعد سیحان اور جیحان بھی ہیں۔واضح رہے کہ سیحون جیحون اور سیحان جیحان میں فرق ہے۔

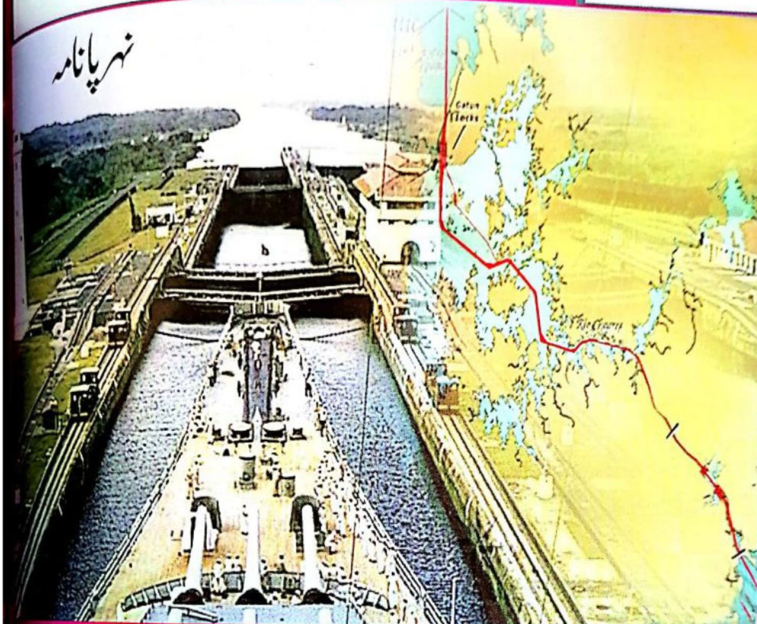
سیحون جیحون ماوراء النھر یعنی وسطی ایشیا میں، جبکہ سیحان جیحان شام کے قریب ترکی میں واقع ہیں۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں اسی کو ترجیح دی ہے۔

"اِعْلَمْ أَنَّ سَيْحَانَ وَجَيْحَانَ غَيْرُ سَيْحُونَ وَجَيْحُونَ. فَأَمَّا سَيْحَانُ وَجَيْحَانُ الْمَذْكُورَانِ فِي هَذَا الْحَدِيثِ اللَّذَانِ هُمَا مِنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ فِي بِلَادِ الْأَرْمَنِ."
(شرح النووی علی صحیح مسلم: 222/9)

طبعی جغرافیہ

(دو مصنوعی نہریں)



نہر پانامہ وسطی امریکا کے ملک پانامہ میں واقع ایک بحری نہر ہے۔ جس کے ذریعے بحری جہاز بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کے درمیان سفر کر سکتے ہیں۔ اس کی تعمیر سے جہاز رانی پر انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ کیونکہ اس سے قبل جہاز جنوبی امریکا کے گرد چکر لگا کر راس ہارن سے بحر الکاہل میں داخل ہوتے تھے۔ اس کی وجہ سے فاصلہ 9 ہزار 500 کلو میٹر ہو گیا جو پہلے 22 ہزار 500 کلو میٹر تھا۔ یہ 77 کلو میٹر طویل ہے۔ اس راستے سے ہر سال 14 ہزار

محل وقوع	وسطی امریکا
لمبائی	77 کلو میٹر
چوڑائی	70 میٹر



نہر سوئز صحرائے سینا کے ساتھ مصر میں واقع ہے اور دنیا کی اہم ترین سمندری گذر گاہ ہے۔ یہ بحیرہ روم کو بحیرہ قلزم سے ملاتی ہے۔ اس کے بحیرہ روم کے کنارے پر پورٹ سعید اور بحیرہ قلزم کے کنارے پر سوئز شہر موجود ہے۔ یہ نہر 163 کلو میٹر طویل اور کم از کم 300 میٹر چوڑی ہے۔ اس نہر کی بدولت بحری جہاز افریقہ کے گرد چکر لگائے بغیر یورپ اور ایشیا کے درمیان آمد و رفت کر سکتے ہیں۔

محل وقوع	مصر
لمبائی	163
چوڑائی	300

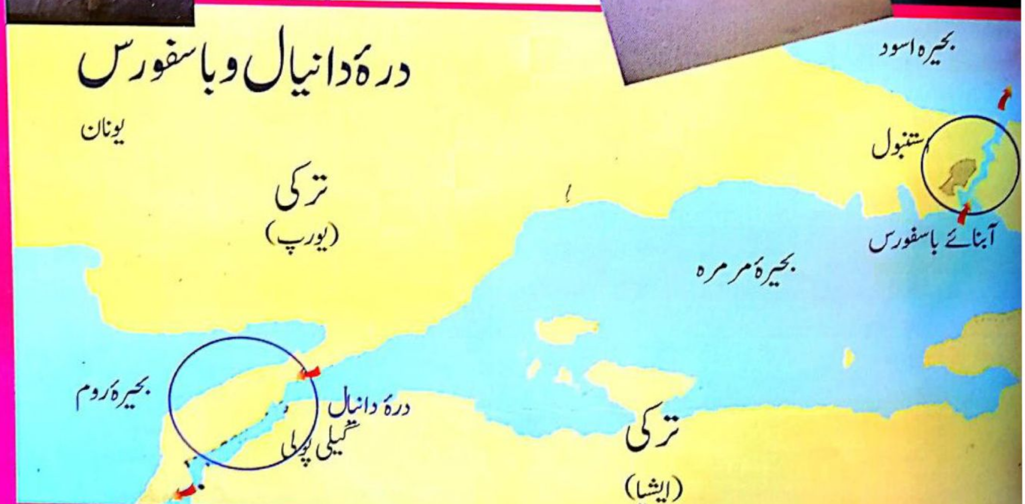
سیحون، جیحون



جیحون وسطِ ایشیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ یہی دریا آمو بھی کہلاتا ہے۔ پامیر کے پہاڑوں سے نکلنے والے اس دریا کی کل لمبائی 2400 کلو میٹر ہے۔ یہ افغانستان، تاجکستان، ازبکستان اور ترکمانستان سے ہوتا ہوا بحیرۂ ارال میں گرتا ہے۔ گویا ان دونوں کا منتہیٰ ایک ہی ہے۔ بحیرہ ارال کو خوارزم بھی کہتے ہیں۔

دریائے سیحون وسطِ ایشیا کا ایک اہم دریا ہے۔ یہ دریا کرغیزستان اور ازبکستان کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مغربی اور شمال مغربی ازبکستان اور جنوبی قازقستان میں 2220 کلو میٹر کا سفر طے کرنے کے بعد بحیرۂ ارال میں گرتا ہے۔

درۂ دانیال و باسفورس



درۂ باسفورس ترکی کے یورپی حصے رومیلیا اور ایشیائی حصے اناطولیہ کو جدا کرکے یورپ اور ایشیا کے درمیان سرحد قائم کرتی ہے۔ بین الاقوامی جہاز رانی کے لیے استعمال ہونے والی دنیا کی سب سے تنگ آبنا بحیرہ اسود کو بحیرہ مرمرہ سے ملاتی ہے۔ یہ ایشیا سے یورپ میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ درہ دانیال آبنائے باسفورس کا جنوبی حصہ ہے جو بحیرہ اسود کو بحیرہ روم سے ملاتا ہے۔ یورپ کو ایشیا سے جدا کرنے والی آبنائے ترکی کے قبضے میں چودھویں صدی میں آئی۔ روس کی ہر حکومت اس پر قبضے کی خواہشمند رہی ہے۔ اسے بحیرہ روم میں داخلہ ہونے کے لیے اس سے گذرنا پڑتا ہے۔

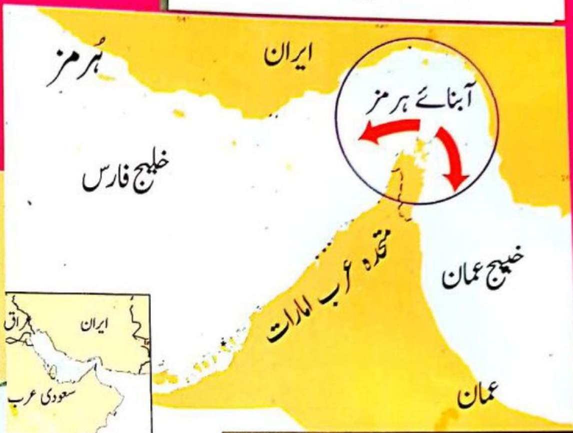
طبعی جغرافیہ

(بڑے سمندر میں تنگ راستے)

16

ہرمز، باب المندب، ملاکا، جبل الطارق

آبنائے ہرمز خلیج عمان ور خلیج فارس کے درمیان واقع ایک اہم آبنائے ہے۔اس کے شمالی ساحلوں پر ایران اور جنوبی ساحلوں پر متحدہ عرب امارات اور عمان واقع ہیں۔اس کی کم از کم چوڑائی 21 میل ہے۔ خلیجی ریاستوں کے تیل کی برآمدات کا واحد بحری راستہ ہے۔دنیا بھر میں تیل کی کل رسد کا 20 فیصد اسی آبنائے سے گذرتا ہے۔



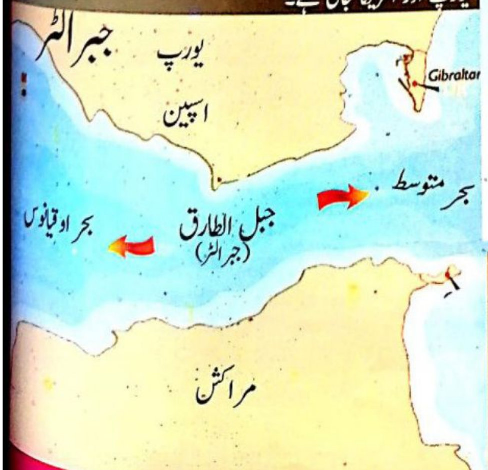
آبنائے ہرمز خلیج عمان ور خلیج فارس کے درمیان واقع ایک اہم آبنائے ہے۔اس کے شمالی ساحلوں پر ایران اور جنوبی ساحلوں پر متحدہ عرب امارات اور عمان واقع ہیں۔اس کی کم از کم چوڑائی 21 میل ہے۔یہ خلیجی ریاستوں کے تیل کی برآمدات کا واحد بحری راستہ ہے۔دنیا بھر میں تیل کی کل رسد کا 20 فیصد اسی آبنائے سے گذرتا ہے۔





آبنائے ملاکا انڈونیشیا کے صوبے سماٹرا کو جزیرہ نما ملائیشیا سے جدا کرتی ہے۔یہ دنیا کی اہم ترین بحری گذرگاہوں میں شمار ہوتی ہے۔بحر ہند اور بحر الکاہل کے درمیان بحری جہازوں کے گذرنے کا مرکزی راستہ فراہم کرتی ہے۔یہاں سے 50ہزار بحری جہاز سالانہ گذرتے ہیں۔اس کے نکڑ پر واقع خطے کو سنگاپور کے نام سے ملائیشیا سے الگ کردیا گیا ہے تاکہ بحری گذرگاہ ہونے کے فوائد اسلامی ملک نہ حاصل کرسکے۔

آبنائے جبل الطارق بحر اوقیانوس کو بحیرہ روم سے ملاتی ہے۔جو اسپین اور مراکش کو جدا کرتی ہے۔اس آبناء پر بنوامیہ کے عظیم جرنیل طارق بن زیاد اسپین فتح کرنے کے لیے اترے تھے۔اسی کے ذریعے عرب ممالک کی بیش قیمت معدنی دولت مضیق ہرمز، مندب اور سوئز سے گذرنے کے بعد یورپ اور امریکا جاتی ہے۔



دوسرا حصہ

جغرافیۂ قرآنی

اجمالی فہرست قرآنی جغرافیہ

پہلا باب

تمہیدی معلومات

قرآن کا ایک خادم

تذکیر بالقرآن کا ذریعہ:

قرآن کریم اپنے لفظ و معنی کے لحاظ سے ایسی جامع مانع اور معجزانہ اسلوب کی حامل کتاب ہے کہ کئی علوم صرف اس کی خدمت کے لیے وضع ہوئے ہیں۔ اگر قرآن شریف نازل نہ ہوتا تو دنیا ان علوم سے آشنا ہی نہ ہوتی۔ یہ اس کتاب کی ایسی خصوصیت ہے بجائے خود اس کی حقانیت پر دلیل ہے اور مسلمان اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ انہی علوم میں سے ایک ''جغرافیۂ قرآنی'' ہے۔ جغرافیہ یونانی زبان کے مرکب لفظ ''جیوگرافی'' کا معرب (عجمی زبان سے عربی بنایا گیا لفظ) ہے۔ جیو کے معنی زمین اور گرافی کے معنی مطالعہ، مشاہدہ و بیان ہے۔ گویا جیوگرافی کا معنی ''علم الارض'' اور جغرافیہ قرآنی کا معنی ''علم ارض القرآن'' ہوا۔ مسلمان اہلِ علم و تحقیق نے ارض القرآن (یعنی مقامات قرآنیہ) کے علاوہ شخصیات قرآنیہ، حیوانیات قرآنیہ، نباتاتِ قرآنیہ وغیرہ پر بھی کام کیا ہے۔ عیسائیوں میں سے بعض تحقیق کاروں نے ''لینڈ آف دی بائبل'' پر تصویری کتابیں (PICTORIAL BOOKS) لکھی ہیں لیکن ان کی تحقیق کا وہی معیار ہے جو ''اسرائیلیات'' (یہود و نصاریٰ کی مذہبی روایتوں اور داستانوں) کا ہے۔ جیسا سلوک انہوں نے بائبل کے ساتھ کیا اس کا ویسا ہی اثر اس کی شرح اور تحقیق میں جھلکتا ہے۔ الغرض اس علم کو اگر خدمت قرآن کے ذریعہ کے طور پر سیکھا سکھایا جائے اور فہم قرآن کے ایک معاون وسیلہ کے طور پر پڑھایا جائے تو اس سے بہت سی آیات، احادیث کا صحیح طور پر سمجھنا، ان سے استفادہ کرنا اور بعض چیزوں کی خاص نوعیت و اہمیت کا اندازہ لگانا ممکن ہو جاتا ہے جن کو قرآن کریم نے ان کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر خاص تناظر میں بیان کیا ہے اور اس کے نتیجے میں تذکر و تذکیر بالقرآن کا وہ مقصد زیادہ بہتر طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے جو نزول قرآن کریم کا اصل مقصد ہے۔

اُلجھن کی سلجھن:

قرآن کریم میں جو قصص مذکور ہوئے ہیں وہ سابقہ اقوام کے ہوں یا افراد کے، ان کے بار بار دہرائے جانے کا صحیح مقصد بھی کسی حد تک ان اقوام کے مسکن و مولد کے صحیح محل وقوع کے جاننے پر موقوف ہے۔ قرآن کریم کے بعد سیرت نبوی، تاریخ اسلام اور بعض روایات حدیث کا صحیح طور پر سمجھنا بھی طبعی جغرافیہ کے جان لینے سے آسان ہو جاتا ہے۔ حدیث و سیرت اور تاریخ اسلام کے علاوہ عربی ادب کی بہت سی باتیں ایسی ہیں اگر ضروری جغرافیائی معلومات نہ ہوں تو طالب علم کا ذہن ایک طرح سے ...ہوت لامکاں میں بند اور اُلجھن کا شکار ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور قیاس سے ان تلمیحات و اشارات کا مطلب نہیں سمجھ سکتا جو شعراء عرب کے کلام میں بار بار آئے ہیں اور ان کے سمجھے بغیر عربی ادب میں مذکور نکات سے صحیح لطف نہیں اُٹھایا جا سکتا۔

قرآنی جغرافیہ:

بطورِ مثال کے جب قرآن اہلِ مکہ پر یہ احسان ربانی جتاتا ہے: "أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ." یا قوم لوط کی بستیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "إِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِمْ مُصْبِحِينَ وَبِاللَّيْلِ." یا عاد و ثمود کی اقوام کی طرف عربوں کے سالانہ دو تجارتی اسفار کا تذکرہ یوں کرتا ہے: "رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ" یا بدر کا نقشہ یوں کھینچتا ہے: "إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ." یا غزوۂ احزاب میں حالت کی تنگی کا بیان کرتا ہے: "إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ." یا جنگ حنین کی ابتدائی مشکلات کی تعبیر ان الفاظ سے کرتا ہے: "وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ." یا جنگ فارس و روم کا تذکرہ کرتا ہے: "غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ." تو ان سب باتوں کی حقیقی معنویت اور ان میں پنہاں مفہوم کو "ارض القرآن" کے ذہن نشین کیے بغیر سمجھنا اور ان کے عمیق ادراک سے ذوق ولطف اُٹھانا مشکل ہوتا ہے۔

سیرتی جغرافیہ:

اسی طرح حدیث شریف میں جب قبلہ کے بارے میں آتا ہے: "مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ." یا آداب الاستنجاء میں اہلِ مدینہ کو حکم ہوتا ہے: "وَلٰكِنْ شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوا." نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو آپ کو اس وقت کی سپر پاور اور استعماری سیاست کی وجہ سے کن مشکلات کا سامنا تھا؟ آپ کے غزوات کا رُخ متعین کرنے میں کون سے حالات کارفرما تھے؟ ابتدائے اسلام میں آپ عکاظ بازار میں جا کر اسلام کی دعوت دیتے تھے، وہ کہاں لگتا تھا؟ آپ طائف کس مقصد سے گئے تھے؟ پہلی ہجرت حبشہ اور دوسری مدینہ کیوں ہوئی؟ مختلف علاقوں سے آنے والے وفود کی اہمیت کیا تھی؟ آپ نے جو خطوط مختلف علاقوں کے حکمرانوں کو لکھے ان کی یہ ترتیب کیوں تھی؟ وغیرہ وغیرہ، یا بوقت ہجرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبلِ ثور کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ مدینہ منورہ پہنچنے پر انصار کی بچیوں نے اشعار میں کہا ہم پر "ثنیات الوداع" سے چودھویں کا چاند طلوع ہوا تو کیا یہ مکہ مکرمہ سے آنے والے کے حسب حال ہے؟ خیبر کس جانب ہے اور تبوک کے سفر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی آزمائش کس نوعیت کی تھی؟ غزوۂ مریسیع میں لشکرِ اسلام کا رُخ کس سمت تھا اور غزوۂ بنی المصطلق سے واپسی کس راستے سے ہوئی تھی؟ ان امور کی حقیقت سمجھنے کے لیے جغرافیہ سے متعلق بعض باتیں سمجھنا ضروری ہیں۔

تاریخی جغرافیہ:

تاریخ کی طرف آجایئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے لشکر کو مغفرت کی بشارت کس بنا پر دی تھی؟ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کیوں یہ کہتے تھے ہمیں اسپین سے شام تک زمینی راستہ نکالنے تک واپس نہ بلایا جائے؟ صلیبی جنگوں کا پس منظر کیا تھا؟ الجزائر، مراکش وغیرہ میں فقہ مالکی، ہندوستان، وسطی ایشیا میں فقہ حنفی اور ساحلی علاقوں انڈونیشیا، ملائیشیا، سری لنکا وغیرہ میں فقہ شافعی کے پیروکار کیوں بستے ہیں؟ تیمور لنگ، سلطان بایزید یلدرم سے کس وجہ سے ٹکرا کر یورپ کو اسلام کا گہوارا بننے سے محروم کر گیا تھا؟ امریکا کو ہسپانویوں نے کیسے دریافت کیا اور اگر ایک جاہ پرست مسلمان حکمران آڑے نہ آتا تو شمالی وجنوبی امریکا کی زبان ہسپانوی کے بجائے عربی اور مذہب عیسائیت کے بجائے اسلام کیونکر ہوتا؟ وغیرہ وغیرہ حقائق اس وقت طالب علم پر آشکارا نہیں ہوتے جب تک وہ "زمینی حقائق" یعنی "علم الارض" سے واقف نہیں ہو جاتا۔

ادبی جغرافیہ:

آخر میں عربی ادب کی طرف آتے ہیں۔ عربی اشعار میں جب اَجا و سلمیٰ نامی پہاڑوں یا تہامہ کی خوشگوار راتوں کا ذکر آتا ہے، بنو طے یا اہل حیرہ کا تذکرہ گزرتا ہے، ہندی تلواروں اور قطری نیزوں کی تعریف آتی ہے، مختلف چشموں یا نخلستانوں سے وابستہ داستانوں کو شعر میں موزوں کہا جاتا ہے یا مختلف وادیوں،

صحراؤں کے درمیان دشوار گزار راستوں پر سفر یا میدانوں میں لڑے جانے والے معرکوں کو بیان کیا جاتا ہے تو ان کے حقیقی مفہوم سے آگاہی سرزمین ارب
ارضی حقیقتوں سے واقفیت کا تقاضا کرتی ہے۔

الغرض قرآن وحدیث، سیرت وتاریخ اور عربی شعروادب سے ذوقِ سلیم صحیح معنوں میں تب ہی استفادہ کرسکتا ہے جب فنِ جغرافیہ آتا ہو اور کم از کم "ارض
القرآن والاسلام" سرزمین عرب کی جغرافیائی حدود ذہن میں ہوں۔ اس کے بغیر سیرت وتاریخ کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی تاریک صحرا میں چہل
قدمی کررہے ہوں۔ حدیث وسیرت اور غزوات کا مطالعہ کرتے کرتے قاری جب کسی جگہ کے تذکرے سے گزرتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے روشن وادی میں
کرتے کرتے اچانک کسی بند غار میں داخل ہو گیا ہو، لہٰذا آیئے علم الجغرافیہ کی موٹی موٹی باتیں سمجھتے ہیں۔

تین براعظموں کے سنگم پر

ہمارا وطن اصلی:

جغرافیۂ قرآنی نام ہے ان علاقوں، ملکوں، شہروں، بستیوں، صحراؤں، پہاڑوں، دریاؤں اور چشموں وغیرہ کا محلِ وقوع جاننے کا جن کا تذکرہ قصص قرآنیہ کے ضمن میں آیا ہے۔ یہ تمام مقامات چونکہ سرزمین عرب اور گردوپیش میں واقع ہیں اس لیے تمہید کے طور پر ارض عرب کے طبعی جغرافیہ سے واقفیت ضروری ہے۔ بحیثیت ایک مسلمان کے یہ سرزمین ہمارا اسلامی گھر، روحانی مرکز اور ہماری اصل تہذیب وتمدن کا گہوارا ہے۔ یہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ''وطنِ اصلی'' ہے۔ آج کے فتنہ زدہ دور کے مسلمان اگر اس حقیقت کو فراموش کردیں تو وہ ان کی مرضی ہے ورنہ کفار اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور یہاں کے باشندوں سے متعلق اُلٹا سیدھا پروپیگنڈہ کر کے عقیدت ومحبت کے اس مرکز سے مسلمانوں کا رشتہ کمزور کرنے اور یہاں اپنا تسلط جمانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ آج کل کے عالمی سیاسی حالات اور اقتصادی وعسکری پالیسیاں بھی جزیرۃ العرب کی سیاست کے اردگرد گھومتی ہیں اور شاید وہ وقت دور نہیں جب ایمان سمٹ کر حجاز میں آجائے گا اور ''ارضِ مبارک'' یعنی سرزمین فلسطین تیسری اور آخری جنگ عظیم (معرکۂ ہرمجدون یا جنگ آرمیگاڈون) کا مرکزی میدان بنے گی۔

بستیوں کی ماں:

سرزمین عرب دنیا کے تین اہم براعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ کے سنگم پر واقع ہے۔ امریکا وآسٹریلیا کی دریافت سے قبل قدیم معلوم دنیا انہی تین براعظموں پر مشتمل تھی۔ شمالی وجنوبی امریکا تقریباً پانچ سو برس پہلے اور آسٹریلیا تقریباً 250 برس پہلے ۱۷۷۰ء میں دریافت ہوا۔ جزیرہ نمائے عرب کے ایک طرف ایشیا ہے دوسری طرف افریقہ اور اوپر کی طرف یورپ۔ اس سرزمین کے وسط میں مکہ مکرمہ ہے جسے ام القریٰ (بستیوں کی ماں) کہا گیا ہے۔ اس کی اسی سیاسی وجغرافیائی اہمیت کی بنا پر اللہ رب العالمین نے نہ صرف رسولِ رحمۃ للعالمین کو یہاں بھیجا اور آخری کتاب جو ذکرٌ للعالمین ہے کو یہاں اُتارا بلکہ قرآن کریم میں جن اقوام کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اس میں یا اس کے گردوپیش میں بسنے والی تھیں، لہٰذا ہمیں جغرافیہ قرآنی کو سمجھنے سے پہلے جغرافیۂ طبعی خصوصاً سرزمین عرب کے طبعی جغرافیہ کو سمجھنا ہوگا۔

جزیرۂ عرب پر جغرافیائی نظر:

جغرافیۂ قرآنی، سیرت نبوی اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی دعوت وجد وجہد کو سمجھنے کے لیے جزیرۂ عرب کی جغرافیائی تقسیم، اس خطے کی اہمیت ومحلِ وقوع اور آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی بعثت سے قبل کے حالات کو سمجھنا ضروری ہے۔

محلِ وقوع:

جزیرہ نمائے عرب تقریباً ۳۴ء۰۵ درجہ طول البلد مشرقی سے ۶۰ درجہ مشرقی طول البلد تک، اور تقریباً ۱۲ء۵۰ درجہ عرض البلد شمالی سے ۳۲ درجہ عرض البلد شمالی

تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے جنوب میں بحیرۂ عرب، مشرق میں خلیج عمان و خلیج عرب، مغرب میں بحیرۂ احمر، شمال مغرب میں علاقۂ اُردن و فلسطین اور شمال میں شام و عراق کے ملک پڑتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے جس قطعۂ زمین کے تین طرف پانی اور ایک طرف خشکی ہو اسے ''جزیرہ نما'' کہتے ہیں۔ اس حساب سے سرزمین عرب ایک جزیرہ نما ہے تین طرف سے سمندر میں گھری ہے، چوتھی جانب شمال میں بھی دریا بہتے ہیں جو اسے قدرتی طور پر بقیہ زمینی خطوں سے جدا کرتے ہیں اس لیے بعض جغرافیہ دانوں نے اسے ''جزیرۃ العرب'' بھی کہا ہے۔ یہ دو دریا دجلہ و فرات کے نام سے مشہور ہیں جو ''القرنہ'' نامی شہر کے پاس آ کر مل جاتے ہیں اور پھر ساٹھ میل تک اکٹھے ہو کر آگے بہتے ہیں اور خلیج عرب میں جا گرتے ہیں۔ ان کے درمیان کی سرسبز و شاداب زمین کو ''الجزیرہ''، ''ما بین الرافدین'' (دو سہارا دینے والوں کے درمیان کی زمین) کہتے ہیں۔ القرنہ سے جنوب کے علاقے کو ''سواد العراق'' اور دونوں دریاؤں کے اس حصے کو جو ''القرنہ'' کے بعد مل کر بہتا ہے، ''شط العرب'' (عرب کا کنارہ) کہا جاتا ہے۔ اس سرزمین کو طبعی طور پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: تہامہ، حجاز، نجد، عروض اور یمن۔ لیکن جدید جغرافیہ دانوں نے اس کی طبعی ساخت کو سامنے رکھتے ہوئے اسے چار حصوں میں تقسیم کرنا مناسب سمجھا ہے: پہاڑی حصہ، ریگستانی حصہ، سطح مرتفع، میدان و ساحل۔ ریگستانی حصے میں چار بڑے صحراء ہیں: شمال میں بادیۃ الشام، وسط میں صحراء نفوذ، جنوب میں الربع الخالی اور آخری دو کو ملانے والا الصحراء دھناء جو سرخ مٹی کا ہے۔

اس مقدس سرزمین کی حدود کو حنفی فقہاء نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس بارے میں ہدایہ اور شامیہ میں درج تفصیل کا خلاصہ یہ ہے سرزمین عرب کی حدود چوڑائی میں عذیب (یہ موجودہ قطر کے پاس قبیلہ بنی تمیم کے ایک پانی کا نام تھا) سے لے کر جدہ تک اور لمبائی میں عراق و شام سے لے کر یمن کے آخری کنارے تک کا علاقہ جزیرۃ العرب کا حصہ ہے۔ فقہاء نے یمن کے ''آخری پتھر'' کا لفظ کہا ہے۔ ''مہرہ'' نامی جگہ یمن کا آخری کنارہ ہے۔

جغرافیائی تقسیم:

جزیرۂ عرب کو علمائے تاریخ و ماہرین جغرافیہ نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(1) پہلا حصہ بحر احمر سے ملا ہوا ہے۔ اسے ''غور'' کہتے ہیں۔

(2) دوسرا حصہ پہلے سے متصل ہے۔ اس میں ''حجاز'' اور ''تہامہ'' نامی علاقے واقع ہیں۔

(3) اس حصے میں ''نجد'' کا ٹکڑا ہے۔

(4) چوتھے حصے کو مؤرخین ''عروض'' کا نام دیتے ہیں۔

(5) خلیج عرب سے ملی ہوئی پٹی ''بحرین'' اور ساحل خلیج کہلاتی تھی۔

بحر ہند اور بحر عرب سے ملنے والی پٹی میں ایک طرف عمان واقع تھا جہاں ''عبد'' اور ''جیفر'' نامی دو بھائیوں کی حکومت تھی۔ دوسری طرف یمن تھا جہاں مشہور عرب قبیلے ''حمیر'' کی حکمرانی تھی۔

جغرافیائی اہمیت:

جزیرۂ عرب طبعی اور جغرافیائی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اندرونی طور پر یہ چاروں جانب سے صحرا اور ریگستان سے گھرا ہوا ہے۔ جس کی بدولت یہ ایسا محفوظ قلعہ بن گیا ہے بیرونی قوموں کے لیے اس پر قبضہ کرنا اور اپنا اثر و نفوذ پھیلانا سخت مشکل ہے۔ بیرونی طور پر یہ پرانی دنیا کے تین اہم براعظموں کے بیچوں بیچ واقع ہے اور خشکی اور سمندر دونوں راستوں سے ان کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس کا شمال مغربی گوشہ براعظم افریقہ میں داخلے کا دروازہ ہے۔ شمال مشرقی کنارا یورپ کی کنجی ہے۔ مشرقی گوشہ ایران، وسط ایشیا و مشرق بعید کے راستے کھولتا ہے اور ہندوستان و چین تک پہنچاتا ہے۔ اس طرح سمندر کے راستے سے بھی یہ تمام

براعظموں سے جڑا ہوا ہے اور ان ممالک کے جہاز جزیرۂ عرب کی بندرگاہوں پر براہِ راست لنگر انداز ہوتے تھے۔ دنیا کے وسط میں واقع ہونے کے علاوہ عرب میں بسنے والے باشندے جس طرح چند اعلیٰ انسانی اوصاف سے آراستہ تھے، ان کا تقاضا یہ تھا کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی میں مبعوث کیا جائے۔ سخاوت، مہمان نوازی، شجاعت، قوت حافظہ، خطابت وشاعری، حلیفوں کے ساتھ کیا گیا عہد نبھانے میں جان قربان کر دینا، غرض کئی ایسی صفات تھیں جو ان پر ختم تھیں۔ بس انہیں صحیح رُخ دینے کی ضرورت تھی۔

سیاسی حالت:

اس وقت دنیا کی سیاسی حالت یہ تھی کہ اس کے دونوں طرف دنیا کی دو بڑی سلطنتیں قائم تھیں جن کے درمیان جزیرۂ عرب حدِ فاصل تھا۔ یہ سلطنتیں اس وقت کی عالمی طاقتیں سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی قوت وشوکت کا یہ عالم تھا کہ یہ روئے زمین پر بسنے والی دیگر اقوام وقبائل کو کسی خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ ہندوستان وچین تمدن وتہذیب، عسکری قوت اور نظامِ مملکت میں ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ یورپ کا اکثر حصہ اس وقت برف کی تہوں تلے چھپا ہوا تھا اور یہاں کے باشندے جہالت اور غلاظت کا بدنما نمونہ تھے۔ شمالی وجنوبی امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور دنیا کے بہت سے جزائر اس وقت کی دنیا کے لیے دریافت ہی نہ ہوئے تھے اور ان میں جنگلی قبائل کا راج تھا۔ (ان قبائل کے بچے کھچے لوگ آج بھی یہاں پائے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک ان ممالک پر قبضہ جمانے والی مہذب اقوام کے لیے باعثِ عار ہے۔)

گویا لے دے کے فارس اور روم دو ہی طاقتیں رہ جاتی تھیں جو ترقی یافتہ اور تہذیب وتمدن کی نمائندہ تھیں اور دنیا پر ان کا سکہ چلتا تھا۔ ان دونوں طاقتوں تک حق کی دعوت پہنچانا اور نہ ماننے کی صورت میں ان کے ردِّعمل کا سامنا کرنا بہت بڑا چیلنج تھا جو بہت راسخ اور گہرے ایمان ویقین کا تقاضا کرتا تھا۔ اللہ ربّ العالمین نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّلین وآخرین کا سردار اور تمام عالم کے لیے داعی وراہنما بنا کر بھیجا تو آپ کو ان تمام خوبیوں سے نوازا جو انبیائے سابقین کو عطا کی گئی تھیں۔

روشن اُمیدیں:

یوں آپ انسانیت کے اعلیٰ ترین اخلاق وعادات اور بنی آدم میں پائے جانے والے تمام اوصاف وکمالات سے آراستہ ہو کر دنیا میں تشریف لائے۔ اس وقت پوری انسانیت گمراہی کے گھپ اندھیروں میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا کہ آپ نوکیلے کانٹوں کے اس جنگل میں خوشنما پھولوں کا گلستان کیسے اُگاتے ہیں؟

دنیا نے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلیل عرصے میں عرب کو توحید کا گہوارہ بنا کر ایسے رفقا اور شاگردوں کی جماعت تیار کی جن کے دل کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ علم اور معرفت میں بھی باکمال تھے اور اخلاق وعادات بھی بے مثال تھے۔ انہوں نے دنیا کی عظیم الشان طاقتوں سے مرعوب ہونے کے بجائے انہیں بانگ دہل پیغامِ حق سنایا اور خون کے دریا عبور کر کے دنیا والوں تک توحید کی امانت پہنچائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمگیر دعوت کی تکمیل آپ کے اصحاب اور تلامذہ کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ بھی آپ کا عظیم الشان معجزہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والے علماء ومجاہدین آج بھی دعوت وجہاد کا یہ تابناک سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن دنیا سے بہت عرصے تک جہاد کے موقوف رہنے کی وجہ سے آج کل دفاعی جہاد ہو رہا ہے۔ اللہ کرے جلد ہی وہ وقت آ جائے جب اقدامی جہاد شروع ہو اور ہم اپنی آنکھوں سے دنیا کے ظلمت کدوں کو اسلام کا مرکز ومسکن بنتے دیکھیں۔

آسمانی مذاہب کی سرزمین:

جزیرہ نمائے عرب محض "ارض الاسلام" ہی نہیں، "ارض الادیان" بھی ہے اس لیے تمام آسمانی دینوں کی یہیں ابتدا ہوئی اور یہیں وہ پروان چڑھے۔ یہ ارض القرآن ہی نہیں، ارض الکتب السماویہ بھی ہے تمام آسمانی کتابیں یہیں نازل ہوئیں۔ سورۃ التین کے شروع میں جو چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے: "وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ." یعنی قسم ہے انجیر کی، زیتون کی، صحرائے سینا کے طور پہاڑ کی اور اس امن والے شہر مکہ کی...... اس میں چار آسمانی کتابوں کے نازل ہونے کے مقامات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ چاروں جگہیں اسی سرزمین عرب میں واقع ہیں۔ فلسطین وہ سرزمین ہے جہاں انجیر اور زیتون بکثرت پیدا ہوتے ہیں، یہاں دو آسمانی کتابیں پہلے زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اور پھر انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئیں۔ ایشیا اور افریقہ کے سنگم پر واقع انسانی دل کی شکل کے ٹکڑے "صحراء سینا" میں "طور" نامی وہ پہاڑ ہے جہاں سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شرف کلام بخشا اور تورات عطا فرمائی۔ آج کل یہ "جبل موسیٰ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ امن والے شہر (آج تک دنیا میں جرائم اور فسادات کی سب سے کم شرح مکہ مکرمہ میں ہے) میں جبلِ نور نامی پہاڑی میں غار حرا سے اس وحی کی ابتدا ہوئی جو انسانیت کی فلاح و نجات کا آخری اور جامع دستور ہے۔ ان چار کتابوں کے علاوہ حضرت ادریس، حضرت ابراہیم اور حضرت شیث علیہم السلام پر جو صحیفے نازل ہوئے، ان کی جائے نزول دنیا کے دو مشہور دریاؤں دجلہ و فرات کی درمیانی زمین تھی جسے مابین النہرین (دوآبہ) کہتے ہیں۔ یہ بھی عرب کی حدود میں آتی ہے۔ بعض مذاہب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر نازل شدہ کتاب (دراشااد یہیا) کے پیروکار ہیں۔ اس جلیل القدر پیغمبر کی حیات مبارکہ بھی اسی سرزمین عرب کے ایک حصے فلسطین میں گزری۔

مشہور قرآنی شخصیات

چھبیس قرآنی شخصیات:

قرآن شریف میں پچیس انبیائے کرام کا تذکرہ ہے۔ چھبیسویں حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔ ان کے نبی ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ مشہور یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی تھے۔ المشهور أن عزيرا نبي من أنبياء بني اسرائيل. (البدایۃ والنہایۃ: ۵۴/۲، قصص القرآن میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے۔ ۶۰۵/۲) سب سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام (۱۳۶ مرتبہ) کا تذکرہ ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام (۶۹ مرتبہ) پھر حضرت نوح علیہ السلام (۴۳ مرتبہ) اور سب سے کم حضرت ادریس، حضرت ذوالکفل اور حضرت یسع علیہم السلام کا (دو دو مرتبہ)......... یہ سب کے سب انبیاء سرزمین عرب اور اس کے گردوپیش میں مبعوث ہوئے۔ ان کے مقاماتِ بعثت کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: عراق، شام، مصر اور مرکزی ارض عرب۔ ان میں سے چار عراق میں، بارہ سرزمین شام میں، تین مصر میں اور چھ ارض عرب کے وسط میں بھیجے گئے۔ ان چھبیس میں سے پانچ انبیاء "اولوالعزم" کہلائے یعنی حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہم السلام اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان پانچوں جلیل القدر ہستیوں کا تذکرہ دو جگہ قرآن شریف میں اکٹھے آتا ہے۔ پہلی جگہ سورۃ الاحزاب کی ساتویں آیت میں: "وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ." دوسری مرتبہ سورہ شوریٰ کی تیرھویں آیت میں: "شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ......" قرآن شریف میں جن نبیائے کرام کا تذکرہ ہے، اگر ان کے اسماء گرامی معلوم یا یاد کرنا ہو تو آسان طریقہ یہ ہے۔ سورۂ انعام کی آیت ۸۳ تا ۸۶ میں اٹھارہ انبیائے کرام کا ایک ہی جگہ تذکرہ ہے۔ بقیہ سات رہ جاتے ہیں جن میں پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام، آخری نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جدِ امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے علاوہ حضرت ہود وصالح وشعیب علیہم السلام اور حضرت ادریس، حضرت ذوالکفل علیہما السلام کا نام شامل ہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کے نبی ہونے میں اختلاف ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ سات ناموں کو عربی کے ان دو شعروں میں جمع کیا گیا ہے:

في تلك حجتنا منهم ثمانية
من بعد عشر، و يبقى سبعة، و هم
إدريس، هود، شعيب، صالح و كذا
ذوالكفل، آدم، بالمختار قد ختموا

دو دلچسپ نکتے:

اس تفصیل سے دو اہم نکات سامنے آتے ہیں:

(۱) مکہ مکرمہ ہی وہ شہر ہے جہاں اللہ کے پہلے نبی اور آخری نبی مبعوث ہوئے۔ درمیان کے بھی عظیم نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام تقریباً چھ مرتبہ یہاں تشریف لائے اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام یہاں مبعوث ہوئے گویا اس کو ابوالبشر کا مہبط (زمین پر اُترنے کی جگہ) سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن اور ابوالانبیاء علیہ السلام کا مسکن بننے اور استقبال کرنے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے کوہِ ہمالیہ کی بلندترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ پر اُترنے کی روایت راجح نہیں اور سری لنکا میں اُترنے کی روایت تو انتہائی ضعیف اور قرائن کے خلاف ہے۔ وہاں ایک پہاڑی پر قدموں کے جو نشانات ملتے ہیں ان کی حضرت آدم علیہ السلام کی طرف نسبت ثابت نہیں۔ سری لنکا روزِ اول سے آج تک کوئی جغرافیائی، سیاسی یا مذہبی اہمیت نہیں رکھتا اس کو اللہ تعالیٰ یہ اعزاز کس طرح بخشیں گے۔ راجح قول کے مطابق حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام مکہ مکرمہ میں صفا پہاڑ پر اور حضرت حوّا، مروہ (یہ لفظ امرأۃ بمعنی عورت سے ماخوذ ہے) پہاڑ پر اُترے۔ مزدلفہ میں ان کا اجتماع اور پہچان عرفات کے میدان میں ہوئی جہاں جبلِ رحمت ہے۔ ہابیل وقابیل کا واقعہ مکہ ہی میں پیش آیا۔ مکہ مکرمہ ہی میں حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر بنایا اور جدّہ (بمعنی دادی) کے ایک قبرستان میں ہماری دادی حضرت حوّا مدفون ہیں۔ (دیکھیے: الدر المنثور فی التفسیر بالماثور میں آیت کریمہ "قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعاً." کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت نیز الدر المختار مع رد المحتار: ۴۶۸/۲۔

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابوالانبیاء ہونے کی ایک علامت یا شہادت یہ ہے کہ آپ ان چاروں علاقوں سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتے ہیں جو انبیائے کرام کے علاقے کہلاتے ہیں۔ عراق میں آپ پیدا ہوئے، فلسطین میں آپ نے رہائش اختیار کی، مصر میں آپ دعوت دین کے لیے تشریف لے گئے اور مکہ مکرمہ میں آپ نے بیت اللہ کی تعمیر کی۔ شام میں آپ کی نسل سے بنی اسرائیل اور مکہ مکرمہ میں بنی اسماعیل پھلے پھولے۔

عالمگیر کتاب محدود کیوں؟

اب یہاں ہم ایک اہم سوال چھیڑتے ہیں جب قرآن عالمگیر کتاب ہے تو اس میں صرف ان انبیائے کرام کا تذکرہ کیوں ہے جو سرزمین عرب اور قریب کے علاقوں میں مبعوث ہوئے؟ اللہ کے نبی تو دنیا کے ہر خطے میں بھیجے گئے، ایسی کوئی آبادی نہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انہی کی زبان بولنے والے نبی نہ بھیجے ہوں۔ قرآن کریم کی تعلیمات سے ساری انسانیت کا استفادہ پیش نظر تھا تو ہر قوم قبیلے کے نبی کا ذکر ہونا چاہیے تھا تا کہ روئے ارض کے تمام خطوں کے باشندے قرآن شریف میں اپنا یا اپنے پیش رووں کا تذکرہ پاتے......اور ہدایت، عبرت ونصیحت حاصل کرتے۔ جو کتاب تمام جہانوں کے لیے تذکیر کا سبب ہے اس میں صرف "اُمَّ الْقُرىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا" کا تذکرہ عجیب سا ہے۔ کچھ انبیاء کے بار بار تذکرے کے بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوتا تمام انبیاء کا تذکرہ ایک ایک مرتبہ ہی آجاتا......؟

اس سوال کا جواب یہ ہے قرآن نے اس حوالے سے فی الواقع عالمگیر کتاب ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اگرچہ بظاہر صرف پچیس انبیائے کرام کا تذکرہ کیا ہے لیکن درحقیقت تمام انبیاء کا تذکرہ اپنے بلیغ اسلوب میں پیش کر دیا ہے۔ اس طور پر کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی کوئی قوم پائی گئی ہے اور اس میں جو نبی مبعوث ہوئے ہیں، ان پچیس انبیاء کے اور ان کی اقوام کے تذکرے میں دنیا کے تمام حصوں میں بسنے والی اقوام اور ان میں بھیجے جانے والے انبیائے کرام کا تذکرہ اس خوبی سے سمو دیا گیا ہے کہ سب پر تبصرہ کی ضرورت نہیں رہی.....لہٰذا نزول قرآن کے وقت سے لے کر قیامت تک دنیا کے کسی بھی حصے میں بسنے والا کوئی انسان اگر اپنے گردوپیش کے حالات کا تذکرہ اور ان کا انجام جاننا چاہتا ہے تو وہ ان منتخب پچیس انبیاء اور ان کی اقوام کے تذکرے کے ضمن میں اپنی قوم کا خدا تعالیٰ کے نزدیک مقام اور اس کا انجام تلاش کر سکتا ہے۔ قرآن سے رابطہ کرنے والے کسی انسان کو اس حوالے سے کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔

ایک اشکال کا جواب

قصص القرآن کی دو قسمیں:

تفصیل اس مختصر جواب کی یہ ہے کہ قصص قرآنیہ دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم انبیائے کرام سے متعلق ہے اور دوسری دیگر شخصیات، گروہوں یا جماعتوں سے متعلق۔ انبیائے کرام سے تعلق رکھنے والے قصص دو طرح کے ہیں۔ تفسیری اصطلاح میں ان کے نام ''قصص الانبیاء'' اور ''انباء الرسل'' ہیں۔ پہلے لفظ سے مراد انبیائے کرام کی سبق آموز سوانح اور آپ بیتیاں ہیں۔ دوسری اصطلاح انبیائے کرام اور ان کی نافرمان اقوام کے درمیان برپا ہونے والی کشمکش کا عنوان ہے...... یعنی انبیائے کرام کی دعوت اور ان کی قوم کی طرف سے نہ ماننے پر اصرار، نافرمانی کے مختلف انداز، انبیائے کرام اور ان کے پیروکاروں سے نامناسب سلوک اور آخر کار ان اقوام کا انجام۔

اب اگلی بات سمجھیے۔ قصص الانبیاء کے طور پر قرآن شریف نے تمام دنیا کے انبیائے کرام میں سے پانچ اولوالعزم انبیاء کا انتخاب کیا ہے۔ ان میں سے آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام، ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام، دنیا کے دو بڑے مذہبوں کے پیغمبر حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام صفات حسنہ کے جامع تھے۔ انباء الرسل کے بیان میں قرآن کریم کا اسلوب یہ رہا ہے کہ انبیائے کرام کی نافرمان اقوام میں جو قدر مشترک تھی یعنی روحانی امراض، ان کے دو حصے ہیں: اصولی اور فروعی یعنی بنیادی اور ثانوی۔ اصولی امراض پانچ ہیں اور ضمنی تقریباً چالیس۔ قرآن کریم نے پانچ ایسے انبیائے کرام کا انتخاب کیا ہے اور ان کا بار بار تذکرہ کیا ہے جن کی اقوام ان پانچ مشہور بنیادی امراض میں مبتلا تھیں جن میں اجتماعی طور پر من حیث القوم مبتلا ہونے اور تنبیہ کے باوجود توبہ نہ کرنے پر اقوام سابقہ ہلاک کی گئیں۔ وہ پانچ مہلک امراض یہ تھے:

پانچ ہلاک کرنے والے گناہ:

۱۔ فساد عقیدہ یعنی کفر و شرک: اس کے خصوصی بیان کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو چنا گیا۔ شرک کئی قسم کا ہوتا ہے: دیوی دیوتاؤں کو پوجنا، ستاروں سیاروں میں سے کسی کو خدا بنالینا، نیک لوگوں کی وفات کے بعد ان کی مورتیاں بنالینا، انوکھے قسم کے درخت اور پتھر وغیرہ میں یا غیر معمولی طاقت و صلاحیت کے حیوانات میں یا جنات و شیاطین میں خدائی طاقت تسلیم کرلینا وغیرہ وغیرہ۔ دنیا بھر کی مشرک اقوام انہی میں سے کسی ایک قسم کے شرک میں مبتلا ہوتی ہیں اور اکثر انبیائے کرام کو انہی غلط عقائد والے انسانوں کی اصلاح کے لیے کام کرنا پڑا۔

۲۔ جسمانی، سیاسی اور عسکری طاقت کا غلط استعمال: یہ مرض قوم عاد میں تھا جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث کیے گئے۔

۳۔ علم و ہنر، سائنس و ٹیکنالوجی اور ذہنی و فکری صلاحیتوں کا غلط استعمال: یہ عادت قوم ثمود میں تھی جس کی اصلاح کے لیے حضرت صالح علیہ السلام بھیجے گئے۔ قوم عاد و ثمود کی ان دو غلطیوں کو ''حُبِّ جاہ'' کا مشترکہ نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

۴۔حبِّ مال، مال کمانے میں حلال وحرام کی تمیز بھلادینا اور جائز وناجائز کا فرق کیے بغیر زیادہ سے زیادہ مال و دولت کا حصول۔ یہ مرض حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم میں بہت زیادہ سرایت کر گیا تھا۔

۵۔اخلاقی وجنسی بے راہ روی: اس میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم بہت بری طرح مبتلا ہو گئی تھی۔

قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والا دیکھے گا ان پانچ اقوام کا اسی ترتیب سے تذکرہ جا بجا ملتا ہے اور مختلف اسالیب اور پیرایوں میں ان کی یہ خرابیاں، غلط ذہنیت اور وہ نفسیاتی کیفیت بیان کی گئی ہے جو ان کی تباہی کا سبب بنی۔ آپ کرۂ ارض میں کہیں بھی چلے جائیں ایسی بستیاں ضرور ملیں گی جو ملبے کے ڈھیر تلے دبی ہوئی ہیں۔ دنیا کے کسی بھی شہر کے ایئر پورٹ پر اُتریں تو اس کے ''سٹی گائیڈ'' میں دیکھیں، اس کے گرد و پیش میں کوئی علاقہ ایسا ضرور ہوگا جسے دنیا والے ''آثارِ قدیمہ'' کہتے ہیں اور اس کی سیر کر کے مزے لیتے ہیں جبکہ وہ ان پانچ وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر عذاب میں مبتلا ہوا ہے اور وہاں سیر وتفریح کے لیے جانا نہایت خطرناک ہے۔ زیادہ سے زیادہ عبرت کے حصول اور توبہ کی تجدید کے لیے جا سکتے ہیں۔ مادیت پرستی کے اس دور میں ان عبرت گاہوں کو بھی سیر گاہیں بنا لیا گیا ہے یا پھر تحقیق کے نام پر عذابی جراثیم رکھنے والی مدفون اشیا کی تلاش ہوتی رہتی ہے جو بجائے خود اس سامراجی دور کا ایک المیہ ہے۔

ثانوی امراض، جزوی تباہی:

امراض کی دوسری قسم ضمنی اور ثانوی ہے۔ ان کا نقصان جزوی اور وقتی ہوتا ہے لہٰذا ان میں مبتلا اقوام مکمل طور پر ہلاک نہیں کی جاتیں البتہ ان کو وقتاً فوقتاً تنبیہ ہوتی رہتی ہے۔ ان کے بیان کے لیے قرآن کریم نے بنی اسرائیل کا انتخاب کیا ہے وہ اہلِ کتاب ہونے کے باوجود ان میں مبتلا تھے اور چونکہ مسلمانوں کے متعلق بھی یہی اندیشہ تھا کہ کہیں یہ بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس لیے بنی اسرائیل اور ان کے امراض کا بکثرت اور بار بار تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ ان سے بچنے کی فکر پیدا ہو سکے اور ان امراض کی تعریف، علامات، اسباب اور علاج جان کر ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ''یٰبَنِی إِسْرَائِیْلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ.'' کی آیت دو جگہ لائی ہے۔ پہلی مرتبہ چھٹے رکوع میں اور دوسری مرتبہ پندرھویں رکوع میں...... ان کے درمیان بنی اسرائیل کے چالیس امراض گنوائے گئے ہیں۔ گویا یہ دو قوس (بریکٹ) ہیں جن کے درمیان بنی اسرائیل پر عائد کردہ فردِ جرم سنائی گئی ہے اور ان روحانی امراض خبیثہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جو کسی فرد یا قوم کو لگ جائیں تو اسے اللہ تعالیٰ کی نظر سے گرا دیتے ہیں اور ایسی قوم نفاق، بدحالی اور ذلت و خواری کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ میں کفر و شرک کی آمیزش بھی ہوتی ہے اور کچھ نفاق کی خاص علامات ہیں۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنے گریبان میں جھانک کر اپنے حالات میں غور کرے اور ان گندی بیماریوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرے اور چونکہ عموماً کسی سچے اللہ والے بزرگ سے تعلق قائم کیے بغیر ان کا علاج بلکہ پہچان بھی مشکل ہوتی ہے، اس لیے ہمارے اسلاف خانقاہوں سے تعلق جوڑے رکھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، کیونکہ خانقاہ دراصل روحانی بیماریوں کی علاج گاہ ہوتی ہے۔

چالیس روحانی بیماریوں کی ممکنہ اجمالی فہرست یہ ہے:

1۔ مشرکانہ عقائد، کفریہ نظریات 2۔ من گھڑت بدعات 3۔ مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم 4۔ اللہ ورسول کی نافرمانی 5۔ حدودِ شرع سے تجاوز 6۔ بغیر ایمان اور عمل کے صرف نسب اور نسبت پر فخر 7۔ بعض احکامات کو ماننا اور بعض کا انکار 8۔ من چاہی خواہشات پر چلنا 9۔ کتمانِ حق (حق کو چھپانا) 10۔ تلبیس بین الحق والباطل (حق اور باطل کو خلط ملط کرنا) 11۔ دنیوی اغراض کے لیے دین میں تبدیلی وتحریف اور مالی مفادات کے حصول کے لیے دین فروشی 12۔ حرص اور بے صبری 13۔ جھوٹ، دھوکا اور خیانت 14۔ بخل کرنا اور دوسروں کو اس پر اُبھارنا 15۔ انبیائے کرام پر بے اعتمادی 16۔ دوسروں کو نصیحت، خود خواہش پرستی 17۔ جہاد سے انکار اور اس پر اعتراض 18۔ عہد شکنی اور وعدہ خلافی 19۔ احکامِ الٰہی میں مین میخ نکالنا 20۔ اپنے گناہ اور قصور دوسروں پر ڈالنا 21۔ حرام کھانا اور اسے حلال

بنانے کی کوشش کرنا 22-اپنوں سے غداری اور غیروں سے تعاون 23- بے سند دعوے اور بے جا خوش فہمیاں 24-اللہ کی نعمتوں کی ناقدری 25- حسد اور ضد کی وجہ سے مذہبی اختلاف اور فرقہ واریت 26- دنیوی دشمنی اور قتل و غارت 27- زندگی کی حرص اور موت سے نفرت 28- حق کو پہچان لینے کے بعد بھی اس کا انکار کرنا 29-احکامِ الٰہی پر بے سروپا اعتراضات 30- شرعی احکام کے بارے میں بے جا لایعنی سوالات 31- بزدلی 32-امیر کی اطاعت نہ کرنا 33-امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غفلت 34- جادو ٹونہ سفلی عملیات 35- کتاب اللہ اور شریعت کو اپنی زندگی میں نافذ نہ کرنا 36-اہلِ حق کو ستانا یا قتل کرنا 37- سنگ دلی کی حد تک دل کی سختی 38- پاک بازوں پر تہمت 39-اللہ تعالیٰ یا فرشتوں اور انبیائے کرام کی توہین اور گستاخی 40- غیر اللہ سے بے تحاشا محبت

الغرض چونکہ دنیا کی تمام اقوام کی طرف بھیجے جانے والے انبیائے کرام اور ان کے ساتھ پیش آنے والے حالات کا خلاصہ پانچ اقوام سابقہ اور بنی اسرائیل کی کارگزاریوں میں پایا جاتا ہے، اس لیے قرآن کریم نے یہاں بھی اپنی معجزانہ جامعیت کا ثبوت دیتے ہوئے اقوامِ عالم کے حالات کو ان مختصر تذکروں میں سمو دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ آخری کتاب سرزمین عرب و گرد و پیش کے انبیائے کرام کے ساتھ مخصوص ہونے کے باوجود تمام دنیا کے انسانوں کے تذکرے پر مشتمل ہے اور ایسی جامع و مانع اور عالمگیر ہے کہ ہدایت کا متلاشی کوئی فرد، کوئی قوم اس کے در سے خالی ہاتھ واپس نہیں جاتے بشرطیکہ نیت درست اور طلب سچی ہو۔

جغرافیۂ قرآنی کے چار ابواب

ان پانچ بنیادی اور چالیس ضمنی امراض کے بعد اچھے اخلاق اور بری عادات سے متعلق کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو الگ سے بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ان کے لیے قصص قرآنیہ کی قسم دوم یعنی ''متفرق قصص'' قرآن کریم کا حصہ بنائے گئے ہیں جن کی سبق آموزی اور عبرت انگیزی اپنی مثال آپ ہے۔یہ قصص تعداد میں پندرہ ہیں۔ان میں سے نصف کو قرآن شریف نے ''اصحاب'' کی اضافت سے پکارا ہے یعنی ان کے نام کے شروع میں ''اصحاب'' کا لفظ آتا ہے۔ذرا ایک نظر ان کی فہرست پر ڈالیے:

١-اصحاب السبت (ہفتہ والے)

٢-اصحاب الکہف (غار والے)

٣-اصحاب القریہ (بستی والے)

٤-اصحاب الرس (کنویں یا کان والے)

٥-اصحاب الایکہ (درختوں کے جھنڈ والے)

٦-اصحاب الجنۃ (باغ والے)

٧-اصحاب الاخدود (خندق والے)

٨-اصحاب الفیل (ہاتھی والے)

٩-ہابیل وقابیل

١٠-حضرت لقمان حکیم

١١-ذوالقرنین

١٢-یاجوج وماجوج

١٣-ہاروت وماروت

١٤-قوم سبا

١٥-قوم تُبّع

ان میں سے "اصحاب الایکہ" کا ذکر چار جگہ، اصحاب الرّس، یاجوج ماجوج اور قوم تبع کا ذکر دو دو مرتبہ، باقی سب کا ایک ایک مرتبہ ہے۔ ان متفرق قصص کے علاوہ بعض ایسے مقامات کا ذکر قرآن شریف میں آتا ہے جن کے محل وقوع کی تعیین کے بغیر جغرافیہ قرآنی کی بحث مکمل نہ ہوگی۔ مثلاً: القریتین، أدنی الأرض، (زمین کا پست ترین حصہ جس سے زیادہ سطح سمندر سے پست اور کوئی مقام نہیں) مجمع البحرین (دو سمندروں کا سنگم جہاں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات ہوئی تھی) کوہِ طور جہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ لینے گئے تو پیغمبری سے سرفراز کیے گئے۔ وادی تیہ جہاں بنی اسرائیل جہاد سے انکار پر چالیس سال تک بھٹکتے رہے۔ دریائے اُردن جس کے کنارے ہزاروں سال پہلے طالوت و جالوت کے لشکروں کا مقابلہ ہوا تھا اور قیامت کے قریب حضرت مہدی اور دجال کے لشکر کا مقابلہ ہوگا۔ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ یعنی قریش کے دو سالانہ تجارتی سفروں کے رُخ اور ان کی خصوصیت۔ وہ مقام جہاں کے جنات نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قرآن سُن کر ایمان لایا تھا اور وہ جگہ جہاں اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا تھا، وغیرہ وغیرہ ان متفرق جگہوں کی تعیین سے قرآن کریم کے فہم میں کسی قدر آسانی ہو جاتی ہے نیز قرآن فہمی کا عمل ایسا دلچسپ اور کیف آفریں ہو جاتا ہے کہ تذکیر بالقرآن جیسے عظیم مقصد کے حصول کی کافی حد تک اُمید باندھی جا سکتی ہے۔

بطورِ خلاصہ کے اگر جغرافیۂ قرآنی کی تمام ابحاث کو سمیٹا جائے تو درج ذیل چار بڑے بڑے عنوانات میں اسے تقسیم کیا جا سکتا ہے:

١- انبیاء سابقین کا تذکرہ

٢- سیرت نبوی، غزوات، تاریخ اسلام کے چند اہم واقعات

٣- مختلف شخصیات کے سبق آموز واقعات

٤- وہ متفرق مقامات جن کا تذکرہ کسی حیثیت سے قرآن شریف میں آیا ہے۔

دو دریاؤں کے درمیان

ندی کا کنارہ:

دنیا کی اکثر بڑی تہذیبوں نے کسی دریا یا سمندر کے کنارے جنم لیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے دریا کے قریب ہونے کی وجہ سے روزی روزگار کے مواقع اور انسانی زندگی کی ضروریات زیادہ میسر ہوتی ہیں جبکہ سمندر کے کنارے آباد ساحلی شہر بھی صنعت وتجارت، نقل وحمل اور ماہی گیری کے سبب انسانی آبادی کے اجتماع اور تہذیب وتمدن میں ترقی کا سبب بنتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کے شمالی سمت دو بڑے دریا بہتے ہیں جو اپنی مسلمہ تاریخی اور جغرافیائی حیثیت کے سبب تاریخِ انسانی میں جداگانہ اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے اس سے مراد سرزمین عراق میں بہنے والے دو مشہور دریا دجلہ اور فرات ہیں۔ ان کا منبع عراق کی سرحد سے ورے ترکی میں واقع دو پہاڑ ہیں۔ یہ دونوں بہتے بہتے خلیج عرب سے تقریباً 60 کلومیٹر پہلے ''القرنہ'' نامی مقام کے قریب آپس میں مل جاتے ہیں اور پھر اکٹھے بہتے ہوئے ان کے طویل سفر کا اختتام خلیج عرب میں جا کر ہوتا ہے۔ جغرافیہ دانوں کی تحقیق کے مطابق خلیج عرب کا پانی زمانہ قدیم میں کافی اوپر چڑھا ہوا تھا جس کے سبب یہ دونوں دریا اس میں الگ الگ براہ راست گرتے تھے مگر سالہا سال کی ارضی تبدیلیوں کے سبب اب وہ سمٹ کر نیچے اُتر گیا ہے۔ لہٰذا یہ دریا پہلے خشکی پر مل کر سنگم بناتے ہیں پھر یکجا ہو کر خلیج عرب میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے سنگم سے سمندر تک بننے والے دریائی حصے کو ''شط العرب'' کہا جاتا ہے۔ شط کے معنی ہیں ندی کا کنارہ، شط العرب سے وہ 100 میل لمبا اور 1200 گز چوڑا دہانہ مراد ہوتا ہے جو ان دونوں دریاؤں کے ملاپ سے ''قرنہ'' اور ''ابادان'' نامی جگہوں کے درمیان بنتا ہے۔

سیاہی مائل سبزہ:

عربی میں دریا کو ''نہر'' کہتے ہیں۔ تاریخ دانوں نے ان دو دریاؤں کے درمیانی علاقے کو ''مابین النہرین'' کے نام سے پکارا ہے یعنی دو دریاؤں کا درمیانی خطہ۔ یہ علاقہ انتہائی زرخیز اور سرزمین عرب کا شاداب ترین علاقہ ہے، حتیٰ کہ کتب فقہ وسیرت میں اسے ''سواد العراق'' کہا گیا ہے۔ ''سواد'' کالے رنگ کو کہتے ہیں۔ سبزے کا رنگ جب گہرا ہو تو وہ سیاہی مائل محسوس ہوتا ہے۔ اس خطے کی پیداوار اتنی سرسبز ہوتی تھی کہ دور سے سیاہ محسوس ہوتی تھی، لہٰذا اس کے زرعی علاقے کو ''سواد العرق'' کہتے تھے۔ کھجور کی پیداوار میں اسے دنیا میں پہلے نمبر پر مانا جاتا ہے۔ یہ علاقہ اپنی زرخیزی وشادابی کے سبب کئی قدیم تہذیبوں کا مرکز رہا ہے جنہیں زمانہ قدیم کی انتہائی ترقی یافتہ اور متمدن اقوام نے تشکیل دیا تھا اور جنہوں نے اپنے وقت میں اس کرۂ ارض پر گہرے آثار ونقوش چھوڑے۔ بابل کا نام کس نے نہ سنا ہوگا؟ اسی طرح نینوی (حضرت یونس علیہ السلام کا علاقہ)، موصل، نصیبین (جہاں کے جنات نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تلاوت سنی تو ایمان لے آئے) اور (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش، یہ فرات کے جنوب میں ہے)، حران یا فاران (ہجرت ابراہیمی کی پہلی منزل) پھر ظہور اسلام اور فتوحات عراق کے بعد حیرہ، مدائن (جی ہاں! وہی مدائن جو حکومت فارس کا پایۂ تخت تھا اور جس کو فتح کرنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے بلاتکلف

موجوں میں اپنے گھوڑے ڈال دیے تھے) بغداد، کوفہ، بصرہ، نجف وغیرہ سب مشہور تاریخی مقامات انہی دو دریاؤں کے بیچ میں پڑتے ہیں۔

کدھر کو چلے؟

قرآن کریم اگرچہ تمام عالم کے انسانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت اور ہر قوم وملت کے لیے کتاب عبرت ونصیحت ہے، لیکن اس میں جن انبیاء علیہم السلام اور اقوام سابقہ کا ذکر آیا ہے، ان میں سے اکثر کا تعلق جزیرۃ العرب اور گردوپیش سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی انسانی آبادی پائی جاتی ہے اور گزشتہ اقوام سے منسوب آثار ملتے ہیں، وہ سب کے سب تقریباً ایک ہی جیسی اور ملتی جلتی عادات واطوار اور فطرت وکردار کے مالک تھے۔ ان میں ایک طرح کی روحانی بیماریاں پائی جاتی تھیں اور جب ان کی اصلاح کے لیے اللہ نے انہی میں سے اپنے نیک بندوں کو بھیجا تو ان کا ردعمل بھی اس پر تقریباً یکساں تھا۔ ان انبیائے کرام کا تعلق انہی اقوام وقبائل سے ہوتا تھا۔ ان کے سیاسی وڈیروں اور خوشحال سرمایہ داروں (جنہیں قرآن کریم کی اصطلاح میں بالترتیب ''ملأ القوم'' اور ''مترفین'' کہا جاتا ہے) نے اپنے ان ہم قوم خیر خواہوں اور ہمدردوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ باہم اتنا مختلف نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے ان اقوام کا انجام بھی ایک دوسرے سے مختلف نہ تھا۔ آپ اس کرۂ ارض میں کہیں بھی چلے جائیں آپ کو جا بجا قدیم آبادیوں کے تباہ شدہ کھنڈرات اور آثار ملیں گے جن پر ایک جیسی وحشت، حسرت اور دردانگیز کیفیت چھائی ہوگی۔ انسانی عقل کو اچنبھا ہوتا ہے یہ لوگ کہاں سے آئے اور کہاں چلے گئے؟

عالم ناسوت کا امتحانی ہال:

قرآن کریم جواب دیتا ہے یہ لوگ ایک عارضی امتحان گاہ کے ایک دروازے سے عالم ناسوت کے ہال میں آئے تھے، پھر مدت امتحان کے خاتمے پر دوسرے دروازے سے برزخ کو چلے گئے اور اب قبروں میں اجمالی نتیجہ سن کر تفصیلی نتیجے کے انتظار میں صور پھونکے جانے کے منتظر ہیں۔ جن لوگوں کو قرآن کریم کی نورانی تعلیمات کی کرنیں نصیب نہیں ہوئیں، وہ ان اقوام کے متروکہ آثار میں مارے مارے کھوج لگاتے پھرتے ہیں ان کا رہن سہن کیسا تھا؟ وہ کتنے ترقی یافتہ تھے؟ اور کس آفت نے ان کی ہنستی بستی آبادی کو نگل لیا؟ افسوس ہے عبرت کے ان مقامات میں برسوں تحقیق کر کے بھی ان کی مادیت زدہ عقلیں پتھر کے کھنڈروں اور گناہوں کے ملبوں میں بھٹکتی رہتی ہیں اور وہ ان تباہ شدہ بستیوں پر تحقیق ومشاہدے سے مادی معلومات کے حصول سے آگے نہیں سوچتے، جبکہ یہ ثانوی درجے کی چیزیں ہیں اور جغرافیہ ارضی وقرآنی کے طالب علم کا اصل مقصد ومطمح نظر قدرتی اور مصنوعی آثار کو دیکھ کر ان کے خالق کی طرف توجہ مبذول کرنا اور اس کی رضا اور ناراضی کے اسباب کو جان کر اپنے آپ کو اس کی منشا کے مطابق ڈھالنا ہے۔

قرآن کریم کے پانچ مضامین:

الغرض قرآن کریم میں جو قصص وواقعات ذکر کیے گئے ہیں، ان کا ابتدائی تعلق تو جزیرہ نمائے عرب اور اس کے قریب کے علاقوں سے ہے، جن کو قرآن کے اوّلین مخاطب بخوبی سمجھتے تھے لیکن درحقیقت احوال وواقعات تمام دنیا کے انسانوں کے لیے باعث عبرت ونصیحت ہیں اور ان کے ذریعے ہر انسان کو چاہے وہ کسی بھی براعظم سے تعلق رکھتا ہو، آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے ان واقعات میں موجود کرداروں میں انسان اپنے اعمال کا عکس دیکھے اور مہلت عمل ختم ہونے سے قبل اپنے آپ کو سنبھالنے کی سوچے اور اپنی ان خامیوں کی اصلاح کی فکر کرے جو اس جیسے انسانوں کو لے ڈوبی تھیں۔ یہی وجہ ہے قرآن کریم میں جا بجا اللہ تعالیٰ نے اپنے مخاطبین سے کہا ہے اس کرۂ ارض پر چلو پھرو اور دیکھو تم سے پہلوں کے اعمال نے ان کو کیا دن دکھایا؟ تاکہ ایسا دن آنے سے پہلے تمہارے دل سے غفلت کے پردے ہٹ جائیں اور تم توبہ کر کے اپنے گناہوں کا بوجھ ہلکا کر لو جن کا وبال پڑنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر تبدیل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کے مضامین کی جو پانچ بڑی اقسام ہیں ان میں سے ایک ''قصص الانبیاء'' (انبیاء علیہم السلام کے واقعات) اور ''انباء الرسل'' (پیغمبروں کی اپنے امتیوں کے

ساتھ گزرنے والی کشمکش) ہے۔اور یہ پانچویں قسم (پہلی چار قسمیں عقائد، احکام، اخلاقیات اور وعدو وعید یا تخویف وتبشیر کہلاتی ہیں) اس وقت بہت اثر آفریں اور رقت انگیز ہو جاتی ہے جب جغرافیہ قرآنی کو مستند حوالہ جات سے اخذ کردہ حقائق اور حصول عبرت کے لیے (نہ کہ محض معلومات کا حجم بڑھانے کے لیے) پڑھا جائے۔

سلسلۂ نبوت کے دومراحل:

اب واپس اس بحث کی طرف لوٹ چلیے جو مضمون کے آغاز میں ذکر کی گئی تھی۔ ''مابین النہرین'' نامی جگہ کا قصص الانبیاء سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے اور ان سے رابطہ رکھنے کے لیے نبوت کے جس بلند مرتبت سلسلے کو جاری کیا، اس کو دو مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام تک اور دوسرا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ آدم علیہ السلام کے علاوہ پہلے سلسلے سے مربوط مشہور انبیاء حضرت ادریس، حضرت یونس اور حضرت نوح علیہم السلام کا تعلق اسی زرخیز اور مردم خیز خطے سے ہے جسے ان دو دریاؤں نے گھیر رکھا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش فرات کی بیرونی جانب ''اُور'' نامی مقام میں ہوئی، پھر آپ وہاں سے ہجرت کر کے حران یا فاران پہنچے، پھر فلسطین گئے جہاں بنی اسرائیل نے نشوونما پائی۔ اس دوران آپ حجاز تشریف لے گئے جہاں بنی اسمٰعیل میں سے آخری نبی تشریف لائے۔ گویا نبوت کے دوسرے سلسلے کی ابتدا بھی انہی دریاؤں میں سے ایک کے کنارے ہوئی، پھر انتہا دریائے اردن اور دریائے نیل کے کنارے بسنے والی آبادیوں سے ہوتے ہوئے ''وادی غیر ذی زرع'' مکہ مکرمہ میں آفتاب ختم نبوت کے طلوع سے ہوئی۔ ان تمہیدی باتوں کو سمجھنے کے بعد اب ہم اس قابل ہوگئے ہیں کہ مشہور انبیائے کرام علیہم السلام سے متعلقہ نصیحت آموز واقعات کو ان کے صحیح پس منظر کے ساتھ سمجھ سکیں تو آیئے! اسرائیلی روایات سے بچتے ہوئے تفسیری حقائق کی روشنی میں ان کا تذکرہ شروع کرتے ہیں۔

دوسرا باب

قصص الانبیاء

ذکر باوا اور امّاں کا

کبڑے کی خواہش:

ابوالبشر جناب سیدنا حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نسل انسانی کے جدِ امجد اور سب انسانوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ اس کرۂ ارض پر انسانی آبادی کا سلسلہ آپ ہی سے چلا۔ مشرق ومغرب، شمال وجنوب کے سب انسان آپ ہی کی اولاد ہیں، اس لیے آپ ''باوا آدم'' کہلاتے ہیں۔ مشہور یہودی مفکر ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء اب خود اس کے فکری پیروکاروں کے ہاں بھی اس قابل نہیں رہا کہ اس کا تذکرہ کیا جائے۔ جس طرح کبڑا چاہتا ہے کہ ساری دنیا کبڑی ہو جائے اسی طرح اس یہودی دانش ور نے چاہا اور دیگر یہودیوں نے اس نظریے کو پھیلایا کہ ہمارے آباواجداد بندر اور خنزیر بنائے گئے تھے اور اس کا طعنہ ہمیں دیا جاتا ہے کہ کیوں نہ ساری دنیا کو اس مغالطے میں ڈالا جائے ان کے آباواجداد بھی دراصل ''بوزنے'' تھے۔ مغرب کی حماقت دیکھیے سیدنا آدم علیہ السلام جیسی جلیل القدر شخصیت جنہیں خدائے قادر ومالک نے اپنے خصوصی حکم سے تخلیق کیا اور جن کے سر پر خلافت کا تاج رکھا، اس عظیم نبی کی جگہ ایک حقیر اور بدتمیز مخلوق کو ایک چکر باز فلسفی کے کہنے پر اپنا جدِ امجد مان لیا۔ سچ ہے وحی کے نور کے بغیر انسانی کھوپڑی میں موجود عقل، جانور کے گلے میں بندھی گھنٹی کی طرح ہے۔

سیدنا حضرت آدم علیہ السلام ہی وہ عظیم شخصیت ہیں جن کے ذریعے سب سے پہلے انسانوں کو دنیاوی زندگی کے طور طریقے اور مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے آنے والی زندگی میں نجات اور کامیابی کے اصول بتائے گئے۔ قرآن کریم میں آپ کا نام نامی پچیس آیات میں پچیس مرتبہ آیا ہے۔ ذیل کا جدول دیکھیے۔

سورت	سورت نمبر	آیات نمبر
بقرہ	2	31....37
آلِ عمران	3	33,59
مائدہ	5	27
اعراف	7	11,19,26,27,31,35,172
اسراء	17	61,70
کہف	18	5
مریم	19	58
طٰہٰ	20	115,116,117,120,121
یٰس	36	60

درمیانی جزیرہ، اونچا پہاڑ:

حضرت آدم وحوا علیہما السلام جب دنیا میں بھیجے گئے تو زمین پر کہاں اُترے؟ اس سلسلے میں مفسرین، محدثین، مؤرخین اور جغرافیہ دانوں کی آراء مختلف ہیں۔ ذیل کے مضمون میں ان تمام کو ذکر کرنے کے بعد اس قول کی تعیین کی کوشش کی جائے گی جو نقل وعقل اور قرائن وشواہد کی رُو سے زیادہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔

(1) بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب زمین پر اتارے گئے تو وہ سرزمین ہندوستان کے جنوب میں واقع جزیرہ لنکا میں اترے جسے پہلے سراندیپ، سیلون اور اب سری لنکا کہا جاتا ہے۔ وہاں ''بدھا پہاڑ'' نامی ایک پہاڑ پر انسانی قدموں کے نشانات ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام سے منسوب بتائے جاتے ہیں۔ مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں: ''میں اس جزیرے میں گیا تو میرا اصل مقصد حضرت آدم علیہ السلام کے قدم کی زیارت کرنا تھا۔ اس جزیرے کے لوگ حضرت آدم علیہ السلام کو ''بابا'' اور حضرت حوا علیہا السلام کو ''ماما'' کہتے ہیں۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ:585,584) اس پہاڑ کا نام جس کا ذکر ابنِ بطوطہ نے کیا ہے عربی میں ''بوذ'' ہے اور آج کل کے مقامی باشندے اس پر موجود نشانات کو بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اسے ''بدھا'' کے پہاڑ سے پکارتے ہیں۔

(2) مشہور مفسر امام طبری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے حضرت آدم علیہ السلام سرزمین ہندوستان میں اتارے گئے۔ انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے، جس پہاڑ پر وہ اترے وہ کرۂ ارض کا سب سے بلند اور آسمان سے قریب ترین پہاڑ ہے۔ اس نکتۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کوہِ ہمالیہ کی چوٹی ''ماؤنٹ ایورسٹ'' بنتی ہے جو سطح سمندر سے آٹھ ہزار آٹھ سو اڑتالیس فٹ (8848) بلند ہے۔

نقل وعقل کی کسوٹی:

ان دونوں اقوال کے پیچھے شاید یہ نظریہ ہے کہ لنکا کا جزیرہ قدیم معلوم دنیا کے وسط میں ہے اور کوہ ہمالیہ کی چوٹی دنیا کا سب سے اونچا مقام ہے جہاں آسمانوں سے اترنے والے کو پہلا قدم رکھنا چاہیے۔ ان دونوں اقوال کی تائید میں اگرچہ کچھ روایات ملتی ہیں لیکن اول تو وہ ضعیف ہیں پھر نقل وعقل اور زمانہ مابعد کی انسانی تاریخ ان کی تائید نہیں کرتی۔ اس لیے کہ سری لنکا کی کوئی تاریخی، مذہبی، جغرافیائی یا سیاسی حیثیت کبھی بھی نہیں رہی تاکہ اللہ حکیم وعلیم کی طرف سے دنیا میں پہلا انسان اتارے جانے کے لیے اسی جزیرے کا انتخاب کیا جاتا۔ ''نزول آدم'' کرۂ ارض کی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں سے ہے، لہٰذا نقل وعقل کا تقاضا ہے اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنے نائب کے اترنے کے لیے جس مقام کا انتخاب کیا ہو وہ مستقبل میں اہم دینی، علاقائی اور تاریخی حیثیت کا حامل ہونا چاہیے۔ سری لنکا کا دور دراز واقع جزیرہ اس معیار پر پورا نہیں اُترتا اور اس کے ایک پہاڑ پر جو قدموں کے نشانات ہیں وہ متنازع ہیں۔ بدھ مت کے ماننے والے اسے گوتم بدھ کی طرف منسوب کر کے وہاں اپنی عبادت اور مذہبی رسوم انجام دیتے ہیں اور ہندو اسے اپنے دیوتا سے منسوب کرتے ہیں۔ یاد رہے سری لنکا کی آبادی میں اکثریت بدھ سنہالیوں کی ہے جبکہ مسلمانوں کی آبادی 10 فیصد ہے اور تامل ہندو 25 فیصد کے لگ بھگ ہیں، جنہوں نے پندرہ بیس سال تک سری لنکا کے شمال مشرق میں ''تامل ایلام'' کے نام سے ایک ہندو ریاست قائم کرنے کے لیے خونریز گوریلا جنگ لڑی۔ یہ بھی ذہن میں رہے سراندیپ میں اسلام پہلی صدی ہجری میں آیا تھا۔ سراندیپ (لنکا) میں عرب تاجر آباد ہو گئے تھے جن کے فوت ہونے پر ان کی بیوی بچے بصرہ جا رہے تھے دیبل (موجودہ کراچی کے شرقی جانب ایک بندرگاہ) کے قریب بحری ڈاکوؤں نے انہیں لوٹ کر قید کر لیا تھا۔ اس پر گورنر عراق حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو مجاہدین کا لشکر دے کر بھیجا تھا جنہوں نے (93ھ/712ء) سندھ فتح کر لیا تھا۔ ان دنوں سری لنکا کی آبادی میں صرف 10 فیصد مسلمان ہیں۔ ماؤنٹ ایورسٹ کا بھی یہی حال ہے اللہ تعالیٰ انسان کو زمین میں اتارنے کے لیے اس کے محتاج نہیں وہ بلند ترین چوٹی کا انتخاب کریں۔ جو قادر مطلق سات آسمانوں کے اوپر جنت سے زمین تک بحفاظت

اتار سکتا ہے اسے ہرگز اس کی ضرورت نہیں وہ بلند پہاڑ کا سہارا لے۔ پھر ان دونوں قولوں کی تردید اس سے بھی ہوتی ہے تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے اماں حوا مکہ مکرمہ میں اتریں۔ اب اگر باوا آدم کا نزول ہندوستان میں مان لیا جائے تو قرآن کریم کی ان آیات کی خلاف ورزی ہوتی ہے جن میں آیا ہے: "قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا۔" "تم سب اکٹھے جنت سے اترو۔"

سچائی کی نشانی:

(3) صحیح بات وہ ہے جسے فقہاء کرام نے بھی اختیار کیا ہے حضرت آدم علیہ السلام دنیا کے وسط میں واقع "جزیرہ العرب" میں "ام القریٰ" (بستیوں کی ماں) یعنی مکہ مکرمہ میں دنیا کے پہلے گھر بیت اللہ کے قریب (جسے سب سے پہلے فرشتوں نے تعمیر کیا تھا) صفا پہاڑ پر اترے۔ یہی وجہ ہے اسے حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام کی طرف نسبت کی وجہ سے "صفا" کہا جاتا ہے، جبکہ اماں حوا قریب کی دوسری پہاڑی مروہ (جو صفا سے چھوٹی ہے۔ قارئین اس جملے پر غور کریں) پر اُتریں۔ "امراۃ" عربی میں عورت کو کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے یہ پہاڑ "مَرْوَہ" کہلایا۔ اللہ تعالیٰ کو چونکہ منظور تھا زمین کے ان اولین مہمانوں کو پہلے پہل زمین کے مقدس مقامات میں لے جایا جائے اس لیے یہ دونوں مکہ مکرمہ سے کچھ فاصلے پر موجود "مزدلفہ" نامی جگہ میں اکٹھے ہوئے۔ مزدلفہ کے معنی ہیں "قرب والی جگہ۔۔۔۔" اس مقام کو "جمع" بھی کہتے ہیں کیونکہ بابا آدم اور اماں حوا کی طرح یہاں حاجی بھی ایک رات کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ پھر دونوں کے اکٹھے ہونے کے باوجود باہمی پہچان ذرا آگے جا کر عرفات کے میدان میں جبل رحمت پر ہوئی اس لیے اس پورے میدان کا نام "عرفات" (پہچان) پڑ گیا۔ (دیکھیے علامہ شامی کی شہرہ آفاق کتاب رد المحتار، کتاب الحج:2/467،468)

یہ رائے نقلاً و عقلاً مضبوط معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے سرزمین عرب دنیا کے تقریباً وسط میں تین بڑا عظموں کے سنگم پر واقع وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر دنیا میں نازل ہونے والے پہلے انسان نے بنایا۔ اللہ کے پہلے نبی کی طرح آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہیں تشریف لائے۔ سرزمین عرب کی تاریخی، مذہبی اور جغرافیائی و دینی حیثیت ہمیشہ سے مسلم رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ تمام بڑے انبیاء علیہم السلام اسی سرزمین میں تشریف لائے، تمام آسمانی کتابیں یہیں نازل ہوئیں۔ موجودہ تینوں آسمانی مذاہب کی مقدس یادگاریں اسی جزیرہ نما میں ہیں۔ یہیں سے نسل انسانی چاروں طرف پھیلی ہے اور قرب قیامت میں رحمانی اور دجالی فوج کا آخری معرکہ اسی سرزمینِ عرب میں لڑا جائے گا۔۔۔۔۔ بہت سے ایسے شواہد و قرائن ہیں جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے یہی سرزمین وہ جگہ ہو گی ہے جسے پہلے انسان کے نزول کے لیے منتخب کیا گیا ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔۔۔۔۔ اگر غور کیا جائے تو اسلام کے سچا ہونے کی ایک واضح اور مضبوط دلیل بھی اس سے سامنے آتی ہے، بشرطیکہ غیر مسلم مؤرخین اور جغرافیہ دان غیر جانبدار ہو کر کھلے دل سے اس پر غور کریں۔

باوا اور اماں کا مسکن:

حضرت آدم علیہ السلام فوت ہونے کے بعد مکہ مکرمہ کے مشہور پہاڑ "جبل ابو قبیس" کے دامن میں مدفون ہوئے اور اماں حوا کی قبر جدہ میں ہے۔ مشہور ہے چونکہ "جَدَّہ" عربی میں دادی کو کہتے ہیں اس لیے اسی شہر کا نام "جدہ" پڑ گیا لیکن بات یہ ہے لفظ "جُدَّہ" جیم کے زیر کے ساتھ نہیں بلکہ یہاں اصل لفظ "جیم" کا پیش کے ساتھ ہے اور عربی میں اس کے معنی "پہاڑوں کے درمیان تنگ راستے اور گھاٹی" کے آتے ہیں۔

عرب مؤرخین نے اس شہر کا نام "جدہ" پڑنے کی یہ وجہ بیان کی ہے اور فصحاء اسے "جُدَّہ" ہی بولتے ہیں۔ یہ سعودی عرب کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی پندرہ سولہ لاکھ ہے۔ یہ نہ صرف حجاز کا دروازہ ہے بلکہ زمانہ قدیم سے حج کا دروازہ چلا آ رہا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جدہ شہر کی بنیاد رکھی گئی ورنہ اس سے پہلے یہ محض مچھیروں کی بستی تھی۔ معجم البلدان میں لکھا ہے جدہ شہر جدہ بن حزم بن ریان قضاعی سے موسوم ہے جو یہاں پیدا ہوا تھا۔ یہ کیونکہ قوم

کے ساحل پر سعودی عرب کی مشہور بندرگاہ ہے۔اور مکرمہ کے مغرب میں 70 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

سچائی اور خلوص کے پیکر

(حضرت ادریس علیہ السلام)

صدیقیت کیا ہے؟

حضرت ادریس علیہ السلام کا شمار قدیم ترین پیغمبروں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ آپ کے زمانہ کی تعیین کے متعلق مؤرخین میں سخت اختلاف ہے، مگر معتبر مآخذ مراجع میں غور کرنے سے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے حضرت ادریس علیہ السلام کا زمانہ بہت قدیم یعنی حضرت ابراہیم و حضرت نوح علیہما السلام سے بھی پیشتر ہوگا جب انسانوں میں سورج کی پوجا یا ستاروں کی پرستش پھیلی ہوئی تھی۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر دو مرتبہ آیا ہے۔ اوّل سورۂ مریم میں، جہاں مختلف انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے آیت ۵۶ میں فرمایا گیا ہے: ''اے نبی! کتاب میں ادریس علیہ السلام کا ذکر کر، وہ راست بازی کا پیکر اور نبی تھا اور ہم نے اسے بڑے بلند مقام پر پہنچا دیا تھا۔'' پھر سورۂ انبیاء، آیت ۸۵ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا ذکر آیا ہے اور کہا گیا ہے یہ سب راہِ حق میں صبر کرنے والے تھے۔ ہم نے انہیں اپنی رحمت کے سائے میں لے لیا وہ یقیناً نیک بندوں میں سے تھے۔ اگرچہ دونوں جگہ آپ کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد ہے، لیکن ہمیں معلوم ہے قرآن کریم کسی موضوع کے بیان میں ترتیب زمانی کی پابندی ضروری نہیں سمجھتا وہ تو اپنے مقصد رشد و ہدایت کے پیش نظر تاریخی بحثوں سے الگ رہتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک جگہ ان کے مقام نبوت و صدیقیت (صدیق، صدق سے اسم مبالغہ ہے۔ اصطلاح شریعت میں نبی کے بعد سب سے برگزیدہ ولی...... مؤمن کامل...... کو کہتے ہیں) کا تذکرہ کیا ہے۔ دوسری جگہ ان کے تقویٰ، صالحیت اور توحید پر ثابت قدمی بیان ہوئی ہے۔

بابل کا متبادل:

راجح قول کے مطابق آپ بابل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ جب آپ کے کندھوں پر نبوت کی ذمہ داری ڈال دی گئی تو آپ کی دعوت سے ایک چھوٹی سی جماعت ایمان لے آئی۔ باقی شریر و مفسد لوگ حضرت آدم و حضرت شیث علیہما السلام کی شریعت جس کی آپ دعوت دیتے تھے، کے منکر و مخالف ہی رہے۔ جب آپ نے یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے پیروکاروں کو بھی ہجرت کی تلقین فرمائی۔ آپ کی جماعت نے جب یہ سنا تو ان کو وطن چھوڑنا بہت شاق گذرا اور کہنے لگے بابل جیسا وطن ہم کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے؟ حضرت ادریس علیہ السلام نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا اگر تم یہ تکلیف اللہ کی راہ میں اُٹھاتے ہو تو اس کی رحمت وسیع ہے۔ وہ اس کا نعم البدل ضرور عطا کرے گا۔ پس ہمت نہ ہارو اور خدا کے حکم کے سامنے سرِ نیاز جھکا دو۔ مسلمانوں کی رضامندی کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی جماعت مصر کی جانب ہجرت کر گئی۔ جماعت نے جب نیل کی روانی اور اس کی سرزمین کی شادابی دیکھی تو

بہت خوش ہوئی۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے یہ دیکھ کر اپنی جماعت سے فرمایا: بابلیون (یعنی تمہارے بابل کی طرح شاداب مقام) اور ایک بہترین جگہ منتخب کر کے نیل کے کنارے بس گئے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے اس جملہ ''بابلیون'' نے ایسی شہرت پائی کہ قدیم اقوام اس سرزمین کو ''بابلیون'' ہی کہنے لگیں۔

علوم نبوت کی وسعت:

حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی جماعت نے جب مصر میں سکونت اختیار کر لی تو یہاں بھی انہوں نے پیغامِ الٰہی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا شروع کر دیا۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے دینِ الٰہی کے پیغام کے علاوہ سیاستِ مُدن، شہری زندگی اور بود و باش کے متمدن طریقوں کی بھی تعلیم و تلقین کی۔ انہوں نے کئی شہر اور بستیاں آباد کیں اور ان کو شہروں کی تعمیر کے اصول پر بسایا۔ ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو سو کے قریب تھی۔ حضرت ادریس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے افلاک اور ان کی ترکیب، کواکب اور ان کے اجتماع و افتراق کے نقاط اور ان کے باہم کشش کے رموز و اسرار کی تعلیم دی اور ان کو علم ہیئت و حساب کا عالم بنایا اور اگر اس پیغمبر خدا کے ذریعہ ان علوم کا انکشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی، لیکن اس کا مطلب یہ ہے آپ کو علم ہیئت و فلکیات، علم ریاضی و ہندسہ اور حکمت و فلسفہ میں بصیرت تامہ عطا کی گئی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں موجودہ فرضی علم نجوم یا رمل و جفر وغیرہ جو گمراہی کی جڑ بلکہ شرک کا سبب ہیں، ان کی نسبت آپ کی طرف کی جائے۔ اس بارے میں آپ کی اصل تعلیمات کی بجائے بعض بے سند باتیں بہت مشہور ہیں جن سے عام مسلمان اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

دنیا پرستوں کا دھندا:

غور کیا جائے تو اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے آپ کی شریعت میں عبادات کو چاند سورج کے مختلف منازل اور بروجوں میں مختلف سیاروں کے بالمقابل آنے والے وقت کے حساب سے ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لیے آپ کو اور آپ کے متبعین کو شمس و قمر کے بروج، کواکب و سیارات کی منازل اور اجرام فلکیہ کی گردش و حساب کا راسخ علم حاصل تھا۔ اس کی حیثیت ہماری شریعت میں اوقات نماز اور رؤیت ہلال کے مباحث کی سی تھی، لیکن بعد میں نفس کے غلام جاہل پیشواؤں نے اس علم کا رخ ''مستقبل بینی'' کی طرف پھیر دیا۔ بعض آپ کو ''ہرمس الہرامسہ'' کا لقب دیتے ہیں یعنی ماہرینِ علمِ نجوم کا استادِ اوّل۔ ہرمس یونان کا ایک مشہور منجم گزرا ہے اور بعض چالاک قسم کے عامل اس سلسلے میں بعض ضعیف روایات کا حوالہ دے کر اپنے ناقص اور جھوٹے علم کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح کے جاہلوں نے آپ کو عطا کردہ علم ہیئت و فلکیات سے عبادات کے اوقات کی تخریج میں استفادہ کی بجائے اس میں اسرار و رموز کی شعبدہ بازی اور جھوٹی سچی باتوں کی آمیزش سے اسے پُراسرار اور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والا مخفی علم قرار دے کر اپنی دنیا بنانے اور عوام کی آخرت تباہ کرنے کا دھندا بنا لیا ہے۔

ناقابل اعتبار اچنبھا:

قرآن شریف میں آتا ہے ''ہم نے انہیں بڑے بلند مقام تک پہنچا دیا تھا۔'' اس آیت سے بعض نے یہ مراد لیا ہے حضرت ادریس علیہ السلام چوتھے یا چھٹے آسمان پر زندہ ہیں۔ مشہور مفسر ابن جریر طبری نے اسی طرف رجحان ظاہر کیا ہے، بعض دوسرے مفسرین (مثلاً صاحبِ جلالین، موضح القرآن وغیرہ) نے بھی اس کو لیا ہے لیکن اکثر مستند تفاسیر جیسے کبیر، بیضاوی، الکشاف اور ابن کثیر کے مطابق اس آیت کا وہ معنی جو قرآن و حدیث کی دیگر روایات اور عربی محاورہ کے مطابق ہے، یہ ہے ہم نے ان کو بلند مرتبہ عطا کیا تھا اور وہ ہمارے مقرب بندے تھے۔ عہد حاضر کے نامور مفسرین و مترجمین میں سے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمہم اللہ وغیرہ نے اسی کو قرین صواب قرار دیا ہے۔ صحیحین کی مرفوع احادیث میں شب معراج کو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر انبیاء کے علاوہ حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کا ذکر ہے، لیکن اس کا یہ لازمی معنی نہیں

حضرت ادریس علیہ السلام حیات ہیں۔ اس واسطے حضرت ادریس علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے کا مرفوع احادیث میں ذکر نہیں ہے (مفسر طبری کی ذکر کردہ چند احادیث موقوف..... یعنی جن کی سند صرف صحابی تک جاتی ہے..... ہیں) اور جو روایات کتب سیرت تاریخ اور قصص الانبیاء میں حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق مسلمان تاریخ نویسوں میں مشہور ہوئیں ان کا ماخذ اسرائیلیات ہیں اور وہ یہود کی غیر مستند ''اساطیر'' (مذہبی داستانوں) سے لی گئی ہیں۔ ان روایتوں میں حضرت ادریس علیہ السلام (اگر ان کا عبرانی نام اخنوخ تسلیم کیا جائے) کے متعلق علم نجوم و حساب اور رمل و جفر وغیرہ ماورائی علوم کے حوالے سے بہت سی ایسی غلط باتیں منسوب ہیں جو یہود نے اپنی مردود و مبغوض عادت کے مطابق بہت سے انبیاء، اولیاء، حکماء اور علماء سابقین کی طرف منسوب کر رکھی ہیں۔ ان کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے واقعے کے متعلق بھی ملک الموت کے ساتھ ان کا جو واقعہ منقول ہے وہ بھی اسرائیلی خرافات میں سے ہے۔ حدیث اور تاریخ میں یدِ طولی رکھنے والے مشہور مفسر علامہ عماد الدین ابن کثیر نے ان کو متن کے اعتبار سے اسرائیلی خرافات اور سند کے اعتبار سے ''نکارت'' (محدثین کی ایک اصطلاح جس کا معنی ''نا قابل اعتبار اچنبھا'' کیا جا سکتا ہے) کا حامل قرار دیا ہے۔

تحقیق کی دنیا میں:

حکمت و فلسفہ یونانی اور نجوم و رمل کی قدیم کتابوں میں بھی آپ کے متعلق بہت سی بے سروپا باتیں منسوب کر کے بیان کی گئی ہیں جن کی اہمیت افسانے سے زیادہ نہیں۔ نہ ان کو عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ تحقیق اور استناد کی دنیا میں ان کا کوئی مقام نہیں اور حقیقت یہ ہے دنیا پرست اور باطل کے پیروکار نجومیوں اور دست شناسوں نے غیب دانی کا دعویٰ کر کے لوگوں کا ایمان خراب کرنے اور عوام الناس کو اپنا معتقد بنانے کے لیے ان یادہ گوئیوں کو گھڑا ہے۔ ان پر اعتماد کرنے میں دنیا و آخرت کی تباہی ہے اور ان کو نقل کرنا بھی مناسب نہیں، اس سلسلے میں بس اسی قدر حق اور سچ ہے جو قرآن و حدیث کے مزاج اور پیغمبرانہ تعلیمات کے شایان شان ہے۔ باقی باتیں خصوصاً احوال غیبیہ معلوم کرنے کے مختلف طریقے، لکیریں اور شکلیں، ستاروں اور بروج سے منسوب اثرات سب من گھڑت انیاں اور شرک و توہم پرستی کے جال ہیں۔

یاد رکھنے کی بات:

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا

وہ خود فراخیِ افلاک میں خوار و زبوں

یاد رکھنے کی بات یہ ہے انسان کو مستقبل کے علم کی ٹوہ لگانے کی بجائے مستقبل کے لیے عمل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ عمل ہی خاکی کو نوریوں سے برتر بنا دیتا ہے اور بد عملی اسے ناریوں کے زمرے میں لا کر شامل کرتی ہے۔ احوالِ مستقبل سے واقفیت میں فائدہ کچھ نہیں اور نقصان بہت زیادہ ہے۔ فائدہ اس لیے نہیں آدمی ان کو بدل نہیں سکتا، الٹا دنیا کا بھی نقصان ہوتا ہے اور دین کا بھی۔ اپنے مصائب سے آگہی کا عذاب انسان کو مصیبت سے پہلے مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے اور لکیروں، ستاروں، بروجوں کی گردش اور فالوں، ہندسوں اور زائچوں کے ہیر پھیر میں پڑ کر انسان اللہ واحد کے دامن سے کٹ کر شرک کی بھول بھلیوں میں پڑ جاتا ہے اور یوں تجسس سے شروع ہونے والا کھیل ہمیشہ کے خسارے پر منتج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان مہلک چیزوں سے ہر صاحب ایمان کی حفاظت فرمائے۔

کشتی والا پہاڑ
(حضرت نوح علیہ السلام)

موتی اور گھونگے:

مابین النہرین کے اس علاقے میں جس کا ذکر آپ پہلی قسط میں پڑھ چکے ہیں۔ یوں تو کئی برگزیدہ پیغمبر آئے ہوں گے لیکن قرآن شریف میں تین مشہور انبیائے کرام کا ذکر ملتا ہے ان میں سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ آپ کا واقعہ قرآن کریم میں ۴۳ جگہ آیا ہے اور اس میں خیر وشر کے درمیان کشمکش، داعیانِ حق کے اسلوب کلام، سیاسی حیثیت کے حاملین طبقہ اشرافیہ (ملأ القوم) اور دنیا پرست صاحب ثروت لوگوں (مُترفین) کی نفسیات، ان کی طرف سے حق کو ٹھکرانے، اس کی اشاعت کا راستہ روکنے اور اہل حق کے ساتھ ناروا سلوک کرنے کے مناظر اور مکالموں کی شاندار نقشہ کشی کی گئی ہے۔ دعوت دین سے وابستہ افراد کے لیے ان مباحثوں اور مناظروں میں اتنی عمدہ اور کارآمد باتیں اور رہنما ہدایات موجود ہیں کہ یہ بیش بہا اور غیر فانی ذخیرہ کی شکل اختیار کر گیا ہے اور اس کا مطالعہ اہل ایمان کے قلوب کو انوار ایمانی سے منور کرنے کے ساتھ انہیں حکمت وبصیرت سکھاتا ہے۔ ان مضامین کا مقصد یہی ہے ان تعلیمات اور عبرت و موعظت کی باتوں کی طرف توجہ دلائی جائے جو قصص قرآنیہ کا مقصود ہیں۔ اگر ہم ان واقعات کی تاریخی تفصیلات، جغرافیائی معلومات اور ضمنی جزئیات میں الجھ کر رہ جائیں تو یہ مطالعۂ قرآن کے مقاصد کے خلاف اور اپنے آپ پر ظلم ہوگا ہم نے سمندر کی تہہ میں اترنے کی مشقت برداشت کرنے کے بعد موتی چننے کی بجائے گھونگھوں سے دامن بھرنا شروع کر دیا۔

جوڑی دار دریا:

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کی محنت اس کرۂ ارض کے اس حصے سے وابستہ تھی جو دجلہ وفرات (ان دونوں کو عربی میں "رافدین" بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ دو دریا جو ایک دوسرے کے لیے سہارا ہیں، جوڑی دار دریا) کے درمیان واقع ہے۔ یہ دونوں دریا ترکی کے پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور جدا جدا بہتے ہوئے عراق کے زیریں حصے میں باہم مل کر خلیج عرب میں جا گرتے ہیں۔ یہ پہاڑ "اراراط" (اردو کی عام کتابوں میں اسے ارارات لکھتے ہیں) کے نام سے مشہور ہیں۔ تورات میں "کوہ اراراط" کا اور قرآن شریف میں اس پہاڑی سلسلے کے اس خاص مقام "کوہِ جودی" کا تذکرہ ہے جہاں کشتی نوح جا کر ٹھہری تھی۔ یہ مقام آج کل ترکی، ایران اور آرمینیا کی سرحدوں کے سنگم پر "جزیرہ ابن عمر" نامی مقام کے قریب واقع ہے۔ قرآن عزیز نے اپنی عادت کے موافق اس واقعے کو 40 سے زیادہ مقامات پر ذکر کرنے کے باوجود صرف ان تفصیلات پر توجہ مرکوز رکھی ہے جو وعظ ونصیحت کے لیے ضروری تھے، باقی مباحث مثلاً اس عظیم الشان واقعہ کا محل وقوع، اس طوفان کا دائرہ کار، کرۂ ارض پر اس کے اثرات وغیرہ کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا تا کہ قارئین وسامعین کا ذہن اصل مقصد

سے ہٹ کر ذیلی مباحث میں الجھ کر نہ رہ جائے، کیونکہ انسان کا نفس نصیحت کی باتوں کو بوجھل سمجھتا اور دیگر چیزوں میں دلچسپی لیتا ہے۔قرآن کریم نے ان تفصیلات کو انسان، اس کی تحقیق اور انسانی علوم کی ترقی کے حوالے کر کے اتنا بتانے کی کوشش کی ہے کہ اہل عقل وشعور کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہزاروں سال پہلے ایک قوم نے خدائی احکامات کو ماننے سے انکار کیا، پیغمبر کو جھٹلایا اور دین پر چلنے والوں کا مذاق اڑایا تو آسمان وزمین سے ان پر عذاب پھوٹ پڑا اور ان کی تباہی وبربادی آج تک اہل حق کے لیے تسلی وتشفی اور باطل پرستوں کے لیے عبرت اور ڈراوے کے طور پر تاریخ کے صفحات اور ارضی نشیب وفراز کے اوراق میں نقش ہے اور آج بھی جو اللہ رب العالمین کی نہ مانے گا یا اللہ والوں کی ہنسی اڑائے گا تو اسے اس طاقت کی پکڑ کو یاد رکھنا چاہیے جو سب سے بالاتر وقوی تر ہے اور اس کا فیصلہ لمحوں میں نافذ ہو جاتا ہے۔

داستانِ عبرت آموز:

سیدنا حضرت نوح علیہ السلام کی اپنی قوم کے ساتھ کشمکش کی داستان انتہائی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ان کی قوم کے عقیدے کو روگ لگ چکا تھا۔ایک اللہ کے در سے کچھ لینے کی بجائے وہ خود ساختہ آستانوں سے دل لگا بیٹھے تھے اور شرک ووہم پرستی نے انہیں کاغذی خداؤں کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔غیر اللہ کی عقیدت ومحبت، ان کے لیے چڑھاوے اور نذرانے، ان کی خاطر نذر ونیاز، انہیں راضی اور خوش کرنے کے لیے طرح طرح کی رسومات میں وہ مگن رہتے تھے تا کہ دیوتا ناراض ہو جانے والے زمینی خداؤں اور ان کے مجاوروں کی توجہ حاصل کر سکیں اور ان کے کام چلتے رہیں۔دراصل شرک کی بنیاد ہی مفاد پرستی پر ہوتی ہے، مشرک اپنی من چاہی خواہشات کو پورا کروانے اور مستقبل کے موہوم خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے دیوی دیوتاؤں اور ان ہستیوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے خیال میں خدائی اختیارات کے مالک ہیں اور اللہ رب العالمین سے چوری چھپے اس کے کام نکال اور اس کی بگڑی بنا سکتی ہیں۔اگر اس کی مراد پوری نہ ہو تو جلد ہی کوئی دوسری چوکھٹ دیکھ لیتا ہے جو اس کی پیشانی کو راس آئے جبکہ اللہ رب العزت کا گرویدہ شخص دعا قبول ہو یا نہ، حالات خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، اللہ کے دامن رحمت سے چمٹا رہتا ہے، اس کو چھوڑنے کی سوچتا بھی نہیں۔اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے اسے توحید کی نعمت اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی توفیق نصیب ہے، پھر چاہے ساری دنیا اس سے روٹھی رہے اس کے سکون واطمینان میں فرق نہیں آتا۔

خشکی میں سمندر:

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت ان کی مشرک قوم کو کھٹکتی تھی خصوصاً امراء اور رؤسائے قوم جو سیاسی وسماجی یا مالی حیثیت رکھتے تھے، وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ دولت وحیثیت تو ہمارے پاس ہو اور ہم کسی ایسے انسان کی پیروی کریں جس کے پاس سفید پوش اور شریف النفس غربا آتے جاتے اور اس کی مجلس میں اٹھتے بیٹھتے ہوں۔حالانکہ یہ انتہائی حماقت کی بات ہے۔اگر دنیا کی طرح آخرت اور مادیت کی طرح روحانیت بھی مالداروں کے لیے مخصوص ہو جائے تو پھر اخلاص، نیک نیتی، پاک دامنی اور اللہ کی رضا کی خاطر خواہشات کو قربان کرنے اور دین کے لیے دنیا کو ترجیح دینے جیسے بلند پایہ اعمال کا صلہ کیا ہوگا؟ یہ پاکیزہ اعمال تو بلا قیمت رہ جائیں گے، جبکہ کائنات کی تخلیق اس آزمائش کے لیے ہے کون ان پر پورا اترتا ہے اور کون نفس پرستی کے بدبودار دلدل میں دھنسا رہتا ہے۔قوم نوح کے وڈیروں اور سرمایہ داروں نے آپ علیہ السلام کے بار بار اور طویل عرصے تک سمجھانے کے باوجود انکار وتکذیب کے علاوہ اہل حق سے نفرت وتحقیر، تمسخر واستہزا اور ایذا وتکلیف رسانی میں بھی کسر نہ چھوڑی، بلکہ کھلم کھلا اپنے حاشیہ برداروں کو جھوٹے خداؤں کے چرنوں سے چمٹے رہنے کا حکم دیا تو حضرت نوح علیہ السلام کو بتا دیا گیا اب ان میں سے کوئی ایمان نہ لائے گا، تب حضرت نوح علیہ السلام نے دوسرے لوگوں کو ان کے شر سے بچانے کے لیے ان کی ہلاکت کی بددعا کی۔جب اس کم نصیب قوم نے وقت کے نبی سے دعا کروانے کی بجائے عذاب نازل کرانے کی جسارت کی تو آسمان برس پڑا، زمین ابل پڑی اور پانی کا

پچھاڑتی لہروں نے خشکی کو سمندر بنا کر سب کچھ سمیٹ کر رکھ دیا۔

پانی کی چادر:

بری صحبت حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے لیے بھی زہر قاتل ثابت ہوئی اور وہ ایمان کی نعمت سے محروم ہو کر ظاہری اسباب میں نجات تلاش کرتے کرتے ہلاک ہو گیا۔ جب طوفان باد و باراں نے زمین کو پانی کی چادر سے ڈھانپا تو نیک لوگوں کے ساتھ بیٹھنے پر اپنی توہین محسوس کرنے والے متکبر اور سرمایہ دار کشتی میں ان کی ہم نشینی کے لیے منتیں کرتے رہے لیکن پانی نے ان کا منہ بھر کر اس پر کیچڑ کا لیپ کر کے ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ عراق، ایران اور ترکی سے دور دراز پہاڑوں پر جو عجیب الخلقت جانوروں کی ہڈیاں دریافت ہوئی ہیں، ان کے مشاہدے کے بعد ماہرین علم طبقات الارض اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ طوفانِ نوح سارے کرۂ ارض پر آیا تھا اور اس وقت جو حصہ خشکی میں تھا وہ بھی سمندر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ البتہ بعض اہل علم کی رائے یہ ہے حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں انسانی آبادی اسی محدود خطے میں تھی، لہٰذا وہی مستحق عذاب تھے، باقی کرۂ زمینی کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا اور یہ عظیم طوفان خاص تھا عام نہ تھا، لیکن اگر طوفان کو ساری زمین پر آیا ہوا مان لیا جائے تو چونکہ باقی دنیا میں بڑی انسانی آبادیاں ہی نہیں اس لیے اس خطے میں طوفان آنے پر کوئی اشکال نہیں رہتا۔ آیت مبارکہ "فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ." اور "وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا." سے سارے آسمان سے بارش برسنے اور زمین کے تمام سوتوں سے پانی ابلنے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

برف پوش آتش فشاں

قدرت کاملہ کا شاہکار:

حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے صاحب ایمان وصاحب عمل ساتھیوں کی کشتی جا ٹھہری
گزشتہ مضمون میں آپ نے اس پہاڑ کا تذکرہ پڑھا تھا جہاں سیدنا
کے لیے معیاری پیمانے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس کے برعکس پہاڑ سطح
تھی۔ کشتی سطح سمندر پر چلنے والی چیز ہے اور سطح سمندر پست ترچیزوں کا لیول بتانے
ناہمواری اور کشتی جیسی چیز کے لیے ناموافقت کے اعتبار سے بھی،
سمندر کے بالکل مخالف اور متضاد ہیں۔ کشتی کی وہاں تک رسائی کے اعتبار سے بھی اور بلندی،
لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ کر دکھایا حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا پہاڑ کی چوٹی پر پناہ لینے کے باوجود نہ بچ سکا، حالانکہ سیلاب کے دنوں میں لوگ
درختوں پر چڑھ کر بھی جان بچالیتے ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے کمزور لیکن پاکباز ودیندار ساتھیوں کی کشتی پہاڑ تک بلند لہروں پر سفر کرتے ہوئے
عین چوٹی پر پہنچ کر بھی محفوظ رہی اور اللہ رب العزت کی قدرت کاملہ کا شاہکار بن گئی وہ نجات کے اسباب میں سے ہلاکت کا فیصلہ اور ہلاکتوں کے بھنور میں سے
نجات کی شکل نکال دکھانے پر قادر ہے۔ تو آیئے! اس حیرت انگیز محیر العقول اور قدرت الٰہیہ کے یادگار واقعے کے متعلق چند جغرافیائی معلومات پر ایک نظر
ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اپنے دوستوں سے محبت (اگرچہ وہ دنیاوی اعتبار سے کتنے ہی عاجز کیوں نہ ہوں) اور دشمنوں سے انتقام (اگرچہ وہ کتنے ہی طاقتور اور
سنگدل کیوں نہ ہوں) کا تذکرہ تازہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے ہمارے غافل دلوں پر لگے قفل اس سے کھل جائیں۔

تسلی اور عبرت:

ہے جبکہ قرآن شریف میں اس کوہستانی سلسلے کی اس چوٹی کا نام متعین کیا گیا ہے جو دور
تورات میں کشتی نوح کے جا ٹھہرنے کا مقام ''کوہِ اراراط'' بتایا گیا
تک پھیلے ہوئے اس طویل سلسلہ کوہ میں سر اٹھائے کھڑی ہے اور دیکھنے والوں پر عجیب تاثر چھوڑتی ہے۔ قصص قرآنیہ سے متعلق تفصیلات میں کسی مقام کا تعین
قرآن کریم نے اکثر وبیشتر نہیں کیا۔ اس اعتبار سے جودی پہاڑ کا نام لے کر تذکرہ اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ ہے۔ اللہ رب العزت نے اس بارے میں کوئی شبہ
نہیں چھوڑا۔ طوفان بلاخیز فی الواقع اس نوعیت کا تھا اور اللہ تعالیٰ کے پیارے بندوں کو حقیر جاننے کی رسوائی وتباہی اسی حساب سے تھی جس حساب سے کمزور وبے
بس ایمان والوں نے قربانی دی اور طاقتور ومتکبر منکروں نے سرکشی دکھائی۔ جیسا جس نے عمل کیا، قدرت نے اسے بدلہ بھی ویسا ہی دیا۔ یہ پہاڑ جس کا نظارہ
ضعفاء ومساکین مسلمانوں کو تسلی اور سرمایہ دار طاقتوروں کو عبرت دلاتا ہے، اس مقام پر واقع ہے جہاں عراق سے شمال کی جانب ترکی، ایران اور آرمینیا کی
سرحدیں ملتی ہیں۔ یہ جگہ کردستان کے علاقے ضلع بہتان میں جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق میں تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر 37 درجے 30 دقیقہ شمال میں واقع
ہے۔ اس کی شمالی اور مشرقی ڈھلان کی طرف دریائے آرس بہتا ہے جو سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ مغرب کی طرف چھوٹی چھوٹی آتش فشاں پہاڑیوں
کا سلسلہ ہے۔ ان پہاڑیوں میں دو بلند چوٹیاں ہیں۔ دونوں چوٹیوں کے درمیان سات میل کا فاصلہ ہے۔ بڑی چوٹی کی انتہائی بلندی 16945 فٹ (تقریباً 17

ہزارفٹ) جبکہ چھوٹی کی 12877 فٹ (تقریباً 13 ہزار فٹ) ہے۔ اس سے طوفانِ نوح کی ہلاکت خیزی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تین ملکوں کا سرحدی نشان:

ان دونوں چوٹیوں کے قریب دور دور تک کوئی اور چوٹی اتنی بلند نہیں ہے۔ دونوں چوٹیاں لاوے اور آتشی چٹانوں سے بنی ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں آتش فشانی کا عمل ہوتا ہوگا لیکن اب تو اس پر ہمہ وقت برف جمی رہتی ہے۔ اور اس طرح کی آگ برسانے والے یہ پہاڑ اب ٹھنڈی برف سے ڈھکے رہتے ہیں جو بذاتِ خود ایک عجوبہ ہے۔ اس پہاڑ کے اردگرد میدانوں میں عمدہ گھاس کے وسیع قطعات ہیں۔ یہاں کُرد قبائل اپنی بھیڑیں چراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے دامن میں کہیں کہیں درخت بھی ملتے ہیں لیکن پہاڑ سبزے سے خالی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں آبادی تھی۔ مشہور مؤرخ المقدسی کے بقول اس پہاڑ پر ایک ہزار گاؤں آباد تھے۔ ابن قتیبہ نے ''ارارط'' ہی کو کوہ ''جودی'' قرار دیا ہے۔ سکندر اعظم کے عہد کا مؤرخ بروسس لکھتا ہے اسے کوہ ''جودی'' کی چوٹی پر سے کشتی کے آثار ملے ہیں۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر کے دوران اس پہاڑ کا مشاہدہ کیا تھا۔ آگ پھونکنے والے ان برف پوش پہاڑوں کا یہ سلسلہ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلتا ہے۔ موجودہ کوہ ارارط تین ملکوں ترکی، آرمینیا اور ایران کے مابین سرحدی نشان کا کام دیتا ہے، البتہ یہ پورا علاقہ ترکی کے پاس ہے۔

پہاڑ والی خانقاہ:

ارارط کے آس پاس کے تمام علاقوں کی طرح جبل جودی کا گرد و پیش آج تک ایسی یادگاروں اور داستانوں سے پُر ہے جن کا تعلق طوفانِ نوح اور کشتی سے اترنے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے حالاتِ زندگی ہے۔ اس اعتبار سے یہ بات تواتر قریب بیقین تک پہنچ جاتی ہے قرآن کریم کا ذکر کردہ مقام یہی ہے۔ مثال کے طور پر پہاڑی کے دامن میں اب تک ایک گاؤں ہے جسے ''قریہ ثمانین'' (80 آدمیوں کا گاؤں) کہتے ہیں کیونکہ داستان کی رو سے کشتی سے نیچ نکلنے والے 80 آدمی پہلے یہیں آباد ہوئے تھے۔ اسی طرح عرب جغرافیہ نویس اپنے زمانے میں ایک خانقاہ کا ذکر کرتے ہیں جو جودی پر موجود تھی اور جسے ''دیرالجودی'' (جودی والی خانقاہ) کہتے تھے۔

حقیقت کا یقین:

1948ء میں ایک امریکی ٹیم نے ایسی تصاویر حاصل کی تھیں جن سے اس پہاڑ پر کشتی کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، لیکن اب تک اس کشتی کی دریافت کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، کیونکہ صدیوں سے بہتے ہوئے لاوے کی تہہ اور سالہا سال سے جمی ہوئی برف کے نیچے کی خبر لانا آسان نہیں ہے۔ اصل بات جو کشتیٔ نوح کی دریافت سے زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ اس واقعے میں چھپی اس حقیقت کا یقین حاصل کیا جائے اللہ رب العزت طاقتور نافرمانوں کو ایک وقت تک ڈھیل دیتے ہیں اور اپنے کمزور فرمانبرداروں کو ایک حد تک ہی آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد جب قدرتِ الٰہی جوش میں آتی ہے تو تنور سے پانی ابلنے لگتا ہے، سربفلک بلندیاں سیلاب سے بھاگنے والوں کو پناہ دینے سے انکار کر دیتی ہیں، سمندر کی تہہ اور پہاڑ کی چوٹیاں ایک ہو جاتی ہیں، نافرمانوں کی دل دہلا دینے والی چیخیں ان کے ان قہقہوں پر غالب آجاتی ہیں جو وہ اللہ والوں کا مذاق اڑانے کے لیے گلا پھاڑ کر لگایا کرتے تھے۔ بلاشبہ اس حقیقت کا یقین، ایمان اور مادیت کے معرکے میں شریک جانثاروں کے لیے مضبوط سہارا اور کارآمد ہتھیار ہے۔

مچھلی والے نبی
(حضرت یونس علیہ السلام)
(1)

انفرادیت کی حامل قوم:

آج کی مجلس میں ایسے پیغمبر کا ذکر خیر ہوگا جن کی قوم کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ وہ عذاب آنے سے فوراً پہلے راہ راست پر آگئی اور نبی کی اطاعت کرکے دنیا و آخرت کی کامرانیوں سے سرفراز ہوئی۔ حضرت یونس علیہ السلام کا پورا نام یونس بن متّٰی تھا۔ آپ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے جنہیں نبوت اور صالحیت کے اعلیٰ مقامات سے نوازا گیا اور دجلہ و فرات کے درمیان زرخیز وادی کے مشہور شہر ''نینوی'' کے باشندوں کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا تھا۔ نینوی عراق کا مشہور مرکزی شہر اور آشوری حکومت کا پایہ تخت تھا۔ تورات میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام ''یوناہ بن امتی'' مذکور ہے اور اس میں اسی نام سے ایک صحیفہ (یوناہ نبی کا صحیفہ) بھی موجود ہے۔ نام کے ہجوں اور تلفظ میں یہ اختلاف محض عربی اور عبرانی زبانوں کی لفظی تعبیر کا ہے۔ آپ کے عہد کا تعین کرنے والوں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن محققین کے نزدیک آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط میں آپ کا عہدِ رسالت متعین کیا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر چھ مقامات پر آیا ہے۔ ان میں سے پہلی چار جگہوں پر آپ کا نام نامی مذکور ہے اور آخری دو میں ''ذوالنون'' اور ''صاحب الحوت'' (دونوں کے معنی: مچھلی والا) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ پہلی دو سورتوں میں انبیائے کرام کے زمرے میں صرف نام ذکر ہے اور آخری چار جگہوں میں ان واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ان کی پیغمبرانہ زندگی سے وابستہ ہیں اور جن میں رشد و ہدایت کے مختلف گوشے دعوتِ بصیرت دیتے ہیں۔

فرات یا بحیرۂ روم:

حضرت یونس علیہ السلام کو ایک لاکھ سے زائد (ایک لاکھ بیس یا ستّر ہزار) انسانوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ انہوں نے ایک مدت تک اپنی قوم کو پیغام حق سنایا اور توحید کی طرف بلایا، لیکن اس سرکش قوم نے ایک نہ سنی اور نافرمان قوموں کی طرح سچے پیغمبر کی دعوتِ حق کا مذاق اڑاتے رہے۔ جب حضرت یونس علیہ السلام نے دیکھا قوم کفر و شرک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو وہ ان سے مایوس ہو کر ان کے لیے عذابِ الٰہی کی بددعا کرکے غصے اور خفگی کے عالم میں شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ [بعض تاریخ دان کشتی کے اس واقعے کا محل وقوع ''یافا'' بتاتے ہیں جو آج کل اسرائیل کی مشہور بندرگاہ ہے۔ ان کا کہنا ہے آپ وہاں سے ترشیش...... موجودہ تیونس...... جانا چاہتے تھے اور مچھلی کے پیٹ میں محبوس رہنے کا یہ واقعہ بحیرۂ روم میں پیش آیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں، راجح تحقیق وہی ہے جو پہلے نقشے میں دکھائی گئی ہے] فرات کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی مسافروں سے بھری تیار تھی، آپ اس میں سوار ہوگئے۔ راہ میں کشتی طوفانی ہواؤں اور بھری

موجوں کی لپیٹ میں آ گئی اور قریب تھا لہروں کی نذر ہو جائے۔ کشتی والوں نے یہ نتیجہ نکالا کشتی میں کوئی ایسا غلام سوار ہو گیا ہے جو اپنے آقا سے بھاگ کر آیا ہے اس کی وجہ سے کشتی کو ڈوب جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے، لہٰذا اہل کشتی کی سلامتی اسی بات میں ہے اس بھاگے ہوئے غلام کو کشتی سے نکال باہر کیا جائے چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا قرعہ اندازی کے ذریعے ایسے غلام کا پتہ چلایا جائے اور جس کے نام قرعہ نکلے اسے پانی میں پھینک دیا جائے تا کہ باقی سب لوگ بچ سکیں۔ جب قرعہ اندازی ہوئی تو قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا، مگر ان کی پیغمبرانہ معصومیت، پاکبازی اور نیک صورت کو دیکھ کر اہل کشتی کو یہ گوارا نہ ہوا انہیں طوفانی لہروں کے سپرد کر دیا جائے۔ تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور ہر مرتبہ انہیں کا نام نکلا، بالآخر حضرت یونس علیہ السلام خود پانی میں کود پڑے جہاں انہیں ایک بڑی مچھلی نے نگل لیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مچھلی کو حکم تھا وہ اللہ کے رسول کو نہ کھائے اور نہ کوئی گزند پہنچائے۔ مچھلی کو صرف نگل لینے کی اجازت تھی، خوراک بنانے کی اجازت قطعاً نہ تھی۔ مچھلی انہیں نگلنے کے بعد اپنے پیٹ میں اٹھائے پانیوں میں گھومتی پھرتی رہی۔ قرآن مجید نے فرمایا: "فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ" (الانبیاء: ۸۷) یعنی یونس علیہ السلام نے اندھیروں میں اپنے رب کو پکارا۔ اندھیروں سے مراد ہے پانی کے اندر کا اندھیرا، مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا اور پھر رات کا دوسری مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا، اس لیے یہ بھی کہا جاتا ہے اس مچھلی کو ایک اور بہت بڑی مچھلی نے نگل لیا تھا۔

مصیبت زدگان کا سہارا:

ان اندھیروں میں انہیں اپنی اجتہادی غلطی کا شدید احساس ہوا بحیثیت پیغمبر انہیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا، اپنی امت کے ساتھ شفقت کا تقاضا تھا وحی الٰہی کا انتظار کرتے، اذنِ الٰہی کے بغیر قوم کو چھوڑ کر غصے کے عالم میں نکل کھڑے ہونے کو انہوں نے اپنی جان پر ظلم کے مترادف سمجھا، چنانچہ پیغمبرانہ شان کے مطابق ندامت و توبہ کا اظہار کرتے ہوئے پکار اُٹھے: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ." (الانبیاء: ۸۷) یعنی اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی قصوروار اور اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی درد بھری پکار کو سن لیا اور انہیں غم سے نجات دے دی۔ دوسرے مقام پر ارشادِ ربانی ہے: "اِذْ نَادٰی وَهُوَ مَكْظُوْمٌ." (القلم: ۴۸) یعنی جب اس نے (اپنے رب کو) پکارا اس حال میں وہ مغموم تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو تین غم لاحق تھے: ایک غم تو قوم کے ایمان نہ لانے کا تھا، دوسرا وحی الٰہی کا انتظار کیے بغیر قوم کو چھوڑ کر چل دینے کا اور تیسرا مچھلی کے پیٹ میں محبوس ہونے کا۔ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی تو مچھلی کو حکم دیا وہ حضرت یونس علیہ السلام کو اُگل دے، چنانچہ مچھلی نے انہیں ساحل پر ایک چٹیل میدان میں اگل دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا اگر یونس علیہ السلام تسبیح اور استغفار نہ کرتے تو مچھلی کے پیٹ سے نجات نہ پاتے۔ اس میں گناہگاروں کے لیے عظیم خوشخبری ہے مصائب سے نجات پانے کا طریقہ بتلا دیا گیا۔ مچھلی کے پیٹ کے اندر رہنے کی وجہ سے وہ بڑے کمزور، ناتواں اور ضعیف ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کی صحت کی بحالی کے لیے ایک بیل دار درخت اُگا دیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے یہ کدّو کی بیل تھی۔ پھر جب وہ تندرست و توانا ہو گئے تو انہیں حکم ہوا قوم کے پاس چلے جائیں جو ان کی غیر حاضری میں ایمان لا چکی تھی (الصّٰفّٰت: ۱۳۹ تا ۱۴۸)

توبہ کی برکات:

جب حضرت یونس علیہ السلام قوم سے ناراض ہو کر شہر سے نکلے تھے تو قوم نے عذاب کی علامات اور نشانیاں بھانپ لیں اور پیغمبر خدا کے بستی کو چھوڑنے اور دیگر قرائن و آثار سے عذاب کو یقینی سمجھ کر توبہ و استغفار کرنے لگے، نہایت عجز و انکسار اور تضرع و زاری سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک گئے اور گناہوں سے تائب ہو کر آبادی سے باہر میدان میں نکل آئے حتیٰ کہ جانوروں کو بھی ساتھ لے آئے اور بچوں کو ماؤں سے جدا کر دیا اور اس طرح دنیوی تعلقات سے کٹ کر درگاہِ الٰہی میں گریہ و زاری کرتے اور متفقہ آواز سے یہ اقرار کرتے رہے: "ربنا امنا بما جاء بہ یونس۔" (پروردگار! یونس علیہ السلام تیرا جو پیغام ہمارے پاس لے کر

آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور ان کے ایمان کی تصدیق فرمائی اور سر پر آیا ہوا عذاب ان سے ٹل گیا۔ رب تعالیٰ آئے تھے ہم اس کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں)۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور ان کے ایمان کی تصدیق فرمائی اور سر پر آیا ہوا
آئے تھے ہم اس کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں)۔ حضرت یونس علیہ السلام حکم الٰہی کے مطابق دوبارہ اپنی قوم میں جا کر ان کی رہنمائی کرنے لگے اور ان کی قیادت میں ان کی قوم امن وسکون
عذاب ان سے ٹل گیا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم تنہا ایسی قوم ہے جس نے عذاب کا حکم آنے سے فوراً پہلے توبہ کر لی اور عذاب ان سے ٹل گیا۔ رب تعالیٰ
سے زندگی بسر کرنے لگی۔ حضرت یونس علیہ السلام کے نقش قدم پر چل کر اسی طرح عذاب الٰہی سے محفوظ ہو سکتی تھیں مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔
فر... ہیں بعد میں آنے والی نسلیں اور قومیں قوم یونس علیہ السلام کے نقش قدم پر چل کر اسی طرح عذاب الٰہی سے محفوظ ہو سکتی تھیں مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔
حضرت یونس علیہ السلام کے قصے میں عبرت وموعظت کا بڑا سامان ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کسی شخص کے لیے احکام الٰہی کی اطاعت و پابندی کتنی
ضروری ہے۔ اہل ایمان کو مژدہ سنایا گیا اپنے گناہوں کا اعتراف واقرار کر کے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کی جائے تو مصائب و آلام سے نجات مل جاتی
ہے۔ تجربہ ہے جو بھی ایمان والا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ." کے ذریعے اللہ کو پکارتا ہے، اللہ اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔

کج فہمی کا تدارک:

انبیائے کرام علیہم السلام کے شرف ومجد کے پیش نظر ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص نہ کہے میں یونس علیہ السلام بن متّٰی سے بہتر ہوں۔'' یہ ارشاد اس لیے فرمایا جو شخص حضرت یونس علیہ السلام کے احوال کا مطالعہ کرے تو واقعات کے ظاہر کو دیکھ کر اس کے دل میں آپ علیہ السلام کی ذات اقدس کے متعلق تنقیص کا کوئی پہلو بھی نہ آنے پائے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ کا معاملہ انبیاء ومرسلین کے ساتھ عوام وخواص سے بالکل جدا ہے اور جو بات خواص اور صالحین کے حق میں معمولی اور قابل نظر انداز سمجھی جاتی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں سخت گرفت کا باعث ہو جاتی ہے اور اس بنا پر ان سے اگر معمولی تر لغزش بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے سخت سے سخت تعبیر اور اس کو بڑا قصور ظاہر کرتے ہیں تا کہ وہ یہ محسوس کریں ان کی شان اس قدر رفیع اور خدا کے یہاں ان کا درجہ اتنا بلند ہے معمولی سی معمولی لغزش بھی ان کی شان کے نامناسب ہے، مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ ان کے متعلق ایسی بات بھی کہہ دیتے ہیں جس سے یہ واضح ہو جائے اگرچہ خدا کے نزدیک ان کا یہ معاملہ قابل گرفت ومواخذہ ہے مگر یہ سمجھ لینا چاہیے اس کی بارگاہ میں ان کی مقبولیت و برگزیدگی میں کچھ بھی فرق نہیں آیا اور چونکہ وہ خطا پر متنبہ ہوتے ہی اظہار ندامت کے ساتھ رجوع وانابت کا اظہار کر کے شرف قبولیت حاصل کر لیتے ہیں، اس لیے ان کا تقرب الی اللہ اسی طرح قائم ہے۔ چنانچہ ساتھ ہی ان کے واقعات میں یہ فرما کر کے "وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ." اور "فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ." فرما کر ان کی عظمت شان اور رفعتِ مرتبہ کو محفوظ رکھا تا کہ کسی کو مغالطہ نہ ہونے پائے اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس خاص معاملہ سے کسی کج فہم کو کج روی کا موقع ہاتھ نہ آئے۔

مچھلی والے نبی

(2)

اظہارِ عقیدت کا ایک رہنما اصول:

یہاں ایک اور اہم بات بھی سمجھ لینی چاہیے وہ یہ کہ ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ." نیز ارشاد گرامی ہے: "لَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ إِنِّي خَيْرٌ مِّنْ يُونُسَ بْنِ مَتّٰى." یعنی نہ انبیاء کے درمیان افضل و مفضول کے درجات قائم کرو اور نہ مجھ کو یونس بن متّٰی پر فضیلت دو۔ بلاشبہ انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے درمیان درجات کا فرق موجود ہے اور یقیناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام سے افضل ہیں، لیکن درج بالا حدیث سے مراد یہ ہے کسی نبی کو دوسرے نبی پر اس طرح کی فضیلت دینا سخت ممنوع ہے جس سے کسی نبی کی تنقیص لازم آتی ہو۔ یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ پیغمبر کی محبت کے جوش میں دوسرے انبیاء کا مقابلہ کرتے ہوئے ایسی مدح و تعریف کی جائے جس سے دوسرے پیغمبر کی شان کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو، نیز ایسے موقع پر ایسی بحث سے بھی ممانعت کی گئی ہے جن سے یہ مسئلہ مجادلہ اور مناظرہ کی شکل اختیار کر لے کیونکہ ایسی صورت میں احتیاط کے باوجود انسان بے قابو ہو کر دوسرے پیغمبر کے متعلق ایسی باتیں کہہ جائے گا جو ان کی توہین یا تنقیص کا باعث ہوتی ہوں اور نتیجہ میں ایمان کی جگہ کفر لازم کرتی ہوں، لہٰذا اس کا یقین رکھنے کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء ورسل کے سردار اور افضل البشر ہیں، کسی نبی کے مقابلے میں آپ کی ایسی تعریف و توصیف سخت ممنوع ہے جس سے کسی نبی کی تنقیص ہوتی ہو جیسا کہ گاہے گاہے نعت اور میلاد کی مروّجہ مجالس میں پڑھے جانے والے اشعار میں دیکھنے میں آتا ہے۔ دینی سیاسی و جہادی جماعتوں کے کارکنوں کو دوسرے قائدین کے متعلق اور علماء و مشائخ کے شاگردوں اور مریدوں کو دوسروں کے اساتذہ اور شیوخ کے متعلق بھی ایسا ہی رویہ رکھنا چاہیے۔ اس سے بہت سی باہمی رنجشوں، رقابتوں اور جھگڑوں کا سدِّ باب ہو جائے گا۔

پہاڑی کی ٹیکریاں:

حضرت یونس علیہ السلام کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی مدت کے بارے میں بھی مختلف اقوال ہیں: (۱) چالیس دن (۲) سات دن (۳) تین دن (۴) صبح سے شام تک۔ اتنے دن تک آپ بغیر کھائے پیے چاروں طرف سے بند ایک اندھیری کوٹھڑی میں زندہ کیسے رہے؟ بات یہ ہے معجزات ہمیشہ محیر العقول ہوتے ہیں جن کو سننے والے اور دیکھنے والے حیران و ششدر رہ جاتے ہیں، ان کو "معجزہ" کہا ہی اس لیے جاتا ہے عام آدمی ایسا کرنے سے "عاجز" ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے اس کو اپنے پیغمبروں کی حقانیت کی دلیل کے طور پر ظاہر کرتے ہیں، ایسے موقع پر عقل کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے، لیکن چند بزعم خود روشن خیال، عقلیت زدہ اور مغرب سے کچھ زیادہ ہی مرعوب افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو معجزات کو قبول کرنے سے خوامخواہ گریز کرتے ہوئے ان کی عجیب و

غریب تاویلیں کرتے ہیں۔ ایسے لوگ یہ نہیں سمجھتے اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور وہ جو چاہتا ہے، جیسے چاہتا ہے کرتا ہے۔ جدید انکشافات اور سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے حضرت یونس علیہ السلام اور حوت (وہیل مچھلی) کا معجزہ محیر العقول اور نادر الوقوع ضرور ہے، ناممکن الوقوع نہیں۔ سمندری حیات پر تحقیق کرنے والوں نے لکھا ہے دریاؤں اور سمندروں میں پائی جانے والی مچھلیاں ڈیل ڈول اور ہیئت و جسامت کے اعتبار سے اتنی لمبی چوڑی ہوتی ہیں ایک چھوٹا سا جزیرہ معلوم ہوتی ہیں۔ یاد رہے قرآن مجید نے لفظ ''حوت'' استعمال کیا ہے۔ ایک حدیث میں اس کا اطلاق ایک بہت بڑی مچھلی ''عنبر'' پر ہوا ہے جس کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جہادی جماعت کئی دن تک کھاتی رہی پھر جماعت کے امیر نے اس عظیم الجثہ مچھلی کی ہڈی کھڑی کر کے سب سے اونچے قد کے صحابی کو سب سے اونچے اونٹ پر بیٹھ کر اس کے نیچے سے گزرنے کا حکم دیا تو وہ آسانی گزر گئے تھے۔ پھر اس مچھلی کی آنکھ بچھا کر اس پر صحابہ کرام کو بیٹھنے کا حکم دیا تو اس میں 13 افراد سما گئے تھے۔ کراچی والوں نے بحیرۂ عرب کے ساحل پر کئی مرتبہ ایسی مچھلیوں کا نظارہ کیا ہے جنہیں مرنے کے بعد سمندر کی موجیں کنارے پر لا پھینکتی ہیں یہ عظیم دیو ہیکل مچھلیاں کئی کئی فٹ لمبی اور پہاڑیوں کی ٹیکری جتنی اونچی ہوتی ہیں۔ ان کے وسیع شکم میں ایک نہیں کئی انسان بلکہ چھوٹی موٹی کشتیاں بھی سما سکتی ہیں۔

خوش اعتقادی یا دنیوی اغراض:

حضرت یونس علیہ السلام کی وفات اسی شہر میں ہوئی جس کی جانب وہ مبعوث ہوئے یعنی عراق کے شہر ''نینویٰ'' میں اور وہیں ان کی قبر تھی۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں فلسطین میں جو مشہور شہر خلیل ہے اسکے قریب ایک بستی ''حلحول'' کے نام سے معروف ہے۔ اس میں ایک قبر ہے جس کو حضرت یونس علیہ السلام کی قبر بتایا جاتا ہے، اور اسی قبر کے قریب دوسری قبر ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے یہ حضرت یونس علیہ السلام کے والد ''متّٰی'' کی قبر ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق جس قدر واقعات بھی ہم تک پہنچ سکے ہیں وہ سب متفق ہیں حضرت یونس علیہ السلام دوبارہ نینویٰ واپس تشریف لے گئے اور انہوں نے اپنی قوم کے اندر بقیہ زندگی گزار دی، لہٰذا قرین صواب یہی معلوم ہوتا ہے۔ ان کا انتقال نینویٰ ہی میں ہوا اور وہیں ان کی قبر ہوگی جو نینویٰ کی تباہی کے بعد نامعلوم ہوگئی اور بعد میں خوش اعتقادی کے نقطۂ نظر سے ''حلحول'' کی غیر معروف دو قبروں کو حضرت یونس علیہ السلام اور ان کے والد ''متّٰی'' کی قبر بنا دیا گیا۔ آج بھی بعض مشاہیر اولیاء اللہ کے نام سے ایک بزرگ کی متعدد مقامات پر قبریں موجود ہیں اور ایسا تو کثرت سے ہے غیر معروف بزرگوں کے نام سے بنی قبروں کو غلط منسوب کر کے اپنی دنیوی اغراض کو پورا کیا جاتا ہے۔

ظاہر بینی اور حقیقت بینی:

آخر میں ایک اعتراض اور اس کے جواب پر، ہم ان پیغمبر صالح کا ذکر ختم کرتے ہیں۔ یہاں ایک شبہہ یہ پیدا ہوتا ہے اگر باشندگانِ نینویٰ نے ایمان قبول کر لیا تھا تو پھر عذابِ الٰہی کا شکار ہونے والی قوموں کے برعکس خدا کے ان مقبول بندوں کی نسلیں آج بھی پھلتی پھولتی نظر آنی چاہیے تھیں، مگر تاریخ بتاتی ہے ان کا اور ان کا تمدن دنیا سے اسی طرح فنا ہو گیا جس طرح عذابِ الٰہی سے ہلاک شدہ قوموں کا حتیٰ کہ نینویٰ جیسا عظیم الشان اور تاریخی شہر جو آشوری تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، اس طرح دنیا سے مٹ گیا ۲۰۰ ق م تک دنیائے تاریخ میں اس کا صحیح جائے وقوع تک بھی بے نشان اور نامعلوم ہو گیا۔ اس اشکال کا جواب قرآن عزیز کے اس جملے سے نکلتا ہے: "وَ مَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰى حِيۡنٍ." (ہم نے ان کو دنیاوی زندگی سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا ایک وقت تک) یعنی یہ درست ہے قوم یونس علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام کے زمانہ میں مؤمن، عادل اور پاک باز ہو گئی تھی اور ان کو اللہ تعالیٰ نے حیات طیبہ عطا فرمائی، لیکن ان کی اگلی نسل ان کی توحید و سنت والے مبارک طریقے پر قائم نہ رہی اور کچھ عرصہ کے بعد ان میں کفر و شرک اور سرکشی کا وہ تمام مواد پھر جمع ہو گیا جس کی اصلاح کے لیے حضرت یونس علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، تب ان میں اس زمانہ کے اسرائیلی نبی حضرت ''ناحوم'' علیہ السلام مبعوث ہوئے، انہوں نے اگرچہ ان کو بہت سمجھایا اور ہدایت

بلند و بالا دکھائی مگر اس مرتبہ گزشتہ قوموں کی طرح انہوں نے بھی سرکشی اور بغاوت کو زندگی کا نصب العین بنائے رکھا۔ اس وقت وحی الٰہی کی روشنی میں حضرت یونس علیہ السلام نے نینوٰی کی تباہی کی خبر دی اور ان کی پیش گوئی سے ۷۰ برس کے اندر (امریکا اور اہلِ مغرب کے ظلم سے عاجز آنے والے اس مدت کو غور سے بعینہٖ نبی کی پیش گوئی کے بعد بھی کتنا عرصہ لگتا ہے۔) آشوری قوم کا تمدن اور ان کا مرکزی شہر سب بابلیوں کے ہاتھوں اس طرح فنا ہو گئے اس کا نام ونشان تک نہیں رہا۔ بلاشبہ اس میں تاریخ کے طلبہ اور آثار قدیمہ کے شائقین کے لیے عبرت کا وافر سامان ہے مگر انسانی آنکھیں ظاہر بینی کی عادی ہیں، غضب الٰہی کے بربادی کے مقامات بھی لطف وتفریح سے زائد کوئی اثر ہماری مقفل دماغوں پر نہیں چھوڑتے۔

عاد وثمود سے امریکا وروس تک

(حضرت صالح وحضرت ہود علیہما السلام)

جوڑی دار طاقتیں:

عاد وثمود روئے زمین کی دو جوڑی دار طاقتوں کے نام رہے ہیں۔ یہ دونوں الگ الگ اقوام تھیں، لیکن ان کا نام اتنی کثرت سے اکٹھے لیا جاتا ہے کہ یہ بھی بابل ونینوا، فرعون وہامان اور قیصر وکسریٰ کی طرح گویا یک لفظی ضرب المثل بن گیا ہے۔ یہ سرزمین عرب میں گذرنے والی دو مشہور ومعروف، طاقتور اور منظم اقوام تھیں اور ان کا جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ یہ مکہ مکرمہ کی دو مخالف سمتوں میں واقع تھیں اور قبیلہ قریش جو قرآن کریم کا اولین مخاطب تھا، وہ سال میں دو بار جب تجارتی قافلہ بھیجتا تو وہ انہی دونوں اقوام کے مسکن اور آثار قدیمہ سے ہو کر گذرتا تھا۔ قریش تجارت پیشہ تھے اس لیے وہ گرمیوں میں شام کی طرف اور سردیوں میں یمن کی طرف تجارتی وفد روانہ کیا کرتے تھے۔ یہ تجارتی قافلے ان اقوام کی تباہ شدہ باقیات کا مشاہدہ کرتے رہتے اور ان سے متعلق تاریخی داستانیں ان کے درمیان سینہ بسینہ چلتی رہتی تھیں۔

تاریخ کا آئینہ:

آپ جزیرہ نمائے عرب کے نقشے کو نظر بھر کر دیکھیں تو آپ کو سرزمین عرب اور اس سے متصل دائیں طرف فارس اور بائیں طرف روم (یورپ) اور براعظم افریقہ کا کچھ حصہ نظر آئے گا۔ یوں تو دنیا کے جس خطے میں انسانی آبادی پائی جاتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی بھیجے تاکہ وہ انسانوں کو بتا سکیں ان کا رب ان سے کیسی زندگی چاہتا ہے لیکن قرآن کریم میں صرف ان اقوام کا تذکرہ ہے جو سرزمین عرب اور اس کے آس پاس پائی جاتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے: قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے جو ان اقوام سے واقف تھے اور ان کی تباہ شدہ بستیوں کے قریب سے آتے جاتے اور ان کے احوال کو جانتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے دنیا میں جو اقوام بھی تباہ ہو کر قصہ پارینہ بنیں، ان کا برا کردار اور اس میں رچی بسی ہوئی گندی عادتیں تقریباً انہی اقوام جیسی تھیں جن کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔ تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا دنیا میں جہاں کہیں بھی گذشتہ اقوام کے آثار ملتے ہیں وہ انہی بداعمالیوں میں سے کسی ایک میں مبتلا تھیں جو جزیرۃ العرب اور گرد وپیش کی اقوام میں پائی جاتی تھیں۔ اس طرح قصص قرآنیہ درحقیقت ایسا تاریخی آئینہ ہیں جن میں روز اول تا یوم قیامت آنے والی اقوام عالم کے کردار اور انجام کی جھلک دیکھی اور اس سے عبرت حاصل کی جا سکتی ہے۔

"لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔"

قرآن کا خادم علم:

الغرض قرآن کریم میں جن اقوام کا ذکر ہے ان پر قیاس کر کے پورے روئے زمین کی بستیوں اور تمام بنی نوع آدم کے ماضی، حال اور مستقبل کو تولا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے قرآن کریم میں بیان کردہ مضامین میں سے قصص الانبیاء کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ان کے تذکرے سے کوئی انسان یا قوم اپنے ماضی کا تجزیہ، حال کی جانچ اور مستقبل کی اصلاح میں مدد لے سکتی ہے اور ''جغرافیہ قرآنی'' وہ علم ہے جس سے ان قصص کو ان کے صحیح اور مکمل پس منظر کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے، نیز اس کی مدد سے قرآن کریم کی متعدد آیات اور بہت سی احادیث کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، لہٰذا علم جغرافیہ ان علوم میں سے ہوا جو کتاب اللہ کے فہم میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ علوم آلیہ میں اس کا مرتبہ قرآن کریم کے خاص خادموں میں سے ہوتا ہے، لہٰذا اس کو دوبارہ زندہ کرنے اور فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

رہے نام اللہ کا:

اب لوٹ کر عاد و ثمود کے نقشے کی طرف آتے ہیں۔ اس میں تاریخ انسانی کی دو مشہور قوموں کے مسکن کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں سے ایک مکہ مکرمہ کی شمالی سمت اور دوسرا جنوبی سمت میں واقع ہے۔ ان کی تاریخی داستانوں سے سارا عرب واقف تھا اور ان کی سرگزشت فی الواقع ہے بھی اس قابل قیامت تک نئے حالات کے تناظر میں ان کا تذکرہ ہوتا رہے گا۔ آج کے دور ہی کو لے لیجیے اور دیکھیے قرآن کریم کی ازلی صداقتیں کس طرح ہمارے دور پر بھی پوری آتی ہیں۔ قوم عاد کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا اور کوئی شک نہیں ان کی جسمانی طاقت اتنی ہی غیر معمولی تھی جتنی آج امریکا کی مادی طاقت ہے۔ واقعہ یہ ہے تاریخ قدیم میں قوم عاد اور عہد جدید میں امریکا کی غیر معمولی قوت و شوکت کی نظیر نہیں ملتی۔ اسی طرح قوم ثمود فنی کمالات، صناعی اور ہنرمندی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ جو اوزار اس زمانے میں دستیاب تھے آج کے کاریگروں کو دیے جائیں تو یہ ان پہاڑوں میں ایک دڑبہ بھی نہ بنا سکیں جن میں قوم ثمود نے دو منزلہ مکانات تیار کیے تھے اور سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیر کر پوری بستی بسائی تھی، لیکن ہوا یہ ان میں رب تعالیٰ کی شکرگزاری اور اپنی اس طاقت و صلاحیت سے اس کے بندوں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے ناز، فخر، اکڑ، غرور، گھمنڈ، سرکشی اور مستی کے جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ وہ اس کائنات میں کسی کو اپنا ہمسر نہ سمجھتے تھے اور اللہ کے مقدس پیغمبروں کے بار بار سمجھانے کے باوجود ان کے سر پر غرور سے نشہ نہ اترتا تھا۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے اپنی اس طاقت کا مظاہرہ کیا جو ہر طاقت پر غالب اور برتر ہے جس سے نہ قوم عاد رہی نہ ثمود، صرف ان کی ملبے تلے دبی ہوئی بستیوں کے آثار اور ان کے کھنڈروں پر سرسراتی داستانیں رہ گئیں۔ ''رہے نام اللہ کا۔''

شداد کی جنت:

کوئی مانے یا نہ مانے امریکا بھی اسی راستے پر چل رہا ہے جس پر قوم عاد بڑے فخر سے چلی تھی لیکن ایک وقت ایسا آیا وہ واپس آنا چاہتی تھی لیکن اسے راستہ نہ ملتا تھا۔ برطانیہ اس کا ساتھ ایسے ہی دے رہا ہے جیسے قوم ثمود نے سرکشی و نافرمانی میں قدم بہ قدم عاد کی پیروی کی تھی۔ کوئی بعید نہیں مستقبل قریب یہ بعید میں خلق خدا ان کے آزار سے ایسی نجات پائے یہ دونوں عاد و ثمود اور قیصر و کسریٰ کی طرح محض داستانوں کا حصہ رہ جائیں۔ قوم عاد کے مسکن کے قریب ہی ''اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَاد'' کا شہر تھا جسے ''ہزار ستونوں والا شہر'' کہتے تھے۔ اس کے متعلق سورہ فجر میں آتا ہے روئے زمین پر اس کا ثانی نہ تھا۔ لیکن ایک دن ایسا آیا اس کا نام و نشان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ بعض نے اس کا مصداق دمشق کو بعض نے اسکندریہ کو اور بعض نے عدن کے قریب ایک شہر کو بتایا ہے لیکن معجم البلدان (۱/۱۰۰) میں لکھا ہے یہ یمن کے دو مشہور شہروں صنعاء اور حضر موت کے درمیان واقع تھا اور اسے شداد بن عاد نے تعمیر کیا تھا، ماہرین ارض القرآن نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کسی بھی جغرافیائی واقعے کی زبانی تفصیل سننا کافی نہیں ہوتا۔ آنکھوں دیکھی روداد کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ذیل میں حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کے مسکن کا حال اور موجودہ کیفیت ایک جہان دیدہ نامور عالم اور صاحب طرز ادیب کی زبانی سنیے:

''قوم صالح علیہ السلام:

''خیبر کے شہدائے کرام کے مزارات پر حاضری کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا اور کچھ دیر بعد تبوک اور شام جانے والی مرکزی شاہراہ پر پہنچ گئے۔ خیبر تک سڑک کے دونوں طرف پہاڑیوں اور ٹیلوں کے سلسلے نظر آتے رہے، لیکن یہاں سے آگے بڑھے تو دونوں طرف لق و دق صحرا تھا۔ حدِ نظر تک نہ کوئی آبادی نظر آتی تھی، نہ کوئی ٹیلہ، نہ درخت، نہ جھاڑی، نہ سبزہ، نہ پانی، بس چٹیل میدان تھا جس میں زندگی کے آثار دور دور نظر نہیں آتے تھے۔ یہ اسی انداز کا صحرا خیبر سے تبوک تک، بلکہ اس سے بھی آگے اردن کی سرحد کے کئی سو کلومیٹر اندر تک اسی طرح چلا ہے اور تقریباً آٹھ نو سو کلومیٹر لمبا ہوگا۔ اسے ''صحراء النفوذ'' کہتے ہیں اور اس طویل صحرا کا رکے ذریعے میں نے پہلے کبھی قطع نہیں کیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ہمارا یہ سفر سردی کے خوشگوار موسم میں ہو رہا ہے۔ سفر کے لیے نئی نویلی آرام دہ اور مکیف (ایئر کنڈیشنڈ) کار میسر ہے۔ بحمد اللہ اور راستہ بھی شاندار پختہ سڑک ہے اور مولوی عطاء الرحمٰن صاحب ۱۲۰ سے ۱۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کار کو دوڑا رہے ہیں، پھر بھی کہیں ہلکا سا جھٹکا بھی محسوس نہیں ہوتا اور بفضلہ تعالیٰ یہ اطمینانِ خاطر میسر ہے کہ شام تک تبوک پہنچ جائیں گے۔ لیکن یہی لق و دق اور دل الٹ دینے والا صحرا تھا۔ سنبلہ کی قیامت خیز گرمی تھی جس میں آسمان آگ برساتا اور زمین شعلے اگلتی ہے۔ نہ سڑک تھی نہ کاریں، نہ گرمی سے بچنے کا کوئی اور انتظام، ایسی سخت گرمی کے عالم میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانثار صحابہ نے غزوہ تبوک کے موقع پر متواتر دو ہفتے سے زیادہ اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعے اس وحشت ناک صحرا کو قطع فرمایا تھا، جہاں دور دور تک کسی جھاڑی کی کوئی پتی بھی نظر نہیں آتی اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تو اس غزوے میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے لشکر کے نکل جانے کے بعد تن تنہا پیدل روانہ ہوگئے تھے۔ اللہ اکبر! آج ان حضرات کے عزم، حوصلے اور تن فراموشی کے تصور ہی سے پسینہ آتا ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اس شاہراہ پر کچھ دیر چلنے کے بعد داہنے ہاتھ پر ایک موڑ آیا، معلوم ہوا کہ یہاں سے ایک سڑک ''مدائنِ صالح علیہ السلام'' کی طرف جا رہی ہے اور وہ یہاں سے صرف چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ حضرت صالح علیہ السلام کی بستی تھی جہاں قومِ ثمود اپنے تعمیری عجائبات کے ساتھ آباد رہی ہے اور پھر حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب اور متواتر نافرمانیوں کی پاداش میں ان پر لرزہ خیز عذاب نازل ہوا۔ ان کی بستی کے آثار قدیمہ اب تک یہاں نظر آتے ہیں اور ہمارے رفقاء میں سے قاری بشیر احمد صاحب اور عطاء الرحمٰن صاحب انہیں دیکھ چکے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ پہاڑوں میں بنے ہوئے مکانات کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔ ایک خیال یہ تھا کہ یہ بستی بھی دیکھ کر جانی چاہیے، لیکن عذاب الٰہی کی اس جگہ کو باقاعدہ مقصود بنا کر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ روایات میں پڑھا تھا کہ جب تبوک جاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بستی کے قریب سے گزرے تو آپ نے چہرے پر کپڑا ڈال لیا، ناقہ کو تیز فرما دیا اور صحابہ کرام کو تاکید فرمائی کہ کوئی شخص اس کے کسی مکان میں نہ داخل ہو، نہ یہاں کا پانی پیے، نہ اس سے وضو کرے اور جن حضرات نے غلطی یا لاعلمی سے پانی لے لیا تھا یا اس سے آٹا گوندھ لیا تھا ان کو حکم ہوا کہ وہ پانی گرا دیں اور وہ آٹا اونٹوں کو کھلا دیں اور وہاں سے سرنگوں ہوتے ہوئے گزر جائیں۔ آنحضرت کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوا کہ عذاب الٰہی کے نزول کے مقامات سے بحالتِ استغفار گذرنا چاہیے۔ خدا جانے ان مقامات پر روحانی طور پر کیسے زہریلے اثرات ہوں گے جن سے بچانے کے لیے آپ نے اس طرزِ عمل کی تاکید فرمائی۔''

(جہانِ دیدہ: 175-177)

بحراوقیانوس کے پار:

آج امریکا کو اپنے جگمگاتے شہروں، بھرے پُرے تعلیمی اداروں اور خلا کی وسعتوں کو ناپتی ٹیکنالوجی کے ناقابل شکست ہونے پر بڑا ناز ہے لیکن قدرت نے لامحدود مہلت کسی کو بھی نہیں دی۔ کسریٰ پہلے ختم ہوا تھا لیکن قیصر اس کے انجام سے عبرت پکڑنے کی بجائے خود کو زمین کی واحد طاقت سمجھنے لگا تھا۔ آخر کار ایک ۲۷ سالہ نوجوان خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں مجاہدین نے قسطنطنیہ کے قلعے کے دروازے پر اس کا اور اس کی بادشاہت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکا بھی ایسا ہی سمجھتا ہے۔ ہم ہوں گے یا نہ ہوں گے لیکن جس طرح یہ عظیم الشان اقوام بکھر کر رہ گئیں، اسی طرح ایک وقت ضرور ایسا آنے والا ہے جب دنیا والے کہیں گے بحراوقیانوس کے پار ایک قوم رہا کرتی تھی جس نے ناقابل شکست رہنے ریکارڈ قائم کرنا چاہا تھا لیکن آج اس کی کامیابیوں کا ریکارڈ بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

ایک حقیقت ایک مغالطہ

(حضرت ابراہیم علیہ السلام)

بت شکن اور بت فروش:

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نسل انسانی کی بہت برگزیدہ شخصیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنایا اور ان کی اولاد میں بہت ذی مرتبت اور جلیل القدر انبیاء بھیجے۔ آپ کی اللہ تعالیٰ سے محبت، توحید کامل کا اعلیٰ درجہ، دین کے لیے اپنی آل اولاد، گھربار کو قربان کرنے کا جذبہ اور اللہ تعالیٰ کی آپ پر بے شمار نعمتیں قرآن شریف میں بار بار ذکر ہوئی ہیں۔ آپ کی حیات مبارکہ کا مختصر خاکہ یہ ہے آپ کا وطن اصلی ''اُور'' نامی شہر تھا۔ یہ شہر موجودہ مشہور شہر کوفہ کے قریب دریائے فرات کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ اس شہر کے لوگ عربی الاصل تھے۔ اب زمین کھود کر اس شہر کے کھنڈرات برآمد کرلیے گئے ہیں۔ ان سے جو کتبے ملے ہیں ان سے اس شہر کے متعلق اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان اور باشندگان شہر کے دینی و اجتماعی حالات کے متعلق بہت سی باتیں سامنے آئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے یہ لوگ شرک میں بری طرح مبتلا تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر بن تارخ (ایک روایت کے مطابق یہ آپ کے چچا تھے اور عرب چچا کو بھی والد کہتے ہیں) بت گر اور بت فروش تھے۔

دریائے اردن کے پار:

جب آپ کی قوم نے اور خود آپ کے والد نے آپ کی خیرخواہانہ دعوت اور دلسوزی کے ساتھ کی گئی تبلیغ اور بت شکنی کے واقعہ کے بعد پیش کیے گئے ناقابل تردید دلائل کو نہ مانا اور آپ کو آگ میں ڈال کر شہید کرنے کی کوشش کی تو اللہ پاک نے آپ کو اپنی غیبی قدرت سے بچالیا اور آپ اس ناقابل تحمل مشرکانہ فضا سے ہجرت کر کے ''حران'' نامی شہر چلے گئے۔ روانہ ہوتے وقت فرمایا: "اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ." (میں اپنے رب کے پاس جا رہا ہوں، وہی میری رہنمائی فرمائے گا) پھر وہاں سے آپ ملک شام چلے گئے اور دریائے اردن (اس دریا کے ساتھ بہت سے تاریخی حقائق اور قرآنی واقعات وابستہ ہیں) عبور کر کے کنعان (موجودہ فلسطین) میں سکونت پذیر ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے اپنی پیغمبرانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور دعوت و تبلیغ کے لیے یہیں سے اندرون و بیرون ملک آتے جاتے رہتے تھے۔ آپ کے ہمراہ آپ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام بھی تھے جو بحیرۂ میت کے قریب سدوم نامی بستی میں ٹھہرے۔ انکی مناسبت سے اس سمندر کو بحیرۂ لوط بھی کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ اپنی اہلیہ حضرت سارہ کے ساتھ مصر تشریف لے گئے۔ وہاں وہ مشہور واقعہ پیش آیا فرعون وقت نے ان کو بُری نیت سے اپنے پاس بلایا تو اس کا جسم فالج زدگان جیسا ہوگیا اور اس کی بُری نیت اس کے چہرے پر ماردی گئی۔ غرض یہ کہ آپ جزیرۃ العرب کے عربی الاصل باشندے تھے اور آپ کی حیات مبارکہ کے واقعات عراق سے شام و مصر اور وہاں سے حجاز تک پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بیٹے دیے۔ پہلے حضرت ہاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور پھر تیرہ سال کے بعد حضرت سارہ سے حضرت اسحٰق علیہ السلام۔ حضرت اسحٰق اور ان کی اولاد پہلے فلسطین اور پھر مصر میں آباد ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان میں بہت سے جلیل القدر انبیاء پیدا فرمائے اور حضرت اسمٰعیل کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے حضرت ہاجرہ کے ساتھ حجاز کی وادی "غیر ذی زرع" مکہ مکرمہ میں آباد فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود فلسطین میں رہتے تھے اس دوران چار مرتبہ آپ کی مکہ مکرمہ آمد ثابت ہے۔ آپ کا انتقال ۱۷۵ سال کی عمر میں فلسطین کے شہر الخلیل میں ہوا جسے خلیل الرحمٰن بھی کہتے ہیں۔ یہودی اسے حبرون کا نام دیتے ہیں۔ یہیں آپ کی قبر مبارک بھی ہے۔

اندنا سے بابل تک:

اب آیئے! ذرا یہود کی طرف یہ کس فتنے کا نام ہے اور اللہ کی کتابوں کے بعد تاریخ کو مسخ کرنے میں کس قدر مہارت رکھتا ہے؟ موجودہ یہود ان قیدیوں میں سے زندہ بچ جانے والے افراد ہیں جنہیں بخت نصر ۵۸۶ قبل مسیح میں قید کر کے القدس سے بابل لے گیا تھا۔ وہاں انہوں نے اپنی نافرمانیوں سے توبہ کرنے کے بجائے یہ حرکت کی تورات کو اپنی من مانی ترتیب سے مدون کرنا شروع کیا۔ موجودہ توراۃ کو ''توراتِ موسوی'' کی بجائے ''توراتِ یہود'' کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ پھر چونکہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مبارک حیات ہی میں ان کی نافرمانی کرتے رہتے تھے اور آپ کے بعد تو آپ کی تعلیمات سے مکمل طور پر ہٹ چکے تھے اور اس میں بہت کچھ اپنی ضرورت کے مطابق داخل کر چکے تھے اس لیے انہیں اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی تھی وہ اپنی من گھڑت باتوں کو سند بخشنے کے لیے اپنی نسبت کسی عظیم اور بزرگ شخصیت کی طرف کریں، لہٰذا انہوں نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرف خود کو منسوب کرنا اور اپنے بنائے ہوئے دین کو ان کا دین بنانا شروع کیا جبکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ان مردودوں کی پیدائش سے کئی سو سال قبل اس دنیا سے اپنے رب کی مہمانی میں تشریف لے جا چکے تھے۔ یہ لوگ ۵۸۶ قبل مسیح میں غلام بنا کر ذلت کے ساتھ بابل لے جائے گئے اور جناب خلیل اللہ علیہ السلام 1985ء قبل مسیح میں انتقال فرما چکے تھے۔

اس حقیقت کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: ''اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو حالانکہ توراۃ اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئیں۔ پس کیا تم نہیں سمجھتے؟ ہاں! تم وہ لوگ ہو جو ان چیزوں کے بارے میں حجت کر ہی چکے تھے جس کا تمہیں کسی قدر علم تھا تو ان چیزوں کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو جس کا تمہیں سرے سے علم ہی نہیں؟ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی لیکن وہ تو صحیح طریقے والے صاحب اسلام تھے اور مشرکین میں سے بھی نہ تھے۔'' (آل عمران: ۶۰، ۶۶، ۶۷)

ارضِ موعود کی وراثت:

دوسری حرکت انہوں نے یہ کی فلسطین کو اپنا وطن قرار دینا شروع کیا، حالانکہ اگر جناب سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ان کا تعلق تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ کا اصل وطن عراق تھا۔ فلسطین کے علاقے پر یا تو یہاں کے اصل باشندے دعوے کر سکتے ہیں یا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روحانی اولاد۔ چنانچہ یہاں کے اصل باشندے فلسطینی مسلمان ہیں جو نہ کبھی یہاں سے جلاوطن ہوئے نہ کوئی انہیں غلام بنا کر کہیں لے گیا۔ یہ لوگ صحابہ کرام کے ہاتھ پر اسلام لائے اور ابتدائے آفرینش سے یہاں رہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روحانی اولاد تو مسلمان ہیں جو توحید کے قائل اور سنت ابراہیمی پر عمل پیرا جبکہ یہود شرک اور اللہ اور اللہ کے رسولوں پر جھوٹ بولنے کے عادی ہیں۔ پس وہ میراث ابراہیمی کے دعویدار کیونکر ہو سکتے ہیں؟ پھر ایک اہم بات یہ کہ یہودیوں کے قانون کے مطابق وراثت کا حقدار سب سے بڑا بیٹا ہوتا ہے اگرچہ وہ باندی کی اولاد کیوں نہ ہو۔ اس قانون سے بھی ان کا وراثت ابراہیمی پر کوئی حق نہیں رہتا کیونکہ حضرت اسماعیل

علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے تھے۔

سوچ کا فرق:

یہ تھا فلسطین کی وراثت کے اس قضیے کی تفصیل جو بنی اسرائیل کے احمقانہ دعووں اور شیطانی منصوبوں کے سبب عالم اسلام کا سلگتا ہوا اور سنگین ترین مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ اس کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شام کی طرف ہجرت سے ہوئی اور انتہا دو مسیحوں کے درمیان فیصلہ کن معرکے سے ہوگی...... مسیح بن مریم علیہ السلام اور مسیح دجال۔ ایک کے ساتھ توحید پرست امت مسلمہ ہوگی اور دوسرے کے ساتھ شرک اور نافرمانی کی عادی قوم یہود۔ یہ معرکہ بالآخر ارض فلسطین پر برپا ہو کر رہنا ہے اور ہم میں سے جو زندہ ہوگا اس کی نجات اس میں شرکت پر موقوف ہوگی۔ سینکڑوں سال بعد دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر بکھرے ہوئے یہود کا ایک جگہ جمع ہونا اس معرکے کی ابتدا ہے لیکن ہمیں اس کی تیاری کا شعور ہی نہیں۔ افسوس صرف اس پر نہیں ہم توحید و سنت میں کمزور ہوتے جا رہے ہیں بلکہ اس پر بھی ہے یہود نے اپنی خیالی وراثت کو ڈھائی ہزار سال گزرنے کے باوجود نہیں بھلایا (بخت نصر کی القدس پر یلغار کو آج ۲۵۸۸ سال ہونے کو آئے ہیں) لیکن ہم ۵۰ سال میں القدس کی مبارک وزارت کو یکسر فراموش کر چکے ہیں۔ یہود کے لیے اپنی جھوٹے دعووں کی خاطر جان دینا اور لینا آسان ہو چکا ہے، مگر ہم اپنے اسلاف کی سچی میراث سے ایسے غافل ہو چکے ہیں جیسے کبھی وہ ہماری تھی ہی نہیں۔ سوچ اور جذبے کے اس فرق نے انہیں کتنا آگے اور ہمیں کتنا پیچھے دھکیل دیا ہے؟؟؟

گناہ گاروں کی بستی

(حضرت لوط علیہ السلام)

کتاب نصیحت وعبرت:

قرآن کریم میں یوں تو چند ہی اقوام کا ذکر ہے اور وہ بھی جزیرۃ العرب میں یا اس کے آس پاس بسنے والی، بقیہ دنیا جہاں میں ہر علاقے میں موجود قدیم بستیوں اور اقوام ماضیہ کے مسکن کا ذکر صراحۃً تو نہیں لیکن معنوی طور پر ضرور موجود ہے۔ وہ اس طرح جن اقوام کو اللہ رب العالمین نے اپنی آخری کتاب میں ذکرے کے لیے منتخب کیا، ان کی عادات واطوار اور کردار ومزاج کچھ اس طرح کا تھا جو عموماً گمراہ قوموں میں مشترک ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کے عقیدے کو شرک، وہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کا روگ لگا ہوا تھا، کوئی انبیاء علیہم السلام کا نافرمان وگستاخ اور وقت کے نبی کے پاکیزہ طور طریقوں کو چھوڑ کر اپنے علاقے کے رسم ورواج اور آباء واجداد کی جاہلانہ رسومات سے چمٹے رہنا چاہتا تھا، کوئی مالی بدعنوانی میں مبتلا تھا تو کوئی جنسی بے راہ روی کا دلدادہ تھا، کوئی طاقت کے نشے میں بدمست تھا تو کوئی مال ودولت کو بے جا خرچ کر کے یادگاریں بنانے، نام ونمود اور فخر وریا کے مظاہروں میں لگا رہتا تھا۔ یہ سب ایسی روحانی بیماریاں ہیں ان کے جراثیم بنی نوع انسان میں تقریباً مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم میں اگرچہ تمام اقوام عالم کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن دنیا کا کوئی بھی شخص یا قوم وملک چاہے وہ افریقہ میں ہو، آسٹریلیا میں یا کسی اور براعظم میں، وہ چاہے تو قرآن میں غور کر کے اپنے کردار کا تجزیہ اور نصیحت وعبرت حاصل کر سکتا ہے۔

ایک لفظ کی تحقیق:

تو آج ایسی ہی ایک قوم کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس قسم کی گندی بیماریوں میں لتھڑی ہوئی تھی اور ان کے جراثیم اس میں اس حد تک سرایت کر گئے تھے اسے صحیح چیز غلط اور غلط چیز صحیح نظر آتی تھی۔ بحیرۂ میت کے کنارے بسنے والی اس قوم کی طرف حضرت لوط علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیں اور گندی حرکتوں سے توبہ کروائیں۔ یہ قوم ہم جنس پرستی (یاد رہے محققین کے نزدیک تحقیق یہ ہے اس فعل کو لواطت نہ کہنا چاہیے کیونکہ اس سے ایک حرام فعل کے نام میں نبی کا پاکیزہ نام جزو بن جاتا ہے۔ اسے بدفعلی، بداخلاقی وغیرہ کہنا چاہیے) کے علاوہ بھی کئی اخلاق سے گرے ہوئے بازاری قسم کے کاموں کی عادی تھی۔ مثلاً مجالس میں کھلے عام فحش باتوں کا تذکرہ، عورتوں اور مخنثوں (ہیجڑوں) جیسے فیشن کرنا، کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں کنگن وغیرہ پہننا (اللہ تعالیٰ معاف کرے آج کل کے بعض نادان نوجوان کانوں میں بالیاں، گلے میں زنجیر، ہاتھ میں کڑے اور چاندی کے علاوہ دوسری دھاتوں کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں اور بعض ان کڑوں میں خاص تاثیر کا اعتقاد رکھتے ہیں یہ تو اور بھی زیادہ گناہ کی بات بلکہ شرک ہے) کبوتر بازی، مرغ بازی کرنا اور اس پر رقم داؤ پر لگانا، مہمانوں، مسافروں اور پڑوسیوں سے بدسلوکی اور باہر سے آئے ہوئے تاجروں اور سوداگروں کے ساتھ دھوکہ بازی کر کے ان کا سامان لوٹ لینا، وغیرہ وغیرہ۔

اخلاقی گراوٹ اور بدکرداری کے عادی اس معاشرے میں اصلاح احوال کی دعوت دینا نہایت جان جوکھوں کا کام تھا۔ اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ انبیاء کرام اولوالعزم، بلند ہمت کے مالک اور وسیع الظرف ہوتے ہیں لہٰذا سیدنا حضرت لوط علیہ السلام نے ہر قسم کی مخالفت، طعن آمیز باتوں اور دھمکیوں کے باوجود خیر خواہی، ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ دعوت و تبلیغ اور وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رکھا۔

نشہ آور گناہ:

بعض گناہوں کا نشہ ایسا ہوتا ہے اتارے نہیں اترتا، انہیں چھوڑنے کے لیے صبر و ضبط اور ہمت و حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سدوم اور عمورہ کے باسی (یہ ان دو بستیوں کے نام ہیں جہاں زمانہ قدیم کے ہم جنس پرست رہتے تھے جیسا کہ آج کل امریکا کے شہر شکاگو کے بارے میں سنا ہے کہ وہاں اس قماش کے لوگوں کی الگ آبادیاں ہیں) خواہش پرستی میں ایسے غرق ہو چکے تھے گناہ و عذاب کے الفاظ انہیں جھنجھوڑنے کے لیے کافی نہ تھے۔ تقریباً وہی صورتحال تھی جو آج کل یورپ و امریکا کے شہروں میں ہے ہم جنس پرستوں نے اپنے حقوق کی تنظیمیں، کلب اور بستیاں علیحدہ بنا رکھی ہیں اور ایڈز جیسے مہلک اور موذی مرض کے قدرتی عذاب کے نازل ہونے کے باوجود وہ ہوش میں آ کے نہیں دے رہے۔ بالآخر جب حضرت لوط علیہ السلام کی نصیحت و دعوت اور ان کی بدکردار قوم کا انکار اور اپنی بداعمالیوں پر اصرار اس حد تک پہنچ گیا اس کے بعد پھر قدرت مزید مہلت نہیں دیتی تو ان کی بساط لپیٹ دی گئی۔ ان کے چہرے مسخ ہو گئے جیسے کہ ایڈز کے مریض کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس بستی میں تھے وہ تو زلزلے کی لپیٹ میں آئے، پوری آبادی الٹ پلٹ ہو گئی، جو باہر تھے ان پر آسمان سے پتھر برسے اور ایک بدکردار قوم اپنے انجام کو پہنچ کر رہتی دنیا کے لیے عبرت بن گئی۔

''ادنی الارض'' کا مصداق کیا ہے؟

حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت کے دائرہ کار میں جو علاقے آتے تھے وہ موجودہ جغرافیہ میں اردن اور اسرائیل کی سرحد پر واقع ہیں۔ سدوم اور عمورہ نامی بستیاں جو تباہ ہوئیں اسرائیل کی حدود میں واقع ہیں۔ ان کے آثار قدیمہ شہوت پرستی میں حد سے نکلنے والوں کو درس عبرت دے رہے ہیں جبکہ ''صوغر'' نامی بستی جہاں حضرت لوط علیہ السلام کو صبح سویرے ہجرت کر کے جانے کا حکم ملا تھا وہ اردن کی حدود میں آتی ہے۔ یہ دونوں علاقے بحیرۂ میت کی نچلی طرف بجانب جنوب واقع ہیں۔ صوغر اس عجیب و غریب بحیرۂ کے دائیں طرف ہے اور سدوم و عمورہ بائیں طرف۔ اس بحیرہ کو عجیب و غریب اس لیے کہا جاتا ہے اس میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا اور اس کا پانی اتنا بھاری اور کثیف ہے اس میں وزنی چیزیں نہیں ڈوبتیں، لہٰذا تیراکی بہت آسان ہے اور یہ جھیل نما بحیرہ سطح سمندر سے 420 میٹر (تقریباً 1377 فٹ) نیچے ہے۔ جب آدمی اردن کی سرحد پر پہنچ کر اس کی طرف جانا شروع کرے تو ایسی اُترائی محسوس ہوتی ہے جیسے جہاز زمین پر اتر رہا ہو۔ اس نشیبی جھیل کی پستی کی وجہ سے محققین اس کو ''ادنی الارض'' (پست زمین) کا مصداق کہتے ہیں جس کا ذکر سورۂ روم میں آتا ہے۔ ان ماہرین کے مطابق فارس نے روم کو اس نشیبی زمین میں شکست دی تھی اور قرآن کا اس جگہ کو ''ادنی الارض'' کہنا اس کے کلام خداوندی ہونے کی ایک ناقابل تردید نشانی اور معجزہ ہے کیونکہ اس زمانے میں علم جغرافیہ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی جس سے سطح سمندر سے اس جگہ کی پستی معلوم کی جا سکتی۔

بے جان سمندر

موت کا کنواں:

بحرمیت دنیا کا سب سے چھوٹا (لمبائی 50 میل، چوڑائی 3 سے 11 میل، گہرائی تقریباً 1300 فٹ) لیکن سب سے زیادہ عجیب سمندر ہے۔ یہ ایک اعتبار سے بہت مالدار ہے اس سے بہت سی اہم معدنیات خصوصاً پوٹاش اور برومائڈ حاصل ہوتی ہیں لیکن دوسری طرف یہ سمندری جانوروں کے لیے موت کا کنواں ہے۔ اس کے پانی میں موجود نمکیات اور ان کی کثافت کی کسی جاندار کی زندگی کے ساتھ مفاہمت نہیں ہوسکتی۔ دریائے اردن کے شیریں اور فرحت بخش پانی کے ساتھ جو مچھلیاں بہہ کر آتی ہیں، وہ اس کے اندر گرتے ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ یہ ان کے لیے ایسا نمکین حوض ہے جو ان کے جسم کو وصول کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی روح سے آزاد کر کے پانی کی سطح پر اچھال دیتا ہے جہاں ان کے بے جان اور الٹے تیرتے جسم خوراک کی تلاش میں پھرتے آوارہ پرندوں کی چونچ سے ہوتے ہوئے ان کے پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں جب سے سائنس نے کرۂ ارض پر موجود ہر چیز کا جگر چیر کر رازہائے پوشیدہ کو آشکارا کر دیا ہے، اس سمندر کی اہمیت اس اعتبار سے بہت بڑھ گئی ہے اس میں موجود معدنیات بیش بہا حیثیت رکھتی ہیں نیز سیاحت کے اعتبار سے بھی کثیر آمدنی کا ذریعہ ہے اس کے نمکین پانی میں تیراکی اور سمندری تفریح وغیرہ سہل اور پر لطف ہونے کے ساتھ ایک عجوبہ روزگار تخلیق کے ساتھ وقت گزارنے کے شوق کی تسکین کرتی ہے۔ اس طرح دنیا والوں نے اسے اللہ کی یاد تازہ کرنے کی بجائے اپنی حیوانی جبلت کی تکمیل کا ذریعہ بنالیا ہے۔ اس سمندر کے شمال مغربی ساحل کے ساتھ موجود غاروں میں سے عہد قدیم کی بائبل کے کچھ مسودات اور بوسیدہ مخطوطے ایک چرواہے لڑکے کو ملے ہیں جس نے ایک غار میں پتھر پھینکا تو اسے کھیل کھیل میں نادر ترین تاریخی اور مذہبی دستاویزات ہاتھ آ گئیں جن سے ماہرین آثار قدیمہ کے لیے قیاس آرائی کا ایک نیا باب کھل گیا ہے۔

سوکھے پن کا سامنا:

تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کے حامل اس سمندر کو آج کل قوم یہود کے ہاتھوں "سوکھے پن" کا سامنا ہے۔ اسرائیل نے دریائے اردن کے پانی کا رخ موڑ کر اسے آبپاشی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ سالانہ سوا سے ڈیڑھ سو ملین مکعب میٹر میٹھا پانی یہودی اپنی طرف پھیر لیتے ہیں۔ تازہ میٹھے پانی کی آمد کی مسلسل کمی اور عمل تبخیر کے ذریعے کھارے پانی کی مسلسل بخارات میں تبدیلی سے بحرمیت کی حدود سکڑنا شروع ہو گئی ہیں۔ اس کی سطح گزشتہ چند سالوں کے دوران سطح سمندر سے 392 میٹر سے گر کر 472 تک پہنچ گئی ہے۔ اس کی تلافی کے لیے ایک منصوبہ ترتیب دیا گیا ہے، بحراحمر کا پانی خلیج عقبہ سے کھینچ کر طویل پائپ لائن کے ذریعے بحرمیت میں گرایا جائے لیکن قدرت نے نہر اردن کے میٹھے پانی کی آمیزش سے جو نظام ترتیب دیا تھا، بحراحمر کا پانی اس کا متبادل ثابت ہوگا یا نہیں؟ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ بنی آدم نے اپنی طاقت، توانائی اور صلاحیت کو بغیر کسی حد بندی کے استعمال کر کے جس طرح اس کائنات میں تصرف کرنا شروع کیا ہے، اس کے نتائج ہولناک اور بھیانک ہو سکتے ہیں۔ عصر حاضر میں انسانیت کا المیہ یہ ہے، جن لوگوں کے پاس طاقت اور وسائل ہیں وہ کسی آسمانی ہدایت

کے پابند نہیں اور جو آسمانی تعلیمات کے پابند ہیں وہ تحقیق اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے ہیں۔اس صورتحال کو دیکھ کر اہل علم ودانش حیران ہیں اس کرۂ ارض کا مستقبل کیا ہوگا؟اور خدا کے دامن رحمت سے کٹ کر مادیت کی ہوشربا ترقی پر فخر کرنے والا یہ مشت خاک کس انجام کو پہنچے گا؟

بحرِ میت کے متعلق ایک تحقیقی مشاہداتی تحریر ہمیں اردو ادب کے شاہکار سفر نامے ''جہانِ دیدہ'' میں ملتی ہے۔آیئے!اس مردار سمندر کی جیتی جاگتی زندہ تصویر ملاحظہ کرتے ہیں:

''بحرِ میت:

''یہ چھوٹا سا سمندر 50 میل لمبا اور 11 میل چوڑا ہے۔اس کی سطح کا کل رقبہ 351 مربع میل ہے۔زیادہ سے زیادہ گہرائی 1300 فٹ ہے۔1967ء سے پہلے اس کا نصف شمالی حصہ مکمل طور پر اردن میں تھا اور نصف جنوبی حصہ اردن اور اسرائیل کے درمیان بٹا ہوا تھا۔1967ء کی جنگ کے بعد اسرائیلی فوجیں پورے مغربی ساحل پر قابض ہوگئی ہیں۔اور اس کی جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کسی بڑے سمندر سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔اپنے طول وعرض کے لحاظ سے اس کو ایک ''جھیل'' کہنا زیادہ موزوں ہوگا،لیکن چونکہ اس کا پانی خالص سمندری پانی ہے،بلکہ اس کی نمکیات اور کیمیاوی اجزا عام سمندروں سے زیادہ ہیں،اس لیے اس کو''بحر''یا''بحیرہ'' کہا جاتا ہے۔اس سمندر کی دوسری جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام سطح سمندر سے تیرہ سو فٹ نیچے ہے۔یہاں سے قریب ترین سمندر بحرِ متوسط (یا بحرِ روم) کی ''خلیج عقبہ'' ہے،لیکن بحرِ میت اس کی سطح سے 1300 فٹ نیچے واقع ہے اور اس طرح یہ کرۂ زمین کا سب سے نچلا حصہ ہے۔ دریائے اردن اسی سمندر میں آکر گرتا ہے اور آس پاس کی پہاڑی ندیاں بھی اسی میں آکر شامل ہوتی ہیں۔

اب بہت سے جدید محققین کا کہنا یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی وہ قوم جس پر بداعمالیوں کی وجہ سے عذاب نازل ہوا اور جس کی بستیوں کا نام''بائبل''اور تاریخی روایات میں''سدوم''اور''عمورہ''ذکر کیا گیا ہے،اسی بحرِ میت کے آس پاس کہیں واقع تھی۔اگرچہ قدیم مسلمان جغرافیہ نگاروں اور مؤرخین مثلاً علامہ حمویؒ اور بکریؒ وغیرہ نے سدوم اور عمورہ کے حالات بیان کرتے ہوئے بحرِ میت کا کوئی ذکر نہیں کیا،بلکہ علامہ قزوینیؒ نے اپنی کتاب'' آثار البلاد واخبار العباد''میں سدوم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ'' آج اس بستی کی جگہ پر سیاہ پتھر ہی پتھر نظر آتے ہیں۔''جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یا تو خود اس جگہ کا مشاہدہ کیا ہے،یا کسی مشاہدہ کرنے والے سے اس کے حالات سنے ہیں،اس کے باوجود انہوں نے اشارہ تک نہیں دیا کہ اس کے آس پاس''بحرِ میت''کے نام سے کوئی سمندر واقع ہے۔

لیکن مشہور یہودی مؤرخ جوزیفس (josephus) نے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گزرا ہے،اپنی تاریخ میں یہی لکھا تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں سدوم اور عمورہ''بحرِ میت'' کے کنارے واقع تھی۔غالباً اسی بنیاد پر 1924ء میں مستشرقین کی ایک جماعت قوم لوط علیہ السلام کی بستیوں کی تحقیق کے لیے نکلی تھی اور اس نے پورے علاقے کا سروے کرکے یہ حتمی رائے دی تھی کہ ان بستیوں میں سے سدوم،عمورہ اور ذعر بحرِ میت کے جنوبی کنارے پر واقع تھیں اور بانی بستیاں سمندر کے نیچے آگئی ہیں۔کہتے ہیں کہ سمندر کے جنوب مشرقی کنارے پر ہی کھدائی کی گئی تو وہاں سے ان بستیوں کے کچھ آثار بھی برآمد ہوئے۔اسی بنیاد پر آخر دور کے مصری محقق عبدالوہاب النجار نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ سمندر پیدا ہی اس طرح ہوا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا،ان کی بستیاں اُلٹی گئیں تو یہاں سمندر کا پانی نکل آیا۔ورنہ حضرت لوط علیہ السلام سے پہلے یہاں کوئی سمندر موجود نہیں تھا۔اس رائے کی تائید مندرجہ ذیل دلائل وقرائن سے ہوتی ہے:

(1) قرآن کریم نے قومِ لوط کی بستیوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے اہلِ عرب کو یاد دلایا ہے کی یہ بستیاں اس سڑک پر واقع ہیں جن کے ذریعے تم شام آتے جاتے ہو۔ارشاد ہے:''وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُقِيمٍ۔''''اور بلاشبہ یہ بستیاں سیدھے راستے پر واقع ہیں۔''

ایک اور جگہ حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام دونوں کی بستیوں کا ایک ساتھ ذکر فرماتے ہوئے فرمایا: "وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ." "اور بلاشبہ یہ دونوں اہم راستے پر واقع ہیں۔" لہٰذا ان بستیوں کا محلِ وقوع اسی علاقے میں کہیں ہونا چاہیے۔

(2) عبدالوہاب النجار کی یہ رائے کہ یہ سمندر پیدا ہی ان بستیوں کے اُلٹنے سے ہوا، اس لحاظ سے بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ اس سمندر کا کوئی رابطہ کسی بڑے سمندر سے نہیں ہے، اس لیے کوئی غیر معمولی واقعہ ہی اس سمندر کے ظہور کا سبب ہو سکتا ہے۔

(3) اس سمندر کا پانی بھی عام سمندروں کے مقابلے میں بہت بھاری اور اس میں نمکیات بہت زیادہ ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بڑے بڑے سمندروں میں چار سے چھ فیصد تک نمکیات ہوتے ہیں، لیکن بحرِ میت کے پانی میں نمکیات کی کا تناسب 23 فیصد سے 25 فیصد تک ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس سمندر میں دیر تک غسل کر لیتے ہیں، ان کو اپنے جسم سے ان کیمیاوی اجزاء کی چپکاہٹ چھڑانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑتی ہے اور عام پانی سے ایک آدھ مرتبہ نہا کر آسانی سے یہ اجزاء جسم سے نہیں چھوٹتے۔ پانی کی یہ غیر معمولی کیفیت بھی کسی غیر معمولی واقعے کی نشاندہی کرتی ہے۔

(4) اس سمندر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مچھلی سمیت کوئی جانور زندہ نہیں رہتا اور نہ کوئی پودا اُگ سکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جب دریائے اردن یا دیگر چشمے اس سمندر میں گرتے ہیں تو بعض اوقات اپنے ساتھ مچھلیاں بہا کر لے آتے ہیں، لیکن یہ مچھلیاں سمندر میں گرتے ہی فوراً مر جاتی ہیں۔ سائنسی طور پر اس کی توجیہ عموماً یہ کی جاتی ہے کہ یہ اس سمندر کی غیر معمولی نمکیات کا اثر ہے اور ظاہری طور پر شاید یہی سبب ہو، لیکن باطنی طور پر یہ اس عبرت ناک عذاب کے اثرات ہوں تو بعید نہیں جو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر نازل ہوا تھا۔ سمندر کی اسی خصوصیت کی بنا پر اس سمندر کو "بحرِ میت" کہا جاتا ہے اور اس کا یہ نام یونانی دور سے چلا آتا ہے۔ اہلِ عرب اس کو "بحیرہ لوط" بھی کہتے رہے ہیں۔

(5) جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، بحرِ میت کا علاقہ دنیا کا سب سے پست علاقہ ہے۔ بحرِ میت کی سطح عام سطحِ سمندر سے 1300 فٹ نیچے ہے۔ دنیا بھر میں سطحِ سمندر سے اتنا نیچا علاقہ کوئی نہیں ہے۔ مجھے جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو ذہن فوراً قرآنِ کریم کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا جس میں اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط علیہ السلام کی بستیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ: "فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا." "ہم نے اس زمین کے بلند علاقے کو اس کا پست علاقہ بنا دیا۔" عام طور سے اس آیت کا مفہوم یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ بستی اُلٹی گئی تو چھتیں زمین بوس ہو گئیں، لیکن قرآنِ کریم کا یہ معجزہ بیان شاید اس طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کہ صرف بستی کی عمارتیں ہی پست نہیں ہوئیں، بلکہ ان بستیوں کا پورا علاقہ روئے زمین کا پست ترین خطہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ بحرِ میت کے شمال اور مشرق کی جانب کے علاقے تو ہم نے بھی دیکھے کہ وہاں میلوں دُور سے زمین کی سطح بتدریج پست ہوتی گئی ہے۔ زمین کا جو حصہ سطحِ سمندر کے مساوی ہے وہاں علامت کے طور پر بورڈ لگا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہر تھوڑے فاصلے پر سطح کی پستی کی مقدار بتانے کے لیے جگہ جگہ بورڈ لگے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ پست ترین سطح [illegible] آتی ہے۔ اللہ اکبر! اس سے ایک طرف قرآن کریم کا یہ اعجاز سامنے آتا ہے کہ وہ چودہ سو سال پہلے ایک ایسی جغرافیائی حقیقت کو واضح فرما رہا ہے جو صدیوں کے بعد ماہرین پر منکشف ہوئی اور بیان بھی اس طرح فرما رہا ہے کہ اس دور کے لوگوں کو بھی اس بیان کے صاف اور سادہ معنیٰ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوتی۔ اور دوسری طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قوم پر عذابِ الٰہی کا یہ پہلو ایسا صاف ہے کہ قیامت تک دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے سامانِ عبرت بنا رہے گا۔ بستیاں اُلٹ گئیں، آبادی بے نشان ہو گئی، ایک عجوبۂ روزگار سمندر اُبل آیا اور قیامت تک کے لیے یہ زمین دنیا کی پست ترین زمین بن کر رہ گئی: "فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ." "پس یہ ہیں ان کے رہنے کے مقامات جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئے مگر بہت کم اور ہم ہی ان کے وارث تھے۔"

ہزارہا سال پہلے حضرت لوط علیہ السلام نے اسی سرزمین پر کوہِ استقامت بن کر اپنی اس بے ہنگم قوم کی اصلاح کی کوشش فرمائی تھی جو دنیا کی ہر قدر کو نوچ کر اپنی

کمینگی پر مگن تھی۔ یہ قوم اپنے غیر جنسی عمل میں تو دنیا میں بدنام ہے، یہاں تک کہ اس گھناؤنے فعل کا نام ہی اس قوم کی طرف منسوب ہو گیا، لیکن قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ قوم رہزنی کی لت میں بھی مبتلا تھی اور کوئی اجنبی مسافر ان کے یہاں آ جائے تو اس کی جان، مال اور آبرو تینوں خطرے میں پڑ جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی اس اخلاقی گراوٹ اور پستی کو قیامت تک کے لیے یہاں ایک محسوس شکل دے دی گئی ہے کہ یہ علاقہ دنیا کا سب سے پست علاقہ بنا دیا گیا ہے۔

یہ جگہ بڑی عبرت کی جگہ ہے، لیکن یہ دیکھ کر دل لرز اٹھتا ہے کہ اسے ایک سمندری تفریح گاہ بنا لیا گیا ہے۔ ریسٹورنٹ کی حد تک تو شاید بات اتنی ناگوار نہ تھی، لیکن سیاحت کی ہمت افزائی نے یہاں وہ فضا پیدا کر دی ہے جو یورپ کی ساحلی تفریح گاہوں پر عام ہے۔ خاص طور پر مغربی سیاحوں کے ہجوم اور ان کو حکومت کی طرف سے ملی ہوئی بے روک ٹوک آزادی نے اسے بے حیائی کا ایک مرکز بنا دیا ہے... اور اسے دیکھ کر دل دُکھتا ہی رہا کہ جو جگہ فحاشی کے خلاف ذہن تیار کرنے کے لیے عبرت کا بہترین پیغام تھی، وہیں پر بے حیائی کے ایسے مظاہرے ہوتے ہیں کہ شرافت منہ چھپا کر رہ جائے۔

ہم یہاں پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، بلکہ تنگ ہونے کے قریب تھا۔ تلاش کے بعد ایک ''جائے عافیت'' دریافت کر کے جماعت سے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد سمندر کے کنارے تک پہنچے۔ بلاشبہ منظر بڑا حسین تھا۔ سمندر کی نیلگوں موجوں کے اس پار فلسطین کے پہاڑ بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے، لیکن دل کہہ رہا تھا کہ یہ منظر کے حُسن سے لطف لینے سے زیادہ ڈرنے، خوف کھانے اور عبرت حاصل کرنے کی جگہ ہے۔ البتہ یہاں کھڑے ہونے کی کشش ایک اور وجہ سے تھی۔ ملک افضل صاحب نے بتایا تھا کہ مغرب میں سمندر کے پار فلسطین کے جو پہاڑ یہاں کھڑے ہو کر نظر آتے ہیں انہی میں بیت المقدس واقع ہے جو یہاں سے 12-15 میل سے زیادہ دور نہیں ہے، چنانچہ اگر مطلع صاف ہو تو بعض اوقات انہی پہاڑوں کے کسی درمیانی خلا سے مسجد اقصیٰ کے مینارے بھی نظر آ جاتے ہیں۔

مسجدِ اقصیٰ کی ایک جھلک...... دور ہی سے سہی...... دیکھنے کے شوق نے دیر تک یہاں کھڑا رکھا، لیکن مغرب کی طرف کے پہاڑ دُھند کی ہلکی ہلکی تہہ میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس لیے بہت سے زاویے بدلنے کے باوجود منارے نظر نہیں آ سکے۔۔۔ ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ مقدس منارے نہ جانے کب سے امت مسلمہ کو فریاد کے لیے بلاتے رہے ہیں، لیکن جب کوئی ایوبی نہ آگے نہ بڑھ سکا تو وہ روٹھ کر روپوش ہو گئے۔ اب ہم جیسے گفتار کے غازیوں کو وہ اپنے چہرے کی ایک جھلک دکھانے کے لیے بھی تیار نہیں۔ اس تصور سے دل پر ایک چوٹ سی لگی...... کیا نوے کروڑ مسلمانوں پر مشتمل یہ عالمِ اسلام اپنے قبلہ اوّل سے مستقل طور پر صرف نظر کر لے گا؟ کیا محض غم اور غصے کی قراردادوں سے قبلہ اوّل کا حق ادا ہو جائے گا؟ کیا ہماری صفوں سے اب کوئی صلاح الدین ایوبی نہیں اٹھ سکے گا؟ کیا صیہونی استعمار کا اژدہا ہمیں ایک ایک کر کے اسی طرح نگلتا رہے گا؟..... جواب تو ان سارے سوالات کا ایک ہی تھا، اور وہ یہ کہ

فضائے بدر پیدا کر، فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

لیکن اس کو کیا کیجیے کہ دشمن کے جبڑوں میں بیٹھ کر بھی ہمیں ''فضائے بدر'' کے بجائے ''شانزالیزے'' کی فضا پیدا کرنے کا شوق کھائے جا رہا ہے۔ انہی سوال و جواب کی اُدھیڑبُن میں سامنے کے پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو گیا۔ ہم نے مغرب کی نماز اسی ساحل پر ادا کی اور واپس عمان کے لیے روانہ ہو گئے۔''

(جہانِ دیدہ: 208-214)

نمکین اور میٹھی جھیلیں:

بحر میت کی جوڑی دار جھیل ''بحیرۂ طبریہ'' ہے۔ بحیرۂ طبریہ نامی میٹھے پانی کی جھیل ملک شام میں واقع ہے۔ آپ جان چکے ہیں اگلے وقتوں میں شام اس

بڑی زمین کو کہا جاتا تھا جواب لبنان، فلسطین، اردن اور شام چار ملکوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔اس جھیل کا پانی بہترین میٹھا اور توانائی بخش ہے۔یہ تیرہ میل لمبی، نو میل چوڑی ہے۔اس کے مغربی جانب طبریہ نامی شہر واقع ہے جس کی وجہ سے اس کا نام ''بحیرۂ طبریہ'' پڑ گیا۔انگلش میں اسے ''گلیلی'' کہتے ہیں۔شہر طویل زیادہ تر چوڑا کم ہے کیونکہ وہ مغرب کی جانب واقع سیدھی اور بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، جو شہر کے شمال اور جنوب میں سمندر تک پہنچ گئی ہیں۔شہر کے جنوب مغرب میں کوہ ہیرود Herod واقع ہے۔اس کے اور بحرمیت کے درمیان دریائے اردن (جسے نہر شریعة بھی کہتے ہیں) کے ذریعے تعلق قائم ہے۔شام کے سرسبز پہاڑوں سے پانی اس بحیرۂ میں آتا ہے۔یہاں سے دریائے اردن میں بہہ کر بحرمیت میں جا گرتا ہے۔بحرمیت کا پانی سخت کھارا اور بحیرۂ طبریہ کا پانی بہت میٹھا ہے۔پانی کے یہ دونوں ذخیرے ''بحیرۂ'' کی دو اقسام میں سے دوسری قسم میں شمار ہوتے ہیں۔یاد رہے جغرافیہ دان بحیرہ (لفظی معنی: چھوٹا سمندر) کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ایک وہ جو کسی بڑے سمندر کا کم گہرا حصہ ہو جیسے بحر ہند کے اندر بحیرۂ عرب، بحر الکاہل کے اندر بحیرۂ زرد، بحر شمالی کے اندر بحیرۂ بالٹک وغیرہ، ان کو ''بحری بحیرے'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ کسی بڑے سمندر کے ساحلی حصے میں ہوتے ہیں۔دوسری قسم ان بحیروں کی ہے جو خشکی میں گھرے ہوئے ہیں جیسے بحیرۂ کیسپین ایران، ترکمانستان، چیچنیا اور جارجیا کے درمیان واقع ہے اور بحیرہ ارال جو ازبکستان اور قازقستان کے درمیان واقع ہے۔ان کو ''بری بحیرے'' کہتے ہیں۔بحیرۂ طبریہ اور بحرمیت دونوں کا شمار بری بحیروں میں کیا جاتا ہے کیونکہ یہ وسعت میں کم ہونے کے ساتھ چاروں طرف سے زمین سے گھرے ہوئے ہیں۔نمکین اور میٹھے پانی کی ان دو جھیلوں کی تاریخی حیثیت ہمیشہ مسلم رہے گی۔یہ انبیا و اولیا کی سرزمین میں واقع ہیں اور حق و باطل کے درمیان کئی تاریخ ساز معرکوں کے گواہ رہے ہیں۔یہی وجہ ہے تاریخ کی اہم کتابوں مثلاً ابن الاثیر کی الکامل: ۲/ ۳۵۱ میں اس کا ذکر ہے اور اس کے علاوہ مشہور مؤرخین الاصطخری: ۱۰۵، المقدسی: ۲/ ۱۵۴: ناصر خسرو: ص۱۱۶ الادریسی: ۷/ ۱۲۸ نے ان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

کامیاب زندگی کا راز

(حضرت ایوب علیہ السلام)

دینی ودنیوی ہدایت کا خلاصہ:

صبر اور تقویٰ دو ایسی چیزیں ہیں جنہیں دین کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے، جس طرح دیانت وانصاف کو دین کی ان تعلیمات کا خلاصہ قرار دیا جاسکتا ہے جو دنیوی فلاح کی حصول کے لیے ہمیں عنایت کی گئیں۔ صبر کا حاصل مطلب ہے احکامِ الٰہیہ پر جمے رہنا اور تقویٰ کا مطلب ہے گناہوں سے بچتے رہنا۔ دیانت کا مطلب ہے آپ پر جو فرائض لازم ہیں انہیں پوری احتیاط اور ذمہ داری سے ادا کرنا اور انصاف کا معنیٰ ہے جو حقوق آپ پر آتے ہیں ان کی جواب دہی کے لیے کھلے دل سے اپنے آپ کو پیش کرنا۔ اگر ہم صبر وتقویٰ کو زندگی کا شعار بنالیں تو آخرت بن جائے گی اور دیانت وانصاف کو رواج دے لیں تو ہماری دنیا سنور سکتی ہے۔ ما رمضان ہر سال ہمیں اس سبق کے اعادے اور پختگی کا پیغام دیتے ہوئے گذر جاتا ہے لیکن ہمارے غافل دل متوجہ ہو کر نہیں دیتے۔ آیے آج ایک ایسے برگزیدہ پیغمبر کے احوال کا مطالعہ کرتے ہیں جو صبر واستقامت اور ہمت واستقلال کے وصف میں ممتاز تھے، حتیٰ کہ اللہ رب العزت نے ان کی اس صفت کو بیان کرتے ہوئے ان سے محبت کا اظہار فرمایا ہے۔

یوباب، ادب اور ایوب:

حضرت ایوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے تھے جو صبر میں ہمیشہ کے لیے ضربِ المثل بن گئے۔ قرآن مجید اور تورات دونوں میں آپ کا ذکر ہے۔ قرآن کریم میں چار جگہ (سورۂ نساء:۱۶۳، سورۂ انعام:۸۵، سورۂ انبیاء:۸۳۔۸۴، سورۂ ص:۴۱۔۴۴) آپ کا اسم گرامی آیا ہے۔ دو مقامات میں انبیائے کرام کی فہرست میں آپ کا نام ہے اور دو جگہ اجمالی تذکرہ ہے۔ تورات میں ایک پورا صحیفہ ''سفرِ ایوب'' کے نام سے موجود ہے۔ قرآن کریم میں آپ کا ذکر اگرچہ بہت مختصر اور سادہ طرز بیان پر مشتمل ہے لیکن بلاغت ومعانی کے لحاظ سے اس قدر کامل ومکمل ہے واقعات کے جس قدر بھی صحیح اور اہم اجزاء تھے ان کو ایسے معجزانہ اسلوب میں بیان کردیا گیا ہے ''سفر ایوب'' کے ضخیم صحیفہ میں (جو بیالیس ابواب اور کئی سو آیات پر مشتمل ہے) بھی وہ بات نظر نہیں آتی۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے وطن، زمانے اور قوم کے باب میں تحقیق وتفتیش کا نچوڑ یہ ہے آپ عرب تھے۔ بائبل میں لکھا ہے وہ ''عوض'' میں رہتے تھے جس کا صحیح مقام متعین کرنا مشکل ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے وہ جنوبی شام میں دمشق اور ازرعات نامی دو مشہور شہروں کے درمیان البثنیہ نامی مقام ہے۔ بعض نے خلیج عقبہ کے شمال میں بیان کیا ہے، لیکن پہلی بات کئی قرائن کی بنا پر زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے۔ شام کے ایک قصبہ بُصریٰ سے چند میل پر ایک مقام ''تل عشترا'' ہے جسے بائبل میں ''عستارات قرنیم'' کہا گیا ہے۔ (پیدائش ۵:۱۴) اس کے دو میل پر شیخ سعد نامی ایک مسلمان بزرگ کی قبر ہے۔ یہاں ایک پتھر ہے جسے ''ا

ایوب" کہتے ہیں۔ایک چشمہ بھی ہے جو "حمامِ ایوب علیہ السلام" کے نام سے معروف ہے۔ایک خانقاہ "دیرِ ایوب" کہلاتی ہے، پاس ہی ایک مقبرے کا نشان بتایا جاتا ہے جسے حضرت ایوب علیہ السلام اور ان کی اہلیہ کا مقبرہ بتاتے ہیں۔یہ سارے قرائن مل کر اسی خطے کو آپ کا مسکن ہونے کی تائید کرتے ہیں۔(واللہ اعلم بالصواب) آپ کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت اسحٰق و یعقوب علیہ السلام کے درمیان پندرہویں صدی قبل مسیح کا ہے۔عبرانی میں آپ کو "ادب" کہا گیا ہے، تورات میں "یوباب" اور قرآن کریم میں "ایوب"۔

کامیاب زندگی کا راز:

حضرت ایوب علیہ السلام بڑے دولت مند، کثیر الاولاد، معزز اور تندرست تھے۔ہمیشہ خدا کی رضا کے طالب رہے، مسکینوں، فقیروں، یتیموں، بیواؤں اور مظلوموں کی دست گیری کرتے۔پھر ان پر ابتلا کا دور آ گیا۔دولت بھی چھن گئی، اولاد بھی جاتی رہی، تندرستی بھی زائل ہوگئی، اقرباء نے بھی کنارکشی اختیار کر لی۔اس دور میں تین مخلص دوست ان کے پاس آئے اور کہا مصیبت گناہ کے بغیر نہیں آتی حضرت ایوب علیہ السلام نے جواب دیا: راحت ہو یا مصیبت سب خدا کی طرف سے ہے۔قضا و قدر کی مصلحتوں کے اسرار خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں"، لیکن دوستوں کی اس بات نے ان کو بے چین اور مضطرب کر دیا اور آپ خدائے توانا کی درگاہ میں سر بسجود ہو کر دعا گو ہوئے۔آخر مشیت الٰہی نے دورِ ابتلا ختم کر دیا۔قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے خدا نے ان کے لیے غسل اور پینے کا سریع الاثر معدنی پانی کا چشمہ جاری کر دیا، غسل سے بیرونی مرض اور پینے سے اندرونی بیماری ختم ہوگئی۔ان کو اہل و عیال بھی پہلے سے زیادہ دے دیے۔حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ ایسی بزرگ ہستی کی کہانی ہے جو کشائش اور تنگی، تندرستی اور بیماری، اقرباء و احباب کے ہجوم اور بے چارگی، غرض ہر حال میں صابر و شاکر اور اللہ پر ایمانِ کامل کا نہایت دل پذیر نمونہ تھی۔اس سے کامیاب زندگی گزارنے کا یہ سبق ملتا ہے خوشی اور نعمت میں رب تعالیٰ کو نہیں بھولنا چاہیے اور غمی اور مصیبت میں بھی اس کی رحمت کا امیدوار رہنا چاہیے۔وہی ہے جو مریضوں کو شفا، فقر و فاقہ میں مبتلا کو مال و دولت، بے اولادوں کو اولاد اور مصیبت زدگان کو نجات دیتا ہے۔سب کچھ دینے والا بھی وہی ہے اور سب کچھ لے کر آزمانے والا بھی وہی ہے۔اسی کے دامنِ رحمت سے چمٹے رہنا چاہیے۔وہی ہے جو صبر و تقویٰ والوں کے لیے مصیبت سے نکلنے کا ایسا راستہ نکالتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔

حیلہ شرعی و غیر شرعی میں فرق:

آپ کی تیماردار اہلیہ نے ایک مرتبہ آپ کی انتہائی تکلیف سے بے چین ہو کر ایسے کلمات کہہ دیے جو شانِ صبر کے منافی تھے۔آپ نے قسم کھا کر کہا تندرستی کے بعد انہیں اس کی سزا دیں گے چونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نیک بندی تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے صحت کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ حیلہ بتایا سو تنکوں کا ایک گٹھا بنائیں، اس سے ایک مرتبہ ماریں تو سو مرتبہ مارنے کی قسم پوری ہو جائے گی۔اس واقعہ سے جہاں دینی معاملات میں سستی پر اپنے اہل خانہ کی باز پرس اور مناسب تادیب کا جواز بلکہ استحسان معلوم ہوتا ہے، وہیں حیلہ شرعی اور غیر شرعی کا فرق بھی معلوم ہوتا ہے۔جس حیلے کا مقصد حکم شرعی کا ابطال یا بے جا سہولت کوشی اور عیش پرستی ہو وہ ناجائز ہے اور جس حیلے میں شرعی احکامات کے دائرے میں رہ کر کسی مشکل سے بچنے کی کوئی راہ نکالی گئی ہو تو وہ جائز ہے اور عوام الناس پر اگر حرج لازم آ رہا ہو تو انہیں ناقابل برداشت تنگی سے بچانے کے لیے کوئی جائز صورت تلاش کرنا تو مستحسن ہے۔فقہاء کی اصطلاح میں اسے "متبادل کی تجویز" کہتے ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب علمِ شریعت میں رسوخ کے ساتھ احوالِ زمانہ پر بھی بھرپور نظر ہو۔الحمدللہ! فقہائے احناف اس حوالے سے ممتاز مقام رکھتے ہیں، ان کے ہاں "کتاب الحیل" معروف ہے جو ان کی فقہی بصیرت، علوم شرعیہ میں کامل مہارت اور عصرِ رواں کے تقاضوں سے واقفیت کی شاہد عدل ہے۔

شفیق باپ، ہونہار بیٹا

(حضرت یعقوب و حضرت یوسف علیہ السلام)

گیارہ ستارے، چاند سورج:

بیٹے سے محبت فطری چیز ہے لیکن جب بیٹا ظاہری طور پر حضرت یوسف علیہ السلام جیسا حسن و جمال میں یکتا اور اخلاقی اعتبار سے پیغمبرانہ اوصاف کا مالک ہو تو باپ اس کا کس قدر گرویدہ اور دیوانہ ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نرینہ اولاد سے خوب نوازا تھا۔ دس بیٹے ایک بیوی سے تھے اور دو دوسری سے۔ (قرآن شریف میں متعدد مقامات پر بیٹوں کو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت گنوایا گیا ہے لیکن مغرب کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ہمارے یہاں ان کو بھی بوجھ سمجھا جانے لگا ہے) حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ ہجرت کرتے رہے تھے۔ آپ کی پیدائش سرزمین عراق میں بہنے والے دو مشہور دریاؤں دجلہ اور فرات کے سنگم کے قریب ''اور'' نامی شہر میں ہوئی۔ (ان دونوں دریاؤں کے درمیانی زرخیز علاقے کو ''مابین النہرین'' کہتے ہیں۔ یہاں بڑی بڑی قدیم تہذیبیں گزری ہیں جن میں حضرت یونس، حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہم السلام جیسے جلیل القدر انبیائے کرام مبعوث ہوئے) وہاں سے جب آپ کے والد نے توحید کی دعوت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کی تو آپ بھی اپنے والد کی ہمراہی میں ہجرت کر کے حران (یا فاران) نامی مقام میں چلے گئے۔ وہاں سے آپ کا اگلا پڑاؤ فلسطین تھا جہاں آپ کے گھر حضرت یوسف علیہ السلام پیدا ہوئے۔

کنویں سے وزارت تک:

حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مثالی خوبصورتی اور قابل رشک خوب سیرتی سے نوازا تھا جس کی بنا پر قدرتی طور پر ان کے والد کو دوسرے بیٹوں کی بنسبت آپ سے زیادہ محبت تھی۔ اس پر دوسرے بھائیوں کو چاہیے تھا حسد کرنے اور جلنے بھننے کے بجائے حقیقت کو تسلیم کر لیتے اور ان کے والد کو جس چیز سے محبت تھی وہ بھی اپنے والد کی تعظیم اور ان کی خوشنودی کی خاطر اس سے محبت و عقیدت رکھتے اور یوں ان سب کی زندگی خوش و خرم گذرتی، لیکن نیک بختی اور ان کے درمیان شیطانی وساوس اور نفس کی چالیں حائل ہو گئیں اور وہ اپنے محترم والد کی خوشی میں خوش رہنے کی بجائے ان کے نور نظر کو ان سے جدا کرنے پر تل گئے۔ بھائیوں نے مل کر سازش کھیلی۔ جناب یوسف علیہ السلام کنویں میں ڈالے گئے لیکن پھر قدرت خداوندی سے کنویں کی وحشت ناک گہرائی سے نکل کر وزارت مصر کے معتبر و مؤقر عہدے پر پہنچ گئے۔

آزمائش میں کامیابی:

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں کئی سبق آموز باتیں ہیں جس میں سے کچھ تو ایسی ہیں ہر انسان کو اسے اپنی زندگی کے اصولوں میں شامل کر لینی چاہئیں۔ انہوں نے گناہ کی زبردست ترغیب کے باوجود اپنے محسن و مربی سے خیانت نہ کی۔ اس کا صلہ انہیں یہ ملا اللہ تعالیٰ نے غلامی سے نکال کر ایک قسم کی بادشاہی عطاء کی اور وہ اپنے سب گھر والوں کے لیے راحت و رحمت کا سبب بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علومِ نبوت اور خوابوں کی تعبیر کے ساتھ امورِ سلطنت کے انتظام کی غیر معمولی صلاحیت بھی عطا فرمائی اور آزمائش کے مراحل سے سرخ رو ہونے کے بعد جب وہ دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے تو انہوں نے اپنے سارے خاندان کو فلسطین سے اپنے پاس مصر بلا لیا اور اپنے حاسد بھائیوں کو نیچا دکھانے اور ان سے بدلہ لینے کی بجائے ان کا اعزاز و اکرام کیا اور انہیں والدین کے ہمراہ اپنے پاس عزت و توقیر سے ٹھہرایا۔

حیاتِ یوسفی کے چند پہلو:

حاسدین کے حسد پر صبر کرنا، احسان کرنے والوں کے احسان کا جواب وفاشعاری سے دینا، گناہ کی ترغیب اور مواقع کے باوجود اپنے دامن کو داغ آلود نہ ہونے دینا، اپنے محسن کی احسان شناسی اور اس کی عزت کے تحفظ کی پاداش میں جیل کی سختیاں بھی قبول کر لینا، سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے بعد امانت و دیانت کو اپنا شعار بنانا، اقربا پروری، بددیانتی سے نفرت و بیزاری، اپنوں کی جفاؤں پر صبر اور ان کی زیادتیوں کا بدلہ لینے پر قدرت کے باوجود وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عفو اور درگذر سے کام لینا، اپنے والدین کی خدمت، ان سے محبت اور ان کا اعزاز و اکرام غرضیکہ یہ سب کچھ ایسی باتیں ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان سن کر انسان سیکھ سکتا ہے اور ان کا بہترین بدلہ اسے دنیا میں بھی مل سکتا ہے۔ حیاتِ یوسفی کے یہ پہلو اعلیٰ اخلاقی اقدار کے آئینہ دار ہیں، لیکن مغربی تہذیب سے متاثر ہونے کے بعد ہماری زندگیوں سے دھیرے دھیرے نکلتے جا رہے ہیں۔

خوش نصیب باپ بیٹا

(حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام)

ضرب المثل صفات:

پچھلی قسط میں آپ نے دو ایسے باپ بیٹوں کا ذکر پڑھا تھا جنہیں اللہ تعالیٰ نے نبوت جیسی افضل ترین نعمت سے نوازا تھا۔ آج آپ ایسے ہی دو باپ بیٹوں کی زندگی کا مختصر خاکہ ملاحظہ فرمائیں گے جو اللہ تعالیٰ کے مقدس پیغمبر بھی تھے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایسی گونا گوں صفات عطا فرمائی تھیں جو آج تک ضرب المثل ہیں۔ نبوت کے ساتھ بادشاہی، علم و فضل کے ساتھ عدل و حکمت، انسانوں کے علاوہ جانوروں اور جنوں پر حکومت، غرض اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعامات کی تکمیل فرما دی اور ان دونوں نے بھی اپنے مہربان رب کی ایسی شکر گزاری کی نیک بخت انسانوں کے لیے نمونہ قائم کر گئے۔ تاریخ کی یہ مشہور شخصیتیں سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام اور سیدنا حضرت سلیمان علیٰ نبینا و علیہ السلام کے نام سے پہچانی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور عیسائی بھی انہیں اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ ہستیاں سمجھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے یہود و نصاریٰ اپنی بدبختی کے سبب ان بزرگ ہستیوں کے متعلق بھی ایسی باتیں کر جاتے ہیں اور ایسی مذہبی داستانیں گھڑ کر سناتے ہیں جو بے ادبی اور گستاخی کے زمرے میں آتی ہیں اور جن کا وبال ان پر قیامت تک پڑتا رہے گا۔

شکر گزاری کا انعام:

حضرت داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیارے بندے تھے۔ جوانی میں ان کو جہاد کا ذوق و شوق تھا اور اس مقدس عبادت کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان کو خلافت بھی عطا فرمائی۔ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے لوہے کو موم بنا دیا تھا جس کی وجہ سے آپ اپنی انگلیوں سے جہاد کے آہنی آلات بڑی خوبصورتی اور پائیداری سے بناتے تھے۔ ایک سچے مجاہد کی طرح وہ جہاد سے شغف کے ساتھ ذکر و تلاوت اور عبادات کے بھی دلدادہ تھے۔ انہوں نے اپنی عبادت کے لیے مستقل جگہ مخصوص کر رکھی تھی جہاں تنہائی میں اپنے رب کے ساتھ مناجات میں مشغول رہتے تھے۔ وہ جب زبور کی تلاوت اور ذکر کرتے تو انسانوں پر تو ان کی آواز کی اثر انگیزی ہوتی ہی بے مثال تھی، پرندے اور پہاڑ بھی اسے سن کر وجد میں آ جاتے تھے اور ساری فضا محبت الٰہی کے پُرکیف رنگ میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و فضل کے ساتھ دلوں میں اتر جانے والی خطابت کا ملکہ بھی عطا فرمایا تھا اور نبوت و بادشاہت کے ساتھ عدل و انصاف اور رعایا کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کے تنازعات کے منصفانہ اور نپے تلے فیصلوں کی صلاحیت بھی نصیب فرمائی تھی۔ آپ دین و دنیا کی ان نعمتوں اور روحانیت و مادیت کے اس حسین امتزاج کو دیکھتے تو بے ساختہ شکر ادا کرتے اور اپنے اہل و عیال کو بھی ہمہ وقت شکر گزار بندوں کی طرح رہنے کی تلقین کرتے۔ اسی شکر گزاری، احسان شناسی اور عجز و تواضع کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمایا جو آپ کا صحیح معنوں میں جانشین اور وارث

چیونٹیوں کی وادی:

حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت جنات اور انسانوں پر یکساں طور پر تھی۔ بڑے بڑے شریر جن آپ کی خدمت تابع داری کے ساتھ کرتے اور انہیں آپ کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ ہوتی تھی۔ اپنے عظیم والد کی طرح آپ بھی جہاد کے دلدادہ تھے۔ اس کی خاطر آپ نے اعلیٰ نسل کے گھوڑے پال رکھے تھے جن کا آپ معاینہ فرماتے اور نگہداشت کرتے رہتے تھے۔ آپ کی زبردست خواہش تھی آپ کی اولاد نرینہ بکثرت ہو اور وہ سب کے سب اللہ کے راستے کے شہسوار بنیں۔ جہادی سبیل اللہ کے حوالے سے آپ کی آرزوؤں کی تکمیل اس صورت میں ہوئی اللہ رب العزت نے گھوڑوں کی جگہ ہوا کے دوش پر اُڑنے والا تخت اور بیٹوں کی جگہ جنات پر حکومت دی جو آپ کے تابع فرمان تھے اور جس کام میں آپ لگاتے، اس میں لگے رہتے۔ آپ کے عظیم الشان جہادی لشکر میں انسانوں اور جنات کے علاوہ پرندے بھی ہوتے تھے اور انہیں مختلف خدمات سونپی جاتی تھیں۔ آپ چونکہ جانوروں کی زبان بھی سمجھتے تھے، اس لیے بلا تکلف ہُد ہُد پرندے سے لے کر چیونٹیوں تک سے آپ کی گفتگو رہتی تھی۔ جب وادی نمل (چیونٹیوں کی وادی) سے آپ کا عظیم الشان لشکر گذرنے لگا تو وہاں موجود چیونٹیوں کے قبیلے میں سے ایک "عقلمند چیونٹی" نے اپنی ہم جولیوں سے کہا: "سب اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ۔ کہیں لشکر سلیمانی بے خبری میں تمہیں روند نہ ڈالے۔"

شرک سے توبہ:

آپ کے لشکر کا سراغ رساں پرندہ "ہدہد" ایک مرتبہ ملکہ بلقیس کے علاقے کی طرف نکل پڑا اور ان کی سورج پرستی اور عورت کو بادشاہ بنالینے پر متعجب ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام کو اطلاع دی۔ آپ نے ملکہ بلقیس کو ایمان کی دعوت دی اور اپنی اطاعت کا خط بھجوایا۔ جب وہ آ گئی تو اسے آپ نے یہ حقیقت ذہن نشین کرانی چاہی چاند سورج وغیرہ سب خدا تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر ہیں، خود خدا نہیں ہیں۔ اسے یہ سمجھانے کے لیے آپ نے دو مثالوں سے کام لیا۔ ایک یہ اس کا تخت اٹھوا کر اس میں کچھ تبدیلی کر کے اس کے آنے سے پہلے اپنے یہاں لا پہنچایا جب اس نے پہچان لیا یہ تخت اپنی ذات میں وہی ہے البتہ صفت میں بدلا ہوا ہے تو آپ علیہ السلام نے بھانپ لیا اس میں حق سمجھنے کی صلاحیت ہے، کچھ چیزیں خدائی صفات کی حامل محسوس ہوتی ہیں مگر ہرگز خدا نہیں ہوتیں، لہٰذا آپ نے دوسری مثال پانی سے لبالب بھرے ایک حوض کی پیش کی جس کے اوپر شیشے کی چھت تھی اور ذرا بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ ملکہ نے اسے بھی پانی سمجھا۔ آپ کا مقصد پورا ہو گیا بعض مرتبہ کچھ چیزوں میں قدرت الٰہی اپنے پورے جوبن میں جھلکتی ہے مگر وہ چیز ہوتی مخلوق ہی ہے، خود قادر نہیں بن جاتی جیسے کہ اس شیشے کو دیکھ کر پانی کا گمان ہوتا ہے مگر شیشہ بہر حال الگ سے موجود ہے۔ ملکہ بلقیس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ سورج کو خدا سمجھنے کے عظیم گناہ سے توبہ کر کے حق تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کی مستحق بن گئی۔

کہیں ہم بھی:

حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو کچھ عطا ہوا، شکر اور اپنے منعم حقیقی کی احسان شناسی کی برکت سے عطا ہوا۔ آج یہود مردود آپ کی وراثت کا دعویٰ کر کے سلطنت سلیمانی کے حصول کے لیے سرگرداں ہیں، مگر وہ کبھی ان کو مل کے نہ دے گی، اس واسطے یہ سخت ناشکرے اور احسان فراموش ہیں۔ ہمارے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اپنے انبیاء علیہم السلام کے بھی گستاخ اور نافرمان ہیں ان کے بارے میں طرح طرح کے واہیات قصے گھڑ کر اپنی مذہبی محفلوں میں سناتے ہیں جس کی ایک جھلک ان اسرائیلی روایات میں ملتی ہے جو ان کے دنیا پرست عالموں نے حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہم السلام کے بارے میں نقل کی ہیں۔

لہٰذا یہ تو طے ہے ان کم بختوں کو نہ تو تخت سلیمانی ملے گا نہ ہی ہیکل سلیمانی، ان کی قسمت میں فلسطینی مسلمانوں کے پتھر اور جوتے لکھے ہیں، لیکن ہمیں بھی یہ سوچنا چاہیے مملکت ''پاکستان'' مل جانے کے بعد کہیں ہم بھی ناشکری کی اس راہ پر تو نہیں نکل پڑے جس پر چل کر یہودی آج ذلت وخواری کا مرقع بن کر گمشدہ سلطنت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔

شہید باپ اور بیٹا
(حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام)

اچھی تربیت کا اثر:

حضرت زکریا علیہ السلام کا اسم گرامی قرآن شریف میں سات مقامات پر آیا ہے۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی عجیب وغریب معاملات ہوئے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کی تربیت و پرورش اپنے ذمہ لے لی اور اسے بہت حسن وخوبی سے نبھاتے رہے۔ آج کل بے اولاد حضرات بچوں کو گود لیتے ہیں، یہ چیز شرعاً درست ہے لیکن اس بات کی احتیاط کرنی چاہیے لے پالک بچے کے نسب کی نسبت بدلنے نہ پائے اور اس کی ولدیت کا اندراج ٹھیک ٹھیک ہو۔ اسی طرح بعض لوگوں پر یتیم بچوں کی کفالت کی ذمہ داری آپڑتی ہے، یہ بڑا نازک معاملہ ہوتا ہے اور اس میں بہت احتیاط، وسعت ظرفی اور امانت و دیانت کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ آدمی اس آزمائش سے سرخ رو ہو کر نکل سکے، نیز ہر انسان کو چاہیے اپنے گھر کا ماحول گناہوں اور ان کے میلانات پیدا کرنے والی چیزوں سے پاک وصاف رکھے تا کہ بچوں کے ذہن میں نیکی کے رجحانات پرورش پائیں اور وہ غلط خیالات سے آلودہ ہونے سے بچے رہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے گھر کے بابرکت ماحول اور دینی فضا کی برکت سے حضرت مریم علیہا السلام کی سیرت وکردار انتہائی مثالی اور قابل رشک تھا۔ اس پر نبوی تربیت کی گہری چھاپ دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ آپ علیہا السلام کو ذکر وفکر اور عبادت ومناجات میں خوب لطف آتا تھا اور آپ ان جھمیلوں سے جن میں عموماً خواتین دلچسپی رکھتی ہیں، دور رہ کر اپنے رب کی یاد اور آخرت کی تیاری کی فکر میں رہا کرتی تھیں۔

محیر العقول نعمتیں:

بندہ جب اللہ تعالیٰ سے واجبی حد تک تعلق رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا اس سے معاملہ بھی عام لوگوں جیسا ہوتا ہے اور جب وہ اپنے رب سے محبت وشیفتگی اور اس کے دین کے لیے قربانی دینے اور اپنے آپ کو مٹانے میں اپنی بساط بھر کوشش خرچ کر دیتا ہے تو اللہ ربّ العزت کا اس سے سلوک بھی منفرد اور جداگانہ قسم کا ہوتا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام نے نوعمری میں ذکر وشغل کو اپنا معمول بنایا اور لغویات سے منہ موڑ کر اللہ ربّ العزت سے لو لگائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر طرح طرح کے ظاہری انعامات اور نوازشیں شروع ہو گئیں۔ اگرچہ ذکر وعبادت سے دنیوی فوائد یا کیفیات قطعاً مقصود ومطلوب نہیں ہوتیں، لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے بندوں کو دنیا میں بطور کرامت ایسی خلاف عادت محیر العقول نعمتوں سے نوازتا ہے جن سے ان کے دل کو تقویت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پہلے سے زیادہ توجہ اور دلجمعی کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ حضرت مریم کو جب طاعات میں رسوخ حاصل ہوا تو انہیں اللہ تعالیٰ نے غیب سے رزق پہنچانا شروع کیا اور ان کی عبادت گاہ میں جہاں وہ تنہائی میں عبادت کیا کرتی تھیں (خواتین کے لیے مساجد کی بجائے گھر اور گھر کے

بیرونی حصے کی بجائے اندرونی حصہ عبادت کے لیے افضل ہے) ایسے پھل اور غذا پہنچنی شروع ہوگئی جن کا نہ موسم ہوتا تھا نہ وہ اس علاقے میں کہیں دستیاب ہوتی تھیں اور نہ ان کے لانے والے کا پتہ چلتا تھا۔

معمول سے ہٹ کر:

حضرت زکریا علیہ السلام (آپ کی رہائش القدس میں تھی) جب اپنی زیر تربیت بچی کے اس روحانی مقام کو دیکھتے تو انہیں مسرت انگیز تعجب ہوتا۔ وہ حیران ہو کر دریافت فرماتے یہ غذا اور پھل وغیرہ کس طرح آپ کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت مریم فرماتیں یہ اس رب کی طرف سے ہیں جو معمول کے مطابق اور معمول سے ہٹ کر دونوں طرح رزق دینے پر قادر ہے۔ یہ سن کر حضرت زکریا علیہ السلام کو تمنا پیدا ہوئی آسمانوں اور زمینوں کا مالک اور بے حساب قدرت رکھنے والا خدا جب رزق کے معاملے میں اپنے بندوں سے خصوصی معاملہ کر سکتا ہے تو انسان رزق کے حصول کی طرح ایک اور چیز کے معاملے میں بھی بے بس اور محتاج ہوتا ہے یعنی اولاد کی تمنا کی تکمیل، اس چیز میں بھی اپنے رب سے اپنی خواہش کا اظہار کرنا چاہیے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے یہاں اولاد تھی نہ اس کے ظاہری اسباب۔ وہ ضعیف اور معمر ہو چکے تھے، ان کی اہلیہ بھی معمر اور بانجھ تھیں، لیکن بات جب اللہ رب العزت سے مانگنے اور اس کے در سے مراد پانے کی ہو تو اسباب نہ ہونے کا کیا اندیشہ؟ وہ قادر مطلق تو ہر چیز کو محض اپنے حکم سے وجود بخش سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت مریم کے پاس غیر متوقع، غیر موسمی اور غیر معمولی رزق کی فراوانی دیکھ کر انہیں اپنے معاملے کو بھی اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں پیش کرنے کا خیال آیا۔

فرمانبرداری کا صلہ:

رب تعالیٰ ہر وقت، ہر جگہ موجود ہے اور ہر بندے کی دُعا سنتا اور اس کی عاجزی وزاری پر کان دھرتا ہے۔ اس کے حکیمانہ فیصلوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔ اس کی حکمت کبھی اسی میں ہوتی ہے بندے کو اس کی مراد فوری طور پر دے کر خوش کر دے، کبھی اسے اپنے بندے کا مانگنا اچھا لگتا ہے اور وہ اسے مزید مانگتے دیکھنا چاہتا ہے۔ کبھی وہ اس چیز کو اس کے لیے اچھا نہیں سمجھتا لہٰذا اس کے عوض دوسری بہتر چیز دنیا یا آخرت میں دے دیتا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اس در کو کھٹکھٹایا تھا جہاں سے کوئی نامراد نہیں جاتا، بس ضرورت صبر و استقلال کی اور ایک داتا کے دامن سے چمٹے رہنے کی ہوتی ہے، چنانچہ بارگاہ رب العالمین کی طرف سے قبولیت کا جواب آ گیا اور انہیں بڑھاپے میں بانجھ بیوی کے بطن سے بیٹے کی خوشخبری سنائی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس فرزند کے عطا کرنے میں اپنی قدرت کا انوکھا انداز دکھایا تھا، اسی طرح ان کا نام بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا تلقین کیا جو اس سے پہلے کسی کا نہ تھا (یعنی یحییٰ جسے عبرانی میں یوحنا کہتے ہیں) اور ان کے اخلاق و اطوار بھی ایسے تھے جو مثالی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور اپنے والدین کی نافرمانی سے انتہائی دور رہنے والے تھے۔ انہیں بچپن سے علم و حکمت کی نعمت عطا ہوئی۔ وہ رحمدل، پرہیزگار، والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے، ان کی منشاء و مرضی پر چلنے والے اور ان کی اطاعت کرنے والے تھے۔ انہیں نفس کی خواہشات پر مکمل قابو حاصل تھا۔ نہ انہوں نے شادی کی نہ کبھی گناہ کا میلان ان کے دل میں پیدا ہوا۔ دنیا میں بھی ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و سلامتی نازل ہوئی، دنیا سے جاتے وقت بھی اور آخرت میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت و سلامتی کے مستحق ہوں گے۔ اللہ کا حق پہچاننے اور والدین کی خدمت و اطاعت کا صلہ بلاشبہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

ایک کے ہو کر:

حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام کی سوانح حیات حکمت کی بہت سی باتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ عام طور پر لوگ جب اپنی کسی ایسی خواہش کو جسے وہ ناگزیر سمجھتے ہیں پورا ہوتے نہیں دیکھتے تو ادھر ادھر کسی آستانے پر قسمت آزمائی کرتے ہیں یا ٹونوں ٹوٹکوں میں لگ جاتے ہیں، حالانکہ سچے بندوں کی

علامت یہ ہے وہ وفادار اور یکجائی ہوتے ہیں اور ایک کے ہو کر رہتے ہیں، راحت و خوشی میں بھی اور مصیبت و رنج میں بھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو جب بیٹے کی خوشی نصیب ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ ہی کا شکر ادا کیا اور جب ان کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام حق بات کہنے کی پاداش میں شہید کئے گئے (کیونکہ انہوں نے بادشاہ وقت کو منع کیا تھا اپنی بھتیجی سے شادی نہ کرے) تو انہوں نے صبر اور حوصلہ سے کام لیا۔ بیٹے کے بعد وہ خود بھی شہید ہو گئے۔ یہود نے ان کو اس درخت سمیت آرے سے زندہ چیر دیا جس کے شگاف میں وہ داخل ہوئے تھے مگر انہوں نے اُف تک نہ کی۔ اللہ کے نیک بندے ایسے ہی شاکر و صابر ہوتے ہیں جب نعمت ملے تو صرف اس ایک ذات کی شکر گزاری کرتے ہیں اور جب تکلیف آئے تو بھی اسی کے بھروسے پر صبر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت کے مستحق ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد تو انہیں ہمیشہ ہمیشہ کا سکون اور راحت نصیب ہو جاتی ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کے بعد ان کا سر مبارک جہاں دفن کیا گیا تھا، روایات کے مطابق وہ جگہ آج دمشق کی مشہور عالم ''جامع مسجد اموی'' کے مرکزی ہال میں ہے۔

فتنۂ مال کی تباہ کاریاں

(حضرت شعیب علیہ السلام)

انسانوں کے مشترک امراض:

اس سے قبل یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ قرآن کریم میں جن پانچ جلیل القدر انبیائے کرام علیہم السلام کا بار بار تذکرہ آیا ہے، اس کی خاص وجہ ہے۔ ان پانچ اقوام میں ایک قدر مشترک ہے۔ انسانوں کو جو عمومی طور پر پانچ بڑے امراض لاحق ہوتے ہیں اور پورے معاشرے میں پھیل کر ناسور بن جاتے اور انسانیت کی تباہی کا ذریعہ ہوتے ہیں، یہ قومیں ان میں مبتلا تھیں۔ دنیا میں جہاں جہاں انسانی آبادی ہے وہ ان پانچ بڑے اور ستر چھوٹے امراض میں مبتلا ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ان امراض میں مبتلا ان اقوام کا تذکرہ اسلوب بدل بدل کر مختلف انداز میں اس لیے کیا ہے کہ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے والوں کو ہر طرح کے خبیث امراض سے چھٹکارا حاصل کرنے میں مدد ملے۔ یہ امراض دنیا کی دیگر اقوام میں بھی تھے، مگر ان پانچ اقوام کا انتخاب اس لیے ہوا کہ ان کی طرف بھیجے جانے والے انبیائے کرام اس قدر اولوالعزم تھے کہ ان کا تذکرہ، ان کا وعظ و نصیحت، ان کا حد درجے کا صبر و شکر اور قوم کے نامناسب رویے پر عفو و درگزر، یہ سب کچھ انتہائی مثالی ہے اور اس کے بعد کسی اور قوم کے تذکرے کی ضرورت نہیں رہتی۔

ان پانچ بڑے امراض کو مختصراً دہرالیا جائے تو آگے چلتے ہیں: (1) کفر و شرک (قومِ نوح)۔ (2) جسمانی طاقت پر غرور و گھمنڈ (قومِ عاد)۔ (3) علم و فن پر ناز اور فخر (قومِ ثمود)۔ (4) فتنۂ مال میں مبتلا ہو کر حلال و حرام کی تفریق کھو بیٹھنا (قومِ شعیب)۔ (5) جنسی بے راہ روی، فحاشی و عریانی اور بے حیائی میں حد سے گزر جانا (قومِ لوط)

فتنۂ مال کی دو شاخیں:

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم جس فتنے میں مبتلا تھی، آج کی محفل میں اس کا تذکرہ مقصود ہے۔ آج کل اس فتنے کا دور دورہ ہے بلکہ آج کے دور کا دوسرا نام ہی مادیت پرستی، افادیت پرستی اور سرمایہ داری کا دور ہے۔ اس فتنے کی دو شاخیں تھیں۔ دونوں کی جڑ ایک تھی لیکن آگے شاخیں الگ الگ تھیں۔ قوم کی بڑی مچھلیاں ایک طرح کی بدعنوانی میں مبتلا تھیں اور چھوٹی مچھلیاں دوسری طرح کی فنکارانہ حرام خوری کو اپنی پہچان بنائے ہوئے تھیں۔ حُبِّ مال ایک ایسا مرض ہے جو شرفا اور سفلہ لوگوں میں الگ الگ شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ قوم کا تاجر طبقہ جب حرام حلال کی تمیز کھو بیٹھتا ہے تو وہ ناپ تول میں کمی، دھوکا دہی اور ملاوٹ کو اپنا شیوہ بنالیتا ہے۔ ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کو کاروبار کی ترقی کے لیے لازم سمجھنے لگتا ہے۔ سود، جوا، ناجائز شرطوں والے نئے نئے منصوبے اسے سوجھتے ہیں۔ یہ شرفا کے کرتوت ہوتے ہیں۔ وہ ان چیزوں میں اتنی مہارت حاصل کر لیتے ہیں کہ اچھے بھلے عقل مند دھوکا کھا جائیں اور ان کی یہ بری عادتیں اتنی پکی ہو جاتی ہیں کہ پھر قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ دوسری طرف اس مفاد پرست معاشرے میں جو جاہل، غیر مہذب اور ان پڑھ ہوتے ہیں وہ ڈاکہ زنی، چوری چکاری اور

رہزنی کو پیشہ بنالیتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے کے مہذب اور پڑھے لکھے لوگ ہوں یا تہذیب سے عاری اور جاہل عوام، سب فتنہ مال کے ہاتھوں اپنی دنیا وآخرت برباد کرڈالتے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے یہ دو طبقے بالکل اسی طرح حرام خوری، بدعنوانی کی ان دو قسموں میں مبتلا تھے جس طرح آج ہم میں جو جتنا پڑھا لکھا ہے وہ اتنا مہذب لٹیرا ہے اور جو جتنا اَن پڑھ ہے وہ اتنا خونخوار ڈاکو ہے۔ مادیت زدگی اور سرمایہ پرستی کے دو پاٹوں میں پستی ہوئی آج کی انسانیت ''فساد فی الارض'' کا قابلِ رحم نمونہ بن گئی ہے۔

دو معزز داماد:

حضرت شعیب علیہ السلام کا نسب اور وطن کیا تھا؟ ذرا یہ سمجھ لیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں: سارہ۔ ہاجرہ۔ قطورا۔ اللہ تعالیٰ نے تینوں سے نبوت کی تین شاخیں جاری کیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''ابوالانبیاء'' کا شرف دے کر ان پر اپنا انعام مکمل کیا۔ (1) حضرت سارہ سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام اور پھر ان سے بنی اسرائیل کے متعدد انبیائے کرام علیہم السلام کا سلسلہ چلا جو شام و فلسطین میں پھیلا۔ (2) حضرت ہاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور ان سے عرب میں امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ (3) قطورا سے مدین پیدا ہوئے۔ ان سے آگے چل کر اہلِ مدین کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوکر تشریف لائے جن کو اپنے چچازاد بنواسرائیل کے دو جلیل القدر پیغمبروں کا خسر بننے کا شرف اور اعزاز حاصل ہوا۔ یعنی قدیم زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آخر زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ صحیح حدیث شریف کے مطابق سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمانوں سے عزت و اکرام کے ساتھ زندہ تشریف لائیں گے اور یہودیوں کو ان کے سربراہ اعظم ''دجال اکبر'' سمیت خاتمہ کرکے خلافت الٰہیہ قائم کریں گے تو اس کے بعد قوم شعیب میں نکاح بھی فرمائیں گے۔ اس طرح اس قوم کو ان دو انبیائے کرام علیہم السلام کے سسرال ہونے کا شرف بھی حاصل ہوگا۔

شہری اور دیہاتی طبقہ:

یہ تو نسب ہوا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا وطن موجودہ جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے سعودی عرب کی حدود میں تبوک کے قریب بحراحمر کے کنارے تھا۔ قرآن کریم میں کہیں ان کو قوم مدین کی طرف بھیجنے کا ذکر ہے اور کہیں ''اصحاب الایکہ'' یعنی جھنڈ والوں کی طرف۔ مفسرین بھی اس بارے میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ دونوں ایک تھے یا الگ؟ جمہور نے قرآن کریم کے انداز بیان سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ دو الگ الگ بستیاں یا گروہ تھے۔ اگرچہ ان کا زمانہ بھی ایک تھا اور مذہب واخلاق اور جرائم بھی ایک جیسے تھے، لیکن ان دونوں اقوام کا حضرت شعیب علیہ السلام سے سوال و جواب، طرزِ گفتگو اور رویہ، پھر آخر میں سرکشی اور بربادی نیز تباہی اور عذابِ الٰہی کا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ اس لیے راجح قول کے مطابق یہ دونوں الگ الگ تھے۔ اہلِ مدین نسبتاً مہذب، متمدن اور شہری خصوصیات کے حامل لوگ تھے اور اصحاب الایکہ (یعنی جھنڈ یا بَن والے) دیہاتی قسم کے لوگ تھے جو ایسے سرسبز و شاداب علاقے میں رہتے تھے جس میں چاروں طرف ہرے بھرے درخت اور جھاڑیاں پودے ہوتے ہیں۔ یہ اتنے گھنے ہوتے ہیں کہ باہر کھڑے ہوکر نظارہ کرنے والے کو یہ انسانی آبادی کے مسکن کے بجائے سرسبز درختوں کا خوبصورت جھنڈ نظر آئے گا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا تعلق چونکہ قوم مدین سے تھا اس لیے قرآن کریم میں انہیں ان کا بھائی کہا گیا۔ اصحاب الایکہ سے خاندانی نسبی تعلق نہ تھا اس لیے ان کا بھائی نہیں کہا گیا۔

خطیب الانبیاء کی نصیحتیں:

لیجئے اس قوم کے جرم اور اس خطرناک جرم کے انجام کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس دُعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مال کے فتنے میں اور اس دنیا کی بے جا محبت

میں مبتلا ہونے سے محفوظ فرمائے۔ حضرت شعیب علیہ السلام جب اس قوم کو حق کی دعوت دینے نکلے تو دیکھا کہ عقیدے کی خرابی کے ساتھ وہ مالی بے ضابطگیوں اور ڈاکہ زنی ور ہزنی دونوں خرابیوں میں مبتلا ہے جن میں عموماً سرمایہ پرستی کا شکار قوم کے اعلیٰ وادنیٰ دو طبقے مبتلا ہوتے ہیں۔ آپ نے ان کے عقیدے کی اصلاح فرماتے ہوئے انہیں توحید کی دعوت دی اور اس کے ساتھ ساتھ لین دین میں ایمانداری اپنانے اور دوسروں کا مال ناحق ہتھکنڈوں سے کھانے سے بچنے کی تلقین کی۔ آپ کے جاندار بیانات اور مختلف انداز سے کی گئی دلسوز نصیحتوں کو قرآن کریم نے جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے آپ کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے پھر قوم شعیب نے جس کے منہ کو حرام لگ گیا تھا اور وہ اسے چھوڑنے یا حرام سمجھنے پر بھی تیار نہ تھی جس طرح آپ کو گھڑے گھڑائے جواب دیئے، اس کے بدلے میں آپ نے جس حکمت اور نرمی سے انہیں سمجھایا، وہ الفاظ بھی آپ کی قوت بیان کے شاہد ہیں۔ آپ کی اسی قادرالکلامی کی بناپر آپ کو ''خطیب الانبیاء'' کا لقب دیا گیا ہے۔ آپ کی اور آپ کی قوم کی یہ کشمکش، آپ کی خیر خواہی اور قوم کی سرکشی کا تذکرہ سورۂ اعراف، ہود، شعراء میں تفصیل سے اور حجر و عنکبوت میں اختصار سے کیا گیا ہے۔ ان سورتوں میں آپ کا اسم گرامی دس جگہ مذکور ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کا خلاصہ نکالا جائے تو وہ انسانی کردار کے اس کمال کی شکل میں نکلتا ہے جس کے مطابق انسان کا اصل جوہر یہ ہے کہ وہ ہر چیز میں، ہر موقع پر، زندگی کے مختلف رویوں میں عدل وانصاف کا ترازو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ خدا اور اس کے بندوں کے تمام حقوق و فرائض کو اپنے اپنے موقع محل کے مطابق ان کے وقت پر ادا کرے۔ دینی معاملات ہوں یا دنیوی، ملکی لین دین ہو یا بین الاقوامی تجارت، ڈنڈی نہ ماری جائے۔ کسی کا حق نہ کھایا جائے۔ کھلا یا چھپا ظلم نہ کرے اور ان چیزوں کو اپنے کردار کا جز بنانے کے ساتھ پورے ایمان اور اعتماد سے دوسروں کو بھی اس کی دعوت دے۔ اگرچہ آوے کا آوا بگڑا ہوا کیوں نہ ہو؟ اگرچہ سارا نظام ہی غلط رُخ پر چل رہا ہو۔ ساری دنیا ہی ناجائز کر رہی ہو، مگر اس کے باوجود نہ خود حرام خوری میں مبتلا ہو نہ ملامت اور طعنوں سے گھبرا کر دوسروں کو اس سے روکنا چھوڑے۔

سامراجی نظام کا انجام:

قرآن کریم ہم سب پر احسان کرتے ہوئے تاریخ کے ایک ورق سے ہم کو آگاہ کرتا ہے کہ قوم شعیب جیسی سرمایہ دار، حیلے ساز اور دھوکا دہی و چرب زبانی میں ماہر قوم دو قسم کے عذابوں میں مبتلا ہوئی۔ ایک طرف تو انہیں زلزلے نے آگھیرا اور جب وہ گھبرا کر باہر دوڑے تو آسمان سے برستی آگ ان کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ کل کے سرمایہ دار و سرمایہ پرست، سرکش و مغرور آج گھٹنوں کے بل اوندھے اور جھلسے ہوئے پڑے ہیں۔ اللہ معاف کرے مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام جو سود، جوے اور ناجائز شرائط والے کاروبار پر چل رہا ہے، جس میں ملٹی نیشنل کمپنیاں قوم شعیب کے مغرور تاجروں کی طرح اجارہ داری قائم کر کے مقامی چھوٹی کمپنیوں کو ناکام بناتی، ان کا دیوالیہ نکالتی اور عوام کا خون چوستی ہیں۔ یہ سارا نظام ہم نے بھی تمام تر خرابیوں کے ساتھ اپنایا ہوا ہے۔ سودی بینک بڑی آن بان سے کھلے ہوئے ہیں۔ جوے کی اسکیمیں اور لاٹریاں زور وشور سے چل رہی ہیں۔ ملاوٹ فن اور دھوکا فیشن بن چکا ہے۔ دنیا والوں کی غلط کاریوں کو اپنی کمزوریوں کا بہانہ بنایا جا رہا ہے۔ تجارتی اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ قوم شعیب ظاہری دین داری اور عبادات کی کسی حد تک ادائیگی کی قائل تھی، مگر مالی بے ضابطگیوں کو حرام سمجھنے یا انہیں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ ہم نے بھی پارسائی کا معیار صرف عبادات کو بنالیا ہے اور روزی کے اندر حرام کا عنصر یا حرام کا شبہ پیدا ہونے سے بچنے کا اہتمام نہیں۔ رزق حلال کے اہتمام کے بغیر عمل صالح بھی قبول نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ ہم حرام اور مشکوک ذریعۂ آمدنی کے ساتھ سوکھا بھانامۂ اعمال لیے ہوئے پھرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فتنۂ مال سے نجات دے اور اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ فرمائے۔

ایک بڑی خرابی جو ہم میں در آئی ہے وہ ''تجارتی قوانین'' کی طرح ''تجارتی اخلاقیات'' کی دھجیاں بکھیرنا ہے۔ ایک ہے شرعی تجارت کا قانون، جس کی ہر حال میں پابندی کرنی ہے اور جس کی خلاف ورزی سے سودا فاسد اور آمدن ناجائز ہو جاتی ہے۔ کم نہ تولو۔ جھوٹ نہ بولو۔ وعدہ پورا کرو۔ ترازو کو ٹیڑھا یا گز کو چھوٹا

...جو کہا ہے وہ فراہم کرو۔ زبان کا اعتبار خراب مت کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک ہیں شریعت کی سکھائی ہوئی تجارتی اخلاقیات جن کو اپنانے سے برکت کا وعدہ
ہے اور ... جن کی خلاف ورزی سے سودے میں کراہت پیدا ہوتی اور رزق میں سے برکت اُٹھ جاتی ہے۔ مثلاً: کسی کے سودے پر سودا نہ کرنا، منڈی میں آیا ہوا سارا
...زید کر اپنے پاس ذخیرہ نہ کرنا، قیمتوں کے دام گھٹانے بڑھانے کے خفیہ حربے اختیار کرنا، اُدھار واپس مانگتے وقت مقروض کی صلاحیت کو مدنظر رکھ کر نرمی نہ
...اجارہ داری سے بچنا جس سے چھوٹے دکانداروں کو نقصان ہو یا ان کو مال بیچنے اور محنت کرنے میں فائدہ ہی محسوس نہ ہو۔ گویا کہ ایک لازمی پابندیاں
... ایک اختیاری پابندیاں ہیں۔ ہمیں نہ ان کا علم ہے اور نہ ان کے پاس رکھنے کا شعور ہے۔ نہ ہم نے اپنے مذہب سے خوبیاں سیکھیں نہ غیروں کو دیکھ کر سبق
... اپنے ماحول کی گندگیوں پر بھی اڑے ہوئے ہیں اور مغرب کی برائیاں بھی چن چن کر اپنے ہاں منتقل کر رہے ہیں۔
... موجودہ صورتِ حال اجتماعی توبہ اور حقوق کی ادائی کا عہد کرنے کا تقاضا کرتی ہے ورنہ ہماری نفسیات تو قوم شعیب سے ملتی جلتی ہیں۔ ہمارے ''طبقۂ شرفاء''
... طریقے سے دولت کے حصول کو اپنا حق سمجھنے اور ہمارے جاہل اور ناخواندہ معاشی مسائل کا شکار عوام ڈاکہ وغارت کو اپنا پیشہ بنانے لگے ہیں۔ خدا نہ کرے
... ان جیسا ہو جائے۔ اللہ کرے کہ ہم ''پاداشِ عمل'' یا ''قانونِ مکافاتِ عمل'' سے پہلے سچی اور حقیقی توبہ کرلیں۔
... ہم شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے شیریں بیانِ قلم اور دلنشین اندازِ بیاں سے استفادہ کرتے ہوئے آپ کو وادیٔ
شعیب کی ایک جھلک دکھاتے ہیں:

''حضرت شعیب علیہ السلام

وادیٔ شعیب میں:

''یہاں سے نکل کر ہماری اگلی منزل وادیٔ شعیب علیہ السلام تھی۔ یہ ایک نہایت خوبصورت وادی ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے کئی پہاڑی راستے طے کرنے
پڑتے ہیں۔ سڑک ایک سرسبز پہاڑ کا طواف کرتی ہوئی چوٹی تک پہنچتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف انجیر اور زیتون کے خوشنما درختوں کی قطاریں سڑک پر
جھکتے ہوئے ہیں اور دھوپ چھن چھن کر سڑک تک پہنچتی ہے۔ بالکل اُوپر پہنچنے کے بعد یہ وادی شروع ہوتی ہے۔ اسی وادی میں حضرت شعیب علیہ السلام کا مزار
ہے۔

جس جگہ یہ مزارِ مبارک واقع ہے وہ آج کل ایک فوجی مرکز کے طور پر استعمال ہو رہا ہے اور ممنوعہ علاقوں میں شمار ہوتا ہے، لیکن ملک افضل صاحب خصوصی
اجازت لے کر ہمیں اندر لے گئے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہم دائیں جانب مڑے تو ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ اس مسجد کے اندر حضرت شعیب علیہ السلام
کی قبر ہے۔ یہاں حاضر ہو کر سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ قبر کی لمبائی یہاں بھی حضرت یوشع علیہ السلام کے مزار کی طرح غیر معمولی تھی۔
حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت سے پہلے مصر سے روپوش ہو کر آپ علیہ السلام ہی کے گھر میں پناہ لی تھی اور آپ کی
صاحبزادی سے نکاح کیا تھا جس کا مفصل واقعہ قرآن کریم نے سورۃ القصص میں بیان فرمایا ہے۔
حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے اُسے قرآن کریم میں کہیں ''مدین'' اور کہیں ''اصحاب الأیکہ'' کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین کی رائے
یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ قومیں تھیں اور آپ پہلے ''مدین'' اور پھر ''اصحاب الأیکہ'' کی طرف مبعوث ہوئے۔ حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی
تحقیق بھی یہی ہے اور ان کا رجحان اس طرف ہے کہ مدین اُردن کی حدود میں واقع ہے اور ایکہ تبوک کا دوسرا نام ہے اور بعض مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ یہ ایک ہی قوم
کا نام ہے۔ مدین اس قوم کا نسبی نام ہے، کیونکہ مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک صاحبزادے تھے اور یہ قوم انہی کی نسل سے تھی اور ''اصحاب

الأ یکہ'' (بن والے) ان کا جغرافیائی نام تھا، یہ لوگ جس جگہ آباد تھے وہاں نہایت گھنا جنگل تھا اسی لیے ان کو ''اصحاب الأ یکہ'' کہتے تھے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان اسی طرف ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف اس مزار کی نسبت کس حد تک درست ہے؟ یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یمن کے شہر حضر موت کے قریب "شبام" کے مقام پر بھی ایک قبر حضرت شعیب علیہ السلام سے منسوب بتائی جاتی ہے، لیکن عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں اس نسبت کو مشتبہ قرار دیا ہے۔

قیاس کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کی حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر یمن میں نہیں اردن یا شام کے کسی علاقے میں ہونی چاہیے۔ کیونکہ مدین اور ''ایکہ'' خواہ ایک ہی جگہ کے دو نام ہوں یا الگ الگ مقامات ہوں، بہر صورت ان کا محلِ وقوع عرب کے شمال مغربی حصّے اور اردن و فلسطین کے درمیان ہی بتایا گیا ہے لہٰذا یمن کا ان علاقوں سے کوئی تعلق نہیں۔

یہاں مقامی طور پر مشہور یہ ہے کہ جس جگہ حضرت شعیبؑ کا مزار واقع ہے، یہ مدین ہی کا علاقہ ہے، بلکہ جب ہم حضرت شعیبؑ کے مزار سے باہر نکلے ہمیں افضل صاحب نے ایک چھوٹا سا کنواں دکھایا جو ''منڈیر'' کے بغیر تھا اور اس پر ایک لوہے کا ڈھکن اس طرح ڈھکا ہوا تھا کہ وہ اُوپر سے ایک گڑھا معلوم ہوتا تھا۔ ملک صاحب نے بتایا کہ یہاں مشہور یہ ہے کہ یہ مدین کا وہی کنواں ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں "وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ." کے نام سے آیا ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچے تھے تو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں پانی بھرنا چاہ رہی تھیں اور ہجوم کی وجہ سے بھر نہیں سکتی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا پانی بھر کر دیا اور یہیں سے حضرت شعیب علیہ السلام کے خاندان کے ساتھ ان کے تعارف کی ابتدا ہوئی۔

کیا یہ کنواں واقعی وہی کنواں ہے؟ اس کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کا کوئی راستہ نہیں، لیکن قرائن سے یہ بات کافی مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے انداز سے مترشح یہ ہوتا ہے کہ وہ کنواں حضرت شعیب علیہ السلام کے مزار سے تقریباً پچیس تیس قدم سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ ہاں اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ آپ کا مزار آپ کی اس رہائش گاہ میں نہ ہو جس میں آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مقیم تھے۔ واللہ سبحانہ اعلم

بہر کیف ہم نیازمندوں کے لیے یہ محتمل نسبت ہی کیا کم تھی؟ یہ پوری سرزمین انبیاء علیہم السلام کی سرزمین ہے اور یہاں پہنچ کر دیدہ و دِل کو حاصل ہونے والا کیف و سُرور لفظ و بیان کی حدود سے ماوراتھا، اور دِل کا تقاضا یہ ہے کہ ع

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرىٰ حَبِيْبٍ وَ مَنْزِلِ

(جہانِ دیدہ: 190-188)

مشرقی اور مغربی کنارہ

(حضرت موسیٰ علیہ السلام)

دودھیے، ایک لکیر:

اردن اور فلسطین کے نقشے کو اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو ان دونوں ملکوں کے سنگم پر دو بڑی جھیلیں نظر آئیں گی جن کے درمیان ایک دریا کے ذریعے رابطہ قائم ہے۔ ان جھیلوں اور بیچ میں بہتے دریا کے ساتھ انسانی تاریخ اور جغرافیۂ قرآنی کا گہرا تعلق ہے۔ قرآن کریم میں ذکر کردہ انبیاء علیہم السلام کے بہت سے واقعات اسی سرزمین میں پیش آئے ہیں جو آپ کو ان دو نیلے دھبوں اور ان کے درمیان بل کھاتی نیلی لکیر کے ارد گرد نظر آ رہی ہے۔ تو آیئے! قصص قرآنی کے اس باب کو کھولنے سے پہلے پانی کے ان ذخیروں کے متعلق جغرافیائی معلومات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں جو ان واقعات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گی جن کا تعلق بنی اسرائیل کے قدیم دور سے لے کر آج فلسطین میں پیش آنے والے واقعات سے ہے۔

تقویٰ کا امتحان:

نقشوں میں دیے گئے رنگ سطح ارض کی سطح سمندر سے بلندی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً نیلا رنگ پانی کے لیے ہے۔ سفید برف کے لیے اور بھورا پہاڑوں کے لیے۔ ان میں سے جو رنگ جتنا گہرا ہوگا وہ اتنی زیادہ گہرائی یا اونچائی کی علامت ہوگا۔ دیے گئے نقشے میں جو پہلا بڑا نیلا دھبا آپ دیکھ رہے ہیں یہ "بحیرۂ طبریہ" ہے۔ دوسرے کو "بحر میت" کہتے ہیں اور ان دونوں کو جو دریا ملا رہا ہے وہ "دریائے اردن" ہے (نہر شریعیت اسی کا دوسرا نام ہے) اس کی لمبائی ۶۰ میل اور چوڑائی ۲ سے لے کر ۱۰ میل تک ہے۔ یہ اردن اور فلسطین کے درمیان قدرتی سرحد کا کام دیتا ہے۔ اس کے مشرقی طرف اردن اور مغربی جانب فلسطین واقع ہے (جی ہاں! فلسطین کا وہ حصہ جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی واقع ہے اور آج کل عرف عام میں اسے "مغربی کنارہ" کہہ کر پکارتے ہیں) دریائے اردن وہی تاریخی دریا ہے جہاں بنی اسرائیل کے تقویٰ کا امتحان لیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تو جہاد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی سزا میں یہ چالیس سال تک صحراء سینا کے ریگزاروں میں (جنہیں تفاسیر میں "وادی تیہ" کا نام دیا گیا ہے) بھٹکتے پھرے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے وقت کے نبی سے درخواست کی ہمیں کوئی سپہ سالار عطا کیا جائے جس کی قیادت میں ہم جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ انجام دے سکیں۔ یہ دعا قبول ہوئی حضرت طالوت کو ان کا امیر مقرر کیا گیا لیکن جہاد میں کامیابی کے لیے چونکہ تقویٰ ضروری ہے اس لیے ان کے امتحان کا اہتمام کیا گیا۔ امتحان یہ تھا انہوں نے اس دریا کو پار کر کے موجودہ فلسطین میں داخل ہونا تھا جہاں جالوت کے لشکر جرار کے ساتھ ان کا مقابلہ تھا۔ اب یہ دریا اس لحاظ سے بالکل انوکھا ہے اس کا پانی شروع میں تو صاف شفاف اور میٹھا و صحت بخش ہے لیکن آگے چل کر جوں جوں بحر میت کے قریب ہوتا جاتا ہے، گدلا، بدبودار اور مضر صحت ہونا شروع

ہو جاتا ہے، نیز یہ دنیا کا واحد دریا ہے جو سطح سمندر سے تقریباً ۱۲۰۰ فٹ نیچے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقویٰ دار اور خواہشات نفس کے غلاموں میں فرق کرنے کے لیے یہ آزمائش ہوئی اس لشکر کو حکم دیا گیا اس دریا سے گذرتے وقت اس کا پانی جی بھر کے کوئی نہ پیے۔ ایک دو گھونٹ کی البتہ اجازت تھی۔ یہ امتحان کچھ اتنا سخت نہ تھا مگر یہود اخلاقی لحاظ سے اتنے پست ہو گئے تھے ملک گیری کے شوق میں جہاد کی درخواست تو کر بیٹھے مگر اپنے نفس کے سرکش گھوڑے پر ان سے قابو نہ پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اکثریت نے ''رج'' کے پیاس بجھائی اور ذرا آگے جاتے ہی بے دم ہو کر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ جس جس نے پانی پیا تھا وہ جی چھوڑ بیٹھا اور مقابلے میں جانے کی اسے ہمت نہ ہوئی لیکن جنہوں نے حکم الٰہی کی تکمیل کے لیے اپنے آپ کو قابو میں رکھا، ان کے قدم میدان میں خوب جمے۔ وہ اگرچہ تھوڑے تھے مگر تقویٰ کی برکت سے جالوت کے عظیم لشکر پر غالب آئے اور قیامت تک آنے والے مجاہدین کے لیے یہ سبق چھوڑ گئے متقی جانبازوں کی چھوٹی سی ٹکڑی دشمنانِ خدا کے ٹڈی دل کے لیے کافی ہوتی ہے۔

دو ناکام کوششیں:

مفسرین نے لکھا ہے بہت ممکن ہے جہاں سے حضرت طالوت کے لشکر نے دریا عبور کیا ہو وہ اس دریا کا یہی گندہ حصہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اتنی بات طے ہے یہود اپنی بداعمالیوں کے سبب ارض فلسطین کی حکومت سے کئی بار محروم کیے جا چکے ہیں، مگر انہیں رہ رہ کر اس کا شوق چڑھتا ہے یہ متبرک خطۂ ارض انہیں واپس مل جائے۔ مثلاً درج بالا واقعے کو لے لیجیے۔ یہ ان کی پہلی درخواست نہ تھی اس سے پہلے بھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں فرعون کے چنگل سے نکال کر واپس لائے تو معلوم ہوا فلسطین پر عمالقہ کا قبضہ ہو چکا ہے جو قوم عاد کی طرح طویل القامت اور طاقتور ہے۔ اب انہیں حکم ہوا آگے بڑھ کر ان سے جہاد کرو، فتح تمہارا مقدر ہوگی، مگر یہ فرعون کے غرق ہونے اور اپنے قبیلے کے پار نکل آنے کا معجزہ آنکھوں سے دیکھ لینے کے باوجود ان سے جہاد کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس مرتبہ انہیں حضرت طالوت کے ساتھ فلسطین کے مغربی جانب سے حملہ آور ہونا تھا جس میں یہ رسوا کن طریقے سے ناکام ہوئے۔ دوسری مرتبہ انہیں فلسطین کے مشرقی جانب سے دریائے اردن پار کر کے داخل ہونے اور فلسطین لے لینے کا موقع ملا، مگر اس مرتبہ بھی وہ اپنے بدکار نفس کی شرارتوں کے ہاتھ ذلیل وخوار ہو گئے۔ البتہ حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے ساتھی اس آزمائش میں کامیاب اترے۔ انہوں نے اس پانی کو منہ نہ لگایا اور جب میدان میں پہنچے تو تقویٰ کی برکت سے ان کے جسم میں بجلیاں سی بھر گئی تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے لشکر کے وسط میں گھس کر جالوت کو قتل کر ڈالا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بادشاہت، نبوت اور علم عطا فرمایا۔ لوہا آپ کے ہاتھ میں موم ہو جاتا تھا اور پہاڑ اور پرندے آپ کی تسبیح و مناجات سن کر وجد میں آ جاتے تھے۔ یہود نے جالوت کے لشکر سے مقابلے کے وقت حضرت داؤد علیہ السلام کا ساتھ تو نہ دیا، مگر آج ان کے فتح کردہ علاقے پر اپنا حق جتانے کے لیے پھر آ موجود ہوئے ہیں۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے جب ایک مرتبہ اپنی حرکت کی سزا پاتے ہیں تو اس سے توبہ کیے بغیر ایک اور موقع کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ خیر اس مرتبہ جو معرکہ ارضِ فلسطین میں بپا ہوگا اس کے بعد انہیں مزید مہلت نہ ملے گی اور ارض مقدس کے درخت اور پتھر جو ان کی عہد شکنیوں کے عینی گواہ ہیں، وہ بھی پکار پکار کہیں گے: اے اللہ کے ولی مسلمان! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہے اسے ٹھکانے لگا دے۔

لاجواب مخمصہ:

اب آخر میں ایک اور آیت اور حدیث جو اس دریا کے متعلق ہے، پھر ان شاء اللہ جغرافیۂ قرآنی سے متعلق چند مزید حقائق اگلے مضمون میں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا ہے:

''اور ہم ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کے مشرق اور مغرب کا مالک بنایا جس میں ہم نے برکت ڈالی ہے۔'' (الاعراف: ۱۳۷) اس آیت

آیت میں "مشارقَ الارضِ ومغاربہا التی بٰرکنا فیہا۔" سے اسی دریائے اردن کا مشرقی اور مغربی حصہ مراد ہے جو برکت والی زمین یعنی ملک شام پر مشتمل تھا۔ قدیم زمانے میں شام کے چار مشہور مقامات تھے۔ شام، اردن، فلسطین اور لبنان۔ اب یہ الگ الگ ملک بن گئے ہیں جن میں یہود کو سب سے زیادہ دلچسپی فلسطین سے ہے جو اس دریا کے مغربی کنارے پر واقع ہے اور جسے یہودی اصطلاح میں "ارضِ موعود" یعنی وہ زمین کہا جاتا ہے جسے انہیں دینے کا وعدہ کیا گیا تو اب یہ الگ مخمصہ ہے وہ اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے اللہ تعالیٰ کے وعدوں کا پورا نہ ہونا ممکن نہیں تو ڈھائی ہزار سال سے وہ فلسطین میں رہنے کے بجائے دنیا بھر میں دھکے کیوں کھا رہے ہیں؟ یہ وعدہ ان کے بجائے مسلمانوں کے حق میں کیوں پورا ہوا؟ نیز یہ کہ وہ جن بداعمالیوں کے سبب یہاں سے نکالے گئے تھے کیا انہوں نے ان سے توبہ کر لی ہے اب وہ پھر سے یہاں آنے کے لیے بے تاب ہوئے جا رہے ہیں؟

مضمون کے اختتام پر اسی دریا کے ذکر پر مشتمل وہ حدیث جس میں معجزانہ پیش گوئی کی گئی ہے:

عَنْ نُهَيْكِ بْنِ صُرَيْمٍ السَّكُونِي، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "لَتُقَاتِلُنَّ الْمُشْرِكِيْنَ، حَتّٰى يُقَاتِلَ بَقِيَّتُكُمُ الدَّجَّالَ عَلٰى نَهْرِ الْأُرْدُنِّ، أَنْتُمْ شَرْقِيَّهُ وَ هُمْ غَرْبِيَّهُ."

"تم لوگ مشرکین سے جہاد کرو گے یہاں تک کہ تم میں سے بعد میں آنے والے دجال سے دریائے اردن کے کنارے جنگ کریں گے۔ تم اس دریا کے مشرقی جانب ہوگے اور وہ مغربی جانب۔"

دیکھیے! آج اس دریا کے مشرقی کنارے اردن ہے اور مغربی کنارے اسرائیل کی ناجائز ریاست وجود میں آ چکی ہے۔ چند دہائیاں پیشتر اس حدیث کا مفہوم سمجھنا بہت مشکل تھا۔ اب ہم اپنی آنکھوں سے وہ بہت کچھ ہوتا دیکھ رہے ہیں جو ہمارے محسن و مشفق حضور علیہ الصلوۃ والسلام ہمیں بتا کر گئے تھے۔

ایک شہر تین سرحدیں

خلیج اور راس:

گذشتہ مضمون میں ہم نے سرزمین شام میں واقع دو بڑی جھیلوں اوران کے درمیان بہتے ایک دریا سے تعارف حاصل کیا تھا تا کہ قرآن کریم کی وہ آیات علیٰ وجہ البصیرت سمجھ میں آسکیں جو اس خطۂ ارض سے متعلق ہیں۔ زیرِ نظر مضمون کے ساتھ آپ جو نقشہ دیکھ رہے ہیں اس میں آپ کو دو خلیجیں نظر آرہی ہیں جو شہادت اوراس کے ساتھ والی انگلی کی شکل میں (آسان لفظوں میں یوں کہہ لیں خرگوش کے کانوں کی شکل میں) زمین کو کاٹتے ہوئے اندر کی طرف چلی گئی ہیں اوران کے نتیجے میں انسانی دل کی شکل میں ایک قطعۂ زمین وجود میں آیا ہے۔ پہلے تو خلیج کا معنی سمجھ لیتے ہیں۔ جب سمندری پانی خشکی کو کاٹتے ہوئے اندر تک چلا جائے تو اس کو خلیج (اردو میں کھاڑی اور انگریزی میں گلف) کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جب خشکی کی چونچ پانی کے اندر دور تک چلی جائے تو اس کو "راس" (عربی سے لیا ہوا لفظ ہے، انگریزی میں کیپ) کہتے ہیں۔ خلیجِ عرب دنیا کی مشہور خلیج ہے اور "رأس الرجاء الصالح" (انگریزی میں کیپ آف گڈ ہوپ) جنوبی افریقہ کی مشہور راس ہے۔ جس کے سامنے سے گھومتے ہوئے واسکوڈی گاما کو ہندوستان کا راستہ دریافت ہونے کی امید پیدا ہوئی تھی، اس واسطے خشکی کی اس چونچ کو "اچھی امید کا راس" کہتے ہیں۔

قرآن فہمی کا لطف:

تو آپ انگریزی کے حرف "V" کی شکل میں جو دو خلیجیں دیکھ رہے ہیں اس میں سے دائیں طرف والی کو "خلیج عقبہ" اور بائیں طرف والی کو خلیج سوئز کہتے ہیں۔ ان کے بیچ میں جو خشکی کا قطعہ ہے یہ "صحراء سینا" ہے۔ جی ہاں! وہی صحراء سینا جس کو قرآن کریم میں "سینین" بھی کہا گیا ہے۔ جس میں کوہ طور واقع ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ رب العالمین سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا تھا اور جہاں ان پر تورات نازل ہوئی تھی۔ اس جزیرہ نما صحراء سے تاریخ قرآنی کے اور بھی بہت سے واقعات وابستہ ہیں جس کی وجہ سے جغرافیہ قرآنی کے طالب علموں کے لیے اس کی اہمیت ایسی ہی ہے جیسی نہر سوئز کی اہمیت معاشی جغرافیہ کے طلبہ کے لیے۔ لیکن اس مضمون میں ہم صرف خلیج عقبہ کا ذکر کر پائیں گے اس سے متعلقہ تاریخ حقائق بھی اتنے دلچسپ ہیں یہ قسط بمشکل ان کو سمیٹ سکے گی۔ آپ اگر قرآن کریم کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور اس میں ذکر کیے جانے والے قصص کو ان کے صحیح پس منظر کے ساتھ سمجھنے اوران سے کما حقہ عبرت حاصل کرنے کے شائق ہیں تو نقشہ خوانی سے کچھ مناسبت پیدا کیجیے اور زیادہ تر قرآنی واقعات کرۂ ارض کے جس خطے سے متعلق ہیں (یعنی جزیرہ نمائے عرب) اس کے محل وقوع اوراس سے وابستہ خاص خاص جغرافیائی معلومات سے ایک مرتبہ واقف ہو جایے، تب دیکھیے قرآن فہمی کا کیسا لطف آتا ہے۔

دو معاون علوم:

ایک قاری نے ایک مرتبہ خط لکھا تھا آپ کے دیے گئے نقشوں میں سمت نہیں دی گئی ہوتی؟ دراصل جغرافیہ کا علم ہمارے یہاں ایسا عنقا ہوگیا ہے اس کی بنیادی معلومات بھی ہم سے اوجھل ہیں، ورنہ پوری دنیا کے جغرافیہ دانوں کا اس پر اجماع ہے جب بھی کوئی نقشہ بنایا جائے گا اس کو سیدھا سامنے رکھیں تو وہ شمال کی سمت ہوگی۔ اس کی کئی وجوہ ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ ریاضی اور جغرافیہ وہ علم ہیں جن کو مسلمانوں نے عروج پر پہنچایا کیونکہ تخریج سمت قبلہ، تخریج، اوقات نماز، جہاد، حج، روزہ، زکوٰۃ اور رؤیت ہلال جیسے بہت سے اہم دینی مقاصد ان دو علوم کے جاننے پر موقوف ہیں۔ جہاد کے لیے دنیا کے مختلف خطوں کی طرف سفر اور حج کے لیے دنیا کے مختلف اطراف سے مکہ مکرمہ کی طرف آمد جغرافیۂ ارضی وفلکی جانے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح سمتِ قبلہ کا تعین، نماز کے اوقات کی جنتریاں، رمضان وشوال اور دیگر مہینوں کے چاند کی رؤیت سے متعلق مباحث، جغرافیہ کے چند اصول اور ریاضی کے کچھ کلیات سمجھے بغیر از حد دشوار ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اور حدیث شریف کی بہت سی روایات کا مطلب ان کے پورے پورے مفہوم کے ساتھ اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب ان دو معاون علوم کی بنیادی باتیں ذہن نشین ہوں۔

ورثے کی حفاظت:

یہی وجہ ہے علماء اسلام ان علوم کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان میں مہارت کے حصول اور جدید اکتشافات کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن نجانے کیوں ان "علوم آلیہ" سے اتنے اہم دینی مقاصد کے وابستہ ہونے کے باوجود رفتہ رفتہ یہ ہمارے نصاب سے خارج ہوتے گئے، حتیٰ کہ سرحد بلوچستان اور پنجاب کے بعض مدارس جہاں فنون کی "تکمیل" کی جاتی ہے وہاں بھی علم ہیئت، ہندسہ اور فلکیات کی تدریس متروک ہوچکی ہے۔ چند جگہوں میں ان علوم کے مبادی پڑھائے جاتے ہیں لیکن مقاصد کے منتہی مباحث کی تعلیم اور ان فنون کے مسائل مہمہ کی عملی تمرین وتخریج اب تقریباً ناپید ہے جس کی وجہ سے سمت قبلہ رکھنے اور رؤیت ہلال کی مباحث جیسے خالص دینی معاملات جاننے والا اہل علم کی برادری میں خال خال ہی کوئی ہے۔ ماضی قریب میں فقیہ العصر حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ نے ان علوم میں بے مثال مہارت اور ایسی کامل بصیرت سے نوازا تھا کہ بڑے بڑے ماہرین فن آپ کی شفقت بصیرت کا لوہا مانتے تھے۔ احسن الفتاویٰ جلد دوم میں اوقات صلوٰۃ، جہت قبلہ اور شمسی وقمری تاریخوں اور تقویم کے استخراج کے متعلق آپ کے تحریر کردہ قواعد ان فنون میں آپ کی مجتہدانہ شان کے شاہد عدل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے اپنے اس ورثے کی حفاظت کی جائے اور مدارس دینیہ میں ان علوم کو دوبارہ زندہ کیا جائے جو دین کے خادم ہیں اور بہت سے شعائر دین کا فہم ان کے جاننے پر موقوف ہے۔

جزیرہ اور جزیرہ نما:

اس طویل جملہ معترضہ کے بعد ہم بات کو وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں چھوڑی تھی۔ صحراء سینا کے مشرقی اور مغربی جانب (چند سطریں پہلے عرض کیا نقشے کو سامنے کا حصہ شمالی ہوگا تو لازماً دایاں مشرق اور بایاں مغرب ہوگا اور جو سمت نقشہ دیکھنے والے کی جانب ہوگی وہ جنوب ہوگی) پانی کی دو کھاڑیاں خرگوش کے کان کی شکل میں زمین کو کاٹتی ہوئی اندر کی جانب جاتی ہیں اور اس صحراء کو جزیرہ نما کی شکل دیتی ہیں۔ [آپ کو اچھی طرح معلوم ہے خشکی کا وہ حصہ جو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا ہو اسے جزیرہ اور جس کے تین اطراف میں پانی ہو اسے جزیرہ نما (عربی میں "شبہ الجزیرہ") کہتے ہیں۔ سرزمین عرب دنیا کا سب سے بڑا "جزیرہ نما" ہے] ان میں سے دائیں طرف والی کھاڑی جسے خلیج عقبہ کا نام دیا گیا ہے، کے آخر میں غور سے دیکھیں تو "ایلات" نامی چھوٹا سا شہر نظر آئے گا اس کا پرانا نام "ایلہ" ہے۔ تفسیر کے طلبہ ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کریں کہ اس نام کی بستی کا ذکر انہوں نے قرآن کریم کی کن آیات کے ذیل

دو معاون علوم:

ایک قاری نے ایک مرتبہ خط لکھا تھا آپ کے دیے گئے نقشوں میں سمت نہیں دی گئی ہوتی؟ دراصل جغرافیہ کا علم ہمارے یہاں ایسا عنقا ہو گیا ہے اس کی بنیادی معلومات بھی ہم سے اوجھل ہیں، ورنہ پوری دنیا کے جغرافیہ دانوں کا اس پر اجماع ہے جب بھی کوئی نقشہ بنایا جائے گا اس کو سیدھا سامنے رکھیں تو وہ شمال کی سمت ہوگی۔ اس کی کئی وجوہ ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ ریاضی اور جغرافیہ وہ علم ہیں جن کو مسلمانوں نے عروج پر پہنچایا کیونکہ تخریج سمت قبلہ، تخریج، اوقات نماز، جہاد، حج، روزہ، زکوٰۃ اور رؤیت ہلال جیسے بہت سے اہم دینی مقاصد ان دو علوم کے جاننے پر موقوف ہیں۔ جہاد کے لیے دنیا کے مختلف خطوں کی طرف سفر اور حج کے لیے دنیا کے مختلف اطراف سے مکہ مکرمہ کی طرف آمد جغرافیۂ ارضی وفلکی جانے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح سمتِ قبلہ کا تعین، نماز کے اوقات کی جنتریاں، رمضان وشوال اور دیگر مہینوں کے چاند کی رؤیت سے متعلق مباحث، جغرافیہ کے چند اصول اور ریاضی کے کچھ کلّیات سمجھے بغیر از حد دشوار ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اور حدیث شریف کی بہت سی روایات کا مطلب ان کے پورے پورے مفہوم کے ساتھ اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب ان دو معاون علوم کی بنیادی باتیں ذہن نشین ہوں۔

ورثے کی حفاظت:

یہی وجہ ہے علماء اسلام ان علوم کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان میں مہارت کے حصول اور جدید اکتشافات کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن نجانے کیوں ان ''علوم آلیہ'' سے اتنے اہم دینی مقاصد کے وابستہ ہونے کے باوجود رفتہ رفتہ یہ ہمارے نصاب سے خارج ہوتے گئے، حتیٰ کہ سرحد بلوچستان اور پنجاب کے بعض مدارس جہاں فنون کی ''تکمیل'' کی جاتی ہے وہاں بھی علم ہیئت، ہندسہ اور فلکیات کی تدریس متروک ہو چکی ہے۔ چند جگہوں میں ان علوم کے مبادی پڑھائے جاتے ہیں لیکن مقاصد کے منتہی مباحث کی تعلیم اور ان فنون کے مسائل مہمہ کی عملی تمرین وتخریج اب تقریباً ناپید ہے جس کی وجہ سے مسجد کا قبلہ رکھنے اور رؤیت ہلال کی مباحث جیسے خالص دینی معاملات جاننے والا اہل علم کی برادری میں خال خال ہی کوئی ہے۔ ماضی قریب میں فقیہ العصر حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ نے ان علوم میں بے مثال مہارت اور ایسی کامل بصیرت سے نوازا تھا کہ بڑے بڑے ماہرین فن آپ کی فنی بصیرت کا لوہا مانتے تھے۔ احسن الفتاویٰ جلد دوم میں اوقات صلوٰۃ، جہت قبلہ اور شمسی وقمری تاریخوں اور تقویم کے استخراج کے متعلق آپ کے تحریر کردہ قواعد ان فنون میں آپ کی مجتہدانہ شان کے شاہد عدل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے اپنے اس ورثے کی حفاظت کی جائے اور مدارس دینیہ میں ان علوم کو دوبارہ زندہ کیا جائے جو دین کے خادم ہیں اور بہت سے شعائر دین کا فہم ان کے جاننے پر موقوف ہے۔

جزیرہ اور جزیرہ نما:

اس طویل جملہ معترضہ کے بعد ہم بات کو وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں چھوڑی تھی۔ صحراء سینا کے مشرقی اور مغربی جانب (چند سطریں پہلے عرض کیا نقشے کا سامنے کا حصہ شمالی ہوگا تو لازماً دایاں مشرق اور بایاں مغرب ہوگا اور جو سمت نقشہ دیکھنے والے کی جانب ہوگی وہ جنوب ہوگی) پانی کی دو کھاڑیاں خرگوش کے کان کی شکل میں زمین کو کاٹتی ہوئی اندر کی جانب جاتی ہیں اور اس صحراء کو جزیرہ نما کی شکل دیتی ہیں۔ [آپ کو اچھی طرح معلوم ہے خشکی کا وہ حصہ جو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا ہو اسے جزیرہ اور جس کے تین اطراف میں پانی ہو اسے جزیرہ نما (عربی میں ''شبہ الجزیرہ'') کہتے ہیں۔ سرزمین عرب دنیا کا سب سے بڑا ''جزیرہ نما'' ہے] ان میں سے دائیں طرف والی کھاڑی جسے خلیج عقبہ کا نام دیا گیا ہے، کے آخر میں غور سے دیکھیں تو ''ایلات'' نامی چھوٹا سا شہر نظر آئے گا۔ اس کا پرانا نام ''ایلہ'' ہے۔ تفسیر کے طلبہ ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کریں کہ اس نام کی بستی کا ذکر انہوں نے قرآن کریم کی کن آیات کے ذیل

میں سنا تھا؟

ایک شہر تین سرحدیں:

اس مقام پر تین ملکوں کی سرحدیں لگتی ہیں: اردن، اسرائیل اور مصر۔ مشرقی جانب سے دراصل سعودی عرب کی سرحد لگتی تھی، مگر اس کے معزز فرمانرواؤں کو خطرہ تھا اسرائیل کا پڑوس ان کی پرسکون زندگی میں خلل انداز ہوگا، یہودیوں کے ہولناک مظالم اور فلسطینیوں کی دردناک چیخیں ان کی طبع نازک پر گراں گزریں گی، اس واسطے انہوں نے ۲۵ میل کے اس ٹکڑے سے رضا کارانہ طور پر پسپائی اختیار کرتے ہوئے اسے ایک دوسری بہادر نسل جو شریف حسین (ارض حرمین کو خلافت عثمانیہ کے سائے سے نکالنے اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو گرفتار کر کے تحریک آزادی ہند کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے والا بدنصیب) جیسے غدار ملت کی جانشین اور اردن کی حکمران ہے، کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ اب خلیج عقبہ کے اس آخری سرے پر اسرائیل اور مصر کے ساتھ سعودی عرب کے بجائے اسرائیل کی سرحدیں لگتی ہیں اور یہودی دو طرف سے مسلمان ملکوں میں گھرے ہونے کے باوجود بے پروا ہو کر کھلے ڈلے انداز میں فلسطینی مسلمانوں پر مشق ستم جاری رکھے ہیں۔

ہفتہ والے

مچھیروں کی بستی:

ہفتے کے دن مچھلی کے شکار کے شوقین نفس پرست یہودیوں کے قصے سے قرآن کریم کا کون طالب علم واقف نہیں۔ بحرقلزم صحرائے سیناء کے پاس جا کر دو کھاڑیوں میں تقسیم ہوجاتا ہے، اس میں دائیں طرف (مشرقی جانب) والی کھاڑی کے سرے پر ایلہ نامی بستی واقع تھی جسے "عقبہ" بھی کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس کھاڑی کو "خلیج عقبہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ اب اس بستی کو "ایلات" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ عملاً اسرائیل کے قبضے میں ہے جبکہ دائیں بائیں سے اردن اور مصر کی سرحدیں بھی اسے لگتی ہیں۔ اس واسطے یہ ایسی ساحلی بستی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اس پر تین ملکوں کی سرحدیں لگتی ہیں۔ اکثر مفسرین کے مطابق یہ اصحاب سبت (ہفتے والوں) کا وہی "قریہ" ہے جہاں کے مکینوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی مسلسل نافرمانی اور باطل حیلوں کے ذریعے سے حرام کو حلال کرنے کی پاداش میں مسخ شدہ بندر بنادیا گیا تھا۔ موجودہ زمانے کے یہودی پادری اچھی طرح جانتے ہیں یہ جگہ مچھیروں کی وہی بستی ہے جہاں ان کے آباء واجداد میں سے وہ قوم رہتی تھی جو اپنی احمقانہ حرکتوں اور احکام شرعیہ میں ناجائز حیلہ سازیوں کی بدولت ایسے رسواکن انجام سے دوچار ہوئی جس کا تذکرہ یہودیوں کو رہتی دنیا تک خجالت وخواری کی یادگار کے طور پر رسوا کرتا رہے گا۔ یہودیوں کے عالم جو اپنی مذہبی کتابوں سے واقف ہیں انہیں بخوبی علم ہے اس مقام پر اسرائیل کی جنوبی سرحدیں ہی ختم نہیں ہوتیں بلکہ ان کی اس تاریخی ذلت کی یاد کا آغاز بھی ہوتا ہے جو "اصحاب سبت" (ہفتے کے دن مچھلی کا شکار کرنے والوں) کے عنوان سے تاریخ اور تفسیر کی کتب میں مذکور ہے۔

آزمائش کی دو قسمیں:

بعض مفسرین نے سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۶۳ اور بعد کی چند آیتوں میں مذکور اس بستی کا محل وقوع "مدین" (جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے! وہی مدین جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وسیع صحراء عبور کرنے کے بعد مصر سے آکر پناہ لی تھی) بعض نے مقنا اور بعض نے طبریہ بتایا ہے، لیکن جمہور مفسرین کا رجحان اس طرف ہے کہ "ایلہ" ہی وہ بستی ہے جہاں شرارت پسند اور خواہش پرست یہودیوں کی ایک جماعت کی آزمائش ہوئی تھی۔ انسان پر آنے والی آزمائشیں دو طرح کی ہوتی ہیں: یا وہ صالح اور سلیم الفطرت ہوتا ہے تو بیماری یا کسی اور امتحان کے بعد اس کو ترقی نصیب ہوجاتی ہے یا وہ بدکردار اور کج فطرت ہوتا ہے اور آزمائش میں ناکامی کے بعد اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت پوری ہوجاتی ہے اور اس امتحان میں پورا نہ اترنے کے بعد وہ عذاب الٰہی کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بستی والے بدقسمتی سے دوسری قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی احمقانہ حرکتیں جب بہت بڑھ گئیں تو ان پر ایک آخری آزمائش آئی۔ یہ اگر اس میں اپنے آپ کو سنبھال لیتے تو گزشتہ بداعمالیوں کی بھی تلافی ہوجاتی، مگر یہ اپنے نفس کے منہ زور گھوڑے پر قابو نہ پاسکے اور ان کی سرکش شیطانی طبیعت نے انہیں لٹکتی دموں والے بندر بنا کر چھوڑا۔

تعلیم یافتہ کم عقل:

ساحلی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے لیے مچھلی کے شکار سے زیادہ مرغوب چیز اور کون سی ہوسکتی ہے؟ سو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی آزمائش ان کے اسی دل پسند مشغلے سے کی۔ انہیں حکم ہوا ہفتے کے دن کے احترام کے طور پر (شریعت موسویہ میں ہفتے کا دن خصوصی اور اجتماعی عبادت کے لیے مقرر تھا جیسے کہ شریعت محمدیہ میں جمعہ کا دن اجتماعی عبادت کے لیے مختص ہے، مگر ہمارے یہاں اسے بھی دنیاداری کی نذر کر دیا گیا اور اذانِ اوّل کے بعد دکانوں کو بند کرنے کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ مؤذنین حضرات بھی پہلی اذان دے دیتے ہیں۔ اس کا آسان حل یہ ہے پہلی اذان جمعہ کے بیان سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں دی جائے) مچھلی کا شکار نہ کریں بلکہ اس دن کو اللہ کی یاد کے لیے مخصوص کریں۔ اب قدرت الٰہی سے ہوا یوں ہفتے کے دن مچھلیاں کنارے پر آ آ کر پانی سے سر نکال کر ان کو للچاتی تھیں اور بقیہ دنوں میں کہیں دور چھپ جاتی تھیں۔ ان سے یہ منظر دیکھ کر رہا نہ جاتا تھا۔ اب دوسری اقوام تو جاہل ہوتی تھیں وہ صاف صاف نافرمانی کرتی تھیں، مگر یہودی پڑھے لکھے تھے۔ انہوں نے شراب پینے سے پہلے اس کا نیا نام سوچنے کی ٹھان لی جس طرح ہمارے یہاں بعض نام نہاد فلاسفر ہیجان خیز موسیقی کی کثیف تانوں میں روح جیسی لطیف شے کی غذا تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان تعلیم یافتہ یہودیوں نے ہمارے یہاں کے بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ اسکالروں، پروفیسروں اور بیرون ملک کے ایجوکیٹڈ دانشوروں کی طرح (جو پردے اور ٹیلی ویژن وغیرہ کے حکم میں نرمی تلاش کرتے رہتے ہیں) جس چیز پر عمل مشکل محسوس ہوا اس کے لیے حیلہ ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے خود کو تسلی دینے کے لیے سمندر سے چھوٹی چھوٹی نہریں کھودیں اور انہیں ایک بڑے حوض میں ملا دیا۔ ہفتے کے دن مچھلیاں اس میں آجاتیں اور یہ ان کی واپسی کا راستہ بند کر کے پورا ہفتہ چٹخارے لیا کرتے تھے۔ اب کون نہیں جانتا جس طرح ہفتے کو جال ڈالنا اور اگلے دن اسے اٹھانا شکار ہے، اسی طرح ہفتے کے دن مچھلیوں کو نالیوں میں راستہ دینا اور پھر انہیں بند کرنا بھی شکار ہی ہے، لیکن ان شہوت زدہ یہودیوں کی عقل ماری گئی تھی۔

متبادل کی تلاش:

علمائے کرام نے لکھا ہے حیلہ کی دو قسمیں ہیں۔ اگر حدودِ شریعت کے اندر رہتے ہوئے اور مقاصد و مصالح شریعت کا احترام اور ان کی رعایت کرتے ہوئے شرعی قواعد کی روشنی میں کسی مشکل کا حل نکالا جائے تو ایسا حیلہ جائز ہے۔ اسے عام طور پر حیلہ کہا جاتا ہے ورنہ درحقیقت یہ ''متبادل کی تلاش'' ہے اور اس کا مقصد شرعی احکام کو توڑنا نہیں بلکہ انہیں قائم رکھنا ہے، تاکہ عوام الناس ناقابلِ برداشت مشکل میں نہ پڑیں اور حکم الٰہی بھی آسانی سے پورا ہوتا رہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ شراب کے عادی شخص کے لیے کوئی جائز مشروب ایجاد کیا جائے یا یہودی کمپنیوں کی مصنوعات سے بچانے کے لیے مسلمان کمپنیوں کی مصنوعات تلاش کر کے تجویز کی جائیں یا سودی بینکاری کے متبادل کے طور پر شرعی بینکاری کی راہیں کھوجی جائیں۔ کتب فقہ میں ایسے حیلوں کی مثالیں ملتی ہیں اور فقہاء احناف کو متبادل کی تلاش میں کامل دسترس اور ید طولیٰ حاصل ہے۔ جبکہ حیلے کی دوسری قسم وہ ہے جس کا مقصد حرام سے بچنا نہیں بلکہ اس میں منہ مارنے کا خفیہ راستہ تلاش کرنا ہے، جیسے ایک زمانے میں ہمارے ہاں سودی بینکاری کو ''نفع و نقصان میں شراکت'' کا پرفریب نام دے کر نفع کے نام پر سود تقسیم کیا جاتا تھا۔ ایسا حیلہ مذموم اور ناجائز ہے۔ اور مچھیرے یہودیوں کو اسی کی سوجھی تھی۔

نقشے کا آئینہ:

ان خواہش زدہ اور بدمست افراد کو دیکھ کر اس بستی کے بقیہ لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک تو اصحاب عزیمت تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو اس گندی حرکت سے سختی سے منع کیا اور نہ ماننے پر ان سے تعلقات منقطع کرنے کی دھمکی دی اور پھر رشتہ داریوں اور محلے داری کے باوجود تعلقات منقطع بھی کر دیے۔ منکرات سے روکنے کا ایک کارگر طریقہ یہ بھی ہے جیسے کہ یہ طے کر لیا جائے ہمارے ہاں جو بھی خوشی اور غمی کے موقع پر غیر شرعی رسومات کرے گا اس سے بول

وہاں بند کردی جائے گی۔ یہ لوگ پوری طرح کامیاب ہوگئے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جو عزم وہمت میں کمزور تھے۔ وہ ان لوگوں کو منع کرنے اور بصورت دیگر ان سے الگ ہونے کے اقدام کا حوصلہ نہ کرتے تھے۔ جیسے کہ بعض لوگ منکرات پر اظہار ناراضی کی بجائے ''دل رکھنے کے لیے'' خاموش رہتے ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ ان جراثیم زدہ گنہگاروں کے سچے خیر خواہ نہ تھے۔ الغرض جب حرام طریقے سے حاصل کردہ غذا کھا کھا کر ان کے رگ و پے میں بینک اور انشورنس کے ملازمین کی طرح حرام رچ بس گیا تو ان کا وقت پورا ہوگیا۔ رات ''تازہ'' مچھلی کے گوشت سے پیٹ بھر کر اس طرح سوئے جیسے ہمارے یہاں کی بڑی فیملیاں کے ایف سی اور مکڈونلڈ کا ''تازہ'' درآمد کردہ گوشت کھا کر گیس اور بدہضمی کی شکایت کرتی ہیں۔ یہ گیس اور بدہضمی نہیں، حرام کے وہ جراثیم ہیں جو ان کی فطرت اور ان کی نسل کو مسخ کر رہے ہیں۔ ہمارے یہ بھائی چاہیں تو اس نقشے کے آئینے میں اپنا عکس عمل دیکھ سکتے ہیں۔ قصہ مختصر بسیار خور یہودی صبح جب اٹھے تو شکلیں مسخ ہو کر بندروں کی ہو چکی تھیں۔ (بندر بہت لالچی اور شرارتی جانور ہے یہ بھی لالچی اور حیلہ گر تھے) تین دن بعد سب مر گئے۔ موجودہ نسل ان بندروں کی نہیں وہ پہلے سے چلی آرہی ہے۔ یہودیوں کی شرارت دیکھئے دنیا کو کبھی یہ نہیں بتاتے ہمارے آباء واجداد ایک زمانے میں بندر بنا کر رسوا کیے گئے تھے بلکہ وہ ایک یہودی مفکر ڈارون کے اس نظریے کی بہت ترویج کرتے ہیں سب انسان بندر کی نسل کی ارتقائی شکل ہیں تاکہ قرآنی حقائق سے متصادم نظریات پیدا کرکے ساری دنیا کو بندروں جیسا لالچی، حریص اور شرارت پسند بنا دیں۔

حیلہ باز مچھیرے

تین ملک، ایک سرحد:

دنیا کے نقشے یا گلوب پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا اس پر واقع طبقات ارضی کی ایک قسم تو قدرتی ہے یعنی خشکی، سمندر، پہاڑ، صحرا، جنگل، گلیشیر وغیرہ.... اسے طبعی جغرافیہ کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔ دوسری سیاسی تقسیم ہے یعنی مختلف ممالک اور ریاستیں وغیرہ...... اسے سیاسی تقسیم کہتے ہیں۔ پہلی تقسیم کے تحت جو چیزیں زمین کی سطح پر نظر آتی ہیں ان میں صدیوں تک کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، سینکڑوں سال بعد تھوڑی بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ مثلاً: دریا راستہ بدل دیتا ہے، سمندر چڑھ جاتا ہے، خشکی کا کوئی حصہ پانی میں غائب ہو جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سیاسی تقسیمات، دنیاوی سلطنتوں کی طرح عارضی اور فانی ہیں۔ ان میں مسلسل تبدیلی وتغیر ہوتا رہتا ہے، پرانی سلطنتیں ختم اور نئے ملک وجود میں آتے رہتے ہیں۔ جس طرح جغرافیائی طور پر دنیا کے مختلف حصوں میں حیرت انگیز قدرتی عجائب پائے جاتے ہیں اسی طرح سیاسی تقسیم کے نتیجے میں بھی جو ممالک وجود میں آتے ہیں ان کی طرح طرح کی عجیب شکلیں بن جاتی ہیں۔ مثلاً: جنوبی امریکا کا ملک چلی چوڑائی میں بہت کم ہے، سارا ملک ایک لمبی لکیر کی طرح ہے جسے جگہ جگہ سے سمندر نے کاٹ کر چھوٹی چھوٹی کھائیاں بنا رکھی ہیں، جس سے اس لمبے زمینی ٹکڑے کی شکل انسانی ریڑھ کی ہڈی جیسی ہو جاتی ہے۔ اٹلی جوتا پہنی ہوئی انسانی ٹانگ سے ملتا جلتا ہے۔ برطانیہ ''سٹنگ ریبٹ'' (بیٹھے ہوئے خرگوش) کی طرح ہے اور براعظم افریقہ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائی تو انسانی سر کی طرح کا دکھائی دیتا ہے۔ براعظم ایشیا وافریقہ کے سنگم پر واقع مقبوضہ فلسطین جسے اب دنیا اسرائیل کہتی ہے، خنجر کی طرح کا ہے (اسرائیل ہے بھی ایسا خنجر جو ارض اسلام کے سینے میں پیوست ہے) اس خنجر کی نوک پر بحرِ قلزم کے کنارے ایک شہر واقع ہے جہاں تین ملکوں اُردن، مقبوضہ فلسطین (اسرائیل) اور مصر کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اس شہر کا قدیم نام ''ایلہ'' یا ''ایلات'' ہے اور موجودہ عربی نام عقبہ ہے۔ یہ خلیج عقبہ کے آخری کنارے پر ہے اور اس سے جو تاریخی واقعہ متعلق ہے وہ آج کی مجلس کا موضوع ہے۔

آزمائش کا مطلب:

ایک زمانے میں یہاں بنی اسرائیل کی ایک شاخ آباد تھی جو ماہی گیری کا پیشہ کرتی تھی۔ یہ لوگ فارغ البال اور خوش حال تھے جس کی وجہ سے من موجیوں میں مشغول رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آزمائش کرنا چاہی۔ ایسی آزمائشوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کھرا کھوٹا الگ ہو جائے، یا تو گناہوں پر فریفتہ شخص توبہ کرلے یا پھر موج مستی میں اتنا آگے چلا جائے اس کے بارے میں حتمی فیصلے کی گھڑی آجائے۔ ایسا چونکہ انفرادی واجتماعی سطح پر انسانوں اور ان کے مختلف گروہوں کے ساتھ ہوتا رہتا ہے، اس لیے اللہ پاک نے انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کی جانے والی ابدی کتاب قرآن پاک میں اس کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے تاکہ خود احتسابی کی توفیق پانے والے خوش نصیب اس سے استفادہ کرسکیں۔ ان لوگوں کو حکم ہوا ہفتے کے روز دنیاوی کام کاج یعنی مچھلی کا شکار مت کیا کرو۔ یہ لوگ چونکہ ظاہری طور پر دین دار تھے اس لیے انہوں نے شکار بند کر دیا لیکن آزمائش کا اصل مرحلہ ذرا بعد شروع ہوا۔ ہوا یوں ہفتے کے روز مچھلیاں پانی سے بر

باہر نکال کر انہیں للچاتیں، چھلانگیں مار مار کر ان کو ورغلاتیں اور بقیہ دنوں میں سمندر کی پنہائیوں میں کہیں غائب ہو جاتیں.........اب یہ لوگ اگر صبر کرتے تو چند دن کی آزمائش کے بعد تقویٰ کی برکت سے کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا اور انہیں اللہ پاک اتنا دیتے انہیں خسارے کے دن یاد بھی نہ رہتے.....لیکن ان کے دل کے کھوٹ نے انہیں چین نہ لینے دیا اور انہوں نے حیلے بہانوں سے اس حرام کو حلال کرنے کی کوشش شروع کی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے ہاں آج کل دیکھنے میں آتا ہے حق حلال کی کمانے والے کو مشقت اور تنگی کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ اللہ رب العزت نے جنت کو مشقت اور صبر سے ڈھانک رکھا ہے اور ناجائز آمدن والے عیش کرتے پھرتے ہیں۔ انہیں اس انجام کی فکر ہی نہیں ہوتی جو آنکھ بند ہوتے ہی سامنے آجائے گا۔ یہ رویہ اب قومی مزاج بن چکا ہے اور جسے دیکھو یہ کہتا ملتا ہے: ''اجی مولوی صاحب! کیا کریں، تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا'' یا ''پورا ملک ہی اس سسٹم پر چل رہا ہے تو ہم کہاں تک بچیں؟''

دین کے بغیر دین داری:

بنی اسرائیل کی یہ شاخ کچھ زیادہ ہی بے صبری اور حرام خوری کی عادی تھی، لیکن ساتھ میں اپنی دینداری کا بھرم بھی رکھنا چاہتی تھی۔ انہوں نے چور دروازہ ڈھونڈنے کی کوشش کی اور یہ حیلہ نکالا سمندر سے نالیاں کھود کر حوضوں تک لے گئے۔ ہفتے کے دن پانی کی سطح پر اٹھکیلیاں کرنے والی مچھلیاں اچھل کود کرتے کرتے نالیوں کے راستے حوض میں جا گرتیں تو یہ اتوار کے دن انہیں پکڑ لیتے۔ ''رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت بھی نہ گئی۔'' یہاں پر ہمیں حیلہ کی دو قسمیں اور ان میں فرق سمجھ لینا چاہیے: حیلہ کی ایک قسم مذموم اور ناجائز ہے اور ایک قسم مستحسن و جائز۔ دونوں کی مثال قرآن پاک میں موجود ہے۔ جو حیلہ لذت پرستی، عیش کوشی اور سہل پسندی کے لیے کیا جائے اور اس میں مقاصدِ شریعت کی نفی اور احکام شرع کی خلاف ورزی کی گئی ہو وہ شیطانی تدبیر ہے اور ناجائز و حرام ہے۔ بنی اسرائیل کا یہ حیلہ اسی قسم کا تھا۔ انسان مچھلی کھائے بغیر بخوبی زندہ رہ سکتا ہے۔ ماہی خوری شدید ضرورت نہیں، اضافی سہولت کے زمرے میں آتی ہے۔ البتہ جہاں لوگ واقعتاً ناقابل تحمل تنگی و مشقت میں مبتلا ہوں، وہاں دائرہ شریعت میں رہتے ہوئے ان کے لیے کوئی ایسا متبادل تجویز کیا جائے جس سے مقاصد شریعت کی نفی لازم نہ آئے، وہ حیلہ نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ اعلیٰ درجے کے علمی رسوخ کے بغیر ایسے متبادل کو تلاش کیا ہی نہیں جا سکتا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی اہلیہ ایک مرتبہ ان کو غلط مشورہ دے بیٹھیں، اس پر حضرت ایوب علیہ السلام نے تنبیہ کے لیے سو مرتبہ سزا دینے کی جو قسم کھائی تھی اس کو پورا کرنے کے لیے انہیں کہا گیا سو تنکوں کا ایک مٹھا بنا لیں اور اس سے انہیں ماریں تو قسم پوری ہو جائے گی۔ ان دو مثالوں سے قارئین دونوں قسم کے حیلوں میں فرق بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ اب ہم اصل واقعے کی طرف لوٹتے ہیں۔

ذومعنی جملے:

ان مچھیری قوم میں تین طرح کے لوگ ہو گئے تھے۔ کچھ وہ تھے جو خود بھی گناہ سے بچتے تھے اور دوسروں کو بھی بچنے کی تنبیہ اور تلقین کرتے تھے۔ یہ لوگ نجات پا گئے۔ کچھ وہ تھے جو گناہ تو نہ کرتے تھے لیکن گناہ (یعنی علانیہ گناہ) کرنے والوں کو منع بھی نہ کرتے تھے۔ یہ مصلحت پسند لوگ اپنے سماجی رشتے اور دنیاوی تعلقات منقطع ہو جانے کے خوف سے ''چھوڑو جی! سانوں کی اے، جیہڑا کرسی او آپوں ای بھرسی'' کہہ کر وسیع النظری کا مظاہرہ کرتے تھے اور تنگ نظری یا قدامت پسندی کا طعنہ سننے سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے کہیں سے یہ جملہ سن لیا تھا: ''ہر ایک اپنی قبر میں جائے گا، ہم کیوں کسی پر اپنا مغز کھپاتے اور دل جلاتے پھریں۔'' انہیں سمجھ نہ آتی تھی آخرت میں یہ بھی پوچھا جائے گا اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ کا حکم ٹوٹتے دیکھ کر تمہارا دل بے چین کیوں نہ ہوا تھا؟ اللہ رب العزت کی کائنات میں غیر اللہ کا حکم نافذ تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی خلاف ورزی کی جاتی تھی، علانیہ نافرمانیاں کی جاتی تھیں، تم نے اس موقع پر کیا کیا؟ یاد رکھیے! ''ہر انسان کو نجی زندگی اپنے طور پر گزارنے کا حق ہے'' یا ''مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے'' یا ''بچوں کو روک ٹوک کرنے سے ان کی ذہنی نشوونما متاثر ہوتی ہے''

اوراس طرح کے دوسرے جملے ان تخریب کار ذہنوں کی تخلیق ہیں جو دلفریب نظریات اور ذومعنی جملوں کی آڑ میں پوری دنیا پر ابلیسی نظام رائج کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کوئی جنگلی جانور نہیں پابندیوں سے آزاد ہو کر جگالیاں کرتا پھرے، اس سے ایک ایک لمحے کا حساب ہوگا اور یہ احتساب علانیہ گناہ پر خاموش رہنے اور حسب قدرت وحیثیت روک ٹوک نہ کرنے پر بھی ہوگا۔

خوبصورت روایت کا خاتمہ:

ایک زمانہ ہوتا تھا...... اور وہ کیا خوب زمانہ تھا...... محلے کے ایک خاندان کا بڑا سارے محلے کا بڑا شمار ہوتا تھا اور اس کے ہوتے ہوئے مجال نہ تھی کوئی ٹیڑھی مانگ والی بودی نکال کر آوارہ پھرے یا محلے کی حدود میں کوئی ناشائستہ حرکت کرے۔ اگر یہ بزرگ اپنی کراری آواز میں کسی کو ڈانٹ دیتے تو مجال نہ تھی کوئی چوں بھی کرتا، سب اپنی سعادت سمجھ کر خاموش کھڑے نصیحت سنا کرتے تھے...... لیکن ناس ہو شیطان کی پروردہ اس مغربی تہذیب کا جس نے ہمیں مشرقی تہذیب کی اس خوبصورت روایت سے محروم کر چھوڑا اور اب تو گھر کا بڑا اپنے ہی زیر کفالت چھوٹوں کو کچھ کہتے ڈرتا ہے کہیں وہ ''مائنڈ'' نہ کر جائیں یا روک ٹوک سے ان کی ''آزاد ذہنی نشوونما'' پر فرق نہ پڑے۔

اُلٹی سمجھ کی کارستانیاں:

بات حیلہ باز مچھیروں کی ہو رہی تھی۔ یہ لوگ خوب خوش ہوتے تھے ہم تو ہفتہ واری شکار کی مذہبی پابندی کا احترام بھی کر رہے ہیں اور موج بھی اُڑا رہے ہیں۔ آخر کار جب حرام ان کی رگوں میں رچ بس گیا، ان کے جسم کے مساموں سے حرام اُبلنے لگا اور مہلت کی مدت ختم ہوگئی تو ان کے سوجے ہوئے جسم بدنما بندر بنا دیے گئے۔ یہ لوگ رات کو جی بھر کر حرام اُڑا کر سوئے اور جب صبح اُٹھے تو ایسے غلیظ بندروں کی شکل میں تبدیل ہوگئے جنہیں دیکھ کر گھن آتی تھی۔ ان کے جسم میں موجود حرام کی نحوست جمع ہو کر ان کے چہروں پر چھا گئی تھی۔ تین دن تک اس رسوا کن اور عبرت انگیز حالت میں رہنے کے بعد سب مر کھپ گئے۔ ڈارون نامی یہودی مفکر نے جو فلسفہ دنیا کو دیا تھا، اس میں اس نے حقیقت کو اُلٹ کر برعکس پیش کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے اس کے اپنے آباء واجداد کسی زمانے میں انسان سے بندر بنا دیے گئے تھے لیکن یہ احمق الٹا سمجھا اور دنیا والوں کو یہ کہتا رہا بندر آگے چل کر انسان بنا دیے گئے۔ اندازہ لگایئے اسلام یہ بتاتا ہے عذاب دی جانے والی مخلوق زندہ نہیں چھوڑی جاتی لہٰذا یہ لالچی یہودی مچھیرے لٹکتی دموں والے بننے کے بعد سب مر گئے تھے اور آج کے بندر بھی ان بندروں کی نسل نہیں، مگر یہودی کی مسخ شدہ عقل کی کارستانیاں ملاحظہ فرمایئے دنیا کو بے دین اور بدعقیدہ بنانے کے لیے کہتے پھرتے ہیں موجودہ انسان بندروں کی اولاد ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی براہ راست مخلوق نہیں بلکہ خود بخود بندر بننے والے جانور سے خود بخود انسان بن گئے ہیں۔

ڈرنے کی بات:

بہر حال کہنے کی...... بلکہ ڈرنے کی...... بات یہ ہے ان مسخ شدہ بندروں کی کچھ عادتیں ہم میں بھی پائی جاتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا پاکستان میں سرکاری طور پر سود حرام ہے لیکن گلشن کا کاروبار سود کی بنیاد پر ہی چل رہا ہے۔ مروجہ بینکوں میں سودی کھاتوں کو ''نفع نقصان میں شراکت کا کھاتہ'' کا نام دے دیا گیا ہے اور دانش ور صاحبان کا کہنا ہے صاحب سود اس زمانے میں حرام تھا جب یہ غریبوں پر ظلم تھا۔ آج تو یہ غریبوں کی مدد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ریٹائرڈ پنشن یافتہ حضرات، بیوگان وغیرہ بینکوں میں رقم رکھوا کر سود کے سہارے جی رہے ہیں۔ یہ ظلم کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ واقعہ یہ ہے سود بینکی ہو یا غیر بینکی، زمانہ جاہلیت کا ہو یا آج کے چمکتے دمکتے دور کا، بہر حال ظلم بلکہ سیاہ ظلم ہے۔ سودی بینکوں کے اس استحصالی نظام کی، جو ہر حال میں سرمایہ دار اور سامراج کو فائدہ دیتا ہے۔ غریب کو جو کچھ ملتا ہے، وہ سرمایہ دارانہ حربوں کی بدولت اس سے واپس لے لیا جاتا ہے اور اس کے حصے میں دھوکے اور فریب کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔

جھونپڑے سے محل تک

تاریخ کے بدلتے رنگ:

زمانہ بھی کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے؟ اور انسان اپنے اوپر گزرنے والا وقت بھول کر بھیگی بلی سے خونخوار بھیڑیے تک کا سفر کتنی خاموشی سے طے کر لیتا ہے؟ اس کی ایک مثال بنی اسرائیل ہے۔ جی ہاں! وہی رسوائے زمانہ اور مردود و مبغوض قوم جس کی بداعمالی، عہد شکنی، اخلاقی گراوٹ اور کج فطری کے واقعات سے آسمانی کتابیں بھری پڑی ہیں اور جو ہر زمانے میں انسانی نسل کے لیے بدنما داغ بنی رہی ہے۔ یہ قوم ظالم ہو یا مظلوم، طاقتور ہو یا کمزور، ہمیشہ اس کردار کا مظاہرہ کرتی رہی جو قابل رشک بلکہ قابل نفرت رہا ہے۔ فرعون کے زمانہ میں یہ محکوم تھی آج شیرون کے عہد میں یہ حاکم ہے لیکن اس کی کارگزاری ایسی ہے اللہ تعالیٰ کی لعنت اور بندوں کی ملامت کے سوا کسی چیز کی حقداری اس کے نصیب میں نہیں۔ کل تک یہ جس ظلم کا شکار تھی آج دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہے اور کل تک یہ جس عذاب سے نجات پانے کے لیے اللہ کے مقدس پیغمبروں سے دعا کروایا کرتی تھی آج اختیار و اقتدار ملنے پر اس نے دوسری اقوام کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کر رکھا ہے جس میں یہ خود مبتلا تھی۔ مظلومیت کا دور گزرتے ہی ظالم بن جانا اور آزمائش ختم ہوتے ہی بدمست بھینسے کی طرح ڈکرانے لگنا اس قوم کی وہ سرشت ہے جس کی بنا پر قیامت تک کے لیے ذلت و خواری کی مہر کھا چکی ہے۔ آیے! تاریخ کے ان بدلتے رنگوں کو جغرافیۂ ارضی و قرآنی کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔

جھونپڑے سے محل تک:

تنزانیہ، یوگنڈا اور کینیا کے نقطہ اتصال پر ایک قدرتی جھیل ہے جسے آج کل وکٹوریہ جھیل کہتے ہیں۔ اس جھیل سے دنیا کا ایک مشہور دریا نکل کر سوڈان اور مصر سے ہوتا ہوا بحیرۂ روم میں جا گرتا ہے۔ بحیرۂ روم میں گرنے سے قبل یہ سست رو ہو کر شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ اس مقام پر آج کل قاہرہ آباد ہے۔ "بابلیون" نامی وہ قلعہ بند شہر جسے فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا، یہیں واقع ہے جب کہ اس سے کچھ پیچھے کسی کے زمانے میں فرعون کا دارالحکومت "منفیس" تھا۔ فرعون کا محل اس دریا کے کنارے تھا جب کہ اس سے کچھ اوپر دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد عمران کا جھونپڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس جھونپڑے سے محل تک لے گئے اور آپ کی پرورش اپنے سب سے بڑے دشمن فرعون کے محل میں ہوئی۔ اس زمانے میں منفیس میں دو قومیں رہتی تھیں۔ قبطی جو حاکم تھے اور بنی اسرائیل جو محکوم و مظلوم تھے۔ قبطیوں کو غرور اور تعصب تھا وہ اس سرزمین کے اصل باشندے ہیں جبکہ بنی اسرائیل فلسطین سے ہجرت کر کے وہاں آباد ہوئے تھے۔ قبطیوں کا بنی اسرائیل سے سلوک انتہائی حقارت آمیز اور ظالمانہ تھا۔ وہ بنی اسرائیل کو برابر کا درجہ دینا تو کجا، آزاد انسان سمجھنے پر بھی تیار نہ تھے جس کا اظہار آئے دن مختلف واقعات کی صورت میں ہوتا رہتا تھا۔ ایسے ہی ایک واقعہ میں ایک اسرائیلی کو ایک مغرور قبطی کی زیادتی سے بچاتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قبطی مارا گیا۔ اب نہ ارادہ قتل تھا نہ آلۂ قتل، لیکن قبطی نسلی تفاخر کے

سب بپھر گئے اور معاملے کی تحقیق کے بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے مشورے ہونے لگے کیونکہ قبطیوں کو محسوس ہوتا تھا اس نوجوان نے آج جس طرح بنی اسرائیل کے ایک فرد کو ہمارے ظلم سے بچانے کی جرأت کی ہے، اس طرح کل یہ ساری قوم کو ہماری غلامی سے نکال کر لے جائے گا، تب ہمیں بیگار کے لیے مفت کے قیدی کہاں سے ہاتھ آئیں گے؟

تقویٰ اور خدمت کا صلہ:

اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیب سے دستگیری فرمائی اور خود فرعونیوں میں ان کا ایک ہمدرد اور خیر خواہ پیدا ہو گیا جس نے نہ صرف فرعونی کابینہ کے مشوروں کی آپ کو اطلاع دی بلکہ ان کی سازش سے بچ نکلنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ آپ اللہ تعالیٰ کی مدد اور رہنمائی سے مفیس سے نکلے اور صحرائے سینا عبور کر کے خلیج عقبہ کے کنارے واقع شہر مدین جا پہنچے جہاں کسی کو آپ کے خفیہ ٹھکانے کی خبر نہ تھی۔ مدین میں آپ کے تقویٰ، رجوع الی اللہ اور دیانت وامانت کی بدولت آپ کو ٹھکانا بھی ملا، روزگار بھی اور گھر بار کا بندوبست بھی ہو گیا اور وقت کے سب سے نیک اور صالح انسان حضرت شعیب علیہ السلام کی صحبت بھی میسر آ گئی۔ یہاں آپ دس سال کا طویل عرصہ گذار کر واپس ہوئے تو اس مرتبہ آمد والے راستے کے برخلاف صحرائے سینا کے بالائی حصے کو چھوڑ کر اس کے اندرونی حصے سے ہوتے ہوئے چلے۔ جہاں کوہِ طور واقع ہے۔ اس جگہ کو "حوریب" کہتے ہیں۔ اس میں زبردست حکمت الٰہی پوشیدہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دس سالہ خدمت وریاضت اور دیانت وامانت کے بعد نبوت جیسے عظیم انعام سے نوازا۔ آپ کو ہمکلامی کا شرف بخشا اور اپنا پیغمبر بنا کر فرعون کے پاس دعوت وتبلیغ کی بھاری ذمہ داریاں نبھانے کے لیے بھیجا۔

بابل کے فرشتے

بابل کا جادو:

آج کل بنگال کے جادو کا بہت چرچا ہے، لیکن کسی زمانے میں اس گندے کام کے لیے ''بابل'' دنیا بھر میں مشہور تھا۔ لوگ وہاں کے جادوگروں کے کمالات دیکھ کر انہیں مافوق الفطرت اور مقدس و محترم شخصیات سمجھنے لگ گئے تھے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو مامور کیا وہ زمین پر انسانوں کے روپ میں جائیں اور لوگوں کو اس مکروہ عمل کی حقیقت اور اس کے کرنے والے خبیث الفطرت انسانوں کی اصلیت سے آگاہ کر کے اس عمل سے بچانے اور جادوگروں کے جال میں پھنسنے سے بچنے کی تلقین کریں۔ یہ کام اگرچہ انبیاء علیہم السلام سے بھی لیا جا سکتا تھا مگر چونکہ لوگوں کو جادو کی حقیقت سمجھانے کے لیے وہ کام عملاً کر کے دکھانے پڑتے جن کے ذریعے جادوگر لوگوں کو اپنا معتقد بناتے ہیں، اس واسطے انبیائے کرام علیہم السلام سے یہ کام نہ لیا گیا تاکہ ان کی شانِ معصومیت پر کوئی حرف نہ آئے۔ ان فرشتوں نے زمین پر آ کر اپنا کام شروع کیا اور لوگوں کو سحر کے عملِ بد سے بچنے اور ساحروں کے چکر میں آ کر دین و دنیا تباہ کرنے سے بچانے کی کوششیں کرنے لگے۔ کچھ لوگ تو جادو کے ''سربستہ راز'' اور جادوگروں کے ''کمالات'' کی حقیقت جان کر راہِ راست پر آ گئے اور انہوں نے اس برائی سے بچنے کا عہد کر لیا لیکن کچھ کم بختوں نے جن میں یہود پیش پیش تھے، ان فرشتوں سے ان چیزوں کی اصلیت جاننے کے بعد خود ہی جادوگری شروع کر دی اور عوام الناس کو پیشہ ور جادوگروں سے چھڑا کر اپنا معتقد بنانے کے ساتھ یہ ملعون حرکت بھی کی اپنے اس علم و فن کو پیغمبرانِ خدا سے حاصل کردہ ''روحانی علوم'' کا نام دینا شروع کر دیا۔

جادوئی کمالات کی حقیقت:

یہ فرشتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خدمت پر مامور تھے لوگوں کو سحر اور معجزہ نیز ساحر اور نبی کا فرق سمجھائیں سحر بدکار لوگوں کے کیے ہوئے مختلف اسباب و ذرائع اور ٹونوں ٹوٹکوں کا نتیجہ ہوتا ہے جو خفیہ ہوتے ہیں اور عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے، جبکہ معجزہ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست حکم سے اس کے نیک بندوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے جو پاکیزہ کردار، نیک طبیعت اور اچھی خصلت والے ہوتے ہیں۔ بظاہر معجزہ اور سحر دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں عام معمول سے ہٹے ہوئے اور خلافِ عادت کام ہوتے ہیں۔ عوام ان میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے جادوگروں کو بھی ایسا ہی قابلِ احترام و تعظیم اور پہنچی ہوئی ہستی سمجھنے لگ جاتے ہیں جیسا کہ انبیائے کرام اور نیک ہستیوں کو سمجھنا چاہیے لیکن حقیقت میں دونوں کے درمیان کئی ایسے فرق موجود ہوتے ہیں جن سے حق و باطل کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً سب سے بڑی چیز جادوگروں کا بدعمل، فسق و فجور کے مرتکب اور گندے کاموں میں مبتلا ہونا ہوتا ہے جبکہ انبیائے کرام اور ان کے متبعین ایسی چیزوں سے پاک اور دور ہوتے ہیں۔ یہ فرشتے لوگوں کو یہ فرق سمجھا کر جادوگروں سے دور رہنے اور سچے اللہ والوں سے تعلق جوڑنے کی نصیحت کرتے اور جب بھی لوگوں کو جادوگروں کے ''محیر العقول'' واقعات کی حقیقت سمجھانے کے لیے ان کو عملاً وہ کام کر کے بتاتے جنہیں عوام الناس ''ماورائی طاقت'' کا کارنامہ یا ''روحانی کرشمہ''

سمجھتے ہیں تو ساتھ ہی یہ ضرور بتاتے ہماری طرف سے تمہارے سامنے ان رازوں کی گرہ کشائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے تم انہیں جان لینے کے بعدان سے بچتے ہو یا نہیں؟ اب سمجھ دار لوگ تو جادو اور جادوگروں پر لعنت کے دو حرف بھیج کر اس گندگی سے ہمیشہ کے لیے توبہ تائب ہو جاتے اور فرشتوں کی مجلس سے یہ عہد لے کر اٹھتے وہ آیندہ ''مافوق الفطرت طاقت'' کے حصول کے اس چکر میں نہ پڑیں گے، لیکن کچھ شریر لوگوں پر کم بختی آئی اور انہوں نے جادو کے معمے کو حل کرنے کے بعد اس پر تف کرنے کی بجائے اسے لوگوں پر رعب جمانے اور انہیں متاثر کر کے شہرت و دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیا۔ ساتھ ہی یہ ظلم بھی کیا اپنی باطل پرستی اور دنیا طلبی پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ مشہور کیا ہمارے پاس جو ''فن'' ہے یہ جادو نہیں بلکہ ''آسمانی علم'' ہے جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا۔ قارئین کرام نے ''جادوئی کمالات'' دکھانے والے پروفیسروں، ڈاکٹروں اور ماسٹروں کے ایسے دعوے ضرور سنے ہوں گے جو لمحہ بھر میں اچھے اچھے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو ڈگمگا دیتے ہیں۔

دو جادوگر فرقے:

ان دو فرشتوں کا نام ہاروت و ماروت تھا۔ یہ قدیم جادو کے مرکز ''بابل'' میں بھیجے گئے تھے اور ان سے جادو کی حقیقت جان کر اسے کمائی اور دھاک بٹھانے کا ذریعہ بنانے والے نامراد لوگ یہود تھے جن کا جادو آج بھی دنیا کے گندے ترین سفلی عمل کے طور پر مشہور ہے۔ سحر کے علم و فن میں یہود و ہنود کی مہارت مسلمہ ہے، اس لیے جادو کے کارگر ہونے کے لیے ظاہری و باطنی نجاست درکار ہوتی ہے جو ان لوگوں میں وافر مقدار میں ہوتی ہے۔ ہنود یعنی ہندوؤں میں شرک اور یہود میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بے ادبی و گستاخی عام ہے۔ جادوگری سے یہود کا شغف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی قائم تھا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زہر خورانی کے علاوہ جادوگری جیسے گھٹیا اور ذلیل حربے بھی استعمال کیے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام ناپاک عزائم اور شیطانی منصوبے خاک میں ملا دیے۔ یہودیوں نے دنیا کو یہ باور کرایا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت و سلطنت کا دارومدار جادو اور طلسمات پر تھا۔ وہ ایک جادو کی انگوٹھی بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یہ عقیدہ بھی غلط طور پر ان میں مروج ہو گیا تھا حضرت سلیمان علیہ السلام نے معاذ اللہ جادو کی ترکیبیں جمع کر کے اپنی کرسی (تخت) کے نیچے دفن کر رکھی تھیں اور ان کی وفات کے بعد یہود جادو کی ان کتابوں کو وہاں سے نکال کر اپنے استعمال میں لے آئے۔ قرآن مجید نے ان تمام الزامات، توہمات اور غلط باتوں کی سختی سے تردید کی اور فرمایا جادو کی تعلیم و ترویج اور اس پر عمل سب کافرانہ افعال اور شیطانی اعمال ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے بری ہیں، نہ انہوں نے کبھی یہ عمل کیا نہ وہ ایسا کر سکتے تھے، یہ کافرانہ اعمال کفار اور شیاطین سے سرزد ہوتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو طلسمات، سحر اور جادو کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں تھا، نیز اس بات کی وضاحت فرمادی گئی جادو میں نقصان اور ضرر کا پہلو بہت نمایاں ہے اور فائدے کا پہلو مفقود ہے۔ دوسروں کو ایذا اور تکلیف پہنچانے سے اللہ تعالیٰ کی ناراضی بلکہ اس کا غیظ و غضب جادوگر کے لیے باعثِ ہلاکت اور موجب بربادی بن جاتا ہے۔

متضاد نظریوں کی اصلاح:

سحر کے بارے میں ہمارے اس ترقی یافتہ دور میں دو متضاد نظریے پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ جن کی روشن خیالی کو سائنس کا ہیضہ ہو چکا ہے اور وہ ہر چیز کو سائنسی اصولوں اور فارمولوں پر پرکھتے ہیں، جادو کے خارجی اثرات کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں محیر العقول واقعات و اثرات کی سائنسی توجیہہ ہو سکے تو ٹھیک ہے، نہ ہو سکے تو وہ آئیں بائیں شائیں کر جائیں گے لیکن جنات اور سحر و نظر وغیرہ کی اتنی حقیقت بھی نہ مانیں گے جتنی قرآن اور حدیث میں بتائی گئی ہے۔ دوسری قسم ان ضعیف العقیدہ توہم پرست اور جاہل لوگوں کی ہے جو ہر سمجھ میں نہ آنے والی چیز کو جنتر منتر کا اثر قرار دے کر اس کے توڑ میں لگ

جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے یقین ہٹا کر ان چیزوں کو مؤثر بالذات سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک جملے میں دونوں کی اصلاح فرما دی ہے: ''وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ'' وہ جادوگر کسی کو اپنے جادو سے کسی کو کوئی نقصان اللہ تعالیٰ کے تکوینی اذن کے بغیر نہیں پہنچا سکتے۔ اس آیت میں ان دونوں متضاد خیالات والوں کی اصلاح کا سامان موجود ہے۔ عقلیت زدہ لوگوں کی اصلاح کی خاطر فرمایا گیا ہے جادو کے خفیہ اعمال سے ضرور ضرر پہنچتا ہے (جیسا کہ منہ کی لپیٹ کر کسی کو مارنے سے ظاہری تکلیف ہوتی ہے) اسے بالکل غیر حقیقی اور فرضی سمجھنا درست نہیں۔ بعض لوگ یہی بات سمجھانے کے لیے ایک غلط جملہ بول جاتے ہیں۔ ''جادو برحق ہے'' جبکہ جادو کا حق سے کیا تعلق؟ وہ تو سراسر باطل ہے۔ ہاں یوں کہنا چاہیے اس کے خارجی اثرات حقیقی وجود رکھتے ہیں۔ یہ کوئی وہمی یا فرضی چیز نہیں۔ دوسری قسم کے وہمی لوگوں کے عقیدے کی درستگی کے لیے اللہ پاک نے فرمایا جادوگروں کی کارستانیاں جتنی خطرناک کیوں نہ ہوں مگر قدرت الٰہیہ سے خارج نہیں۔ اگر کسی کو جادو کے ہاتھوں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو وہ اس کے لیے ایسی ہی آزمائش ہے جیسے بیماری یا حادثات وغیرہ۔ اس پر صبر کرے، اللہ سے عافیت مانگے، مسنون دعاؤں سے اس کا علاج کرے اور اس تکلیف پر اجر کا امیدوار رہے۔

سحر کیا ہے؟

آخر میں ہم سحر کا لغوی و اصطلاحی معنی اور حکم لکھ کر اس قسط کو ختم کرتے ہیں۔ سحر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو، چاہے وہ سبب معنوی ہو، جیسے خاص خاص کلمات اور افعال کا اثر، یا غیر محسوس چیزوں کا ہو جیسے جنات و شیاطین کا اثر یا ٹیلی پیتھی وغیرہ میں قوتِ خیالیہ کا اثر یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات مخفی ہوں، جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لیے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو۔ اصطلاحِ قرآن وسنت میں سحر ایسے خفیہ کام کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو۔ پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر جنتر پڑھے جاتے ہیں جن میں کفر و شرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی تعریف کی گئی ہو، یا کواکب و نجوم کی عبادت کی گئی ہو جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔ کبھی ایسے اعمال اختیار کیے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا یا جنابت و نجاست کی حالت میں رہنا، طہارت سے اجتناب کرنا وغیرہ۔ اسی لیے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہیں، پاکی اور اللہ کے نام سے دور رہیں، خبیث کاموں کے عادی ہوں جادوگرنی عورتیں بھی مخصوص ایام میں یہ کام کرتی ہیں تو زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

فراڈیوں کی دنیا:

جادو کی جتنی بھی قسمیں روئے زمین پر پائی جاتی ہیں، ناجائز و حرام تو سب ہیں اور بعض اس سے بھی زیادہ مہلک و خطرناک یعنی کفر و شرک ہیں۔ جس جادو میں کوئی کفریہ یا شرکیہ عمل کیا گیا ہو جیسے شیاطین و خبیث ارواح و جنات سے مدد طلب کرنا، ستاروں کی تاثیر کو مستقبل بالذات ماننا وغیرہ تو یہ بالا جماع کفر ہے اور جس میں یہ کافرانہ کام تو نہ ہوں لیکن دوسرے گندے شیطانی کام ہوں تو یہ غلیظ ترین حرام اور اکبر الکبائر میں سے ہے۔ اسی واسطے جادو کا سیکھنا سکھانا، کرنا کروانا، اس پر اجرت لینا دینا سب حرام و ناجائز ہے۔ آج کل مسلمانوں میں یہودیوں کی اس گندی خصلت کا بڑا چرچا ہو گیا ہے اور اپنی دشمنی نکالنے یا ناجائز کام یا غرض پوری کروانے کے لیے بے دھڑک سفلی عاملوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور دنیا و آخرت برباد کر کے لوٹتے ہیں۔ یاد رکھیے! ان بدعمل اور بدکردار عاملوں کے دیے ہوئے تعویذ گنڈوں میں اگر شرکیہ یا کفریہ کلمات ہوں گے تو وہ شرک ہے، تب ایمان کہاں رہا؟ اور اگر ایسے اجنبی و نامانوس کلمات و الفاظ ہوں گے جن کا معنی معلوم نہیں تو وہ بھی ناجائز ہے، کیونکہ عموماً ایسے الفاظ خبیث ارواح اور شیاطین کو خوش کرنے کے لیے بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں شیاطین پر لعنت کی گئی ہے اور ان کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا دشمن بتایا گیا ہے، ان سے مدد طلب کرنا بہت بڑی حماقت، جہالت اور دارین کی ہلاکت و

بربادی ہے۔ پھر یہ نام نہاد جعلی عامل چونکہ جادو کا فن بھی صحیح طرح نہیں جانتے، اکثر فراڈیے اور شعبدہ باز ہوتے ہیں اس واسطے ان کے پاس جانے والا نادان ایمان کے ساتھ پیسہ بھی برباد کر کے لوٹتا ہے اور سوائے نامرادی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

خلیج سوئز کے کنارے

کشمکش کا آغاز:

سیدنا حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کی زندگی کے مختلف ادوار وواقعات داعیان دین کے لیے مثالی نمونہ ہیں، اس لیے قرآن شریف میں ان کا ذکر مختلف اسلوب میں بار بار آیا ہے۔ جب آپ کے کندھوں پر نبوت کا بارگراں ڈالا گیا اور آپ اللہ رب العالمین کی کبریائی کی دعوت لے کر فرعون کے دارالحکومت ممفیس نامی شہر میں پہنچے جو دریائے نیل کے ڈیلٹا کے قریب واقع تھا تو ایک طویل کشمکش کا آغاز ہوا۔ ایک طرف خیر خواہی اور ہمدردانہ نصیحت تھی اور دوسری طرف ضد بازی اور ہٹ دھرمی۔ ایک طرف روحانیت، شفقت، صبر اور بلند ہمتی تھی تو دوسری طرف مادیت پرستی، انانیت اور گھمنڈ و غرور۔ یہ کشمکش کئی مراحل سے گذرتی ہوئی بالآخر اس وقت اختتام پذیر ہوئی جب فرعون بمع اپنی سرکش قوم کے بحر احمر (بحیرۂ قلزم) کی ایک شاخ خلیج سوئز میں غضبناک موجوں کی لپیٹ میں آ کر عبرتناک انجام سے دوچار ہوا اور رہتی دنیا تک تکبر اور غرور کے برے انجام کی علامت بن گیا۔ بلاشبہ عقل والوں کے لیے اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں۔

دین و دنیا کی امامت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے محبت، ہمکلامی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے ساتھ غیبی مدد و نصرت کے واقعات بہت ہی ایمان افروز اور توکل و یقین کو بڑھانے والے ہیں۔ آپ کو دو قسم کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں: ایک تو فرعون جیسے خدائی کے زعم میں گرفتار بد دماغ شخص پر اس بات کی محنت کہ وہ جھوٹی انا کے خول سے باہر آ کر عجز و انکسار کی خو اپنائے اور خود کو اپنے جیسے بندوں کا مالکِ کل سمجھنے کی حماقت ترک کر دے۔ دوسرے بنی اسرائیل کو جو قبطیوں کی زیادتی، نسلی تعصب، ظلم و ستم اور معاشی و سماجی استحصال کا شکار تھے مصر سے نکال کر آزاد علاقے کی طرف لے جایا جائے جہاں وہ اپنے دین کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ گویا جناب موسیٰ علیہ السلام کو روحانی اور سیاسی دونوں میدانوں کی قیادت سپرد کی گئی تھی اور آپ کو تفویض کیے گئے فرائض دین و دنیا کا حسین امتزاج تھے۔ آپ جلیل القدر نبی بھی تھے اور سیاسی امور کے ماہر اور اس شعبے میں اپنے وقت کے امام بھی۔ تاریخ بتاتی ہے انہوں نے یہ دونوں ذمہ داریاں اس خوبی اور عمدگی سے نبھائیں ان کے ہر قول و فعل میں بعد میں آنے والوں کے لیے رہنما ہدایات موجود ہیں۔ علمائے امت محمدیہ جو مسلمانوں کے لیے دونوں شعبوں میں امامت اور قیادت کے مکلف ہیں ان کے لیے آپ کی حیات مبارکہ کی وہ تفصیلات جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، نہایت سبق آموز اور رہنما اصولوں پر مشتمل ہیں۔

دو مشکل محاذ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین سے واپسی پر کوہ طور سے ہوتے ہوئے مصر پہنچے تو انہیں دونوں محاذوں پر سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ فرعون جیسے جابر، متکبر اور غرور و نخوت میں مبتلا حکمران کو جس کی انا خوشامدی درباریوں کی چاپلوسی سے سوج کر کپا ہو چکی تھی، اس سے خیالی خدائی کا زعم اور جھوٹی الوہیت کا دعویٰ

چھڑوا کر اللہ احکم الحاکمین کی خدائی مان لینے کی دعوت دینا......اور اپنی منتشر، غیر منظم اور سالوں سے فرعونی ظلم کے تحت پسی ہوئی قوم کو منظم کر کے اس سے شریعت موسویہ پر عمل کروانا اور اسے سلامتی کے ساتھ ایک بد دماغ اور بے لگام حکمران کے چنگل سے نکال لے جانا۔ دونوں کام نہایت کٹھن، صبر آزما اور حوصلہ طلب تھے۔ آپ کو دونوں محاذوں پر تن تنہا کام کرنا تھا اور آپ کے ساتھ اس طویل سفر میں سوائے آپ کے ماں جائے بھائی کے اور کوئی مزاج شناس اور مکمل اطاعت و وفاداری نبھانے والا نہ تھا۔ جب آپ فرعون کے بھرے دربار میں پہنچے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے آپ کی قوت ایمانی اور تعلق باللہ کا کیا عالم ہوگا وقت کا باجبروت حکمران آپ پر قتل کی فرد جرم عائد کیے ہوئے تخت پر بیٹھا ہوا ہے، آس پاس درباریوں کا جم غفیر ہے، مارے رعب کے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں اور پوری مملکت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سوائے آپ کے بھائی کے اور کوئی غمخوار و مددگار نہیں، مگر آپ بے خوفی سے بھرے دربار میں اس کے دعوائے خدائی کی نفی کرتے ہیں اور اسے سچے خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں جبکہ یہ دونوں باتیں اس پر سخت گراں اور ناگوار ہیں۔

علاج کا فیصلہ:

فرعون نے اول تو دلائل سے بات چیت شروع کی جب اس میں لاجواب ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر حجت تام کرنے کے لیے اپنے معجزات پیش کیے تو اس نے ان کا جواب تلاش کرنے کے لیے جادوگروں کو بلا بھیجا۔ مصر براعظم افریقہ میں واقع ہے اور یہاں کے ہر قبیلہ میں جادوگر ہوتا ہے جس کی جاہل قبائل بڑی عزت کرتے ہیں۔ چنانچہ دور دراز قبائل کے جادوگر اپنا خاندانی فن لے کر آپہنچے۔ فرعون کی ضد اور خودسری دیکھیے اپنے درباریوں سے کہہ رکھا تھا ہم جادوگروں کی بات صرف اس صورت میں مانیں گے جب وہ جیت جائیں۔ اگر وہ ہار گئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کمالات کو سحر کی بجائے معجزہ قرار دیا تو ہم ان کی بات بھی نہ مانیں گے "لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِنْ كَانُوا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ." (الشعراء:40) چنانچہ جب جادوگروں نے معجزات موسوی کی حقیقت سے اسے آگاہ کیا تو عقل اور سنجیدگی کے اس دشمن نے الٹا ان پر ملی بھگت کا الزام لگا کر انہیں بھی شہید کر ڈالا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب اس کی مہلت کی گھڑیاں ختم ہوگئیں اور قدرت کی طرف سے اس کی بد دماغی کے علاج کا فیصلہ کر لیا گیا۔

محیر العقول واقعہ:

بنی اسرائیل کو حکم ہوا تم رات کے اندھیرے میں مصر سے نکل پڑو، صبح ہونے تک بنی اسرائیل "ممفیس" سے نکل کر خلیج سوئز سے کچھ فاصلہ پر پہنچ چکے تھے۔ قبطیوں نے جب دیکھا آج ہمارے گھر کا کام کرنے کے لیے کوئی اسرائیلی نہیں آیا تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور حقیقت حال معلوم ہونے پر وہ بجائے اس کے ان کو جانے دیتے، غصے سے بپھرے ہوئے ان کے تعاقب میں نکل پڑے۔ انہیں علم نہ تھا وہ بنی اسرئیل کے پیچھے نہیں جا رہے بلکہ موت ان کے پیچھے آ رہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ خلیج سوئز کے کنارے پہنچے تو آگے سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پیچھے دھول اڑاتا فرعونی لشکر تھا۔ قلیل وقت میں سمندر پار کرنے کا انتظام کرنے یا راستہ بدل کر صحراء سینا کی طرف نکلنے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن اس نازک وقت میں بھی ان کے پائے استقامت میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ اس پر رحمت الٰہی جوش میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ پانی سے ڈبونے کی صلاحیت چھین لی گئی، اس کے اندر راستے بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم جب پار اتری اور فرعونی لشکر معاملے کی حقیقت سمجھے بغیر (اور ہمارے بعض عقلیت زدہ علی گڑھی مفسرین کی طرح) پانی کے اتار چڑھاؤ کو جوار بھاٹا سمجھ کر ان کے پیچھے پیچھے سمندر میں اتر پڑا تو خلیج سوئز کی موجیں دوبارہ اپنی اصلی حالت پر بلکہ پہلے سے زیادہ غیظ و غضب کے ساتھ پھر کر ان پر آ پڑیں۔

کھال اترا ہوا دنبہ:

غرور میں اٹی ہوئی فرعونی قوم کے ہوش پہلے ہی تھپیڑے میں ٹھکانے آگئے۔ انہوں نے گریہ وزاری شروع کی لیکن اب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ آن کی

آن میں سب قصہ پارینہ بن گئے۔ البتہ فرعون کا بدن تاریخ کے بدلتے موسموں کے باوجود آج تک بھی محفوظ ہے۔ قاہرہ کے بین الاقوامی عجائب گھر میں اس کی لاش کو دیکھنے کا اتفاق راقم الحروف کو بھی ہوا۔ اس کے چہرے و مہرے پر چھائی بے بسی اور اس کی سوکھی ہڈیاں انسان کو اللہ رب العزت کی قہاریت و جباریت اور زمین پر خدا بننے والوں کے غرور و تکبر کا رسوا کن انجام یاد دلاتی ہیں۔

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے نجات دی، مگر آج اس قوم کی باقیات اس انعام کو بھول کر فلسطین کے مظلوم اور لاچار مسلمانوں سے وہ فرعونی سلوک کر رہی ہیں جس سے نجات کے لیے یہ خود دن رات دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ آج کے بنی اسرائیل اپنا مشکل وقت بھلا کر فلسطینی مسلمانوں کے معصوم بچوں کو اسی طرح قتل کر رہے ہیں جیسے فرعون ان کے بچوں کو قتل کرتا تھا اور یہی خلیج سوئز جہاں ان کو نجات ملنے کا محیر العقول واقعہ پیش آیا تھا، اس سے متصل نہر سوئز پر قبضہ جمانے کے لیے وہ کتنے ہی مسلمانوں کا خون بہا چکے ہیں اور اس کی پاداش میں لگتا ہے وہ بھی ایسے انجام سے دوچار ہوں گے لوگ ان کی لاشوں کو دیکھ کر نفرت اور کراہت سے ناک سکیڑ لیا کریں گے۔

واضح رہے جغرافیۂ قرآن کے ماہرین کے راجح قول کے مطابق خلیج سوئز ہی وہ مقام تھا جہاں قدرت الٰہی نے ظالم اور متکبر حکمران اور اس کے لشکریوں کو ہلاکت خیز غوطے دیے۔ بعض نے بحیرۂ مرہ بتایا ہے جو نہر سوئز کے بیچ میں پڑتا ہے لیکن راجح اور قرآنی الفاظ (بحر، یمّ) سے قریب پہلا قول ہی ہے۔

وادی ''تیہ'' میں

نجات دہندہ کا انتظار:

وہ بھی کیا عجیب منظر ہوگا جب حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام خلیج سوئز سے پار ہوتے ہوں گے اور اپنے پیچھے پانی میں غرق ہوتے فرعونیوں کی چیخ وپکار سن ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صبر، توکل اور عزیمت کا بدلہ اسی دنیا میں دے دیا تھا ایک سنگدل اور شقی القلب دشمن سے ان کو اور ان کی قوم کو نجات ملی اور ان کی آنکھوں کے سامنے دعوائے خدائی سے انکار کرتے کرتے اس کا منہ پانی اور مٹی سے بھر گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک طویل آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلے تھے۔ ان کو وقت کی سب سے متکبر اور ہٹ دھرم طاقت کو دین کی دعوت دینے اور مظلوم انسانوں کو اس کے شکنجے سے نکال کر آزاد کروانے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ انہوں نے سخت آزمائشوں اور صبر آزما مشکلات کے باوجود دین کی دعوت اور احکام الٰہیہ کی تبلیغ بہت خوش اسلوبی سے کی اور فرعونیوں کی اس گرفت سے اپنی قوم کو بخیر و عافیت نکال لائے جس سے خلاصی کا اس زمانے کے مظلوم خواہش تو کر سکتے تھے، مگر یہ خواہش کبھی حقیقت کا روپ دھار لے گی، اس کا سوچنا بھی ان کے لیے ناممکنات کی تمنا میں وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ آج بھی دنیا تقریباً اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ طاقت کے گھمنڈ میں آئی ہوئی بعض قوتوں نے پورے عالم انسانیت کے حقوق پامال کیے ہوئے ہیں، کرۂ ارضی پر جابجا بکھری ہوئی مخلوق ان کے دیدہ اور نادیدہ حصار میں جکڑی ہوئی ہے اور سب کی نظریں کسی نجات دہندہ کی منتظر ہیں۔

فطری کج روی:

فرعون اور اس کے ظلم سے یکدم نجات مل جانا بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام تھا۔ ذرا تصور تو کریں چند ساعتیں قبل وہ سمندر کے اُس پار کھڑے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکوہ کر رہے تھے ہم تو فرعونیوں کے گھیرے میں آ گئے اور اب وہ دوسرے کنارے پر صحیح سلامت موجود تھے اور ان وڈیروں، چوہدریوں، نوابوں اور جاگیرداروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے غوطے کھاتے اور ابھرتے ڈوبتے، بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے اور چیخ وپکار کرتے دیکھ رہے تھے جنہوں نے برسوں ان کی تحقیر کی تھی، ان سے بیگار لیا تھا اور ان کے بچوں کے قتل اور خواتین کی بے حرمتی سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ اس دنیا میں ظالموں نے مظلوموں کی بے بسی کا تماشا بارہا کیا ہے لیکن ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے مظلوم بھی ظالم کو خراب ہوتے دیکھ سکیں۔ قدرت نے اپنے فضل سے بنی اسرائیل کو یہ دن دیکھنا نصیب کیا تھا، لیکن یہ ایسی عجیب وغریب قوم ہے نہ اسے عیش میں یاد خدا کا دھیان رہتا ہے نہ طیش میں خوف خدا نام کی چیز ان کو سوجھتی ہے۔ اس کا ثبوت آج ہر کوئی فلسطینی بچوں کی تڑپتی لاشوں میں دیکھ سکتا ہے۔ خلیج سوئز کے پار پہنچنے کے بعد ان کے سامنے وسیع اور لق ودق صحرا تھا جہاں انسانی زندگی کے وسائل کمیاب بلکہ نایاب تھے۔ اللہ پاک نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعے ان کے لیے ایک پتھر سے بارہ چشموں کو رواں کیا۔ خوراک کے لیے میٹھی اور نمکین دونوں طرح کی آسمانی غذائیں (من وسلویٰ) اتاریں۔ بادل ان پر سایہ کر کے چھاؤں دار رہائش فراہم کرتا تھا اور یہ خوراک، پانی اور شب بسری کے انتظامات کے

غموں سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ ریگستانی آب و ہوا میں غذا اور رہائش کا یہ نظام ایسا عمدہ اور بہترین تھا ان کے علاوہ بنی نوع انسان میں سے کسی نے بھی اتنی بے فکری کی زندگی نہ گزاری ہوگی۔ اب ان کو چاہیے تھا اس کا ویسا شکر ادا کرتے جیسے اس کا حق ہے مگر ان کی فطری کجی رفتہ رفتہ ان پر غالب آتی گئی۔

بے ادبی کی سزا:

بنی اسرائیل بے صبر، کم حوصلہ اور تنگ ظرف قوم تھی۔ اس نے نہ آزادی کی نعمت کا حق پہچانا، نہ ان عجیب وغریب قدرتی مہربانیوں پر عاجزی اور شکر کا اظہار کیا۔ ان کو ہر وقت نئے شکوے، نئے مطالبے اور نئے اشکالات سوجھتے تھے۔ بے صبری کے ساتھ بزدلی اور بخل کا مرض بھی ان میں بہت تھا۔ وہ ایک چیز کی خواہش تو کرتے تھے، مگر جب اس کے لیے جان یا مال کی قربانی دینے کا وقت آتا تو زکام لگی بکری کی طرح باڑے کے ایک کونے میں چھپنے کی کوشش کرتے تھے۔ جدا وطن کا حصول ان کی دیرینہ خواہش تھی، لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بتایا اس کے لیے جہاد کی ضرورت ہے، تم اللہ کے وعدوں پر یقین کر کے کمر ہمت باندھ کر میدان کارزار کی طرف نکلو، اللہ تعالیٰ کی غیبی طاقتیں تمہارے ساتھ ہوں گی اور تم فاتح رہو گے تو ان کی فطری بزدلی، نکما پن اور کام چوری آڑے آئی۔ ان کی غیر موجودگی میں ''عمالقہ'' نامی قوم فلسطین پر قابض ہو گئی تھی جو قوم عاد کی طرح بہت طاقتور تھی۔ عمالقہ کے ظاہری تن و توش، ڈیل ڈول اور جسمانی طاقت کو دیکھ کر یہود کا شوقِ حصولِ وطن جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بہتیری ترغیبات دیں، بزدلی کے انجام سے ڈرایا، ہمت بندھائی، مگر ان کم بختوں نے ان کی بے ادبی کرتے ہوئے انہیں صاف جواب دے دیا اور گستاخی سے کہا آپ اور آپ کا رب جا کر ہمارے وطن پر قابض دشمن سے لڑیں، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اس گستاخی کی پاداش میں یہ چالیس سال تک صحرائے سینا نامی بے آب و گیاہ ریگستان کے وسطی حصے میں بھٹکتے رہے جس کو مفسرین کی اصطلاح میں ''وادیٔ تیہ'' کہا گیا ہے۔

کیا صبح قریب نہیں؟

یہ ان کے لیے فلسطین واپس لینے کا پہلا موقع تھا جو انہوں نے گنوا دیا۔ دوسری مرتبہ فلسطین کے مشرقی جانب سے حضرت طالوت کی سربراہی میں دریائے اردن پار کر کے دشمن پر حملہ آور ہونا تھا، تب یہ سب اس دریا کا پانی پی کر پیٹ پھلا کر وہیں پڑے رہ گئے۔ پہلی مرتبہ جنوب مغربی جانب یعنی صحراء سینا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں حملے کا حکم ہوا تھا، مگر اس مرتبہ بھی یہ کھوٹے نکلے۔ جس کی بنا پر ان پر ذلت وخواری کی ابدی مہر لگا دی گئی۔ یہ کم بخت لعنت کے ان اسباب سے اچھی طرح واقف ہیں جن کی سیاہی سے ان پر دائمی خواری کا ٹھپہ لگایا گیا اور یہ سالہا سال تک دنیا بھر میں بھٹکتے پھرے، مگر ان سے توبہ کیے بغیر یہ پھر ارضِ فلسطین میں آوارد ہوئے ہیں اور جس چیز کو اپنے انبیاء علیہم السلام کی قیادت میں حاصل کرنے سے منکر ہو گئے تھے، اسے صہیونی منصوبہ سازوں کی سازشوں کے ذریعے لینے کی فکر میں ہیں۔ کل تک یہ ''وادی تیہ'' میں خوار و بدحال ہو کر حیراں و سرگرداں گھومتے تھے، صبح جہاں سے چلتے شام کو پھر وہیں پہنچ جاتے، آج یہ اپنی ذلت بھلا کر فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال کر یہودی بستیاں آباد کر رہے ہیں اور انہیں مہاجر کیمپوں میں بھی رہنے دینے پر تیار نہیں۔ پیچ در پیچ منصوبوں، مکروہ عزائم اور سنگدلانہ مظالم کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو یہ مردود و مبغوض قوم ارضِ فلسطین کے اصل باشندوں کے خلاف جاری رکھے ہوئے ہے۔ جن لوگوں کو قصص قرآنیہ اور سنت الٰہیہ کا علم ہے وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں جس طرح اندھیرے کے بعد صبح ہونے والی ہے اسی طرح اسرائیل اپنی آخری سزا کی طرف گامزن ہے جس سے دنیا کی کوئی قوت اسے نہیں بچا سکتی۔

دو سمندروں کا سنگم

انفرادی نصیحت، مشترکہ پیغام:

اس دنیا میں جو واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس بات کا یقین حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعہ سے ہوتا ہے۔ یہ واقعہ سورۂ کہف میں بیان شدہ ان چار واقعات میں شامل ہے جن میں سے ہر ایک میں الگ الگ بھی ایک خاص سبق اور حکمت پوشیدہ ہے اور چاروں کے مجموعے سے بھی ایک مشترکہ پیغام ملتا ہے۔ مشترکہ پیغام تو یہ ہے دجال کا سامنا کرنے کے لیے اصحابِ کہف جیسی استقامت، صاحب الجنۃ (باغ والے زمیندار) کے دوست جیسی مادیت پرستی سے اجتناب، حضرت موسیٰ وخضر علیہ السلام کی طرح ہر غیر معمولی اور مافوق الفطرت کام کے پیچھے صرف اور صرف اللہ رب العزت کی قدرتِ کاملہ کا استحضار اور ذوالقرنین کی عالمی سلطنت کی طرح حضرت مسیح (علیہ السلام) وحضرت مہدی کی قیادت میں عالمی خلافت الٰہیہ کا قیام۔ انفرادی حکمت ونصیحت جو حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعے میں ہے، اس کو ''آداب المتعلمین'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک طالب علم کے لیے وہ رہنما اصول وآداب جن سے علم میں ترقی ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کا پیغمبرِ وقت ہونے کے باوجود علم سیکھنے کے لیے طویل سفر کرنا، اس کے لیے تھکن، بھوک پیاس اور کسی چیز کو خاطر میں نہ لانا، استاذ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادے کی درخواست، ان کی لگائی گئی شرائط کی پابندی کا عہد، خلاف ورزی ہو جانے پر فوراً اپنی غلطی کا احساس اور اس پر معذرت، غرض بہت ساری ایسی باتیں ہیں جن سے انسان سیکھنا چاہے تو بلند پایہ اخلاق وآداب کی تعلیم پا سکتا ہے۔ بعض اکابر نے اس واقعے کی روشنی میں ان آداب پر مشتمل مستقل کتاب تحریر کی ہے۔ نام نہاد جاہل پیروں اور گمراہی پسند اور گمراہ کن بے دین رہنماؤں نے اس واقعے سے اپنی بداعمالیوں کو سہارا دینے کے لیے بہت سے حیلے بہانے تلاش کیے ہیں اور شریعت وطریقت کو جدا ثابت کر کے اپنے بے راہ روی کو جواز فراہم کرنے کی بھونڈی کوشش کی ہے مگر قرآن تو اپنا دفاع خود کرتا ہے اور ایسے باطل پرستوں کے دلائل کو قرآن کریم کے معجز الفاظ غبار بنا کر اُڑا دیتے ہیں۔

علم تشریعی وتکوینی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے احکام الٰہیہ کے علم کا بلند مقام عطا فرمایا تھا، وہ علم جو بندے کو خدا تک پہنچاتا ہے اور عابد کو معبود سے ملا دیتا ہے، وہ علم جو براہِ راست آسمانوں اور زمینوں کے مالک نے اپنی مخلوق پر مہربانی کرتے ہوئے اس لیے اُتارا کہ وہ اسے پہچان سکے، اس سے راز ونیاز کر سکے، اس سے قرب ومحبت کا شوق پورا کر سکے۔ اس علم کو حاصل کیے بغیر نہ کوئی اللہ تعالیٰ کی مرضی پہچان سکتا ہے نہ اس پر عمل کیے بغیر کوئی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔ اس علم کا تعلق آخرت کی کامیابی سے ہے جبکہ اس دنیا میں ہونے والے واقعات وحوادثات کے پیچھے کارفرما وجوہ واسباب کے جاننے کا تعلق ''علمِ تکوین'' سے ہے۔ دنیاوی حوادث کے پس منظر اور وجوہ واسباب جاننے سے روحانی ترقی، آخرت کی نجات اور اللہ تعالیٰ کے قرب ورضا کا کوئی تعلق نہیں، لیکن چونکہ انسان نظر

آنے والی چیز کے پیچھے مرتا ہے اگر چہ وہ عارضی، فانی اور فریب کیوں نہ ہو اور جو چیز اسے مادی آنکھوں سے نظر نہ آئے وہ کتنی ہی قیمتی، دیرپا اور عالیشان کیوں نہ ہو، اس کی خاطر قربانی دینا اسے مشکل ہوتا ہے، اس لیے اکثر لوگ ایسے کسی ماورائی علم کی تلاش میں رہتے ہیں جو انہیں اس دنیا میں کام آنے والی کسی پُر اسرار طاقت کا مالک بنادے اور اس کے ذریعے وہ اپنی انفرادیت ثابت کرسکیں، اپنا امتیاز جتا سکیں یا کچھ مادی فوائد بٹور سکیں اور اس کے مقابلے میں اس علم کے لیے اپنی جان نہیں کھپاتے جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی میں ان کی عزت وافتخار اور رفع درجات کا سبب ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات اور مرضیات کا علم عطا فرمایا تھا جبکہ حضرت خضر علیہ السلام کو اس دنیا کے کچھ واقعات میں مخصوص کردار ادا کرنے پر مامور فرمایا تھا۔

طریقت شریعت کے تابع ہے:

اس طرح کے تین واقعے حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے قصے میں مذکور ہیں۔ ان میں بظاہر جو کام ہوا وہ ظاہری حکمت اور مصلحت کے خلاف تھا اور حضرت خضر علیہ السلام چونکہ اس کے انجام دینے پر مامور تھے اس لیے وہ ان کے پابند تھے، لیکن ان کی وجہ سے نہ علم تکوینی کو علم شریعت پر فوقیت دی جاسکتی ہے نہ کسی باطنی مصلحت سے شریعت کے ظاہری احکام کی خلاف ورزی کی دلیل نکالی جاسکتی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام تو منجانب اللہ مامور اور پابند تھے، کسی نام نہاد ملنگ، فقیر کو کیسے یہ اجازت ہوسکتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے جن احکامات کا مکلّف ہے، انہیں توڑتا پھرے اور علم باطن کا دعویٰ کر کے اپنی بے علمی اور بدعملی پر پردہ ڈالے۔ ان واقعات سے یہ مطلب لینا علم ظاہر کچھ اور ہے اور علم باطن کچھ اور، قطعاً غلط ہے۔ ان کا مطلب تو یہ ہے اس دنیا میں جو واقعہ رونما ہوتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس پر صابر وشاکر ہو کر رضا بالقضا کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس کائنات کے اندر پیش آنے والے حوادث وواقعات کے اسباب ورموز کا علم، علم باطن نہیں، علم تکوین ہے۔ علم باطن تو اخلاق نفسانیہ کی اصلاح اور رزائل نفس کے ازالے کا نام ہے اور جس شخص کے باطن کی گندگیاں دور ہو جائیں، وہ اپنے ظاہر کو ضرور بالضرور احکام شریعت سے آراستہ کرتا ہے۔ اپنے ظاہر کو شریعت سے نہ سنوارنا اور باطنی مدارج کے حصول کا دعویٰ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ناسور سے سڑتا مریض زخموں پر پوڈر مل کر خود کو صحت مند سمجھ کر، پہلوانوں کے اکھاڑے کے باہر چھلانگانے کا چیلنج دیتا پھرے۔

مجمع البحرین کا مصداق:

پہلا واقعہ کشتی میں سوراخ کرنے کا تھا۔ دوسرا ایک بچے کی جان لینے کا اور تیسرا ناشکرے گاؤں والوں کی ایک گرتی دیوار سیدھا کرنے کا۔ ان واقعات کی جو حکمت حضرت خضر علیہ السلام نے بیان کی، اس سے پتہ چلتا ہے انسان کو جان ومال کے نقصان یا اولاد کی وفات پر اللہ کی رضا سمجھ کر بسر کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ دنیا یا آخرت میں اس کا بدلہ ضرور عنایت فرمائیں گے۔ اللہ کے کاموں کی مصلحت اور اس کے فیصلوں کی حکمت وہی بہتر جانتا ہے۔ بندہ کو ہر حال میں راضی بقضا رہنا چاہیے۔ نیز یہ علم دین کے حاملین کو اپنی علمی مصروفیات کو بہتر سے بہتر انداز میں نبھانے کی کوشش میں لگا رہنا چاہیے، دوسرے علوم کی طرف توجہ ان کی شان و منصب نہیں جیسا سیدنا حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام ان تین واقعات کے بعد جب اسرار ربانی سے فی الجملہ آگاہ ہوگئے تو واپس آکر دینی، دعوتی اور اصلاحی معمولات میں مصروف ہوگئے۔ حضرت خضر علیہ السلام سے آپ کی ملاقات قرآن کریم کے مطابق دو سمندروں کے سنگم پر ہوئی تھی۔ بعض حضرات نے اس کا مصداق عراق میں ''شط العرب'' نامی مقام بتلایا ہے جہاں دجلہ وفرات آکر ملتے ہیں۔ آپ کی حیات مبارکہ جس خطہ زمین میں گزری، اس کا جائزہ لینے سے ایک دو جگہیں ممکنہ طور پر اس کا مصداق بنتی ہیں۔ ایک تو بحر احمر کے شمال میں خلیج عقبہ اور خلیج سوئز کا سنگم اور دوسرے اسپین اور مراکش کے بیچ میں بحر روم اور بحر اوقیانوس کا ملاپ۔ زیادہ امکان پہلی جگہ کا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں تشنگی رہے گی اگر اس کے آخر میں آپ کے وفادار شاگرد اور اطاعت گذار خادم سیدنا حضرت یوشع علیہ السلام کا کسی

قدر دان کرتا ہو۔ اس کے لیے ہم اردو ادب کے علمی و تحقیقی اور جغرافیائی وادبی سفرنامے "جہانِ دیدہ" سے مدد لیں گے۔

"حضرت یوشع علیہ السلام:

"عمان ہزاروں سال پرانا شہر ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی تاریخ حضرت لوط علیہ السلام کے زمانے تک پہنچتی ہے اور اس وقت سے اس کا یہی نام چلا آ رہا ہے۔ جس علاقے میں عمان آباد ہے اسے "بلقاء" کہا جاتا تھا۔ یہ رومی سلطنت کا ایک ڈویژن جیسا تھا جس کا صدر مقام عمان تھا۔ اسی لیے اسے "عمان البلقاء" بھی کہا جاتا ہے اور حدیث میں اس شہر کا یہی نام آیا ہے۔ کتابوں میں پڑھا تھا کہ عمان بڑا سرسبز و شاداب شہر ہے، لیکن اس وقت شہر کو تو زیادہ سرسبز نہیں پایا، البتہ اس کے مضافاتی علاقے کافی زرخیز اور شاداب ہیں۔

عمان شہر سے نکلنے کے بعد ہم سب سے پہلے ایک انتہائی خوبصورت وادی سے ہوتے ہوئے ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے جو اس علاقے میں سب سے بلند چوٹی نظر آتی تھی اور وہاں سے دور تک پھیلی ہوئی سبز پوش وادیاں بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ پہاڑ کے ایک کنارے پر ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ ملک افضل صاحب نے بتایا کہ حضرت یوشع علیہ السلام کا مزار اسی مسجد کے ایک کمرے میں واقع ہے۔ ہم مسجد میں داخل ہوئے تو اس کے ایک کمرے میں ایک نہایت طویل قبر بنی ہوئی تھی۔ اس کی لمبائی بارہ سے پندرہ گز کے درمیان ہوگی۔ اسی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت یوشع علیہ السلام کا مزار مبارک ہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادمِ خاص تھے۔ ان کا اسم گرامی تو اگرچہ قرآنِ کریم میں مذکور نہیں ہے، لیکن ان کا نام لیے بغیر ان کے متعدد واقعات قرآنِ کریم میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ مثلاً جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو عمالقہ سے جہاد کرنے پر آمادہ کرنا چاہا اور پوری قوم نے انتہائی سرکشی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت کو رد کر دیا تو حضرت یوشع علیہ السلام پہلے شخص تھے جنہوں نے بنی اسرائیل کو ہمت دلانے کی کوشش کی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا جو واقعہ سورہ کہف میں بیان ہوا ہے، اس میں جو نوجوان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ ایک صحیح حدیث کے مطابق یہی حضرت یوشع علیہ السلام تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کو نبوت عطا فرمائی گئی اور بنی اسرائیل کی سربراہی بھی انہی کو عطا ہوئی۔

اب اس بات کی سو فیصد تحقیق تو قریب قریب ناممکن ہے کہ یہ واقعتاً حضرت یوشع علیہ السلام کی قبر ہے یا نہیں؟ البتہ یہ تمام علاقہ اسی ارضِ مقدس کا حصہ ہے جسے حضرت یوشع علیہ السلام نے فتح فرمایا تھا، اس لیے یہ بات جو یہاں کے لوگوں میں مشہور چلی آتی ہے، کچھ بعید بھی نہیں۔ قبر کی غیر معمولی لمبائی ہمارے لیے حیران کن تھی، لیکن بعد میں اُردن اور شام کے اندر جو دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مزارات دیکھے، وہاں بھی یہی صورت نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں کسی مقدس شخصیت کی تعظیم کے خیال سے اس کی قبر بہت لمبی بنائی جاتی تھی۔ واللہ اعلم

بہر صورت! ایک جلیل القدر پیغمبر کے مزار پر حاضری اور سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ احقر کے لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کے بعد کسی پیغمبر کے مزار پر حاضری کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ مسجد سے باہر نکلے تو سردی ناقابلِ برداشت حد تک شدید تھی۔ زبردست برفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور عجب نہیں کہ یہاں درجہ حرارت نقطۂ انجماد تک پہنچا ہوا ہو، اس لیے باہر زیادہ دیر ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ ہم دوبارہ گاڑی میں سوار ہو گئے۔"

(جہانِ دیدہ: 187-186)

حکمت والے بادشاہ

(حضرت لقمان حکیم)

حکمت کیا ہے؟

"حکمت" کے معنی علم صحیح اور عمل صحیح کے ہیں۔ قدیم عرب میں ایک برگزیدہ ہستی حکمت اور دانائی میں ضرب المثل گذری ہے جن کی فراست و بصیرت پر مشتمل اقوال مختلف مجموعوں میں بکھرے ملتے ہیں۔ شعرائے جاہلیت مثلاً امراؤالقیس، لبید، اعشی اور طرفہ وغیرہ کے کلام میں حضرت لقمان کا ذکر موجود ہے اور عربوں کے ہاں ان کا صحیفہ بھی مشہور چلا آتا ہے، لیکن حیرت ہے قدیم زمانے سے عربوں میں اس قدر شہرت اور صحیفۂ لقمان کی موجودگی کے باوجود حضرت لقمان کا نسب معروف نہیں۔ اس بات پر تو اتفاق ہے آپ علم و حکمت میں انبیاء علیہم السلام کے بعد اولادِ بنی آدم کے ممتاز ترین افراد میں سے تھے لیکن آپ عربی الاصل بادشاہ تھے یا حبشی النسل غلام؟ اس بارے میں عموماً دو مشہور قول پائے جاتے ہیں۔ ہم ان دونوں کو ذکر کرتے ہیں اور ان دونوں اقوال کے مطابق آپ کی جائے رہائش کو متعین کرتے ہیں پھر زیادہ صحیح بات کی تعیین ممکن ہو سکے گی۔

سو انسانوں کے برابر:

ابن جریر، ابن کثیر اور سہیلی جیسے اکابر مؤرخین کی رائے یہ ہے لقمان حکیم افریقی النسل تھے اور عرب میں ایک غلام کی حیثیت میں آئے تھے۔ چنانچہ یہ حضرات ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کرتے ہیں: لقمان بن عنقا بن سندون۔ ابن کثیر نے لقمان بن ثاران کہا ہے اور حلیہ کے بارے میں کہتے ہیں وہ سوڈان کے نوبی قبیلہ سے تھے اور پستہ قد، بھاری بدن تھے۔ رنگ سیاہ تھا، ہونٹ موٹے تھے، مگر نہایت نیک، عابد و زاہد، صاحبِ حکمت اور دانا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور بعض یہ بھی کہتے ہیں وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل میں عہدۂ قضا پر مامور ہو گئے تھے۔

لیکن مشہور مؤرخ اور صاحبِ مغازی محمد بن اسحاق کہتے ہیں لقمان حکیم عرب کے مشہور قبیلہ عاد سے یعنی عرب بائدہ کی نسل سے تھے اور غلام نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔ اس قول کے مطابق آپ خالص عرب نژاد اور عاد ثانیہ (قوم ہود علیہ السلام) میں سے عادل اور نیک بادشاہ ہو کر گذرے ہیں۔ محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ سے روایت کی ہے جب شدّاد بن عاد کا انتقال ہو گیا تو حکومت اس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی اور اللہ تعالیٰ نے لقمان کو وہ چیز عطا فرمائی تھی جو اس زمانے کے انسانوں میں کسی کو نہیں عطا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو سو انسانوں کے برابر ادراک و احساس عطا فرمایا تھا اور وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ طویل قامت تھے۔

شعراور کتبے کی گواہی:

معاصر مؤرخین میں سے برصغیر کے مشہور محقق سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ مصنف ''ارض القرآن'' نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے لقمان حکیم اور لقمان بادشاہ ایک ہی شخصیت ہے اور وہ بلاشبہ عادِ ثانیہ کے نیک بادشاہوں میں بہت بڑے حکیم ودانا تھے اور عرب میں لقمان کے نام سے جو ''صحیفہ'' منسوب تھا وہ ان ہی لقمان عاد کا ہے۔ اور وہ اپنے اس دعوے کے مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ دیتے ہیں جاہلی شاعر سلمٰی بن ربیعہ کے یہ اشعار اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتے ہیں:

اَهْلَكْنَ طَسْمًا وَ بَعْدَهٗ

غذی بِهِمْ وَ ذَا جَدُوْنِ

وَاَهْلَ جَاشٍ وَمَارِبِ

وَ "حَيَّ لُقْمَانَ" وَالتَّقُوْنِ

''حوادثِ زمانہ نے قبیلۂ طسم کو اور اس کے بعد ذاجدون شاہِ یمن کو، اہلِ جاش ومارب کو اور قبیلۂ لقمان کو مٹا دیا۔''

اس کے بعد فرماتے ہیں: اس دوسرے شعر سے نہ صرف لقمان کا عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے بلکہ ایک قبیلہ کا مالک، یمن کا باشندہ اور عظمت وشوکت میں سبا کا مقابل ہونا سمجھ میں آتا ہے اور یہ تمام باتیں لقمانِ عاد پر صادق آتی ہیں۔ یمن میں جہاں قوم عاد بستی تھی اس جگہ کے آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے وقت ایک کتبہ عدن کے قریب حصن غراب کے کھنڈروں میں سے ۱۸۳۴ء میں دریافت ہوا تھا اس میں حضرت ہود علیہ السلام کی شریعت کو ماننے والے نیک طینت بادشاہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے یہ کتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی دریافت ہوا تھا اور اس کا ترجمہ عربی میں ہوا جو لفظ بہ لفظ اس کے موجودہ ترجمے سے ملتا ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں: کیا اچھے فیصلوں والی کتاب سے ہم صحیفہ لقمان مراد نہیں لے سکتے؟

محاکمۂ قرآنی:

یہ دونوں اقوال آپ نے پڑھ لیے۔ اگر کوئی اس بارے میں محاکمہ کرنا چاہے تو خود قرآن حکیم سے اچھا حکم اور ثالث اور کون ہوگا؟ لہٰذا ہمیں اس بارے میں قرآن کریم سے مدد لینی چاہیے۔ قرآن کریم میں جو آیات نصائح لقمانیہ پر مشتمل ہیں ان میں حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو خود پسندی، شیخی خوری، غرور ونخوت، سخت مزاجی اور درشتگی کے خلاف جو نصائح کی ہیں اور حکمت ودانائی کی باتیں بتائی ہیں وہ ایک شہزادے کے لیے تو موزوں ہیں غلام زادے کے لیے نہیں۔ حکیم لقمان اگر غلام ہوتے تو اپنے بیٹے غلام زادہ کو یہ نصیحتیں نہ کرتے، اس لیے یہ اوصاف عموماً بادشاہوں، شاہزادوں اور صاحبِ اقتدار انسانوں کے اندر ہی پائے جاتے ہیں۔ غلام اور غلام زادہ کے لیے نہ ان کا موقع ہے اور نہ فرصت۔ اس تائیدی قرینے کے بعد جو قرآنِ عزیز سے ماخوذ ہے راجح یہ معلوم ہوتا ہے بلاشبہ لقمان حکیم اور لقمانِ عاد ایک ہی شخصیت ہیں اور وہ عادِ ثانیہ کے نیک نفس بادشاہ اور حضرتِ ہود علیہ السلام کے پیروکار تھے اور حبشی الاصل غلام نہیں بلکہ عربی الاصل بادشاہ اور عادل وحکیم حکمران تھے۔

ایک اور بحث:

اس ضمن میں ایک ذیلی بحث یہ بھی ہے آپ نبی تھے یا نہ؟ اگرچہ بعض اہل علم نے فرمایا ہے حضرت لقمان نبی تھے لیکن قرآنِ کریم کا اسلوبِ بیان اس کا

ساتھ نہیں دیتا۔ اس لیے سورۂ لقمان میں باوجود اس بات کے ان کی بعض حکیمانہ نصائح اور بلیغانہ وصیتوں کا ذکر صراحت کے ساتھ ہے لیکن کسی ایک جملہ میں بھی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا جو ان کی ''نبوت'' پر دلالت کرتا ہو، اسی لیے جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے۔ جمہور کا قول یہ ہے لقمان خدا کے ولی اور حکیم دانا تھے، نبی نہیں تھے۔ مشہور مؤرخ اور محدث ابن کثیر نے اس بحث کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ''اختلف السلف فی لقمان، ھل کان نبیا او عبدا صالحا من غیر نبوة، علی قولین، والاکثرون علی الثانی۔'' یعنی جمہور کی رائے یہی ہے آپ نبی نہ تھے البتہ اللہ کے نیک بندے تھے۔

پانچ غیبی امور:

سورۂ لقمان ۳٤ آیات پر مشتمل کی سورت ہے، البتہ تین آیات ''۲۷، ۲۸، اور ۲۹'' مدنی ہیں۔ ترتیب تلاوت کے لحاظ سے اس سورہ کا عدد ۳۱ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا عدد ۵۷ ہے۔ اس سورت کی صحیح اہمیت کا اندازہ اس کے مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے ہوتا ہے۔ اس میں خطبے، تمہید، وعدو وعید اور آیات آفاقیہ کے بعد قرآن حکیم نے حضرت لقمان کی چند نصیحتوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کیں۔ یہ نصیحتیں شرک کی مذمت، اللہ تعالیٰ کی صفات کمال، اقامت صلوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، صبر کی تلقین، تکبر سے بچنے، گفتگو اور چال میں تواضع اختیار کرنے اور گلا پھاڑ کر بولنے سے باز رہنے کی تلقین پر مشتمل ہیں۔ اس سورت کے دیگر مضامین یہ ہیں: اطاعتِ والدین، اخروی کامیابی کے حصول کے لیے رجوع الی اللہ، اللہ تعالیٰ کی غیر محدود اور ان گنت نعمتوں کا ذکر، عجائباتِ فطرت کے مشاہدے کی تلقین، کفار کے مضحکہ خیز رویے کا ذکر مصیبت کے وقت اللہ کو پکارتے ہیں اور مصیبت ٹلنے پر شرک شروع کردیتے ہیں، فلاح وکامرانی کے حصول کے لیے خوفِ خدا اور خوفِ قیامت رکھنے کی تاکید۔ سورت کے آخر میں ان پانچ ''امورِ غیبیہ'' کا ذکر ہے جنہیں سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ اور صرف پانچ امورِ غیبیہ کا ذکر مثال کے طور پر ہے اور ان کی تخصیص کی وجہ یہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انہی پانچ چیزوں کے بارے میں سوال کیا گیا تھا، ورنہ امورِ غیبیہ کی کوئی حد نہیں۔

معجزانہ اسلوب کا شاہکار:

سو اس سورت میں عرب قوم کو قرآن مجید نے بتایا ہے تم صدیوں سے جس شخصیت کی عقل وفراست کے قائل چلے آتے ہو وہ توحید کو مانتے تھے اور شرک کو ظلم عظیم قرار دیتے تھے۔ پھر تم کیوں ان کے طریق پر نہیں چلتے؟ موعظت لقمانی میں توحید، عزم الامور اور مکارمِ اخلاق کی تعلیم شامل ہے اور بتایا گیا ہے چھوٹی سے چھوٹی اور حد درجہ کی مخفی باتیں بھی علم الٰہی سے مخفی نہیں۔ اس لیے کوئی بھی شخص اپنے اعمال کے مؤاخذے سے نہیں بچ سکتا۔ اختصار کے باوجود سورۂ لقمان میں دی ہوئی یہ پند ونصائح اس قدر رفیع اور جامع ہیں قرآن کریم کے معجزانہ اسلوب کا شاہکار ہیں۔ قرآن کریم نے جس طرح عقائد، عبادات، اخلاق اور سیاست سے متعلق ان کی نصائح کا نچوڑ چند آیات میں نقل کیا ہے، یہ اس کتاب مبین کے برحق ہونے کی بجائے خود ایک دلیل ہے۔ بلاشبہ جس ذات نے لقمان حکیم کو حکمت ودانائی عطا کی، اسی نے ان کے چیدہ چیدہ مقولوں کا جامع خلاصہ مسلمانوں کی ہدایت ونصیحت کے لیے نقل کیا ہے کیونکہ ان پر عمل کرنا انسانی صلاح وفلاح کے لیے کافی ہے۔

چار قصے، چار سبق

سورۂ کہف کا اجمالی مطالعہ

بخاری شریف کتاب التفسیر میں روایت ہے:

حَدَّثَنَا آدَمُ، قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي إِسْحٰقَ، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ مَسْعُودٍ قَالَ فِي بَنِي إِسْرَائِيْلَ وَالْكَهْفِ وَمَرْيَمَ: "إِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْأُوَلِ، وَهُنَّ مِنْ تِلَادِي." (صحیح بخاری: ٦٨٣/٢)

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف اور سورۂ مریم یہ تین سورتیں اعلیٰ درجے کے قدیم نوادراتی خزانے میں سے ہیں اور یہ تینوں میرا محفوظ سرمایہ ہیں۔''

دجالیات پر قابلِ قدر تحقیق نگار اسرار عالم لکھتے ہیں:

''پورے ذخیرۂ حدیث کو بھی جانے دیجیے اس لیے کہ وہ تو ایک ضخیم خزانۂ علم ہے۔ یہ عاجز صرف صحیح بخاری میں ایسے ایک ہزار مقامات کی نشاندہی کر سکتا ہے جس کی تشریح، توضیح، تبیین، تفصیل، تفریق، تاویل، تعبیر، تفسیر اور تعیین اب بھی امت پر قرض ہے۔ یہ عاجز صرف ایک مثال پیش کرتا ہے۔ یہ حدیث ان سینکڑوں حدیثوں میں سے ایک ہے جس کی معنویت اور گہرائیوں کو جاننا تو دور کی بات جس کی ابتدائی معلومات سے بھی یہ امت نابلد ہے۔'' (دجال: ج2، ص120)

آں موصوف نے یہاں علمائے کرام کے بارے میں کچھ غیر مناسب تبصرہ کیا ہے۔ یہ عاجز اسے نقل نہیں کرتا۔ ہمارے ممدوح جناب اسرار عالم صاحب کہیں کہیں بے اعتدالی، مبالغہ آرائی یا تعلّی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انہیں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے، اہلِ علم کا پاسِ ادب ملحوظ رکھتے ہوئے عہد حاضر کے فتنوں کے خلاف کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس روایت میں ان تینوں سورتوں کی جو قرآن کریم کے وسط میں واقع ہیں، خاص اہمیت و فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے پہلی سورت تو سورۂ کہف ہے جس میں ایک لفظ ''وَلْيَتَلَطَّفْ'' ایسا ہے جو قرآن کریم کے ''ترازو کا دستہ'' ہے۔ یعنی اس پر قرآن کریم کے الفاظ نصفا نصف ہو جاتے ہیں۔ آدھا قرآن پاک اس سے پہلے ہے اور آدھا بعد میں۔ سورۂ کہف قرآن کریم کے وسط میں آتی ہے۔ اس سے پہلے سورۂ بنی اسرائیل ہے اور اس کے بعد سورۂ مریم۔ یہ تینوں سورتیں قدیم زمانے کے اہل کتاب کی تاریخ سے ابتدا کر کے آخر زمانے میں اہلِ کتاب کے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس لیے "العتاق الأول" یعنی اعلیٰ درجے کا قدیم خزانہ ہیں اور ان میں ایک بڑے فتنے سے بچنے کا حفاظتی حصار کھینچ کر بتایا گیا ہے۔ زبانی وظیفہ بھی اور لائحہ عمل بھی۔ اس لیے یہ ''تِلَاد'' یعنی ''محفوظ سرمایہ'' ہیں۔

ان سورتوں کی ترتیب پر نظر ڈالیے۔ بنی اسرائیل، کہف، مریم۔ سورۂ کہف کے اول و آخر میں چونکہ فتنۂ دجال سے بچنے کا وظیفہ ہے اور درمیان میں چار

واقعات ہیں جن کے ضمن میں فتنہ دجال کے چار عناصر کا بیان اور ان سے بچنے کا طریق کار بتایا گیا ہے۔اس لیے آپ اسے دجال یا فتنہ دجال کے تذکرے والی سورت بھی ایک خاص تاویلی تبیین وتعیین میں کہہ سکتے ہیں۔اس توضیح وتعبیر کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ سورتوں کے ناموں کو ایک مرتبہ پھر بالترتیب نظر ڈالیے۔بنی اسرائیل، دجال، مریم۔

بنی اسرائیل دوقسم کے اہل کتاب ہیں۔ان میں سے ایک نے اپنی عددی قلت کے باوجود دوسرے کی عمومی کثرت کو زیر کر کے اس کے مذہب اور مذہبیات کو پیس کر چورہ چورہ کردیا۔ایک سنگدل یہود ہیں اور دوسرے قابلِ رحم عیسائی۔دونوں میں سے برتر فریق مخالف فریق پر برتری پانے کے بعد پوری دنیا پر برتری حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔اس طرح سورۂ بنی اسرائیل میں تذکرہ یہود ہی کا ہے۔سورت کے شروع میں ان کی دو مرتبہ القدس سے جلاوطنی اور سورت کے آخر میں تیسری واپسی کے بعد نسل کے خاتمے کا ذکر ہے۔دوسرے لفظوں میں اس کی تشریح وتفصیل یوں کی جاسکتی ہے۔شروع میں شریعت موسوی اور عیسوی کے انکار کی بنا پر جزوی اور وقتی سزا کا اور سورت کے آخر میں شریعت محمدی کے انکار کی بنا پر کلی اور حتمی سزا کا تذکرہ۔اب تینوں سورتوں کی تاویلی ترتیب پر پھر نظر ڈالیے۔یہود، دجال، مریم۔سورۂ مریم میں چونکہ مقدس مریم کے بیٹے ابن مریم کا ذکر ہے جو پوری دنیا کو دجال کی نحوست سے نجات دلائے گا۔تو اب تینوں سورتوں کے حاصل معنی اور مرکزی مضمون کے لحاظ سے ترتیب کیا ہوئی؟ یہود، دجال، عیسیٰ (ابن مریم علیہما السلام)۔

قارئین محترم! کیا آپ نے غور کیا کہ قرآن پاک کے بالکل وسط میں ان تین سورتوں کے درمیان کس خاص ربط وترتیب کی بنا پر انہیں "قدیم خزانہ" اور "محفوظ سرمایہ" کہا جاسکتا ہے۔ذرا پھر سماعت فرمایئے:

قوم یہود انسانیت کا وہ بے بہبود گروہ ہے جو قدیم زمانے سے انسانیت کے لیے برا نمونہ بنا رہا ہے اور آخر زمانے تک ایسا ہی بنا رہے گا۔دجال اکبر وہ متنفر ترین مخلوق ہے جو اس ننگ انسانیت گروہ کا سربراہِ اعظم اور دشمنِ انسانیت شیطان ملعون کا آلہ کار اکبر ہوگا۔ابن مریم وہ پاکباز ومظلوم ہستی ہے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آخری نبی تھے۔ان کو بنی اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو راہِ راست پر لانے کی آخری مہلت کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ان کے حواریوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کے آخر میں سے کچھ خوش قسمت لوگوں کو یہ سعادت ملے گی کہ وہ ان کے آسمان سے نازل ہونے کے بعد ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں گے کیونکہ اس امت کے پہلوں نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا نہ چھوڑا تھا بلکہ ان کے گرد حواریوں کی تعداد کے برابر صحابیوں نے اپنے جسم کی دیوار کھڑی کرکے بے مثال نظیر قائم کی تھی۔غزوۂ احد میں ایک موقع پر صرف گیارہ صحابی اپنے محبوب قائد کے قریب رہ گئے تھے۔دو مہاجر جو دفاع کرتے تھے اور نو انصاری جو یکے بعد دیگرے آگے بڑھ کر لڑتے اور حقِ بیعت وصحابیت ادا کرتے تھے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں میں سے ایک نے یہود کو مخبری کردی تھی اور گیارہ انہیں اکیلا چھوڑ گئے تھے۔واضح رہے کہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی حواریوں پر فضیلت کا بیان ہے۔خدانخواستہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب مسیح علیہ السلام پر ایسی ترجیح ہرگز نہیں جس میں ان کی کسی قسم کی تنقیص کا پہلو ہو۔گویا کہ تینوں مضامین کی ترتیب کیا بنی؟ (1) یہود: وہ تاریخی بدنصیب جن کی شقاوت تاریخی اور دائمی ہے۔(2) دجال: وہ شیطانِ ثانی جو گروہ کج روکی قیادت کے لیے بیڑیوں سے آزادی چاہتا ہے۔(3) کنواری مریم کا مقدس بیٹا: جو انسانیت کے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے جانثاروں کے ساتھ مل کر انسانیت کو اس فتنہ باز قوم اور اس کے فتنہ گر سرغنے سے نجات دلائے گا۔

ان تینوں سورتوں کے مرکزی مضمون کے باہمی ربط اور قرآن کریم کے وسط میں جگہ پانے کی اہمیت کے بعد اب ہم درمیانی سورت کے مرکزی مضامین کی طرف آتے ہیں۔اس سورت میں چار قصے بیان کیے گئے ہیں۔چاروں میں ایک ایسے روحانی مرض یا فتنے کا ذکر ہے جو انسان کے لیے گمراہی کا سبب بنتا چلا آیا ہے۔(1) حکومت واقتدار۔(2) مال ودولت (3) عقل پرستی (4) غیر معمولی صلاحیتوں کا غلط استعمال۔ذرا تصور کریں جب یہ چاروں مل کر، عالمی سطح پر، عالمی

خدائی کا دعوی کرنے والے، عالمی اقتدار پر قبضہ جمانے والے جنونی گروہ کی سرپرستی میں اور عالمگیر طور پر بالجبر مسلط کیے جائیں گے تو رحمان سے دور رہنے والے انسان پر کیا بیتے گی؟ یہ چاروں عملی فتنے ہیں۔ سورت کے شروع و آخر میں ایک عقیدتی فتنہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ یعنی شرک کی ایک ایسی قسم جس سے مشرکین بھی شرما جائیں۔ عام مشرکین کسی مخلوق کو شریک مانتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کچھ انبیاء کو اللہ رب العزت کا ''مولود'' مانتے ہیں۔ یہ شرک اعظم ہے۔ کیونکہ مخلوق بہرحال مخلوق ہے۔ کوئی جاہل اسے شریک مانتا رہے لیکن یہ تسلیم کرے گا کہ وہ خالق کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتی۔ بیٹا تو باپ کی جنس میں سے اور اس کی فطری اہلیت وصلاحیت کا پرتو ہوتا ہے۔ اسے شریک نہ بھی فرض کیا جائے تو بھی مولود بہرحال مخلوق شریک سے خود بخود بہت بڑھ کر ہے۔ یہ تو نہ کہنے کے باوجود ایسا شرک ہے کہ آسمان پھٹ جائیں، زمین دہل جائے اور پہاڑ لرز کر چورہ ہو جائیں۔ خصوصاً جب یہ جرم ان لوگوں کی طرف سے ہو جو خود کو موحد اور اہل کتاب کہتے ہیں۔ سورۂ کہف کی ابتدا و اختتام میں مخلوق کو بیٹا یا عبد کو ولی ماننے سے منع کیا گیا ہے۔ بیچ میں چار عملی فتنوں سے بچنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ یہ پانچ فتنے.....ایک عقیدہ، چار عمل.....ایک زمانے میں یک جان ہو کر انسانیت پر حملہ آور ہوں گے۔ اس سے بچنے کا برکتی وظیفہ اس سورت کے اول و آخر میں اور عملی لائحہ بیچ میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ چار قصوں اور ان میں مبینہ چار علاماتی فتنوں پر ذرا ایک نظر ڈال لیجیے۔

1-اصحابِ کہف:

پہلا قصہ انسانی آبادی سے دور غار میں پناہ لینے والے ان چند نوجوانوں کا ہے جن پر اس وقت کے صاحبان اقتدار نے بالجبر اپنا باطل نظریہ تھوپنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے اللہ کی خاطر گھر بار چھوڑ کر ہجرت اختیار کی۔ ان کی شریعت میں جہاد نہ تھا۔ ہجرت کے ساتھ جہاد کا امتزاج امت محمدیہ کا اعزاز اور خاصہ ہے، لہٰذا جبری اور جھوٹی خدائی مسلط کرنے والے دجال سے انسانیت کو مجاہدین ہی نجات دلائیں گے۔

2-اصحاب الجنۃ:

دوسرے قصے میں ایک ایسے سرمایہ دار، جاگیردار اور غیر دیندار مالدار کا ذکر ہے جو مادہ پرستی اور سرمایہ داری کے فتنے میں مبتلا تھا۔ مسبب الاسباب کے بجائے اسباب پر نظر رکھتا تھا۔ کسی مخلص دوست کی تنبیہ کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ نہ کمانے میں حلال و حرام کا فرق، نہ خرچ کرنے میں غریب غربا کا حق۔ بالکل ایسے جیسا آج کل کے سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں۔ مال و دولت کا نشہ انسانی عقل کو پھیر دے تو انجام کیا ہوتا ہے؟ اس قصے میں اسی نکتے کو سمجھا کر فتنۂ مال سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہی فتنہ جس کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی امت کے لیے شرک سے زیادہ اندیشہ رکھتے تھے۔

3-قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام:

سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے دور میں علم شریعت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہے کہ اس دنیا میں کچھ واقعات اصحاب تکوین کے ہاتھوں انجام دلوائے جاتے ہیں۔ وہ بظاہر خلاف عقل ہوتے ہیں۔ جناب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ رب العزت کی طرف سے محبت آمیز تنبیہ کے بعد اپنی عقل اور محدود علم کی نفی کی اور ظاہر بینی میں پڑنے کے بجائے وحی الٰہی اور قضائے الٰہی کو برحق سمجھا۔ جاہ و مال پرستی کے بعد عقلیت پرستی دجال کے دور کا سب سے بڑا فتنہ ہوگا۔ اس سے بچنا، وحی کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور خلاف طبع چیزوں میں رضا بالقضا اختیار کرنے کے ذریعے ممکن ہے۔ چاہے وہ ناگوار چیز جان کے حوالے سے ہو (جیسے لڑکے کا قتل ہونا) مال کے حوالے سے ہو (جیسے کشتی میں سوراخ ہو جانا) یا کسی متوقع نفع کے ہاتھ سے چلے جانے کے عنوان سے ہو (جیسے دیوار سیدھا کرنے کی مزدوری نہ لینا) اس قصے میں تین واقعات ہیں اور تینوں میں بنیادی طور پر تعقلیت (عقل پرستی، وحی کے مقابلے میں محدود علم اور نارسا عقل کی ترجیح) پر عصائے موسوی کی ضرب لگائی گئی ہے۔

4-قصہ ذوالقرنین ویاجوج ماجوج:

بعض لوگوں کو غیر معمولی وسائل یا غیر معمولی طاقت وصلاحیت ملتی ہے۔ ذوالقرنین جیسے عباد الرحمان ان سے وسائل کو فلاح اہل ارض کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یاجوج ماجوج جیسی نچلا نہ بیٹھنے والی مخلوق اپنی غیر معمولی ذہنی وجسمانی طاقت کو فساد فی الارض میں لگاتے ہیں۔ دجال کو بھی غیر معمولی ذہنی وجسمانی طاقت حاصل ہوگی اور اسے رحمان کے مقرب بندے مسیح بن مریم علیہما السلام معجزانہ طور پر ہلاک کر کے انسانیت کو اس سے نجات دلادیں گے اور نبوت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف تحیۃ) کے مطابق خلافت الٰہیہ قائم کریں گے۔

الغرض یہ چار فتنے ہیں جن سے بچنے اور بچانے کے لیے علماء ومشائخ جدوجہد کرتے چلے آئے ہیں۔ انہوں نے ان کو حب جاہ، حب مال، عقل پرستی اور نفس پرستی کا نام دیا ہے۔ اس کا خلاصہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے ''مادیت پرستی'' کے نام سے نکالا ہے اور اسے ''عہد حاضر کا شرک'' کا عنوان دیا ہے۔ (معرکۂ ایمان ومادیت، ص:(۹)) ان کے بچنے کی جدوجہد کو عقیدہ وعمل کی اصلاح کا نام دیتے اور ان کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے شریعت پر استقامت اور سنت کی اتباع پر زور دیتے ہیں۔ یہ چاروں بلکہ پانچوں (پانچویں سے مراد یہود ونصاریٰ کا گھڑا ہوا شرکیہ عقیدۂ ''ولدیت'' یا ''ابنیت'' یعنی حضرت عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو خدا کا بیٹا ماننا) اپنی اپنی جگہ فتنہ ہیں، لیکن جب یہ محدود نہیں، عالمگیر ہوں گے؛ اختیاری نہیں، جبری ہوں گے؛ الگ الگ نہیں اکٹھے ہوں گے اور غیر منظم طور پر نہیں، خدائی کے جھوٹے دعویدار کی سرپرستی میں منظم ہوں گے تو سوچیے کہ اقتدار، دولت کے ساتھ اور عقل، طاقت کے ساتھ مل کر کیا گل کھلائے گی؟

اللہ کریم کا فضل ہے کہ امت کو قرآن پاک کی آیات جیسے متبرک کلمات، تقویٰ جیسا حصار اور جہاد جیسا علاج مرحمت فرمایا ہے۔ باطل قوتوں کا یک چشم سربراہ اگر بدی کی طاقتوں کا محور ہے تو عقیدہ وعمل کی اصلاح اس کا سب سے مؤثر توڑ ہے۔ خوش نصیب ہیں جو شریعت وسنت کے دامن سے چمٹے رہیں، عقیدہ وعمل کی اصلاح سے رب العالمین کو راضی کریں، ترازو کا دستہ تقویٰ واعتدال سے تھامے رکھیں اور دعوت وجہاد کی محنت کرتے ہوئے پوری دنیا پر پورے دین کو غلبہ دلانے کی محنت میں لگے رہیں۔

تیسرا حصہ

دروسِ جغرافیہ

اجمالی فہرست دروس جغرافیہ

پہلا سبق

تعریف، اقسام اور غرض وغایت

جغرافیہ کے متعلق آج ان شاءاللہ ہم تین چیزیں پڑھیں گے: جغرافیہ کی تعریف، اقسام اور غرض وغایت۔

تعریف:

جغرافیہ اصل میں معرّب ہے یونانی زبان کے ایک مرکب لفظ "جیو" اور "گرافی" سے۔ اسے عربی میں منتقل کر کے جغرافیہ کہتے ہیں۔ یہ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ یونانی زبان میں "جیو" کا معنی ہے: زمین اور "گرافی" کا معنی "مطالعہ" بھی کیا جاتا ہے اور "تحریر" بھی کیا جاتا ہے۔ اگر گرافی کو ہم بیان کے معنی میں لیں تو جغرافیہ کا معنی ہو جائے گا "زمین کی تشریح" اور گرافی کو مطالعہ کے معنی میں لیں تو پھر معنی ہوگا: "زمین کا مطالعہ کرنا یا تحقیق کرنا"۔ لہٰذا جغرافیہ کی تعریف ہو جائے گی: "عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهِ أَحْوَالُ سَطْحِ الْأَرْضِ."

اصطلاح میں ماہرین میں اس کی دو تعریفیں مشہور ہیں۔ پہلی مذکورہ بالا تعریف: ایسا علم جس میں کرّہ ارض کی سطح کا مطالعہ کیا جائے: "عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهِ أَحْوَالُ سَطْحِ الْأَرْضِ" لیکن اس تعریف کو کامل کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ احوال سطح الارض سے مراد ہے: انسان اور اس کے اردگرد پائے جانے والا ماحول۔ لہٰذا جغرافیہ کی دوسری تعریف ہوگی جو نسبتاً جامع سمجھی جائے گی: "انسان اور ماحول کے درمیان جو باہمی تعلق ہے اس کے مطالعے کا نام جغرافیہ ہے۔"

ماحول اور انسان کی کیا خصوصیت ہے؟ ان دونوں میں کیا مناسبت ہے؟ دراصل زمین پر کچھ بلکہ اکثر مظاہر تو رب تعالیٰ نے بنائے ہیں اور کچھ انسان نے ہاتھوں سے تراش کر صناعی کا فن دکھایا ہے۔ ہم زمین پر دو بڑے بڑے آثار دیکھتے ہیں۔ اگر فضا سے کوئی زمین پر دیکھے اس کو نیچے ایک تو "قدرت ساز خطے" نظر آئیں گے: پہاڑ، سمندر، گھاٹیاں، وادیاں، دریا۔ کچھ مردم ساز خطے نظر آئیں گے: بڑے بڑے شہر، انسانی آبادیاں، عمارتیں۔ انسان نے دریاؤں پر ڈیم بنا دیے، گھاٹیوں کے درمیان پل بنا دیے، مصنوعی نہریں اور جھیلیں بنا دیں۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ انسان کے ہاتھوں کی تعمیر ہے۔ یہ "مردم ساز خطہ" ہے۔ ان دونوں کو ملا کر کہا جا سکتا ہے: "جغرافیہ روئے زمین پر قدرت کی تخلیق اور انسان کی تعمیر کے مطالعہ کا نام ہے۔" جب ہم کسی نقشے یا گلوب کو دیکھیں کہ اس میں قدرت نے کیا کیا سمندر، درّے، جھیلیں، دریا بنائے ہیں اور انسان نے کون کون سے شہر آباد کیے ہیں؟ تو ان دونوں چیزوں کا مطالعہ اور علم جغرافیہ کہلاتا ہے۔

اقسام:

جغرافیہ کی چار بڑی اقسام بیان کی جاتی ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد ہم نے ایک پانچویں قسم (قرآنی جغرافیہ) کی طرف منتقل ہو جانا ہے جو عام طور پر جغرافیہ کی کتابوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔ چار بڑی اور مشہور قسمیں یہ ہیں۔

پانچ اولو العزم رسول صلوٰت اللہ وسلامہ علیہم

- حضرت نوح علیہ السلام
- حضرت ابراہیم علیہ السلام
- حضرت موسیٰ علیہ السلام
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام
- حضرت محمد صلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وآلہٖ وسلم

بقیہ بیس★ انبیائے کرام علیہم السلام جن کا تذکرہ قرآن شریف میں آیا ہے

علیہم الصلوٰۃ والسلام

آدم	اسماعیل	ایوب	الیاس
ادریس	اسحاق	ذوالکفل	یسع
ہود	یعقوب	ہارون	یونس
صالح	یوسف	داؤد	زکریا
لوط	شعیب	سلیمان	یحییٰ

عُزیر★

علیہم الصلوٰۃ والسلام

★ ان انبیائے کرام علیہم السلام کے اسمائے گرامی ترتیب زمانی کے لحاظ سے اوپر سے نیچے کی طرف لکھے گئے۔

★ حضرت عزیر علیہ السلام کے نبی ہونے میں اختلاف ہے۔ "المشہور انہ نبی من انبیاء بنی اسرائیل." (البدایہ والنہایہ:54/2).

قرآن کریم میں مذکور چھبیس انبیاء ان چار علاقوں (وسطِ عرب، عراق، مصر، شام وفلسطین) سے تعلق رکھتے تھے

آدم — ہود — صالح

اسماعیل — شعیب — محمد

ادریس — نوح — ابراہیم — یونس

یوسف — موسیٰ — ہارون

لوط — اسحاق — یعقوب

ایوب — ذوالکفل — داؤد

سلیمان — الیاس — لیسع

زکریا — یحییٰ — عیسیٰ

عزیر

علیہم الصلوٰۃ والسلام



یہ جگہ دنیا کا وسط ہے۔ بقیہ کرۂ ارض پر آنے والے انبیائے کرام کے حالات ان جلیل القدر انبیائے کرام سے ملتے جلتے تھے، اس لیے ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں رہتی۔ انہی اقوام کے حالات پر پوری دنیا کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔



”اور قسم زیتون کی، سینا کے طور پہاڑ کی اور اس امن والے شہر
کی
ں کے نازل ہونے کی جگہ کی طرف اشارہ ہے۔
ہوا ہیں۔ یہاں دو کتابیں زبور اور انجیل نازل
ے شہر مکہ مکرمہ میں قرآن شریف نازل ہوا۔



پانچ قرآنی انبیائے کرام کی اقوام کا مسکن

قرآن شریف میں کثرت سے اکٹھے ذکر کیے گئے پانچ عظیم انبیائے کرام کی جائے بعثت، جن کی قومیں پانچ ایسی علتوں میں مبتلا تھیں جن میں اقوامِ عالم عمومی طور پر مبتلا ہوتی ہیں۔



حضرت آدم (وحوا) علیہ السلام کہاں اترے؟
ہمالیہ، سراندیپ (سیلون، سری لنکا) یا صفا مروہ

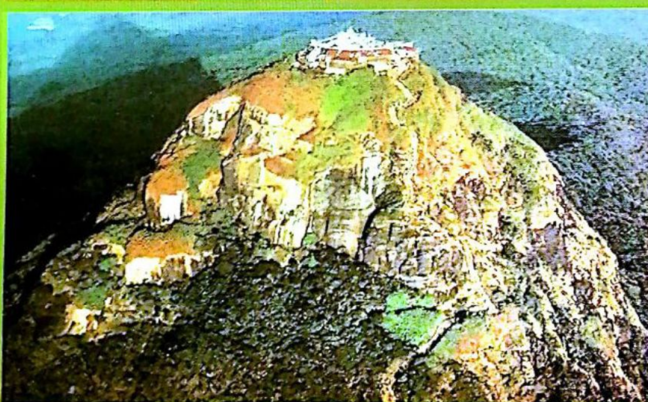
حضرت آدم علیہ السلام کہاں اترے؟

قول 1: ہمالیہ پہاڑ پر
قول 2: سری لنکا میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر
قول 3: مکہ مکرمہ میں واقع صفا نامی پہاڑی پر

تیسرا قول صحیح ہے۔ پہلے دو غلط مشہور کے قبیل سے ہیں۔



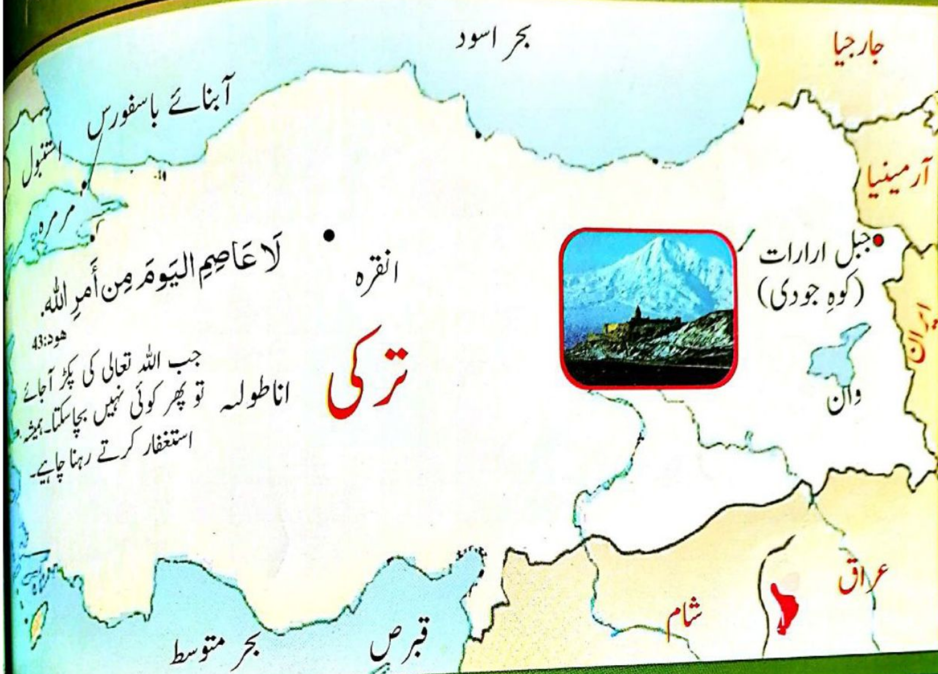


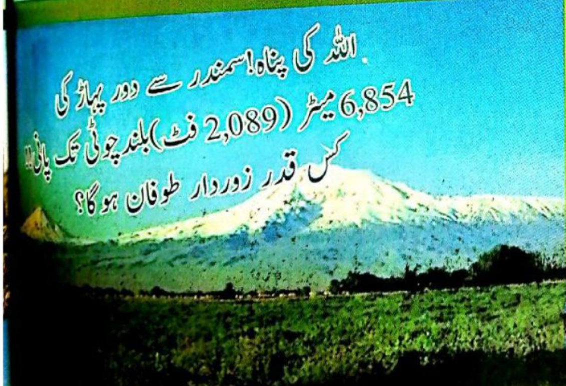


بدھا پہاڑ
(سری لنکا)



حضرت آدم علیہ السلام زمین پر کہاں اترے؟ چونکہ ہمالیہ زمین کا بلند ترین مقام ہے، اس لیے بعض حضرات اس کے قائل ہوگئے۔ سری لنکا میں ایک پہاڑ پر کسی کے قدم کے نشانات پائے جاتے ہیں تو بعض حضرات نے اس کو ترجیح دی، حالانکہ ان دونوں مقامات کی کوئی دینی، سیاسی یا جغرافیائی حیثیت نہیں کہ اس اہم واقعے کے لیے ان کا انتخاب کیا جاتا۔ راجح قول کے مطابق حضرت آدم صفا پہاڑی پر اور حضرت حوا مروہ پہاڑی پر اتریں۔ (رد المحتار، کتاب الحج: 2/467,468)





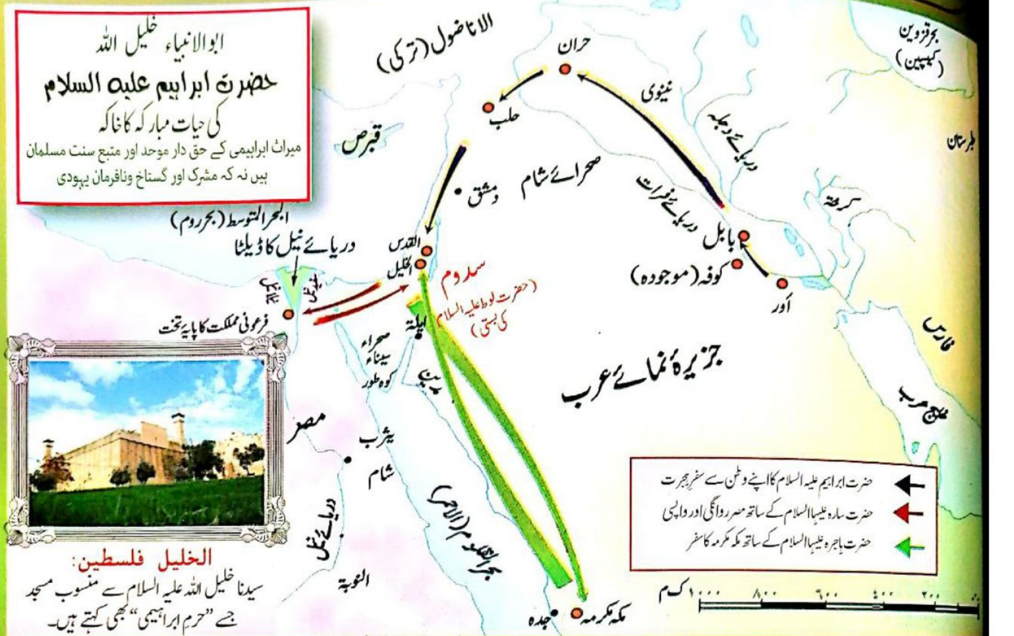




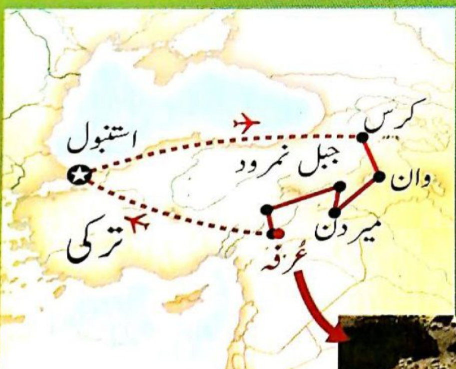
جودی پہاڑ جہاں کشتی نوح جا کر ٹھہری تھی۔ یہ مقام آج کل ترکی، ایران اور آرمینیا کی
سرحدوں کے سنگم پر جزیرہ وان عمر نامی مقام کے قریب واقع ہے۔ تورات میں پہاڑ کا
نام کوہ ارارات ہے جبکہ قرآن کریم میں اس پہاڑی سلسلے کے ایک خاص مقام کو جودی کہا
ہے۔ نیچے کی تصویر میں پہاڑ کی چوٹی کی تصویر ہے جہاں کشتی کے نشانات بتائے جا...

ابوالانبیاء خلیل اللہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی حیات مبارکہ کا خاکہ

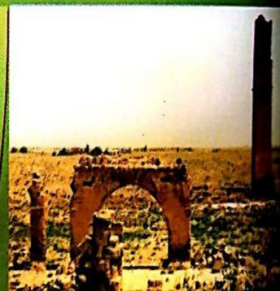
میراثِ ابراہیمی کے حق دار موحد اور متبع سنت مسلمان ہیں نہ کہ مشرک اور گستاخ ونافرمان یہودی



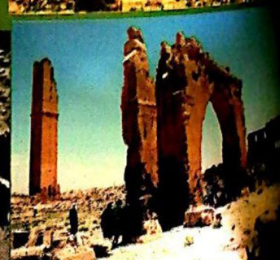
الخلیل فلسطین:
سیدنا خلیل اللہ علیہ السلام سے منسوب مسجد جسے "حرم ابراہیمی" بھی کہتے ہیں۔



ترکی میں عرفہ نامی جگہ پر موجود آثار قدیمہ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے یہاں آگ میں ڈالا تھا۔ یہاں موجود پہاڑ کو جبل نمرود کہا جاتا ہے۔ لیکن محققین کے





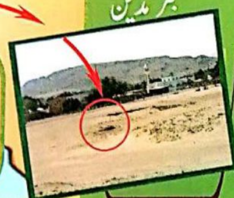


نزدیک اس واقعے کا مقام عراق میں بابل کے قریب "اور" نامی مقام ہے، لیکن اس کی تصویریں دستیاب نہیں ہیں۔



حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام عمرم بن عمران بن قاہث ہے۔ عبرانی زبان میں "مو" پانی اور "سیٰ" لکڑی کو کہتے ہیں۔ آپ کو لکڑی کے صندوق میں پانی کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس لیے "موسیٰ" نام پڑ گیا۔

بئر مدین



وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا۔ (الکہف:60)

مجمع البحرین کا محل وقوع:

تین احتمال، راجح پہلا ہے۔

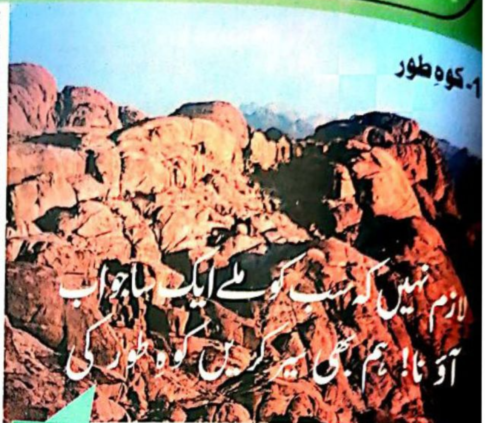
1- خلیج عقبہ اور خلیج سوئز کا بحر قلزم کے ساتھ ملاپ

2- بحر روم اور بحر اوقیانوس کا سنگم

3- دجلہ وفرات کا سنگم

پہلا قول راجح اور تیسرا ضعیف ہے۔





آج اگر کوہِ طور پر جایا جائے (جو مصر کی حدود میں وادی سیناء میں واقع ہے اور جہاں "شرم الشیخ" کے راستے سے جانا ممکن ہے) تو وہاں پانچ بڑی یادگاریں دیکھنے کو ملیں گی:

1- کوہِ طور: یہ وہ پہاڑ ہے جہاں سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی اور کئی یادگار واقعات پیش آئے۔

2- حجرِ موسیٰ: طور سیناء کی اس چٹان پر کھڑے ہوکر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے تھے۔

3- بئرِ موسیٰ: پتھروں سے پھوٹتا وہ پانی جس کے متعلق آتا ہے کہ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضربِ کلیمی سے جاری ہوا۔

4- شجرِ تجلی: (برننگ بُش) وہ جھاڑی نما درخت جس کی پتیاں ہر سال گر جاتی ہیں اور پھر نئے سرے سے اگتی ہیں۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگ جلتی نظر آئی تھی۔

5- جبلِ دکّاء: وہ پہاڑ جو رب العزت جل جلالہ کی تجلیات برداشت نہ کر سکا اور ریزہ ریزہ ہو گیا۔





کوہِ طور کے دامن میں واقع سینٹ کیتھرائن نامی چرچ میں واقع "بئرِ موسیٰ" جس کے بارے میں عیسائیوں کا خیال ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے جاری ہوا۔

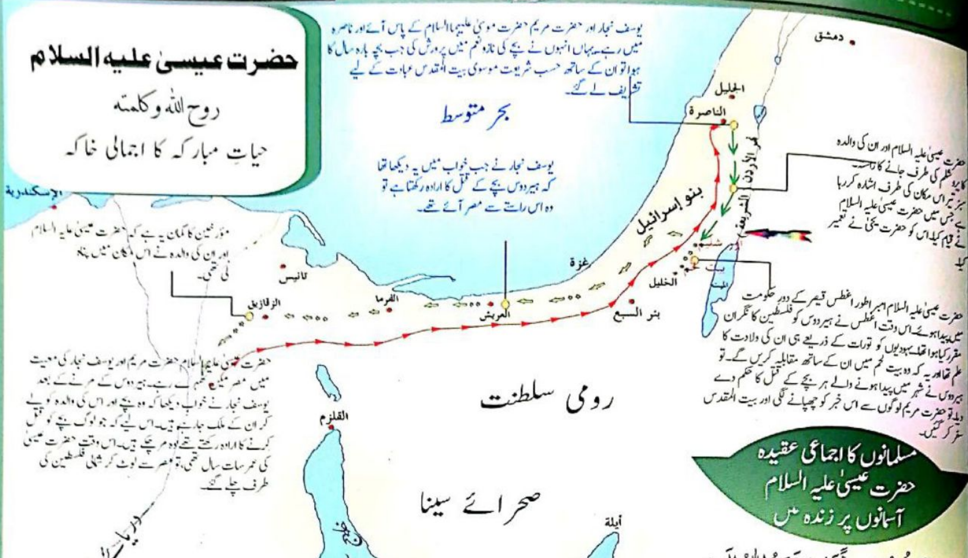
5- جبلِ دکّاء (اس کا ایک حصہ ریزہ ریزہ ہے)





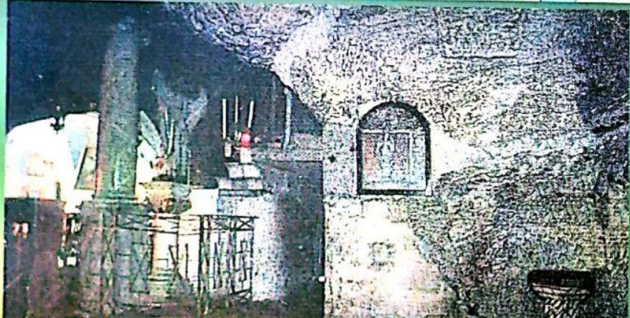
1. وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ الاعراف:163
2. قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ المائدة:26
3. فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ الاعراف:136
4. لَا أَبْرَحُ حَتَّى أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا الكهف:60
5. وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً القصص:23

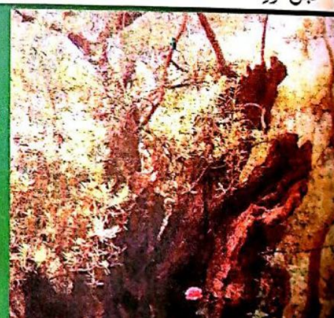




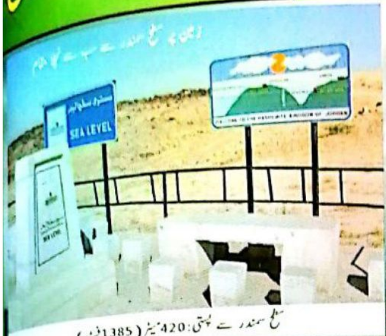
وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ. النساء:158.157

وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ. النساء:159





حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مبارکہ کا مختصر خلاصہ آپ اوپر کے نقشے میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔نیچے کی تصویریں ان سے منسوب ہیں۔تاریخی روایات کے مطابق پہلی تصویر میں اس زیتون کے درخت کی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے آج تک موجود ہے۔دوسری تصویر میں جو جگہ نظر آرہی ہے اس کے متعلق عیسائی حلقوں میں مشہور ہے کہ یہ بیت اللحم موجودہ فلسطین (جو سینٹ کیتھرائین چرچ کا حصہ ہے) کا وہ غار ہے جہاں ایک چبوترے پر حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی۔قرآن وسنت کی صریح نصوص کی رُو سے امت مسلمہ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحفاظت آسمانوں پر اٹھالیے گئے تھے اور قیامت کے قریب نازل ہو کر پوری دنیا پر اسلامی خلافت قائم کریں گے۔



سطح سمندر سے پستی: 420 میٹر (1385 فٹ)

بحر میت

وَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا. (ھود: 82)

"ہم نے اس زمین کے بلند علاقے کو زمین کا پست علاقہ بنا دیا"

غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ (روم: 2)

"رومی مغلوب ہو گئے زمین کے پست ترین حصے میں"



وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا. (الاعراف: 137)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ (البقرۃ: 249)

لَتُقَاتِلُنَّ الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُقَاتِلَ بَقِيَّتُكُمُ الدَّجَّالَ عَلَى نَهْرِ الْأُرْدُنِّ أَنْتُمْ شَرْقِيَّهُ وَهُمْ غَرْبِيَّهُ. (مجمع الزوائد: 303/7)

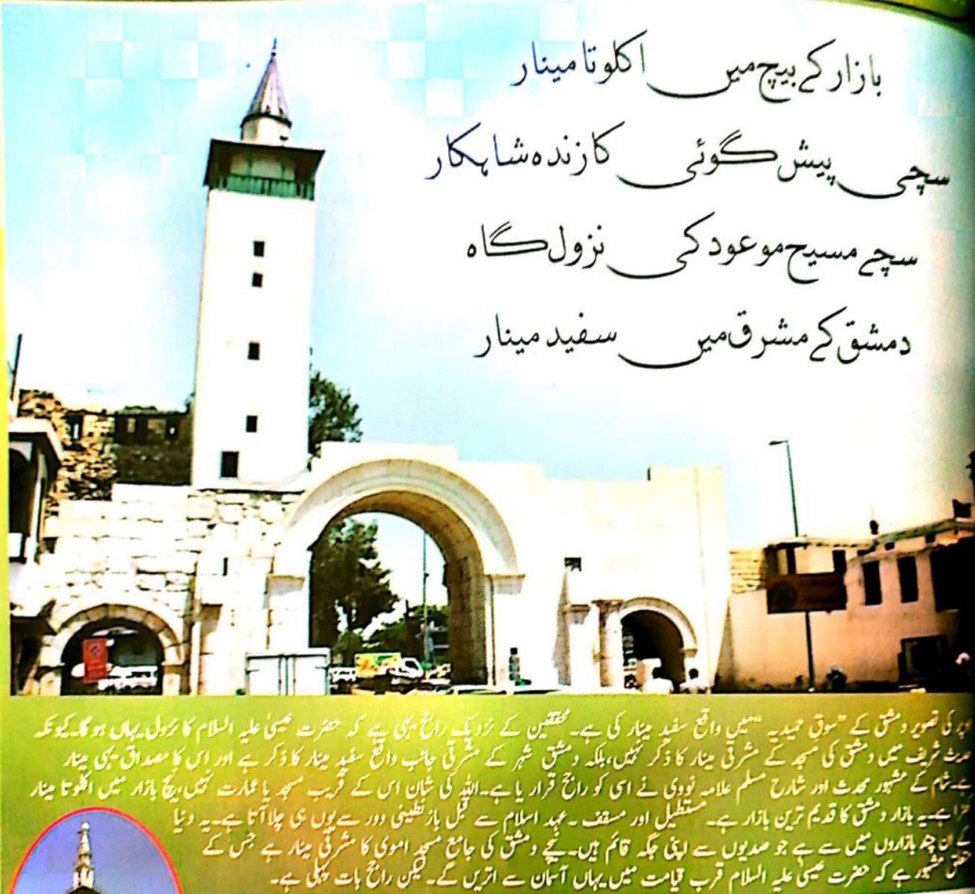
اسرائیل اور اردن کی سرحد پر بپتسمہ دینے کا مقام

بازار کے بیچ میں اکلوتا مینار

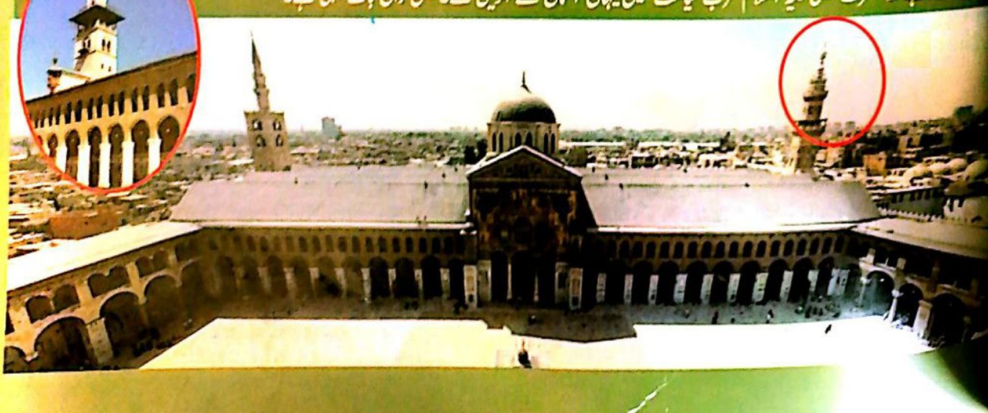
سچی پیش گوئی کا زندہ شاہکار

سچے مسیح موعود کی نزول گاہ

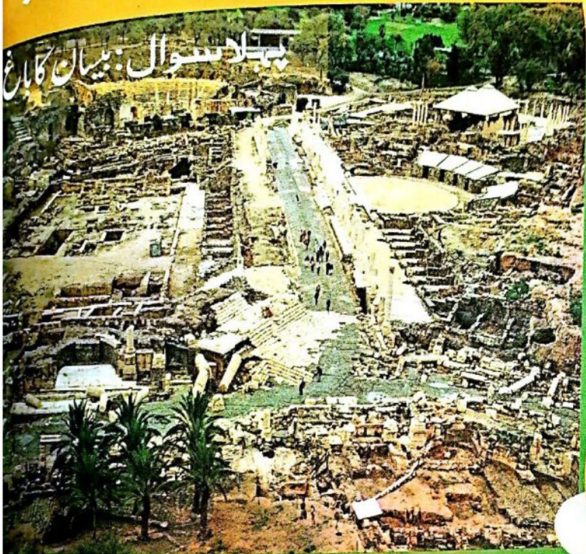
دمشق کے مشرق میں سفید مینار



اوپر کی تصویر دمشق کے "سوق حمیدیہ" میں واقع سفید مینار کی ہے۔ محققین کے نزدیک راجح یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یہاں ہوگا۔ کیونکہ حدیث شریف میں دمشق کی مسجد کے مشرقی مینار کا ذکر نہیں، بلکہ دمشق شہر کے مشرقی جانب واقع سفید مینار کا ذکر ہے اور اس کا مصداق یہی مینار ہے۔ شام کے مشہور محدث اور شارح مسلم علامہ نووی نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ اللہ کی شان اس کے قریب مسجد یا عمارت نہیں، بیچ بازار میں اکلوتا مینار کھڑا ہے۔ یہ بازار دمشق کا قدیم ترین بازار ہے۔ مستطیل اور مسقف۔ عہد اسلام سے قبل بازنطینی دور سے یوں ہی چلا آتا ہے۔ یہ دنیا کے ان چند بازاروں میں سے ہے جو صدیوں سے اپنی جگہ قائم ہیں۔ نیچے دمشق کی جامع مسجد اموی کا مشرقی مینار ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت میں یہاں آسمان سے اتریں گے۔ لیکن راجح بات پہلی ہے۔



سچے مسیحِ موعود کے بعد جھوٹے مسیحِ کذاب کا ذکر

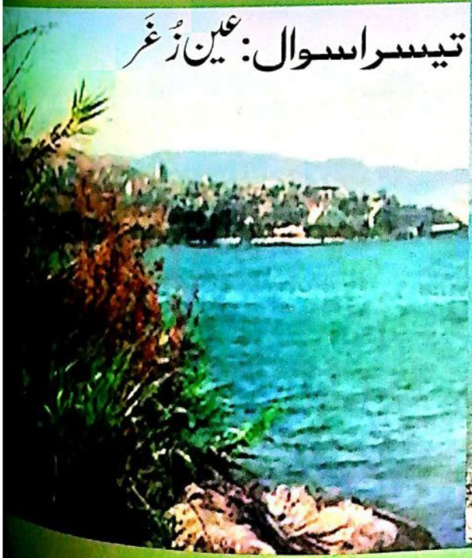


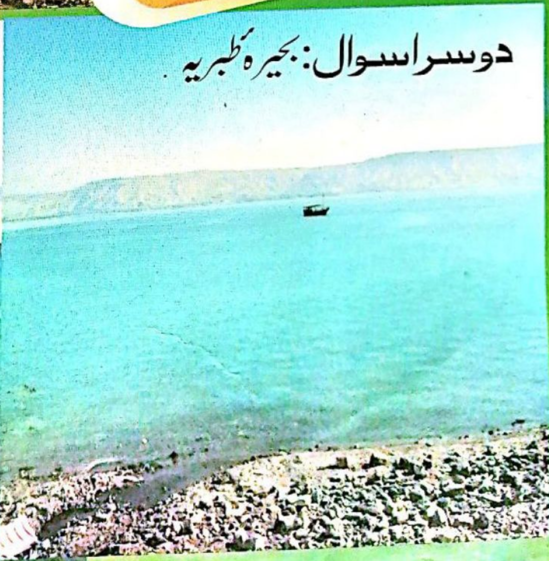
حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی ملاقات جب جساسہ سے ہوئی تو اس نے تین سوال کیے:

1- کہا: مجھے بیسان کے باغ کے بارے میں بتاؤ۔ حضرت تمیم داری فرماتے ہیں: ہم نے کہا: اس کے بارے میں آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا: میں اس کے کھجور کے درختوں کے بارے میں پوچھتا ہوں، کیا وہ پھل دیتے ہیں؟ ہم نے کہا: جی! اس نے کہا: قریب ہے کہ وہ پھل نہ دے۔

2- پھر کہا: مجھے بحیرہ طبریہ کے بارے میں بتاؤ۔ ہم نے کہا اس کی کس حالت کے بارے میں آپ جاننا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا: کیا اس میں پانی ہے؟ ہم نے کہا: وہ تو بہت پانی والا ہے۔ اس نے کہا قریب ہے کہ اس کا پانی جاتا رہے۔

3- پھر اس نے کہا مجھے زغر کے چشمے کے بارے میں بتاؤ۔ ہم نے کہا: اس کی کس حالت کے بارے میں آپ پوچھنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا: کیا چشمے میں پانی ہے اور کیا اس کے آس پاس رہنے والے اس سے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں؟ ہم نے کہا: اس میں پانی وافر مقدار میں ہے اور وہاں کے لوگ اس سے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں...











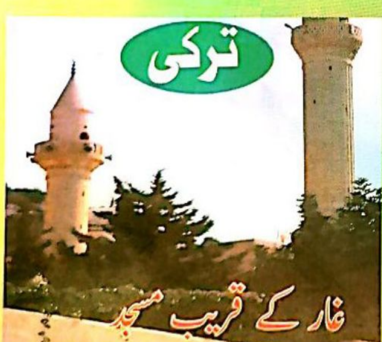
اردن والے غار سے برآمد ہونے والے آثارِ اصحابِ کہف

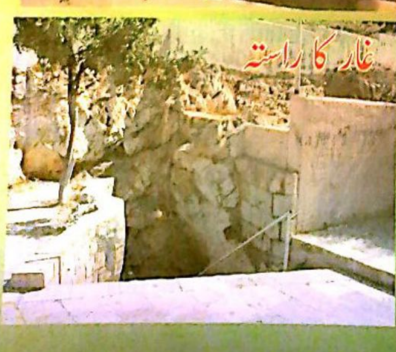
اصحابِ کہف کے محلِ وقوع کے بارے میں تین مشہور قول ہیں:
1-اندلس 2-ترکی 3-اردن
زیادہ قرائن تیسرے قول کے ہیں۔ اردن کے دارالحکومت عمان سے 7 کلومیٹر جنوب میں واقع ایک غار پر قرآن کریم کی بیان کی ہوئی علامات کافی حد تک صادق آتی ہیں۔ اوپر کی تصاویر اسی غار کی ہیں۔ نیچے کی تصاویر ترکی والے غار کی ہیں۔
محققین کے مطابق اس عجیب واقعے کا ایک سے زیادہ جماعتوں کے ساتھ پیش آنا بھی ممکن ہے۔

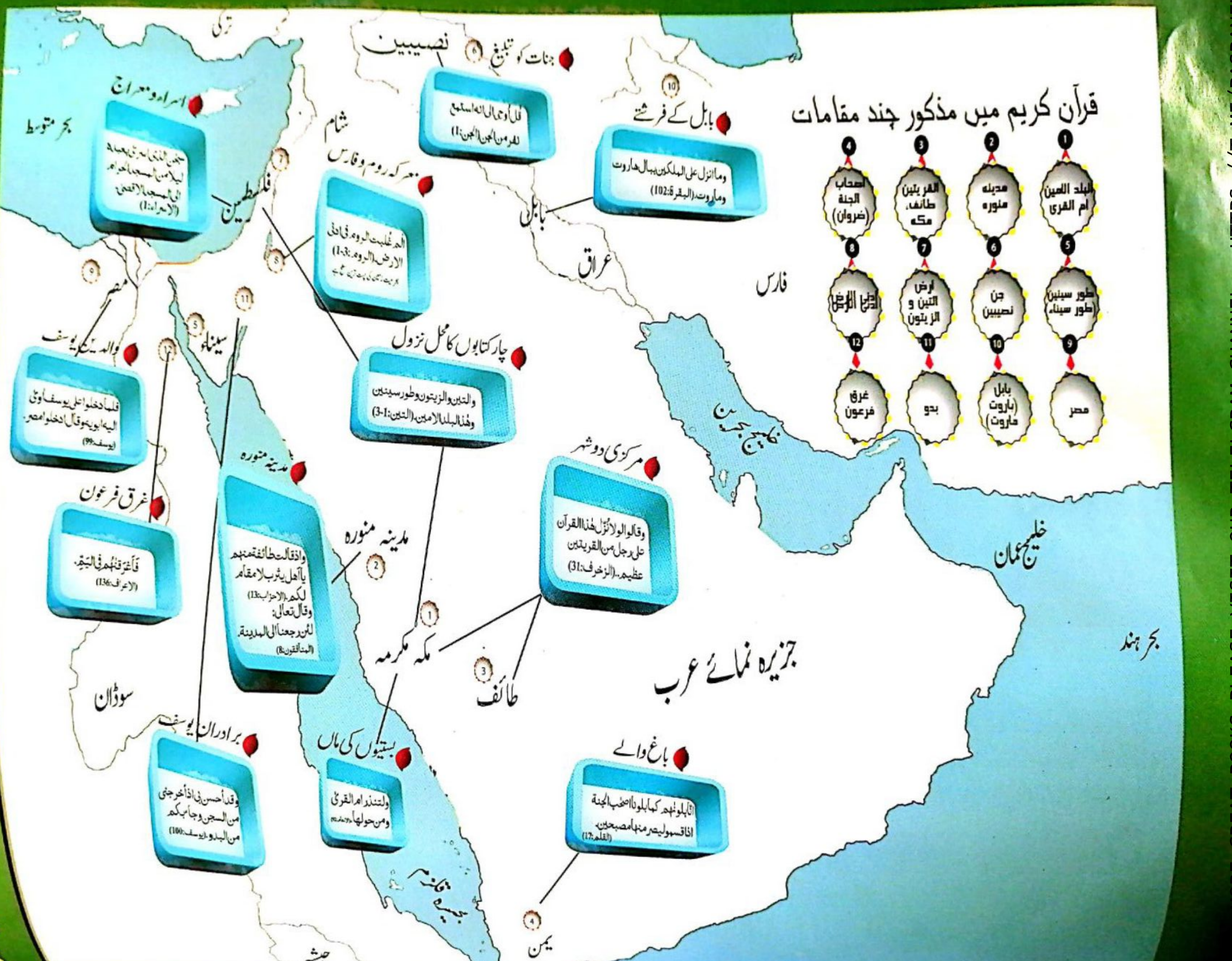
اصحابِ کہف کہاں تھے؟

قول 1: اندلس میں قرطبہ کے نواح میں
قول 2: ترکی شہر افسس، اسلامی نام طرسوس
قول 3: اردن کے دار الحکومت عمان کے قریب








قرآن کریم میں مذکور چند مقامات
1 البلد الامین ام القریٰ
2 مدینہ منورہ
3 القریتین طائف، مکہ
4 اصحاب الجنۃ (ضروان)
5 طور سینین (طور سیناء)
6 جن نصیبین
7 ارض التین و الزیتون
8 ادنی الارض
9 مصر
10 بابل (ہاروت ماروت)
11 بدو
12 غرق فرعون
اسراء و معراج
سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ (الاسراء:1)
جنات کو تبلیغ
قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن (الجن:1)
بابل کے فرشتے
وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت (البقرۃ:102)
معرکہ روم و فارس
الم غلبت الروم فی ادنی الارض (الروم:1-3)
چار کتابوں کا محل نزول
والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین (التین:1-3)
والدین یوسف
فلما دخلوا علی یوسف اویٰ الیہ ابویہ وقال ادخلوا مصر (یوسف:99)
غرق فرعون
فاغرقنٰھم فی الیم (الاعراف:136)
مدینہ منورہ
واذ قالت طائفۃ منھم یاھل یثرب لا مقام لکم (الاحزاب:13)
وقال تعالیٰ:
لئن رجعنا الی المدینۃ (المنافقون:8)
مرکزی دو شہر
وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم (الزخرف:31)
برادران یوسف
وقد احسن بی اذ اخرجنی من السجن وجاء بکم من البدو (یوسف:100)
بستیوں کی ماں
ولتنذر ام القریٰ ومن حولھا
باغ والے
انا بلونٰھم کما بلونا اصحٰب الجنۃ اذ اقسموا لیصرمنھا مصبحین (القلم:17)
ترکی
بحر متوسط
نصیبین
شام
فلسطین
مصر
سینا
عراق
بابل
فارس
خلیج عمان
بحر ہند
جزیرہ نمائے عرب
مکہ مکرمہ
طائف
مدینہ منورہ
سوڈان
یمن
حبشہ

طبعی جغرافیہ:

سب سے پہلی اور بنیادی قسم ''طبعی جغرافیہ'' ہے یعنی زمین کی طبعی ساخت جس پر قدرتی نقوش بنے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالی نے جب زمین کو سنوارا۔ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا، اَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَ هَا وَمَرْ عَاهَا. [النازعات: 30,31] اس زمین میں اللہ تعالی نے کرۂ خاکی و آبی بنایا۔ اس کے اندر معدنیات رکھیں، اس میں راستے بنائے اور نہریں جاری کیں۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا، فَنِعْمَ لْمَاهِدُوْنَ. [الذاریات: 48] یہ جو قدرتی ساخت ہے اس کے مطالعہ کا نام طبعی جغرافیہ ہے۔ اس میں زمین پر پائے جانے والے مختلف قدرتی مظاہر، بحر و بر، پہاڑ اور جزیرے، صحرا و دریا وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ انسان کا ماحول ہے۔ یہ اس کا گرد و پیش ہے۔ قدرتی طور پر انسان اس سے واقفیت کی خواہش رکھتا ہے۔ جغرافیہ کی یہ قسم تمام اقسام کی اصل ہے۔

ریاضیاتی جغرافیہ:

دوسری قسم ریاضیاتی جغرافیہ ہے۔ یعنی زمین کی ساخت، اس کی حرکت، اس کے حجم وغیرہ کی پیائش، اس کی قوت کشش، اس کا دوسرے سیاروں سے فاصلے کا مطالعہ کرنا۔ اس کو ریاضیاتی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں اعداد و شمار زیادہ بیان کیے جاتے ہیں کہ اس کرے کی پیائش اتنی ہے، رفتار اتنی ہے، حجم اتنا ہے، قوت کشش اتنی ہے، فلاں سیارے سے فاصلہ اتنا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

سیاسی جغرافیہ:

تیسری قسم سیاسی جغرافیہ ہے۔ یعنی کرۂ ارض پر موجود مختلف ریاستوں اور مملکتوں کی سیاسی حدود کا بیان۔ زمین پر مختلف قومیں بستی ہیں۔ انسان جس طرح گھر بناتا ہے اور اس کی حد بندی کرتا ہے اسی طرح اقوام بھی اپنے لیے گھر یعنی وطن بناتی ہیں اور اس کی حدود مقرر کرتی ہیں۔ سیاسی جغرافیہ میں اقتدار کی ان حدود سے واقفیت حاصل کی جاتی ہے۔ زمین کی سیاسی تقسیم مصنوعی ہے اور اس میں ہر وقت تغیر و تبدل کا امکان پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس زمین پر جو قدرتی تقسیم ہے وہ مصنوعی نہیں، قدرتی ہے اور سالوں یا صدیوں بعد بدلتی ہے۔ قدرتی طور پر زمین کی تقسیم یوں کی جاتی ہے کہ اس پر خشکی اور پانی ہے۔ پھر خشکی میں پہاڑ ہیں، جنگل ہیں، صحرا ہیں، دریا ہیں، سطح سمندر سے نشیبی علاقے یا سطح مرتفع والے علاقے ہیں۔ پانی میں بحر ہیں، بحیرے ہیں، جھیلیں اور دریا ہیں۔ یہ قدرتی تقسیم ہے۔ اس کو چار مختلف رنگوں میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ ہر نقشے میں کم از کم چار مختلف رنگ پائے جاتے ہیں۔ نیلا: پانی کے لیے۔ پیلا: سطح سمندر سے مساوی سطح کے لیے۔ سبز: سمندر سے بلند علاقوں کے لیے اور بھورا: پہاڑوں یا زیادہ بلند علاقوں کے لیے ہے۔ اس قدرتی تقسیم کے بیچ میں انسان نے خلل انداز ہو کر ایک مصنوعی تقسیم کر رکھی ہے۔ اس نے اپنے اقتدار کی حدود کے تعین کے طور پر جو لکیر کھینچی ہے اس نے سیاسی تقسیم کو وجود دے دیا ہے۔ مثلاً جزیرۃ العرب ہے۔ قدرتی تقسیم یا طبعی جغرافیہ کے اعتبار سے یہ سارے کا سارا ایک جیسا ہے کہ صحرائی اور پہاڑی علاقہ ہے۔ کہیں کہیں نخلستان ہیں، لیکن سیاسی تقسیم میں یہ بارہ ملک بن گئے۔ اب کویت اور عراق کو لے لیں۔ قدرتی تقسیم کے اعتبار سے دونوں ایک جیسے خطے میں ہیں۔ سرحد کے ادھر یا اُدھر زمین کی ساخت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بحرین یا قطر کی طرف چلے جائیں تو ایسا نہیں کہ ایک برفانی علاقہ تھا اور دوسرے میں جنگل شروع ہو گیا۔ ادھر شام میں چلے جائیں۔ لبنان و فلسطین اور اردن یہ سب ایک جیسی ہیں۔ ادھر برصغیر میں آ جائیں آپ واہگہ بارڈر کے ادھر چلے جاتے ہیں۔ زمینی ساخت تو ایک جیسی ہے، سارا زرعی علاقہ ہے، اس کے اوپر سیاسی تقسیم نے ایک حد فاصل قائم کر دی۔ کشمیر مقبوضہ ہو یا آزاد، زمین اور آب و ہوا تو تقریباً ایک جیسی ہے۔ اس لیے اس سیاسی حد بندی کو مصنوعی تقسیم کہتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کسی وقت بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ رات سوئے صبح اٹھے پتا چلا ملک ٹوٹ کر دو ہو گیا یا مثلاً دیوار برلن گر کر جرمنی متحد ہو گیا، جبکہ طبعی تقسیم یعنی سمندر، خشکی، دریا،
لے تو طبعی جغرافیہ تبدیل ہو جاتا ہے۔
۔ صدیوں سال تک نہیں بدلتی۔ کبھی کبھار سمندر آبادیوں پر چڑھ دوڑے یا دریا راستہ بدل

معاشی اور تجارتی جغرافیہ:

معاشی اور تجارتی جغرافیہ اکٹھے کر کے بیان کیا جاتا ہے، لیکن ان میں تھوڑا سا فرق ہے۔ معاشی جغرافیہ کا معنی ہوتا ہے: کسی خطے یا ملک کے قدرتی ذرائع آمدنی کا مطالعہ۔ کسی ملک میں زراعت ہے، نباتات ہیں۔ پاکستان زرعی ملک ہے۔ نباتات کو برآمد کرتا ہے اور اس کے بدلے میں معدنیات کو درآمد کرتا ہے، مثلاً تیل باہر سے منگواتا ہے۔ اس حوالے سے دنیا میں کیا کیا معاشی سرگرمیاں پائی جاتی ہیں؟ مختلف خطے کون سے ہیں جو نباتات اگاتے ہیں؟ اور وہ کون سے ہیں جن میں ایک پتہ نہیں اگتا؟ سارا مدار معدنیات پر ہوتا ہے یا صنعت و تجارت سے معیشت چلتی ہے۔ معاشی جغرافیہ میں اس سے بحث ہوتی ہے۔

تجارتی جغرافیہ معاشی جغرافیہ سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ کون سی زرعی یا صنعتی اشیا کی کھپت کہاں ہے؟ اشیا کی درآمد و برآمد، نقل و حمل، ان کا تبادلہ اور مبادلہ۔ اس کو "تجارتی جغرافیہ" کہتے ہیں۔

قرآنی جغرافیہ:

ہمارے سبق کا موضوع درج بالا چار اقسام میں سے طبعی اور سیاسی جغرافیہ ہے۔ جبکہ اصل مقصود ہماری ایک اور قسم ہے "قرآنی جغرافیہ"۔ یہ قرآن مجید کے طلبہ کے لیے، سیرت اور تاریخ کے طلبہ کے لیے بہت ضروری ہے، مثلاً: حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ مشہور ہے۔ وہ فلسطین سے نکلے اور مصر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہے کہ وہ مصر سے نکلے اور مدین چلے گئے۔ اب قرآن اور تاریخ کے سب طلبہ یہ دونوں واقعات جانتے ہیں، لیکن مصر اور فلسطین میں ایک خاص مناسبت تھی۔ یہاں کسی پر آزمائش آتی تو اُدھر نکل جاتا تھا اور وہاں اگر کسی پر کوئی ابتلا آئے تو اِدھر آجاتا تھا۔ یہ مناسبت قرآنی جغرافیہ کے بغیر سمجھ نہیں آسکتی۔ قرآنی جغرافیہ کا معنی خود بخود سمجھ میں آجانا چاہیے۔ جغرافیہ کا کیا معنی تھا؟ "عِلمُ احوالِ الأرض"، تو قرآنی جغرافیہ کا کیا معنی ہوگا؟ "عِلمُ أحوالِ أرضِ القرآن" قرآن کریم میں جو مقامات آئے ہیں یعنی ملک، شہر، پہاڑ، دریا، چشمہ، سمندر، درے؛ غرض جو بھی چیز آئی ہے اُن کا محل وقوع اور متعلقہ تفصیلات کا علم۔ کیوں؟ اس لیے کہ نزولِ قرآن کا مقصد کامل طریقے سے پورا ہو جائے۔

نزولِ قرآن کا مقصد:

نزولِ قرآن کا مقصد "تذکیر" ہے، نصیحت یا عبرت۔ قرآن نے جتنے انبیائے کرام کا تذکرہ کیا ہے یا "آلاء اللہ" کا تذکرہ ہے یا "أیام اللہ" کا تذکرہ ہے، وہ کس مقصد کے لیے ہے؟ وعظ اور وعید کے لیے، نصیحت یا عبرت، انذار و تبشیر کے لیے۔ اس کو جغرافیہ کی مدد سے زیادہ اچھے طریقے سے سمجھا اور بیان کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً: طوفانِ نوح بہت عجیب واقعہ ہے، قرآن نے کہا ہے کہ آسمان بھی برس پڑا اور زمین بھی پھوٹ پڑی۔ بہت عظیم طوفان آگیا مگر اس کی ہیبت کو نہیں سمجھا جاسکتا جب تک جودی پہاڑ کی بلندی کو نہ دیکھ لیا جائے کہ وہ سطحِ ارض سے کتنا بلند تھا اور قوم نوح جو تعجب کرتی تھی: كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ. [ھود: 38] اس علاقے میں کشتی! اس تعجب کو نہیں سمجھا جاسکتا اور اس معجزہ کا کمال بھی نہیں سمجھا جاسکتا جب تک سمندر سے اس پہاڑ کی دوری اور بلندی کو ایک نظر نہ دیکھ لیا جائے۔ بس اس پہاڑ کی تصویر کو آدمی ایک نظر دیکھ لے۔ اس کی سمندر سے دوری اور سطحِ سمندر سے اس کی بلندی کو ایک مرتبہ دیکھ لے تو فوراً اس کو قرآن کا یہ عظیم الشان واقعہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو برباد کرنا چاہے تو ایسی جگہ پر پانی لے آتے ہیں جہاں پانی کا تصور ہی نہ ہو اور وہاں پانی ہوتا کتنا بھیانک ہے؟ اٹھارہ سو میٹر بلند لہر اٹھتی جاتی ہے۔ کیونکہ جودی پہاڑ اٹھارہ سو (1800) میٹر بلند تھا جہاں پر جاکر کشتی ٹکی۔ اس علاقے میں اس سے بلند ترین جگہ نہیں تھی۔ اب تصور کیا جاسکتا ہے اس طوفان کی ہیبت ناکی کا جو کہ سمندر کی سطح سے 1800 میٹر بلند تھا۔

قرآن اور حدیث، سیرت اور تاریخ ان چاروں علوم کو اگر تصاویر اور نقشوں کے پسِ منظر کو ساتھ لے کر پڑھایا جائے تو بہت آسانی سے ان سب علوم میں

بصیرت حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسے ذوالقرنین نے اس زمانے کے تمام اسباب ساتھ لے کر سفر کیا، اس وقت کوئی اور زمین پر یہ نہیں کر سکتا تھا۔ مطلع الشمس اور مغرب الشمس اور بین السدین تین سفر انہوں نے کیے۔ اب طالب علم ان تین اسفار کے حوالے سے ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے جب تک وہ یہ سمجھ نہیں لیتا کہ زمین پر ان تین سفروں کا رخ کس طرف تھا؟ ان کی اہمیت اس پر واضح نہیں ہوتی جب تک کہ وہ ان تینوں کی منزل سے واقف نہیں ہوتا۔

غرض وغایت:

1- اس فن کی ایک اہم غرض وغایت "آیات الٰہیہ" کی معرفت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ. [آل عمران: 190] آسمان اور زمین کی پیدائش میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ آسمان میں کیا نشانیاں ہیں؟ یہ فلکیات سے تعلق رکھتا ہے۔ زمین میں اللہ کی آیات کیا ہیں؟ یہ جغرافیہ کے علم سے پتا چلتا ہے۔ اس سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ اللہ کا جلال وجمال انسان کے قلب میں اپنا اثر ڈالتا ہے: سِيرُوا فِي الْأَرْضِ۔ گھوم پھر کر دیکھو تو سفر میں دو چیزیں سامنے آتی ہیں: "آیات الارض" اور "عاقبة المكذبين" یہ جو بڑی اقوام تھیں، یہ دنیا کے جس خطے میں رہتی تھیں، اس خطے کو تسخیر کرنے کا اللہ تعالیٰ نے ان کو عجیب وغریب کمال اور فن دیا ہوا تھا۔ اس طرح آیات الٰہیہ کا اصل مقصد موعظت اور تذکیر سمجھ میں آتا ہے۔ اب سفر دو طرح کا ہے، حقیقی سفر: اس کے اسباب کسی کسی کے پاس ہوتے ہیں۔ دوسرا کتابی سفر: یہ فن جغرافیہ کے ذریعے ممکن ہے۔

2- کچھ عبادات ہیں، مثلاً: نماز، حج، جہاد اور کچھ معاملات ہیں: تجارت، معیشت۔ ان کے سمجھنے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ نماز کا وقت اور قبلہ معلوم کرنا فن جغرافیہ کی کچھ مبادیات سمجھنے پر موقوف ہے۔ پچھلے زمانے میں حج کے قافلے چلتے تھے۔ اگر سمت معلوم کرنے کا طریقہ اور سطح الارض پر موجود مظاہر کا ان کو پتا نہ ہوتا تو وہ کون سے رخ پہ سفر کرتے؟ کتنے دنوں میں پہنچنے کا اندازہ کر کے چلتے؟ کتنا زادِ راہ ساتھ رکھتے؟ کچھ نہ پتا چلتا۔ جہادی قافلے اجنبی سرزمین کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ اگر انہیں "طبقات الأرض" کا علم نہ ہوتا تو وہ کس طرح رباط یا دار الحرب تک پہنچتے اور آج کل بھی اگر کسی جگہ کی رکی صحیح نہیں ہے، نقشہ صحیح نہیں ہے، معلوم نہیں ہے کہ پہاڑ ہیں، دریا ہیں، گھاٹیاں ہیں، اترائی ہے، چڑھائی ہے، قافلہ کیسے سفر کرے گا؟ اور مسلمان مجاہدین کے ساتھ مسلمان تجار، اسفار میں بہت آتے جاتے تھے۔ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ. [الجاثیہ: 12] اور وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. [الجمعۃ: 10] پر عمل کرنے کے لیے زیادہ تر مسلمان نوکری نہیں کرتے تھے۔ تجارت کرتے تھے، یہ خود مختار کام ہے۔ اس میں برکت زیادہ ہے۔ تو انہیں اس علم کے ذریعے ہی پتا چلتا تھا کہ دنیا کا کون سا ملک کہاں ہے؟ کس مال کی کھپت کہاں ہے؟ طبعی، سیاسی، معاشی، ہر طرح کے جغرافیہ کی ان کو ضرورت پڑتی تھی۔ کون سے ملک کے کیا قوانین ہیں؟ کون سے ملک یا بادشاہ کے محصول کی شرح کیا ہے؟ غیر ملکیوں کے حوالے سے اس کا کیا رویہ ہے؟ یعنی عبادات، معاملات وغیرہ دونوں میں اس فن کی ضرورت پڑتی تھی اور ضرورت پڑتی ہے۔

3- تیسرا فائدہ ہے علمِ تاریخ اور سیاستِ حاضرہ میں بصیرت۔ علم تاریخ وسیاست اس وقت تک اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا جب تک جغرافیہ سمجھ میں نہ آئے۔ دنیا میں اس وقت بعض مشہور جنگیں چل رہی ہیں، تنازعات جاری ہیں۔ چیچنیا میں روس کا تنازعہ ہے۔ روس کو کیا دلچسپی ہے کہ اس نے پندرہ ریاستیں آزاد کر دیں؟ لیکن اس ایک چھوٹی سی ریاست کو آزاد نہیں ہونے دیتا؟ آخر کیا مطلب ہے اس کا؟ فلسطین کے دو بڑے بڑے حصے ہیں۔ ایک "دریائے اردن کا مغربی کنارہ" اور "غزہ کی پٹی" اور تیسرا مشہور حصہ اس کا "القدس" ہے۔ ان تین مقامات کی کیا اہمیت ہے؟ دریائے اردن کیا ہے؟ اور اس کا مغربی کنارہ کیا ہے؟ عالمی سیاست میں، اخبارات، بیانات میں بارہا اس کا تذکرہ آیا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی اہمیت کیا ہے؟ مغربی کنارہ کا یہ نام رکھنے کے بعد اس پر اتنا زور لگانے کا کیا مطلب ہے؟ اس طرح کی چیزوں کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی؟ جب تک کوئی جغرافیہ نہ جانتا ہو۔ تاریخ کے ساتھ اسے منتھی کر کے پڑھنے کا

عادی نہ ہو۔ تاریخ اور سیاست یہ دو ایسے علوم ہیں کہ جغرافیہ جاننے سے ان دونوں کو سمجھنے میں سہولت اور آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

آج کے سبق میں تین چیزیں ہوگئی: (1) جغرافیہ کی تعریف۔ (2) اس کی اقسام اور (3) غرض وغایت۔ آگے کا ہمارا سبق ہوگا: سیاسی اور تاریخی جغرافیہ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ دونوں اکٹھے پڑھائے جائیں تو دلچسپ اور مفید ہوتے ہیں۔ البتہ طبعی جغرافیہ کا سبق اللہ نے چاہا تو مستقل الگ ہوگا۔

دوسرا سبق

فنِ جغرافیہ سے غفلت کیوں؟

آج کل اسکولوں کالجوں سے ''سیاسی جغرافیہ'' ختم کردیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے پڑھنے سے مسلمانوں کی نئی نسل میں اپنے آباء واجداد کی وراثت واپس لینے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم ''جزیرۃ العرب'' کا سیاسی جغرافیہ پڑھتے ہیں کہ اس میں بارہ ملک ہیں تو سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں ''ارضِ اسلام، ارضِ حرمین'' کے بارہ ٹکڑے کیسے ہوگئے؟ یہ تو صحابہ کے زمانے میں ایک ملک تھا اور خلافت عثمانیہ میں ایک خطہ تھا۔ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد اس میں بارہ ملک کیسے بن گئے؟ جبکہ ان ممالک میں بعض ملک اتنے چھوٹے ہیں کہ نقشہ بنانے والا جب چھوٹی سی ''ڈاٹ'' لگاتا ہے، دارالحکومت کی علامت کا دائرہ بناتا ہے، یا شہر کی علامت کا چھوٹا سا سُرتبع لگاتا ہے تو نام لکھنے کے لیے جگہ نہیں رہتی۔ جیسے بحرین ہے، اس کا کل رقبہ صرف 694 مربع کلومیٹر ہے اور 2007ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی 7,60,168 ہے۔ یعنی تقریباً 700 کلومیٹر رقبہ اور صرف ساڑھے سات لاکھ آبادی ہے۔ اتنی چھوٹی سی جگہ کو مستقل ملک بنانے کی ضرورت کیا تھی؟ اس سوال پر جب مسلمان نوجوان غور کرتا ہے تو وہ اُس سیاست کو سمجھنے لگتا ہے جو ہمارے ساتھ ہوئی اور یہ وراثت جو ہم سے چھینی جارہی ہے، اس کے متعلق اُس کے ذہن میں شعور پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں لہو ولعب سے وقت بچا کر ایک کام کرنے کا یہ بھی ہے کہ اپنے آبائی ورثے کی حفاظت کی جائے۔

دشمن طاقتیں نہیں چاہتیں کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل کو پتا چلے کہ ان کے آباء واجداد کے پاس کیا کچھ تھا؟ پھر کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟ اب کیا ہورہا ہے؟ اور کون کررہا ہے؟ کسی کو یہ علم نہ ہو۔ اس لیے اس فن کو عصری تعلیمی اداروں سے نکال دیا گیا ہے۔

ہمارے اکابر نے اس پر بڑا کام کیا ہے۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے بنگال کے مدارس کا نصاب ترتیب دیا تو اس میں جغرافیہ شامل تھا۔ (بنگال الگ ہے اور بنگلہ دیش الگ ہے۔ بہار اور بنگال بھارت کے دو صوبے ہیں۔ بنگال، بنگلہ دیش الگ الگ دو خطے ہیں۔ بنگال، بنگلہ دیش میں نہیں۔) بنگال اور بہار میں حضرت کے مریدین کی جماعت تھی، ان لوگوں نے وہاں ''امارتِ شرعیہ'' قائم کی ہے۔ بہار میں ''پٹنہ'' شہر ہے۔ اس میں ''پھلواری شریف'' مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ وہاں ''امارتِ شرعیہ'' قائم ہے۔ باقاعدہ قضاء کورس ہوتا ہے۔ بڑے بڑے علماء بطور قاضی مقرر ہیں۔ کوئی مسلمان اپنا فیصلہ یہاں کروانے کے بجائے سرکاری عدالت میں جائے تو مسلمان اس کا مقاطعہ کرتے ہیں۔ اس سے تعلق ختم کردیتے ہیں۔ کوئی مسلمان اس سے رشتہ ناتا قائم نہیں کرتا اور اس کی شادی غمی میں شریک نہیں ہوتا۔ سب مل کر اس کا بائیکاٹ کرتے ہیں کہ تم سرکاری عدالت میں فیصلہ کے لیے کیوں گئے؟ قاضی صاحب کے پاس کیوں نہیں گئے؟

بنگال اور بہار کے مدارس میں حضرت نے جو نصاب مرتب کیا، اس میں جغرافیہ شامل ہے۔ اورنگزیب عالمگیر نے ایک دن اپنے استاد سے شکوہ کیا کہ آپ نے کبھی ہمیں یہ نہیں بتایا اتر کی کس طرف ہے کہ ہم باہمی تعاون کریں، ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کریں۔ مغلیہ سلطنت اور عثمانیہ خلافت دنیا کی دو بڑی

سلطنتیں ہیں لیکن آپ نے کبھی ہمیں جغرافیہ ہی نہیں پڑھایا، ہمیں یہ نہیں بتایا کہ دنیا میں کہاں کہاں اسلامی ممالک ہیں؟

سلطان محمد فاتح نے اپنی خصوصی نشست گاہ میں جغرافیہ کا ایک نقشہ لگایا ہوا تھا اور ایسی جگہ لگایا تھا کہ جہاں سے بھی دیکھے اسے یہ نقشہ نظر آئے۔ کسی نے پوچھا: آپ اسے ہر وقت کیوں دیکھتے رہتے ہیں؟ اس نے کہا: میں دل کا راز زبان پر نہیں لاتا۔ میرے دل میں جتنی آگ لگی ہوئی ہے وہ میں جانتا ہوں۔ اس نقشے کو دیکھ دیکھ کر وہ بھڑکتی رہتی ہے۔ میں اُسے اور بھڑکتی چاہتا ہوں۔ وہ کسی کو راز نہیں دیتا تھا کہ اگلے سال یورپ کی کس ریاست پر حملہ کرنا ہے۔ اس نقشے میں دیکھتا رہتا تھا میری اگلی منزل، اگلا ہدف کونسا علاقہ ہونا چاہیے۔ بہر حال یہ بہت کارآمد اور مفید فن ہے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان تاریخ اور سیاست کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ہم لوگ حالات حاضرہ اور تاریخ سابقہ سے اکثر لاعلم رہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ جغرافیہ سے لاعلم ہونا ہے کیونکہ تاریخ نام ہے: ''کسی زمانے میں کسی مقام پر پیش آنے والے کسی واقعہ کے علم کا''۔ اگر کہا جائے علمِ تاریخ کی آسان سی تعریف کریں تو کہا جا سکتا ہے: ''روئے زمین پر کسی زمانے میں کسی مقام پر کوئی واقعہ ہوا ہو، اس کا علم تاریخ کہلاتا ہے''۔ جب آپ تاریخ کی کوئی کتاب کھولیں گے، وہاں یا سن لکھا ہوگا یا مقام لکھا ہوگا۔ عیسوی سن، ہجری سن۔ یہ زمانہ ہے اور مقام انہی سات براعظموں میں کوئی ایک مقام ہوگا۔ تو زمان اور مکان سے تعلق رکھنے والے اُس فن میں جغرافیہ سے ناواقفیت کی وجہ سے ہم اس علم کی آدھی بنیاد ہی سے ناواقف رہتے ہیں۔ اس لیے تاریخ سے دلچسپی نہیں پیدا ہوتی۔ اسپین کو مسلمانوں نے فتح کیا، وہ اس کی فتح کے بعد کیا کرنا کیا چاہتے تھے؟ قسطنطنیہ کی فتح کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی تھی۔ اس کی کیا اہمیت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی بڑی بشارت دی اور مسلمان اس کی فتح پر اتنا زور کیوں لگاتے تھے؟ یہ سب باتیں جغرافیہ کے علم کے بغیر آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

بنو عباس میں سے مامون الرشید بڑا حکمراں گذرا ہے۔ یہ علم دوست خلیفہ تھا۔ اس نے ''دار الحکمت'' نامی عظیم ادارہ بنایا تھا۔ اس ادارے میں دنیا بھر کی علمی کتابوں کے ترجمے ہوتے تھے۔ اس خدمت پر مامور ایک عالم تھے ''عبداللہ بن محمد بن موسیٰ خوارزمی''۔ یہ خوارزم کے رہنے والے تھے۔ خوارزم سنتے ہی آپ کے ذہن میں جلال الدین خوارزم شاہ کا نام آیا ہوگا۔ یہ وہ حکمران تھا کہ پورا عالم اسلام وہ کام نہ کر سکا جو اس نے تن تنہا کر لیا، لیکن جغرافیہ کا علم نہ ہونے کے سبب ہمیں پتہ نہیں چلے گا یہ خوارزم ہے کدھر؟ سلطنت خوارزم تھی کہاں؟ اور وہ عرب اور عجم کے مسلمانوں کی حفاظت کا کیوں خواہشمند تھا؟ خوارزمی نے جغرافیہ سے ہٹ کر ایک کتاب لکھی تھی: ''المختصر فی حساب الجبر'' جبر کا معنی ہے: کسر، جمع کسور۔ ایک عدد کامل ہوتا ہے اور ایک مکسور۔ اس کتاب میں انہوں نے ریاضیاتی فارمولے دیے تھے جو ایک اختراعی کام تھا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کچھ علم ہیں جو مل جل کر چلتے ہیں۔ یہاں میں چار علوم کا اکٹھے نام لے سکتا ہوں: جغرافیہ اور تاریخ، ریاضی اور فلکیات۔ اب فلکیات کے لیے دو علم ضروری ہیں: ریاضی، جغرافیہ۔ یہ دونوں اس کے لیے بالکل ''صرف ونحو'' کی طرح ہیں، صرف اور نحو اگر کسی نے نہیں پڑھی ہے تو وہ قرآن وحدیث پڑھنے کی، سمجھنے کی کوشش کر سکتا ہے، لیکن کماحقہ سمجھ نہیں سکتا۔ ریاضی کسی نے اچھی طرح نہیں پڑھی ہے تو وہ ''میراث'' نہیں پڑھ سکتا، اسی طرح فلکیات نہیں سمجھ سکتا۔ فلکیات اچھی طرح سمجھنے کے لیے ریاضی کے ساتھ جغرافیہ بھی ضروری ہے۔ اب جب جغرافیہ پڑھیں گے تو محسوس کریں گے کہ بہت سی باتیں جن کا ہوائی تصور تھا، ان کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی تھی، وہ ان شاء اللہ اب سمجھ میں آجائیں گی۔ پھر ریاضی اور جغرافیہ ایک دوسرے سے استمداد کرنے والے فن ہیں۔ ایک کے جاننے سے دوسرے میں فائدہ ہوتا ہے، کیسے؟ مثلاً جغرافیہ پیمائش کا نام ہے؟ اب ریاضی آپ جانتے ہیں تو آپ پیمائش کر سکتے ہیں۔ کہ آپ کے شہر کے طول وعرض بلد سے، مکہ مکرمہ کا طول وعرض اور پھر قطب شمالی تک کا فاصلہ کتنا ہے؟ اس اصل پر پھر آگے سمتِ قبلہ اور اوقاتِ نماز کے قواعد نکلیں گے۔

الغرض! میں عرض کر رہا تھا کہ خوارزمی نے ریاضی میں مناسبت کی وجہ سے علم جغرافیہ میں کارنامہ انجام دیا کہ ''صورۃ الارض'' کے نام سے کتاب تصنیف کی۔

آج کل یہ بات اتنی اہم نہیں سمجھی جاتی۔ کہیں بھی چلے جاؤ تو نقشے مل جائیں گے۔ اس وقت اس فن کی بنیادیں بھی نہیں تھیں۔ اس کی بنیادیں مسلم محققین نے فراہم کی ہیں۔ اس میں شک نہیں انہوں نے یونان کے علماء سے استفادہ کیا، لیکن اس میں بھی شک نہیں انہوں نے استفادہ کرنے کے بعد اس فن کو واقعتاً چار چاند لگا دیے اور اصل واضعین کی طرف بھی نسبت کی۔ مسلمان محققین اور مغربی محققین میں فرق کیا ہے؟ مسلمانوں نے طب میں، جغرافیہ میں، فلسفہ میں، منطق میں یونان سے استفادہ کیا لیکن ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا۔ ہر جگہ وہ کہتے ہیں: یہ افلاطون کا نظریہ ہے، یہ بطلیموس کا نظریہ ہے، یہ فیثا غورث کا قاعدہ ہے، یہ جالینوس کا ہے۔ بوعلی سینا، ابونصر فارابی پر سارا منحصر نہیں کر دیتے، بلکہ یونان کے منطقیوں اور فلسفیوں کی طرف باقاعدہ نسبت کرتے ہیں اور مذہب کے اختلاف کے باوجود اُن کے علمی مقام کا پوری دیانتداری کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں۔

اس کے برعکس مغربی اقوام بہت کم ظرف ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتیں۔ وہ ان تحقیقات پر اپنا نام لگاتی ہیں اور مسلمانوں کی طرف نسبت تو ہونے ہی نہیں دیتی۔ غرض یہ کہ مسلمانوں نے یونانی علماء سے استفادہ تو کیا، لیکن ان کے کام کو بھی آگے بڑھایا اور اصل ماخذ کو بھی نہیں چھپایا۔ تو خوارزمی نے نقشہ سازی کے فن کی بنیاد ڈالی۔ طول اور عرض کے خطوط بھی انہوں نے وضع کیے۔ اِن خطوط کے بغیر کرۂ ارض پر کسی چیز کا محل وقوع متعین نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے پڑھا ہے یہ جو سطح ہوتی ہے یہ طول اور عرض دو ابعاد میں تقسیم کو قبول کرتی ہے۔ جب تک دو بُعد معلوم نہیں ہوں گے، اُس وقت تک کسی سطح پر کسی چیز کے محل وقوع کا صحیح تعین نہیں ہوسکتا۔ ان خطوط کی تعیین سب سے پہلے خوارزمی نے کی تھی۔ انہوں نے اس گول اور بے علامت کرّے (یعنی زمین) پر ہر مقام کی صحیح صحیح تعیین کے لیے یہ طریقہ ایجاد کیا۔

تیسرا سبق

سیاسی اور تاریخی جغرافیہ

زمین کے دو بڑے حصے ہیں "بر" اور "بحر"۔ ان کو کرۂ خاکی اور کرۂ آبی بھی کہتے ہیں۔ بر کو سات بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس طرح سات "براعظم" ہو جاتے ہیں۔ بحر کو پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا اِس طرح پانچ "بحر اعظم" ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں میں پھر کچھ تو طبعی اور قدرتی تقسیمات ہیں۔ مثلاً: بحر میں (یا کرۂ آبی میں) کہیں جھیلیں ہیں، کہیں دریا ہیں۔ کہیں بحیرے ہیں۔ بر میں برصغیر ہیں، جزیرے ہیں۔ جزیرہ نما ہیں اور کچھ سیاسی تقسیمات ہیں جو انسانوں نے اپنے اقتدار کی حدود متعین کرنے کے لیے قائم کی ہیں۔ پہلی تقسیم کو "طبعی" اور دوسری کو "سیاسی جغرافیہ" کہتے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ سیاسی اور تاریخی جغرافیہ صحیح طریقے سے ذہن نشین ہو جائے تاکہ قرآنی جغرافیہ جو اصل مقصود ہے سمجھنا آسان ہو جائے۔

طبعی جغرافیہ نام ہے زمین کی سطح پر موجود مختلف مظاہر قدرت کو سمجھنا اور سیاسی جغرافیہ اس چیز کا نام ہے کہ دنیا میں جو مختلف حکومتیں اور سلطنتیں ہیں، منتشر قوتوں نے اپنا اپنا اقتدار قائم کیا ہوا ہے، اس کی حدود کیا ہیں؟ یہ دو اقسام بہت اہم ہیں۔ اس کے بعد تیسری قسم تاریخی جغرافیہ ہے۔ سیاست اور تاریخ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے بعد ہم قرآنی جغرافیہ کی طرف جائیں گے۔ سیاسی جغرافیہ کو یاد رکھنے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ اگر اسے اپنا لیا جائے تو دنیا کے بڑے بڑے جو قابل ذکر ممالک ہیں، کسی درجہ میں اہمیت رکھتے ہیں، ان کا محل وقوع، ان کی ایک دوسرے سے سمت، جہت اور فاصلہ وغیرہ آسانی سے ذہن نشین ہو جائے گا۔ جب کوئی بات کرے گا کہ مشرق بعید کی سیاست میں آج کل یہ رجحان پایا جا رہا ہے یا مشرق وسطی میں عالمی استعمار کا مفاد آج کل اس پالیسی میں ہے تو آپ کو فوراً سمجھ میں آجائے گا یہ مشرق بعید کیا بلا ہے؟ مشرق وسطی کہاں پایا جاتا ہے؟ اس کی کیا اہمیت ہے؟

سیاسی جغرافیہ یاد رکھنے کے طریقے:

سیاسی جغرافیہ یاد رکھنے کے سات بڑے بڑے طریقے ہیں۔ اتنے سارے ممالک کے نام اور محل وقوع کو آسانی سے ذہن نشین نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان طریقوں کے ذریعے یاد کرنے سے زمین کے اہم ممالک کا محل وقوع وغیرہ یاد ہو جاتا ہے۔

پہلا طریقہ یہ ہے آپ مختلف براعظموں کو ایک ایک کر کے لے لیں۔ ان براعظموں کے بڑے ہونے کی وجہ سے ان کی الگ الگ جہات میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اس کا ذکر خبروں اور بیانات میں آتا رہتا ہے۔ وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا یہ کیا چیز ہے؟ یہ ایک ہی براعظم کے بڑے ہونے کی وجہ سے اس کی مختلف جہتوں میں تقسیم ہے۔ ان جہات کو اور ان جہات میں پائے جانے والے مشہور ممالک کو سمجھ لیں تو بات کافی حد تک واضح ہو جائے گی۔

مثلاً امریکا کو لے لیجیے۔ یہ دو براعظم ہیں۔ شمالی امریکا اور جنوبی امریکا۔ ان کے بیچ میں وسطی امریکا بھی ہے۔ اب یہ براعظم امریکا کی ایک تقسیم ہو گئی: شمالی، جنوبی۔ وسطی، شمالی کے چند اہم ممالک۔ جنوبی کے چند اہم ممالک اور وسطی کے چند اہم ممالک۔ انہیں پڑھ لیں تو کافی حد تک ان تمام براعظموں سے تعارف

ہو جاتا ہے۔ افریقہ میں آ جائیں۔ اس کی مشہور تقسیم ہے۔ کہا جاتا ہے شمالی افریقہ کی پٹی۔ لفظ استعمال کیا جاتا ہے ''پٹی''۔ کیونکہ اس پٹی میں پانچ ممالک ہیں۔ جو ہیں تو افریقہ کے، لیکن عرب افریقن ہو گئے۔ عرب کی حدود میں آتے ہی نہیں، لیکن ان کی زبان عرب ہے۔ مذہب عرب والا ہے۔ ثقافت عرب والی ہے۔
وسطی افریقہ بذات خود ایک ملک کا نام بھی ہے۔ اور ان چند ممالک کو بھی کہتے ہیں جو افریقہ کے وسط میں واقع ہیں۔ اسی طرح جنوبی افریقہ ایک ملک کا نام بھی ہے۔ اور ان پانچ ممالک کو بھی کہتے ہیں جو افریقہ کی جنوبی سمت میں واقع ہیں، علی ہذا القیاس مشرقی اور مغربی افریقہ۔ الغرض ہر برّ اعظم کو جغرافیہ دانوں نے مختلف جہات میں تقسیم کر کے آسانی پیدا کر لی ہے۔

پہلا طریقہ براعظموں کی مختلف جہات میں تقسیم ہے۔ ان جہات میں تقسیم شدہ ممالک میں سے مشہور مشہور چند ممالک کو اگر ہم ذہن نشین کر لیں تو بہت آسانی سے دنیا کے سیاسی جغرافیے سے واقف ہو جائیں گے۔ مثلاً اگر میں آپ کو کہوں کہ دنیا کے دو متقابل کناروں میں واقع آٹھ ممالک کا نام یاد کر لیں تو آپ کو مشکل ہوگی، لیکن میں آپ سے کہوں بھئی، دیکھو! یہ مشرق بعید میں چار اہم ممالک ہیں: چین۔ جاپان۔ کوریا، تائیوان اور مغرب اقصی کا اطلاق ان چار ممالک پر ہوتا ہے: مراکش، موریطانیہ، سینیگال۔ گمبیا۔ ان آٹھ ممالک کا محل وقوع آپ کو نقشے پر بھی دکھا دیا جائے تو سارے ممالک خود بخود آپ کو ذہن نشین ہو جائیں گے۔

پہلا طریقہ تھا: براعظموں کی مختلف جہات میں تقسیم اور اس میں پائے جانے والے اہم ممالک کو سمجھنا۔ دوسرا طریقہ ہے: دنیا میں تقریباً دس کے قریب ممالک ایسے ہیں جن کی مختلف فرضی شکلیں ہیں۔ یہ فرضی شکلیں حقیقی فائدہ دیتی ہیں کہ ان دس ممالک کے نام بغیر خاص کوشش کے فوراً یاد ہو جاتے ہیں۔
تیسرا طریقہ ہے جغرافیائی اشتراکات کو سمجھنا۔ دنیا میں چند جغرافیائی اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ یعنی چند ممالک کا مجموعہ ہوتا ہے جس کو ایک نام دیا گیا ہوتا ہے۔ جیسے سکینڈے نیوین۔ کیریبین۔ ویسٹ انڈیز۔ ہند چینی۔ ان جغرافیائی اشتراکات کو آپ نے یاد کر لیا اور ان کے اندر موجود ممالک کو ذہن نشین کر لیا تو بہت سارے ممالک آسانی سے یاد ہو جائیں گے۔
چوتھا طریقہ ''لاک لینڈ ممالک'' کا ہے۔ کچھ ممالک اتنے چھوٹے چھوٹے ہیں کہ وہ دوسرے ملک کے اندر پائے جاتے ہیں۔ کہیں ایک ملک ہے، اس کے اندر دوسرا ملک پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں تو بین الاقوامی استعمار کی سیاست نے ایسی صورتِ حال پیدا کی ہے کہ اگر ان ٹکڑوں کو الگ نہ کیا جاتا تو استعماری مقاصد کے حصول میں مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ کہیں قبائلی اور نسلی بنیاد پر ایسا ہوا ہے۔ کہیں مذہبی بنیاد پر اور کہیں قدرتی طور پر ایسا ہوا ہے کہ آس پاس پورا ایک ملک اور بیچ میں چھوٹا سا ٹکڑا کسی اور ملک کا۔ یہ چار طریقے ہو گئے ہیں۔ یادداشت پختہ کرنے کے لیے ان کو ایک مرتبہ دہرا لیتے ہیں۔
پہلا براعظموں کی جہات اور ان میں پائے جانے والے اہم ممالک۔ دوسرا طریقہ جغرافیائی اشتراکات ہیں۔ چند ممالک میں مشترک قدریں پائی جاتی ہیں۔ اس بنا پر ان کو ایک نام دے دیا جاتا ہے۔ کبھی ان کی اپنی یونین اور تنظیم بھی ہوتی ہے جیسے ''مشرقی افریقا کی انجمن'' ملاوی زمبیا اور زمبابوے پر مشتمل ہے۔ اور تیسرا طریقہ کہ دس کے قریب ممالک مختلف فرضی شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ کہیں ہاتھی کی سونڈ۔ کہیں ریڑھ کی ہڈی ہے، کہیں خرگوش کے کان ہیں۔ اللہ جل جلالہ کی شان ہے۔ ممالک کو یاد کرنے کا چوتھا طریقہ ''قفل بند'' محصور ممالک ہیں۔ کچھ ممالک ایسے ہیں جو دوسرے ملک کے اندر ہیں۔ یہ چند طریقے ہیں۔
جب یہ مکمل ہو جائیں گے تو ہم قرآنی جغرافیہ کی طرف آسانی سے جا سکیں گے۔ اب ہم پہلا طریقہ باقاعدہ طور پر شروع کرتے ہیں۔

براعظموں کے بڑے حجم کی وجہ سے ان کی چار مختلف جہات تو ہوتی ہی ہیں، مثلاً: شمالی و جنوبی افریقہ۔ مشرقی و مغربی افریقہ۔ کبھی ان چار جہات کے علاوہ بھی نام رکھتے ہیں جیسے وسطی ایشیا، وسطی افریقہ۔ جنوب مشرقی ایشیا وغیرہ۔ مثلاً: یہ تین براعظم ہیں: ایشیا، افریقہ، یورپ۔ ان کی کچھ مشترکہ جہات ہیں۔ آیئے ان کو دیکھتے ہیں۔ ان تین براعظموں کے بیچ میں ایک بڑا انسانی دل نما ٹکڑا ہے۔ یہ جزیرۃ العرب ہے۔ ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔'' [البقرۃ:143] یہ آیت

اب آپ کو سمجھ میں آ گئی ہوگی "امۃ وسطا" محض معنوی طور پر نہیں ہے کہ اس میں معنوی اعتدال پایا جاتا ہے۔ شریعت موسوی کے احکام میں جلال الٰہی غالب تھا اور شریعت عیسوی میں جمال الٰہی غالب تھا اور شریعتِ محمدی میں جمال اور جلال کا امتزاج اور اعتدال ہے۔ "امۃ وسطا" کا صرف یہی معنی نہیں ہے، بلکہ "امۃ وسطا" کی ایک تاویل یہ بھی ہے کہ جتنی معلوم دنیا آج سے پانچ سو سال پہلے تک تھی، یعنی کرۂ ارض کا حصۂ معمورہ کہ جہاں بڑی بڑی انسانی بستیاں اور تہذیبیں آباد تھیں، وہ ان تین بڑے براعظموں پر مشتمل تھا اور ان تین براعظموں کے بالکل وسط میں قلب انسانی ہے۔ انسان کے دل کے مشابہ زمینی ٹکڑا ہے۔ یہ جزیرہ نما ہے۔ یعنی تین طرف پانی ہے اور ایک طرف خشکی میں معلق ہے۔ جیسے انسانی دل معلق ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی معلق ہے۔ وحی دل پر نازل ہوتی ہے "امت وسط" جو وحی کی معتدل تعلیمات کی حامل ہے، وہ بھی یہیں پر پائی جاتی ہے۔ اسی دل کی دوسری مثال ہے "صحرائے سینا"۔ یہ بھی چھوٹے سے انسانی دل کی طرح ہے۔ یہاں بھی وحی کلامی نازل ہوئی تھی۔ جب ہم "دل کی طرح" کہتے ہیں اور جب ہم فرضی شکل کا لفظ کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہی یہی ہے یہ بات صرف سمجھنے کے لیے ہے۔ جیسے ہم کہہ دیتے ہیں آسمان پر بارہ بروج ہیں۔ کوئی "حوت" ہے، کوئی "سنبلہ" ہے۔ کوئی "دلو" ہے، کوئی "قوس" ہے۔ یہ سب فرضی نام اور شکلیں ہیں۔ آسانی کے لیے ان کو حقیقی چیزوں کے نام دے دیے گئے ہیں۔ اسی طرح زمین پر بھی خشکی کے ایک ٹکڑے (جزیرۃ العرب) کے بارے میں آسانی کے لیے کہہ دیا گیا۔ یہ بڑا دل ہے، کیونکہ اس میں وحی دائمی نازل ہوئی ہے۔ دوسرے ٹکڑے کے بارے میں کہہ دیا گیا یہ چھوٹا سا دل ہے صحرائے سینا، کیونکہ اس کے وسط میں کوہ طور ہے اور اس میں سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا گیا ہے۔ قدیم تاریخ سے کچھ اصطلاحات مشہور چلی آ رہی ہیں۔ جن کا تعلق ان تین براعظموں اور ان کی مشترکہ جہات سے ہے یعنی یہ جو تین براعظم ہیں ان کو ملا کر گویا پوری معلوم دنیا کی چند جہات مشہور تھیں، مثلاً مشرقِ بعید۔ پوری دنیا کا آخری مشرقی کنارہ۔ مغربِ اقصیٰ، دنیا کا آخری مغربی کنارہ۔ مشرقِ وسطیٰ، تینوں براعظموں کے نکتۂ ملاپ پر واقع حصہ۔ اس وقت کی دنیا میں یہ تین براعظم تھے۔

امریکا اور جنوبی امریکا دریافت نہیں ہوئے تھے۔ یہ تو آج سے 518 سال پہلے 1292ء میں دریافت ہوئے ہیں۔ آسٹریلیا تو ابھی 1728ء میں 283 سال پہلے دریافت ہوا ہے۔ یہاں امریکا کے جنگلی قبائل سے زیادہ پسماندہ وحشی اور جنگلی قسم کے لوگ تھے جن کو یہ یورپین لوگ "ایب اور جینز" کہتے تھے۔ ان تینوں براعظموں سے دنیا چند سو سال پہلے واقف ہوئی ہے اور انسانی تاریخ میں چند صدیاں کوئی خاص عمر نہیں رکھتیں۔ ساتویں براعظم قطب جنوبی پر آبادی نہیں ہے۔ اس سے پہلے تین ہی براعظم تھے۔ ان کے سنگم پر مشرقِ وسطیٰ یا جزیرۃ العرب تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج سے پانچ سو سال پہلے تک بڑی بڑی اور اہم انسانی تہذیبیں سرزمینِ عرب اور اس کے اردگرد پروان چڑھیں۔ ان تین براعظموں کے مشترکہ ٹکڑے کو ملا کر دیکھا جائے تو دائیں طرف سب سے آخر میں ان تینوں کا مشرقی کنارہ ہے۔ اس کو کہتے تھے: "مشرق بعید"۔ بائیں طرف سب سے آخر میں مغربی کنارہ ہے، اس کو کہتے تھے: "مغربِ اقصیٰ"۔ بیچ میں واقع ارضِ عرب کو کہا جاتا ہے: "مشرقِ وسطیٰ"۔ اللہ تعالیٰ کی شان "وسط" کا لفظ "امۃ وسط" کے مسکن کے ساتھ خود ہی لگا ہوا ہے اور زبان زدِ عام ہے۔ مشرقِ بعید میں چار بڑے بڑے ممالک کون سے ہیں؟ سب سے بڑا ملک چین ہے۔ اس کے بعد جاپان، کوریا، تائیوان۔ بس چار ممالک یاد کر لو۔ چین، جاپان، کوریا اور تائیوان۔ کوریا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اوپر والا شمالی کوریا اور نیچے والا جنوبی کوریا کہلاتا ہے۔ جیسے افریقہ یا امریکا میں ہم جائیں گے تو شمالی افریقہ، امریکا اور جنوبی افریقہ، امریکا۔ تو خود بخود شمالی اوپر والا، جنوبی نیچے والا۔ یہ چار ممالک سمجھ میں آ گئے۔ یہ چار بڑے ممالک ہیں جن کی مصنوعات دنیا بھر میں جاتی ہیں۔ ان کا تذکرہ صنعت کے حوالے سے ہوتا رہتا ہے۔ ان کی دنیا تجارت پر قائم ہے۔ تو یہ دنیا کی پہلی جہت مکمل ہو گئی یعنی "مشرقِ بعید"۔

دوسری جہت مغربِ اقصیٰ ہے۔ یہ تین براعظموں (ایشیا، افریقہ، یورپ) کے مشترکہ خطے کا آخری مغربی کنارہ ہے۔ جو بحر اوقیانوس کے کنارے واقع ہے۔ اس کے بعد سمندر ہی سمندر ہے۔ اس میں مراکش، موریطانیہ، مغربی صحرا اور سینیگال نامی چار ملک آتے ہیں۔ تیسری جہت مشرقِ وسطیٰ ہے۔ اس میں جزیرۃ العرب کے بارہ ممالک آتے ہیں جن کا تفصیلی تعارف آگے آئے گا۔ ان میں تین عالمی جہتوں سے فارغ ہو کر ہم ایشیا کی مختلف جہات کا مطالعہ شروع

کرتے ہیں۔
فلپائن کے بعد جاپان میں بھی اسلام پہنچ گیا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ والوں نے ان کے لیے بحری جہاز پر مبلغین روانہ کیے تھے۔ واپسی میں مبلغین، نومسلم مقامی افراد اور جاپان کے بادشاہ کا وفد آرہا تھا کہ اس خطرناک سمندر، بحرالکاہل میں ڈوب گیا۔ اس میں زلزلے آتے ہیں، آتش فشاں پھوٹتے ہیں۔ اس بحرالکاہل میں آگے جاکر ایک ''شیطانی سمندر'' نامی خطہ ہے۔ یہ بھی بہت خطرناک ہے۔ اس زمانے میں ہم نے اسلام کا حق ادا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو نہ کھڑا کردے۔ "وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم." [محمد:38] وہ قوم کونسی ہوسکتی ہے؟ ماضی قریب میں پوری دنیا پر جن دو قوموں نے قبضے کی کوششیں کی اور جن کی باہمی جنگ رہی۔ یہ دونوں دنیا کے کناروں پر ہیں۔ اِدھر مشرق میں جاپان ہے تو دوسرے کنارے پر بحر شمال میں انگلینڈ ہے۔ دونوں چھوٹے ملک ہیں۔ آبادی بھی اتنی زیادہ نہیں۔ دونوں جزیرے کی شکل میں ہیں۔ انگلینڈ خرگوش نما ملک خود تین حصوں میں بٹا ہوا ہے: انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور شمالی آئرلینڈ۔ چوتھا حصہ ویلز کہلاتا ہے۔ ان میں سے صرف ''انگلینڈ'' نے آدھی دنیا پر حکمرانی کی ہے۔ دنیا میں عربی گھوڑے کا اگر کوئی مقابلہ کرتا ہے تو یہ انگلش گھوڑا ہے۔ اس کا مطلب ہے قدرت نے بھی یہاں کچھ رکھا ہے۔ اُدھر دوسری طرف جاپان ہے۔ دنیا پر اس کی صنعتی حکمرانی تو مسلم ہے۔ یہ جنگِ عظیم دوم میں ایشیا کو فتح کرتے کرتے برما تک آگیا تھا۔ آگے بنگلہ دیش رہ گیا تھا کہ جاپان کو شکست ہوگئی، ورنہ آج ہندوستان پر جاپانیوں کی حکومت ہوتی۔

"وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ، ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم." [محمد:38] اگر ہم یوں ہی اسلام کے رستے میں رکاوٹ بنتے رہے تو معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کس کو کھڑا کرتا ہے جو اسلام کو تاتاریوں کی طرح مضبوط کرے گا۔ تاتاریوں نے پہلے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا۔ پھر جب ایک اللہ والے کی کوشش سے ایک تاتاری شہزادہ مسلمان ہوگیا تو اس قوم نے علم میں بھی، جہاد میں بھی اور فتوحات میں بھی اسلام کی بہت خدمت کی ہے۔ جب مسلمانوں نے کوتاہی شروع کی تو انہوں نے مسلمانوں کو مغلوب کرلیا، پھر آخر میں خود اسلام کے ہاتھوں مفتوح ہوگئے۔ آج کے دور میں بھی مسلمان کچھ نہیں کر رہے، اپنی بداعمالی سے دنیا والوں کو اسلام قبول نہیں کرنے دے رہے۔ اگر ہمارا طرزِ عمل یہی رہا تو اللہ تعالیٰ کسی اور کو اسلام کے غلبے کے لیے کھڑا کردے گا۔ ﴿وإن تتولوا﴾ اگر تم الٹے پاؤں پھر گئے تو ﴿یستبدل قوماً غیرکم﴾ اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔ خدا جانے وہ کون ہوگا؟ روس یا جرمنی؟ جاپان یا انگلینڈ! واللہ اعلم بالصواب۔

چوتھا سبق

وسطی ایشیا

آج کے سبق میں ہمارا موضوع وسطی ایشیا کا تعارف ہے۔ وسطی ایشیا میں پانچ اور چار، نو ممالک آتے ہیں۔ ہم نے نو نہیں کہا، پانچ اور چار ''نو'' کہا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے قرآن پاک میں: ''ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۔'' [الکہف:25] یعنی تین سو اور نو سال کہا گیا ہے۔ تین سو نو سال نہیں کہا گیا۔ اس میں نکتہ ہے کہ تین سو سال باعتبارِ قمری سال اور تین سو نو سال باعتبارِ شمسی سال کے بنتے ہیں۔ وسطی ایشیا کے نو ممالک کو دو الگ الگ کیٹگری میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پانچ ایک میں آتے ہیں اور چار دوسری میں۔ اس لیے ہم نے پانچ اور چار نو کہا۔ براہِ راست نو نہیں کہا۔ ان چار میں ایک ملک آپ کو نقشوں میں نہیں ملے گا۔ عالمی طاغوت کے مقاصد میں اگر کسی شہر یا ملک کا نام تبدیل کرنا ہو تو فوراً تمام نقشوں میں بدل دیا جاتا ہے۔ آپ کو نظر نہیں آئے گا کہ ''القدس اور فلسطین'' بھی کہیں نقشوں میں ہیں۔ اگر کسی کو غائب کرنا اُن کے مفادات میں ہو تو نقشے پر اسے بالاتفاق سرے ہی سے غائب کر دیا جاتا ہے۔ وہ ریاستیں جنہیں ''قفقاز'' کی ریاستیں کہا جاتا ہے، یہ چار تھیں۔ ایک کا نام اب نقشوں میں ملتا ہی نہیں ہے، کیونکہ دنیا کے بڑے طاغوتوں میں سے ایک کی خواہش ہے کہ وہ ملک دنیا کے نقشے پر خود مختار حیثیت سے نہ رہے۔ میرے ہی قبضے میں رہے۔ وہ ملک ہے ''چیچنیا''۔

اب ہم پہلے پانچ کو بیان کرتے ہیں۔ اس سے پہلے یہ سمجھیں کہ فارسی زبان میں ''ستان'' کا لاحقہ جب کسی لفظ کے ساتھ لگا دیا جائے تو یہ ظرف مکان اور کثرت کا فائدہ دیتا ہے، مثلاً: برف اور ریت کے ساتھ اگر آپ ''ستان'' کا لفظ لگا کر برفستان اور ریگستان کہیں تو اس کا مطلب ہوگا: وہ جگہ جہاں بہت سی برف اور بہت ساری ریت ہو۔ اسی طرح ''زار'' کا لفظ بھی یہی ''ستان'' والا معنی دیتا ہے۔ گلزار، لالہ زار وغیرہ۔ گل اور بو کے ساتھ ''ستان'' لگانے کا مقصد بھی ظرف مکان اور کثرت کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، جیسے: گلستان، بوستان۔

وسطی ایشیا میں پانچ قومیں رہتی تھیں۔ ان قوموں کے ناموں کے ساتھ ''ستان'' کا لفظ ہوتا ہے۔ یہ لفظ انگلش کے لفظ ''لینڈ'' کا معنی دیتا ہے۔ انگلستان اور انگلینڈ، آئرستان اور آئرلینڈ کا ایک ہی مطلب ہے یعنی انگلش اور آئرش قوموں کا مسکن اور گھر۔ چنانچہ اس خطے میں پہلی قوم ہے ''قازق''۔ دوسری ''کرغیز'' ہے۔ دیگر تین قومیں افغانستان کے مقابل واقع ہیں۔ بیچ میں دریائے آمو یعنی ''جیحون'' واقع ہے۔ اس دریائے آمو کے نیچے افغان قوم رہتی ہے، اس لیے اسے افغانستان کہا جاتا ہے۔ تین قومیں دریا کے پار رہتی ہیں: تاجک، ازبک اور ترکمن۔ ان کے وطن کو تاجکستان، ازبکستان اور ترکمانستان کہتے ہیں۔ پہلی دو کے ساتھ مل کر یہ پانچ قومیں ہوگئیں۔ قازق، کرغیز، تاجک، ازبک اور ترکمن۔ ان قوموں کے ساتھ ''ستان'' کا لفظ استعمال کریں گے تو ملک وجود میں آجائے گا مثلاً قازقستان۔ یعنی قازق قوم کا گھر یا ملک۔ یہ ان ممالک میں سب سے بڑا ہے۔ اس کے ساتھ کرغیزستان یا کرغیزیا ہے۔ بقیہ تین افغانستان کے بالمقابل ہیں: تاجکستان، ازبکستان اور ترکمانستان۔ یہ پانچ ممالک بحیرۂ کیسپین کے مشرقی جانب واقع ہیں۔ بحیرۂ کیسپین دنیا کی سب سے بڑی کھاری جھیل ہے۔ اس

لیے اسے بحیرہ یعنی چھوٹا سمندر بھی کہہ دیتے ہیں۔ بحیرۂ کیاسپین کی مغربی جانب ''قفقاز'' کی چار ریاستیں ہیں۔ ان چار ریاستوں میں سے ایک چیچنیا آپ کو نقشے نظر نہیں آرہی۔ اسے نقشے سے اس لیے غائب کر دیا گیا کہ اگر آئندہ آنے والی نسل میں سے کسی کے دل میں یہ خیال آجائے کہ گیند، بلا کھیلنے کے علاوہ بھی دنیا میں کوئی کام ہے، تو اس کا ذہن اس طرف نہ جاسکے اور وہ دشمن کے ساتھ حال احوال کرنے کی کوشش نہ کرے۔

سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد جو ملک سب سے بابرکت ٹھہرا، وہ یہ درمیان والا ''ازبکستان'' ہے۔ اس میں بخارا اور ترمذ بھی ہیں اور تاشقند و سمرقند بھی ہیں۔ یہ چار مشہور شہر اسی ملک کے حصے میں آئے ہیں۔ اگر کسی کو اپنے اکابر کے آثار کی زیارت کا شوق ہے یا کوئی وسطِ ایشیا کے اسلامی آثارِ قدیمہ دیکھنا چاہتا ہے، اور وہ اس ملک کے ان چار مقامات کی زیارت کر لیتا ہے تو اس کے لیے کافی ہے۔

جو علاقے افغانستان کی شمالی سرحد پر دریائے آمو کے ساتھ واقع ہیں، ان میں ان تین اقوام کے آثار زیادہ ہیں۔ مثلاً احمد شاہ مسعود کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا تاجک تھا۔ شمالی اتحاد والے اکثر تاجک قوم سے تعلق رکھتے تھے، جبکہ مزار شریف کی طرف جو رہتے تھے یعنی دوستم والے یہ ازبک تھے۔ یعنی نسلی اعتبار سے ازبک اور سیاسی اعتبار سے افغانستان کے باشندے۔ عبدالمالک پہلوان وغیرہ ترکمن تھے۔ اافغانستان کی شمالی سرحد پر یہ تین قومیں آباد ہیں۔ اگرچہ وہ افغانستان کی حدود میں رہنے کی وجہ سے افغان شمار ہوتی ہیں۔

قفقاز کی ریاستوں کو جغرافیائی اشتراک کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہے۔ جب میں نے جغرافیہ پڑھا اور یاد کیا تھا، ان ممالک میں ''انگشتیا'' بھی تھا۔ نقشوں میں وہ اب کہیں نظر نہیں آتا۔ میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کر رہا تو میں آپ کو بتاؤں گا کہ وہ ملک کہاں تھا اور اب کیوں نظر نہیں آرہا؟ قفقاز کی ریاستوں میں اوپر سے نیچے بالترتیب پہلے چیچنیا ہے، دوسری جارجیا ہے، اس کے بعد آرمینیا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین دورِ فاروقی میں یہاں آرمینیا میں پہنچ گئے تھے۔ بہت سے صحابہ کرام اور تابعین آرمینیا کے جہاد میں شہید ہوئے ہیں۔ اس کے بعد آذر بائیجان ہے۔

میں جس پانچویں ریاست کے بارے میں کہہ رہا ہوں وہ ریاست انگشتیا نامی تھی۔ کچھ ممالک کلاً یا جزواً دوسرے ممالک کے اندر واقع ہیں، ان کو ''قفل بند'' (لاک لینڈ) ممالک کہا جاتا ہے۔ آذر بائیجان کا ایک ٹکڑا آرمینیا کے پار واقع ہے۔ شاید یہی ٹکڑا انگشتیا تھا۔ موجودہ نقشوں میں اس ٹکڑے کو آذر بائیجان دکھایا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ وسطی ایشیا کے ممالک میں جو نو ممالک ہیں، ان میں سے پانچ ممالک بحیرۂ کیاسپین کے شرقی جانب واقع ہیں۔ یہ پانچ قوموں کے گھر ہیں۔ چار بحیرۂ کیاسپین کے مغربی جانب واقع ہیں۔ یہ قفقاز کی ریاستیں ہیں۔ چیچنیا کا صدر مقام گروزنی ہے۔ روس جو کسی زمانے میں سوویت یونین کہلاتا تھا، اس نے پندرہ ریاستیں ہڑپ کر رکھی تھیں۔ سولہواں افغانستان تھا، جو اگر ہتھیار ڈال دیتا تو اس وقت دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ دیگر سترہ ممالک افغانستان سے بڑے تھے۔ زیادہ آبادی رکھتے تھے۔ دولت کی فراوانی تھی۔ بے شمار وسائل رکھتے تھے۔ لیکن سرخ ریچھ کے سامنے ڈھے گئے۔ روس کی یلغار کے سامنے ڈھیر ہوگئے۔ افغانستان ڈٹ گیا۔ اس نے ان پندرہ ممالک کو بھی آزاد کروالیا۔ ان میں سے نو کا نام ابھی آپ نے سنا۔

وسطی ایشیا کے بیچ میں ایک بڑا دریا بہتا ہے ''دریائے آمو''۔ اس کے نچلی طرف جنوب میں افغانستان ہے اور اوپر والی طرف شمال میں واقع علاقے کو ''ماوراء النہر'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے مشرقی جانب چین ہے۔ چین تک پہنچنے کے لیے ''حجاج بن مسلم'' نے ''قتیبہ بن مسلم باہلی'' کی سرکردگی میں ایک جماعت بھیجی اور کہا کہ تم وسطی ایشیا کے راستے سے چین کی طرف چلنا شروع کرو۔ دوسری جماعت بھیجی ''محمد بن قاسم'' کی سرکردگی میں کہ تم ہندوستان کے راستے سے چلو اور ہندوستان کو فتح کرنا شروع کرو۔ دونوں کا ہدف اور آخری منزل چین تھی۔ حجاج نے اعلان کیا: ''الصِّيْنُ لِمَنْ سَبَقَ مِنْكُمَا اِلَيْهِ'' جو پہلے چین پہنچے گا چین کی قیادت اور وہاں نفاذِ اسلام کی بنیاد رکھنے کا اعزاز اسی کو ملے گا۔ اتنا اولوالعزم تھا کہ ممالک فتح کروانے کے لیے کمانڈروں میں مقابلے کرواتا تھا۔ اس مقابلہ کروانے کا مقصد گویا یہ ہوا کہ پورا ایشیا فتح کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ عراق، آرمینیا، اور آذر بائیجان وغیرہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں ہی

فتح ہو چکے تھے۔ بحیرۂ کیاسپین کا مغربی حصہ فتح ہو چکا تھا۔ ایشیا میں عرب کے بعد فارس، ہند اور چین بڑے علاقے شمار ہوتے تھے۔ مسلمان فاتحین جب وسطی ایشیا پہنچے تو دریائے آمو کی وجہ سے ایک طبعی جغرافیائی تقسیم کا مشاہدہ کیا۔ نہر کا اِدھر کا علاقہ اور نہر کا اُدھر کا علاقہ۔ نہر کے اِدھر افغانستان ہے۔ اس میں بلخ کے علماء بڑے مشہور تھے۔ نہر کے اُس پار ''ماوراء النہر'' اور وسطی ایشیا کے ممالک تھے۔ کہا جاتا تھا: یہ ماوراء النہر کے علماء کا قول ہے۔ ماوراء النہر یعنی وسطی ایشیا میں نو ممالک ہیں۔

پہلے ہم نے ذکر کیا کہ حجاج بن یوسف کے بھیجے ہوئے لشکروں کا رخ چین کی طرف تھا۔ ایک لشکر بحری راستے سے چلا تھا، دوسرا خشکی کے راستے سے روانہ ہوا تھا۔ تاریخی طور پر ثابت ہے مسلمان مغربی چین جا پہنچے تھے۔ اس حصے کا نام ہے ''سنکیانگ''۔ یہ ایک پورا صوبہ ہے۔ اس کا مشہور علاقہ ''کاشغر'' ہے۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر۔ علامہ اقبال کے مشہور شعر میں اسی مسلم علاقے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مسلمان یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد ولید بن عبدالملک کا انتقال ہوا۔ اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک آیا۔ اس وقت ولید کے دو کمانڈر تھے۔ ایک مشرق میں فتوحات کر رہا تھا یعنی ''محمد بن قاسم''۔ دوسرا مغرب میں تھا ''طارق بن زیاد''۔ سلیمان بن عبدالملک نے دونوں کو بلا لیا۔ اس کا بڑا نقصان ہوا۔ ''لَو'' کا استعمال ''رضا بالقضا'' کے ساتھ ہو تو جائز ہوتا ہے ورنہ شیطان کا دروازہ کھولتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ذاتیات میں پڑ کر اجتماعی مفاد کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ اس سے بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ سلیمان بن عبدالملک کو اُس وقت خبر نہیں تھی کہ میں ان دو کمانڈروں کو واپس بلا کر کتنا بڑا اجتماعی نقصان کر رہا ہوں؟ یہ علاقے کفر و شرک کے اندھیرے میں پڑے رہیں گے۔ ہمارے پورے خطے کے غیر مسلم ممالک میں جتنے مسلمان مظلومانہ مارے جاتے ہیں۔ جتنی عورتوں کی عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کسی درجے میں اس میں سلیمان بن عبدالملک کا دخل ہے۔ (اللہ اس سے درگزر فرمائیں) اس نے مشن ادھورا چھوڑ کر ان کمانڈروں کو واپس کیوں بلوایا تھا؟

خراسان کا مصداق:

اب ذرا ''خراسان'' کو سمجھیے کہ اس قدیم اصطلاح کا جدید مصداق کیا ہے؟ آمو کے اوپر کا علاقہ ''ماوراء النہر'' اور وسطی ایشیا ہے۔ آمو کے نیچے خراسان ہے۔ دریائے آمو سے لے کر دریائے کابل تک، ان دو دریاؤں کے بیچ کا علاقہ خراسان ہے۔ جغرافیائی اصطلاح کے حوالے سے یہ ''مابین النہرین'' ہے۔ یعنی دو دریاؤں کے درمیان کی سرزمین۔ سیاسی تقسیم میں یہ کچھ افغانستان میں اور کچھ پاکستان کے ساتھ شامل ہو گیا ہے اور کچھ حصہ ایران کا ہے ''نیشاپور'' تک۔ اغلب واکثر کا اعتبار کرتے ہوئے خراسان اور افغانستان مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، لیکن حقیقی حدود میں اس میں پاکستان میں سے ''اٹک'' تک اور ایران میں سے نیشاپور تک کا علاقہ شامل ہے۔

آمو کا نام ''جیحون'' ہے۔ اس کے اوپر دوسرا دریا ہے سیحون۔ یہ دونوں وسطی ایشیا کے مشہور جڑواں دریا ہیں۔ ان کے بیچ کے علاقوں نے اسلامی تاریخ کا سنہری دور دیکھا ہے۔ موجودہ سیاسی جغرافیہ کے اعتبار سے اس زمانے کے قدیم اہم اسلامی شہر موجودہ ازبکستان کے اندر آ جاتے ہیں۔ جب روس ٹوٹا ہے اور علاقوں کی تقسیم ہوئی ہے تو سب سے زیادہ بابرکت یہ ازبکستان رہا ہے۔ بخارا و ترمذ اور سمرقند و تاشقند چاروں اس کے اندر آئے ہیں۔ وسطی ایشیا دو نہروں کے درمیان میں ہے۔ تو مابین النہرین کا مصداق دو علاقے ہو گئے: وادیٔ دجلہ و فرات اور وادیٔ جیحون و سیحون۔ اس کے ساتھ ایک یہ علاقہ ہے خراسان۔ جس کے متعلق آتا ہے: ''خراسان سے کالے جھنڈے بلند ہوں گے اور ان کو کوئی نہیں روک سکے گا۔'' اس کا مصداق آمو سے اٹک تک افغانستان پورا اور پاکستان کا کچھ حصہ ہے۔ یہ اس کا اصل مصداق ہے، لیکن یہ ضابطہ ہے کہ جب کسی چیز پر کسی کا اطلاق ہو تو اس کا مجاور بھی اسی میں سے شمار کیا جاتا ہے اور ''لا یَشْقٰی جَلِیْسُهُمْ۔'' کا قانون جاری ہوتا ہے۔ لہٰذا پاکستان میں سے جو ان کا ہمنوا ہو گا وہ قیامت میں انہی میں سے ہو گا۔ صہیب رومی ہو، سلمان فارسی ہو یا بلال حبشی

(رضی اللہ عنہم)، سب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محشر میں ہوں گے۔ تو جو کالے جھنڈے والوں کے ساتھ ہوگا چاہے کسی علاقے سے ہو، قیامت میں انہی کے ساتھ شمار کیا جائے گا۔ قیامت تک کے لیے یہی قانون ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ روس نے سولہ ممالک کو آزادی دے دی، چیچنیا کو نہیں دی، کیوں؟ اگر وہ چیچنیا کو آزادی دے دیتا ہے تو پھر اس کو کیا سپین کا کنارہ نہیں ملے۔ اس کی گاڑی میں ایندھن کہاں سے آئے گا؟ اس کو بحیرۂ کیا سپین کا تیل کیسے ملے گا؟ اس نے تو بھوکا مر جانا ہے، کیونکہ سارے روس کا اکثر شمالی حصہ برف ہے۔ اسی میں سائبیریا کا برفانی علاقہ ہے۔ یہ روس کا مشہور قید خانہ ہے، جسے ''ٹھنڈا جہنم'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ روسی ڈکٹیٹر وسطی ایشیا کے مجاہدین وعلماء کو یہاں قید کرتے تھے۔

روس کی افغانستان میں کیا دلچسپی تھی؟

روس اتنا بڑا ہے کہ دو براعظموں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ دو بڑے مسئلے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کے پاس قابل کاشت رقبہ نہیں۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ اس کا کچھ حصہ ایشیا میں ہے اور کچھ حصہ یورپ میں واقع ہے۔ تیسرا حصہ امریکا سے جا کر لگتا ہے۔ مشرقی روس جہاں جا کر ختم ہوتا ہے وہاں ایک تنگ سمندر ہے، ''درۂ بیرنگ''، عربی میں اسے ''مضیق بیرنغ'' کہیں گے۔ انگریزی میں ''بیرنگ چینل'' کہا جائے گا۔ اس درے کے بعد امریکا ہے۔ امریکا کی ایک ریاست ''الاسکا'' 1867ء تک روس میں شامل تھی۔ 1867ء میں امریکا کے صدر اینڈریو جونسن نے روس کے بادشاہ الیگزینڈر سوم سے یہ ریاست 60 ملین ڈالر میں خریدلی تھی تاکہ براعظم امریکا کا کوئی حصہ کسی اور ملک کے پاس نہ رہے۔ گویا 1867ء سے پہلے روس تین براعظموں پر مشتمل تھا۔ براعظم امریکا سے ''الاسکا''، ایشیا میں سے پورا شمالی ایشیا، یورپ میں سے اس کا اپنا حصہ اس کے ساتھ کئی اور ممالک جس پر اس نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ ان سب کو ملا کر ایک متحدہ روس (سوویت یونین) بنا تھا، لیکن اس سب کے باوجود 10 ہزار کلومیٹر چوڑے اس ملک کا قابلِ کاشت رقبہ اُس وقت بھی صرف 11 فیصد تھا۔

روس کا دوسرا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس اپنا کوئی سمندر نہیں تھا اس کے شمال میں جو سمندر ہے اس میں بڑے جہاز تو کیا، کشتی بھی نہیں چل سکتی۔ اس سرد ترین سمندر میں گلیشیئر کی صورت میں برف کے پہاڑ چلتے رہتے ہیں۔ جزیروں جیسے بڑے بڑے برفیلے ڈلے گھومتے پھرتے ہیں۔ اس کے سبب جہاز رانی نہیں ہوسکتی۔ درّۂ بیرنگ سے آگے ایک خلیج ہے۔ اس کے بعد بحر الکاہل ہے۔ لے دے کر اگر اسے کسی سمندر کا سہارا تھا تو وہ یہ بحر الکاہل ہے، لیکن یہ بھی جہاز رانی کے لیے اچھا نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ اس کے نیچے چٹانیں ہیں اور اس میں زیرِ آب زلزلے آتے اور آتش فشاں پھٹتے ہیں۔ اسی بنا پر روس کے ساحل پر کوئی بڑی بندرگاہ نہیں بن سکتی۔

پھر ایک مسئلہ یہ تھا کہ روس بحر الکاہل کے آخری کنارے پر تھا جس کی وجہ سے وہ دنیا سے بہت دور ہو جاتا تھا۔ اسے مال کی کھپت والے ممالک تک پہنچنے کے لیے بہت لمبا سفر کرنا پڑتا تھا۔ بے تحاشا ایندھن خرچ ہوتا تھا، بہت وقت لگتا تھا، حادثات پیش آتے رہتے تھے، اس لیے اس کا ہر سفر خسارے کا سودا ثابت ہوتا تھا، لہٰذا اسے گرم سمندر کی خواہش بحیرۂ عرب پر واقع پاکستانی ساحل تک پہنچنے پر ابھارتی رہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے وسطی ایشیا کی 9 ریاستیں ہڑپ کررکھی تھیں۔ آگے افغانستان کا خطہ حائل تھا، پاکستانی بلوچستان عبور کر کے سامنے دنیا کا بہترین ساحل ''گوادر'' موجود تھا۔ بہترین اس لیے کہ ساحل ریتیلے ہوتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں جہاز اگر مقررہ حد سے ذرا آگے بڑھ جائے تو ریت میں پھنس جاتا ہے اور ایسی بندرگاہ کی ہر سال صفائی بھی کرنا پڑتی ہے۔ گوادر ایسی قدرتی بندرگاہ ہے کہ پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ کنارے تک گہری ہے۔ جہاز سیدھا آکر کنارے پر لگ سکتا ہے۔ سمندر کی کھدائی کر کے بنانے اور صاف کرتے رہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اخبارات میں آتا رہتا ہے کہ پاکستان پر اتنے اور اتنے ارب روپے قرضہ ہے، گوادر کی بندرگاہ تھوڑے عرصے کی کمائی یہ قرضہ اُتار سکتی ہے۔

روس کی ازحد کوشش تھی وہ کسی طرح ان گرم پانیوں تک پہنچ جائے۔اس مقصد کے لیے اس نے یہ کھڑاگ پالا تھا اور پندرہ ریاستیں ہضم کر کے سولہویں ملک افغانستان میں داخل ہو چکا تھا۔افغانوں کی غیرت اور بہادری کو سلام کرنا چاہیے۔ان غیور مجاہدین نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔دنیا کہتی تھی روس تاتاریوں کی مثل ہے۔جب کسی ملک میں گھس جائے تو قبضہ کیے بغیر واپس نہیں ہوتا۔تاتاریوں کے بارے میں مشہور تھا"اِذَا قِیْلَ لَکَ :"اِنَّ التَّتَرَ انْهَزَمَ، فَلَا تُصَدِّقْ." (اگر کوئی تم سے کہے کہ تاتاری شکست کھا گئے ہیں تو اسے سچا نہ سمجھنا) یہی مقولہ ماضی قریب میں روس کے بارے میں بولا جاتا تھا۔سرخ ریچھ کہیں پنجے گاڑ لے تو پھر کوئی اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔افغان اس ریچھ سے پھر کیسے لڑے؟دو سال تک انہوں نے کلہاڑوں سے لڑا۔کیچڑ لے کر ٹینکوں پر چڑھ جاتے تھے۔کیچڑ کو ٹینک کے شیشے پر مل کر اندھا کر دیتے تھے۔اس طرح ان سے لڑتے تھے۔ان بے سروسامان مجاہدین نے پوری دنیا کو روس سے نجات دلائی۔ان کا احسان ماننے کے بجائے دنیا ان کے خلاف اکٹھی ہوگئی ہے اور جلد ہی منہ کی کھائے گی۔ان شاءاللہ!اب یہ بات بھی سمجھ میں آئی ہوگی کہ روس چیچنیا کو آزادی کیوں نہیں دے رہا؟تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ چیچنیا کا کیا سپین سے لگنے والا ساحل تیل سے بھرا ہوا ہے۔

سیاسی جغرافیہ پڑھتے ہوئے کسی ملک کی چار چیزیں یاد کرنی چاہییں: ملک، دارالحکومت، اہم شہر اور کرنسی۔

اب ہم وسطی ایشیا کے نو ممالک کے نام اور ان کے دارالحکومت کا نام یاد کرتے ہیں۔ازبکستان کا دارالحکومت تاشقند، ترکمانستان کا اشک آباد، تاجکستان کا دوشنبہ، کرغیزستان کا بشکک، قازقستان کا دارالحکومت نئے نقشوں میں "استانا" دکھایا جارہا ہے۔ہم نے جب یاد کیا تھا اس وقت "الما آتا" لکھا ہوتا تھا۔دارالحکومت بدل جاتے ہیں۔جیسے پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوگیا۔افریقہ کے کچھ ممالک کا دارالحکومت بھی ساحل سے اندر کی طرف منتقل ہوگیا ہے۔اسے ہم آگے چل کر پڑھیں گے۔قفقاز کے ممالک میں چیچنیا کا دارالحکومت "گروزنی"، آذربائیجان کا "باکو" بہت مشہور ہے۔یہ ساحلی شہر ہے۔جارجیا کا دارالحکومت "تبلیسی" اور آرمینیا کا "یروان" ہے۔

سلطنت خوارزم کہاں تھی؟

بحیرۂ کیا سپین کو بحیرۂ خوارزم بھی کہتے ہیں۔اس سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا خوارزمی سلطنت کہاں تھی؟یہ منگولیا یعنی تاتاریوں کے وطن اور عالمِ اسلام یعنی عراق، حجاز وغیرہ کے بیچ میں تھی۔یہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالی نے جلال الدین خوارزم شاہ ایسا آدمی پیدا کیا جو عالم اسلام سے کہا کرتا تھا: میں تاتاریوں اور عالمِ اسلام کے بیچ آگ کی دیوار کھڑی کر دوں گا۔تم میرا ساتھ دو۔تاتاری ادھر نہیں آسکیں گے۔اس نے تمام اسلامی مملکتوں کے سربراہان کو خطوط لکھے جس طرح سلطان ٹیپو خطوط لکھتا رہا۔اس نے انگریزوں کے خلاف مدد حاصل کرنے کے لیے تمام اطراف میں خطوط لکھے۔مصر کو، خلافتِ عثمانیہ کو۔بھئی!میرے ساتھ معاہدہ کرو۔فرانس نے برطانیہ کی مخالفت میں اس کے ساتھ معاہدہ کرلیا، لیکن مسلمانوں نے نہیں کیا۔ریاست میسور میں فرانسیسی سپاہیوں کا دستہ رہتا تھا۔جب میر جعفر و میر صادق نے غداری کی اور انگریزوں کا ساتھ دے کر اُن سے سرنگا پٹم کے قلعے پر حملہ کروایا تو فرانسیسیوں نے سلطان ٹیپو سے کہا: "آپ اپنی آل اولاد کو لے کر نکل جائیں، ہم ان انگریزوں کے ساتھ لڑلیں گے۔" اس نے کہا: "نہیں، ہرگز نہیں!ایسا نہیں ہوسکتا۔اگر آپ میں اتنی غیرت ہے تو میں آپ سے زیادہ اس کا مستحق ہوں۔آپ ہمارے حلیف ہیں، مہمان ہیں۔مل کر لڑتے ہیں۔" قلعے کے دروازے پر پانچ سو لاشوں کے بیچ میں سلطان کی "لاش" ملی تھی۔گویا اس نے جواں مردی کا حق ادا کردیا۔یہ تاریخ کا حصہ ہے۔ریاست میسور کے دروازے "باب الماء" (Water gate) کے سامنے پانچ سو لاشوں کے بیچ سے لاش ملنے کا کیا مطلب ہے؟اس نے اور اس کے جاں نثاروں نے اندر چھپنے کے بجائے آگے بڑھ کر لڑنے کو ترجیح دی اور بہادروں کی طرح آخری دم تک جنگ کی۔

اسی طرح سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے عالم اسلام کے مختلف حکمرانوں سے کہا: آپ میری مدد کرو تو تاتاری عالم اسلام کی طرف نہیں آسکتے۔چار،

پانچ دستے میری طرف بھیج دو۔ میری طرف خلافت کی طرف سے خط لکھ دو۔ لوگ مجھے خلافت کا نمایندہ سمجھ کر میری مدد کریں گے۔ پھر میں تاتاریوں سے سمجھ لوں گا۔ کسی نے مدد نہ کی۔ یہ تنِ تنہا تاتاریوں سے لڑتے لڑتے دریائے سندھ تک آیا۔ آگے دریا تھا۔ پیچھے چنگیز خان تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ساتھیوں سے کہا: دریا میں چھلانگ لگا دو، پار ہو گئے تو ٹھیک ہے۔ مر گئے تو ان کے ہاتھ تو نہیں آئیں گے۔ اس نے دریا کی بپھری موجوں کی پروا نہ کرتے ہوئے، اپنے ساتھیوں، عورتوں اور بچوں کو لے کر گھوڑے سمیت چھلانگ لگا دی۔ دریائے سندھ کو پار کر کے دوسری طرف پہنچ کر اپنا نیزہ نکال کر گاڑا اور پگڑی اُتار کر اس کے اوپر سوکھنے کے لیے ڈال دی اور سائے میں آرام سے بیٹھ گیا۔ چنگیز خان دوسری جانب حیرت کا بت بنا کھڑا تھا۔ چنگیز جیسا فاتح حسرت اور نا امیدی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کے کچھ سپہ سالاروں نے اجازت چاہی کہ ہم بھی چھلانگ لگا کر اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ چنگیز خان نے ڈانٹ کر کہا: ''چھلانگ لگانے والے اجازت طلب نہیں کرتے۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ ایسا ماں نے ایک ہی جنا ہے۔ جس نے پورے عالمِ اسلام میں اکیلے مجھ کو یہ دن دکھایا ہے۔'' مولانا اسماعیل ریحان نے اپنی کتاب ''تیرے نقشِ پا کی تلاش میں'' کے اندر تاریخ میں پہلی مرتبہ اس ورثے کو جھاڑ پونچھ کر نکالا ہے۔

الغرض گرم پانیوں تک پہنچنے کے لیے روس نے دو راستوں سے کوشش کی۔ ایک بحیرۂ عرب کے لیے وسطی ایشیا کے راستے سے، دوسرا بحرِ اوقیانوس کے لیے بحیرۂ شمال کے راستے سے۔ روس کا خیال تھا کہ اگر وسطی ایشیا سے راستہ نہیں ملتا تو میں کسی طرح بحیرۂ شمال اور پھر انگلینڈ کے ''ڈوور چینل'' تک پہنچ جاؤں۔ چنانچہ اس نے مشرقی یورپ میں فن لینڈ، تین بالٹک ریاستوں اور اس کے نیچے کے پانچ ممالک بیلا روس، یوکرائن، مالدووا ہڑپ کر لیے تھے۔ جبکہ رومانیہ، بلغاریہ اور چیکوسلواکیہ بھی سارے کے سارے کمیونسٹ بنا لیے تھے۔ اس کی یلغار دو طرفہ جاری تھی۔ وسطی ایشیا سے بحیرۂ عرب کی طرف اور یورپ سے بحرِ متوسط یا بحرِ شمال کی طرف۔ اگر دونوں طرف پہنچ جاتا تو بات ہی کیا تھی؟ اگر ایشیا راستہ نہ دیتا تو مشرقی یورپ کی طرف بھی پیشقدمی جاری تھی۔ یہاں سے وہ بحیرۂ اسود، بحیرۂ مرمرہ اور بحیرۂ ایجہ سے ہو کر بحرِ متوسط میں پہنچ جاتا۔ مغربی یورپ والے بھی اس سے سہمے رہتے تھے، کیونکہ وہ جرمنی تک پہنچ کر اس کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا: پولینڈ کے ساتھ والا مشرقی جرمن کمیونسٹ تھا۔ فرانس کے ساتھ والا مغربی جرمنی سرمایہ دار تھا۔ اس کی یلغار کا یہ حال تھا۔ مغربی ممالک کے لوگ اس سے سہمے رہتے تھے جس ملک میں گھسا، وہی اس کا ہو گیا۔ یہ تو آپ دعا دیجیے افغان مجاہدین کو جنہوں نے اس طوفان کے سامنے نہ صرف بند باندھا بلکہ اس کا منہ پھیر کر رکھ دیا۔ ایشیائی روس کا صدر مقام ''ماسکو'' ہے۔ یورپی روس کا بڑا شہر ''لینن گراڈ'' ہے۔ اب تک بارہ ملک ہو گئے ہیں جن پر روس قبضہ کر چکا تھا۔ نو تو وسطِ ایشیا کے اور تین بالٹک ریاستیں۔ اگلے سبق میں، ہم ان شاء اللہ وسطی ایشیا سے آگے چلیں گے۔

پانچواں سبق

جنوبی ایشیا

یہ آپ کے سامنے نقشے پر "ہند" اور چین ہے۔ "چین اور ہند" کی سرحد پر دو ملک ہیں: نیپال اور بھوٹان۔ غزوۂ ہند کی فضیلت کا مصداق کون سے لوگ ہیں؟ ہند کے مصداق میں ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان آتے ہیں۔ نیپال اور بھوٹان اس میں داخل ہیں یا نہیں؟ اگر ہم غور کریں تو یہ چین اور ہند کے سنگم پر واقع ہیں۔ ان کی تہذیب، ثقافت اور حلیے کو دیکھیں گے۔ اگر یہ چین سے زیادہ مشابہ ہیں تو اس کے ساتھ ملحق ہو جائیں گے ورنہ پھر ہند میں داخل ہوں گے۔ اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے یہ چین سے زیادہ مشابہ ہیں، کیونکہ چین والے حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں میں سے ایک کی اولاد ہیں جو "بنوالأصفر" کہلاتے ہیں۔ یہ چپٹی ناک اور زرد رنگ والے ہیں۔ نیپال اور بھوٹان میں ایسے ہی لوگ ہیں۔ جو تھوڑی بہت کھڑی ناک پائی جاتی ہے وہ انہی علاقوں میں ہے جو ہند کی سرحد کے قریب ہیں۔ ان کی زبان اور تہذیب وثقافت زیادہ چین والوں سے ہی ملتی ہے۔ لہٰذا غزوۂ ہند کا صحیح مصداق آج کے جغرافیے کے اعتبار سے یہ تین ممالک ہیں: پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش۔

ہند کے ان تین ممالک کے ساتھ بقیہ چار ملک اوپر سے نیپال، بھوٹان اور نیچے سمندر کی جانب سے سری لنکا و مالدیپ ملا کر جنوبی ایشیا کے سات ممالک پورے ہو گئے۔ ان سات ممالک نے "سارک" نامی تنظیم بنائی اور افغانستان کو بھی شامل کیا تو آٹھ ہو گئے۔ بعض کے نزدیک ایران بھی اسی سارک کا حصہ ہے۔ اس طرح کل نو ممالک ہو گئے۔

اب جنوبی ایشیا کے ممالک کے دارالحکومتوں کے نام دیکھ لیں۔ بنگلہ دیش کا دارالحکومت ڈھاکہ، ہندوستان کا "نیو دہلی" پاکستان کا "اسلام آباد"۔ بھوٹان کا دارالحکومت "تھمپو"، نیپال کا "کھٹمنڈو"، سری لنکا کا "کولمبو"۔ سری لنکا کے دو حصے ہیں: ایک اوپر کا، جس میں "جافنا" ہے۔ دوسرے نیچے والا جس میں "کولمبو" ہے۔ سری لنکا میں دو بڑی نسلیں رہتی ہیں: "تامل" اور "سنہالی"۔

مالدیپ کے عجائبات:

ساتھ میں مالدیپ کے جزائر ہیں۔ ان کا دارالحکومت "مالے" ہے۔ یہ مالدیپ کے جزائر دنیا کی عجیب جگہ ہے۔ اس ملک میں چوپایہ نہیں پایا جاتا۔ یعنی صرف درندے ہی نہیں، گائے بکری وغیرہ بھی نہیں ہیں۔ گائے یہاں چڑیا گھر میں رکھی جاتی ہے بچوں کو دکھانے کے لیے کہ گائے ایسی ہوتی ہے۔ باوجود مسلمان ملک ہونے کے یہاں کسی کو احساس ہی نہیں کہ قربانی بھی فرض یا واجب ہے۔ یہ واحد ملک ہے جس کا سربراہ "عالم" ہے۔ یہ ازہری ہے یعنی جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل۔ مامون عبدالقیوم نام ہے لیکن یہاں عباداتِ اسلامیہ کے دو اہم جز بالکل مفقود ہیں: قربانی اور اعتکاف۔ قربانی اس لیے نہیں ہے کہ یہاں چوپائے نہیں ہیں۔

ہمارا ایک پاکستانی ساتھی مالدیپ گیا ہوا تھا۔اس نے کہا: میں تو قربانی کروں گا۔انہوں نے کہا: کرو بھئی! اس کے لیے انڈیا سے بکری منگوائی گئی۔لیکن کسی کو بھی اسے ذبح کرنا نہیں آتا تھا۔آتا بھی کیسے؟ وہاں تو سب لوگ مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ان کا ریکارڈ ہے ایک گھنٹے میں کئی ٹن مچھلیاں پکڑتے ہیں۔انہوں نے کبھی جانوروں کا نرخرہ کٹتے اور خون بہتے نہیں دیکھا تھا۔چنانچہ قربانی پر ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا، جس طرح ہمارے ہاں اونٹ کی قربانی پر ہوتا ہے۔ذبح کرنے کے لیے پاکستانی کو کہا گیا تو اس نے کہا: میں نے بھی کبھی ذبح نہیں کیا۔بہرحال اس نے ہمت کی اور ذبح کرنا شروع کردیا۔چھری چلاتے ہوئے ہاتھ او چھا پڑ گیا۔اس کے باوجود کہ بکری کو آدمیوں نے پکڑا ہوا تھا، چھوٹ کر بھاگ نکلی۔اس کو پکڑ کر دوبارہ ذبح کرنا ایک مسئلہ بن گیا۔

دوسری چیز اعتکاف ہے۔اس کا رواج ہی نہیں ہے۔ہمارے پاکستانی دوست نے اعتکاف کا عزم کیا تاکہ متروکہ سنت زندہ ہو جائے۔اس نے بتایا: میں جس مسجد میں بیٹھا۔وہاں کے امام صاحب نے تراویح کے بعد کہا: ''اتنی تکلیف نہ اُٹھاؤ۔عشاء کے بعد گھر چلے جایا کرو۔صبح سحری کر کے پھر آجایا کرو۔''

ان جزائر کے لوگ بہت زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ما من رجل وامرأة، ذکر أو انثی، الا وقد تزوج أکثر من واحد۔شادیاں اس طرح کرتے ہیں کہ صبح چھڑے گئے، دوپہر کو شادی کر کے آگئے۔بس شادی ہوگئی۔ہمارے دوست نے میزبان سے ایک دن پوچھا خیر تو ہے۔آج ذرا صاف کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔اس نے بتایا آج میری ساتویں شادی ہوئی ہے۔اس کے وہاں رہتے رہتے گھر کے مالک کی دو تین شادیاں ہوگئی تھیں۔

غرض مالدیپ اس طرح کا عجیب وغریب ملک ہے۔ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں اس ملک کے سفر کی روداد لکھی ہے۔اس نے لکھا ہے میں نے بھی یہاں چار شادیاں کی تھیں۔اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیے: ''ولقد کان لي أربع نسوة وجوار سواهنّ، فکنت أطوف علی جمیعهنّ کل یوم۔'' اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ یہاں ایک خاص قسم کی مچھلی پائی جاتی ہے جس میں بے نظیر قوت ہوتی ہے۔بہرحال مالدیپ کا صدر مقام ''مالے'' ہے۔(سفرنامہ ابن بطوطہ: ج2 ص193)

پاکستان کے ساتھ کشمیر ہے۔تقسیم ہند کے وقت سے مسلمانوں نے تقریباً لے لیا تھا۔مسلمانوں کے قافلے جہاد کر کے اس کو لینے کے لیے چل پڑے تھے۔ایک ریٹائرڈ میجر ان کا رہنما بن گیا لیکن ایک قادیانی نے ان کو جنگلوں میں بھٹکائے رکھا۔اُدھر اُس نے انڈیا سے کہا کہ جلدی سری نگر کے ہوائی اڈے پر فوجیں اُتارو ورنہ یہ کشمیر لے جائیں گے۔اس طرح کشمیر بھارت کے قبضے میں چلا گیا اور اب حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھی ہی اسے آزاد کروائیں گے۔

ہندوستان کی فتح کا آغاز ''محمد بن قاسم'' کے ہاتھوں ہوا تھا، لیکن یہ مشن مکمل نہ ہوسکا تھا۔خیر القرون کے دور میں نیچے سمندر کی جانب سے مسلمان آئے تھے۔لیکن ملتان سے آگے نہ جاسکے۔پھر بعد میں چھٹی صدی ہجری میں افغانستان سے ''غوری'' اور ''غزنوی'' آئے تو انہوں نے ہندوستان فتح کیا۔ان کی حکومت کابل سے دہلی تک تھی۔حجاج بن یوسف نے راجہ داہر سے بدلہ لینے کے لیے دو جماعتیں بھیجیں۔ایک سمندر کے راستے سے، دوسری خشکی کے راستے سے۔دونوں کو کہا سندھ جا کر دیبل کے قریب پہنچو اور ایک امیر کے ماتحت جمع ہو جاؤ۔جب انہوں نے دیبل فتح کرنے کے بعد آگے کا سفر شروع کیا تو ملتان تک آگئے تھے پھر انہیں واپس آنا پڑا۔لوگ ان کی جدائی پر روتے تھے۔تاریخ میں روایت ہے بعض ہندوؤں نے عقیدت میں ''بن قاسم'' کے بت بنا کر رکھ لیے تھے۔یہ جب واپس آگئے تو دوسرا حملہ اوپر سے وسطی ایشیا اور افغانستان سے ہوا۔اس میں ہندوستان فتح ہوا۔غزنوی عزم وہمت کا مالک تھا اُس نے گجرات جہاں سومنات کا مندر تھا، سترہ حملے کیے۔ان لوگوں کے سامنے مشکلات رکاوٹ نہ بنتی تھیں، نہ ناکامی سے حوصلہ کم ہوتا تھا۔تب انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے اتنا کچھ کام کرلیا۔دل میں ایمان اور سینے میں عزم ہو تو مشکلات مشکلات نہیں رہتیں۔

چین کے ساتھ ''منگولیا'' ہے تاتاریوں کی جنم بھومی۔اس کا صدر مقام ''اولن بتول'' ہے۔تاتاری یہاں سے نکلے تھے اور وسطی ایشیا کو تاراج کرتے ہوئے عرب میں جا پہنچے تھے۔یہ ہماری تاریخ کا عبرتناک دور ہے، جب مسلمانوں نے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موقع دیا کہ عرب

کے صحرا سے نکلو اور فارس فتح کرو۔ وسطی ایشیا کو فتح کرو اور چین تک جا پہنچو۔ جب ان کے اعمال میں کمزوری آئی تو اللہ تعالی نے چین کے ساتھ واقع صحرائے گوبی اور منگولیا سے ان تاتاری بدوؤں کو کھڑا کیا۔ منگولیا چنگیز خان اور ہلاکو خان کا گھر ہے۔ ہلاکو خان نے پورے وسطی ایشیا پر یلغار کی اور اسے روندتے ہوئے عراق آپہنچا اور یہاں خلافت بنی عباس کے اُس وقت کے خلیفہ کو قتل کیا۔ منگولیا کی آج کل جغرافیائی لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں۔ بس وہاں کے لوگ بڑی بڑی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے صحرا میں پڑے رہتے ہیں۔ اُس دور میں اللہ تعالی نے اِن کو ہمارے اوپر عذاب بنا کر مسلط کیا تھا۔ اس کے بعد یہ واپس اپنے بل میں سمٹ گئے اور آج دنیا کے منظر نامے پر ان کی کوئی قابلِ ذکر حیثیت نہیں۔ امت مسلمہ اور دوسری اقوام میں یہی فرق ہے۔ عروج وزوال دونوں پر آیا۔ برے دور بھلے دن اس دنیا میں سب نے دیکھے ہیں۔ لیکن ملت اسلامیہ اور دوسری اقوام میں فرق یہ ہے کہ ان اقوام کی عروج کی باری گذرنے کے بعد اب یہ دوبارہ عالمی سطح پر عروج نہ پائیں گی)۔ تاتاری منگولیا کے صحرا میں دھوپ تاپ رہے ہیں اور یونانی، بحری جہازوں کی مرمت کرکے گذارا کر رہے ہیں۔ جبکہ ایک زمانہ تھا جب تاتاریوں کی عسکریت اور یونانیوں کی ذہانت کا لوہا مانا جاتا تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں نے بھی عروج وزوال کا زمانہ گذارا۔ اب زوال کے دور سے گذر رہے ہیں، لیکن ان شاء اللہ پھر عروج دیکھیں گے بلکہ ایسا عروج ملے گا کہ ان شاء اللہ پوری دنیا پر اسلامی خلافت قائم کریں گے۔

چھٹا سبق

جنوب مشرقی ایشیا

ایشیا کا سبق مکمل ہونے میں ایک آخری چیز باقی رہ گئی ہے ''جنوب مشرقی ایشیا''۔ آپ اس سے پہلے اس براعظم کے چار حصے پڑھ چکے ہیں: مشرقِ بعید، مشرقِ وسطی، وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا۔ پہلے آپ نے مشرقِ بعید پڑھا۔ مشرقِ بعید پوری دنیا کے اعتبار سے مشرقِ بعید ہے۔ یعنی یہ صرف ایشیا کا مشرق نہیں، تین براعظموں (ایشیا، یورپ، افریقہ) کا مشترکہ مشرق ہے، جس طرح مغربِ اقصی پوری دنیا کے اعتبار سے (یا کم از کم تین براعظموں کے اعتبار سے) مغربِ اقصی ہے۔ مشرقِ بعید کے بعد آپ مشرقِ وُسطی میں گئے، پھر وسطی ایشیا میں آگئے۔ پھر جنوبی ایشیا میں چلے گئے۔ آج آخری سبق ہے: ''جنوب مشرقی ایشیا''۔

اس کے دو مشہور ملک آپ کو پہلے سے یاد ہوں گے: انڈونیشیا اور ملائشیا۔ ملائشیا وہ ملک ہے جس میں سے کاٹ کر دو بہت امیر اور بہت وسائل رکھنے والے ملک الگ کیے گئے تاکہ ملائشیا ایشیا کی یا مسلم دنیا کی سپر پاور یا منی سپر پاور نہ بن سکے۔ ملائشیا کے دو حصے تھے: ایک مغربی اور ایک مشرقی۔ بیچ میں سمندر گزر رہا ہے۔ مشرقی حصے سے بھی ایک مالدار ترین ملک الگ کیا گیا۔ یعنی ''برونائی'' اور مغربی حصے کی جو چونچ تھی، جہاں پر محصول کمانے والا ناکہ لگتا ہے، جہاں دنیا بھر کے جہازوں کی گزرگاہ ہے۔ وہ بھی ''سنگاپور'' کے نام سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ برونائی کا پورا نام ''برونائی دارالسلام'' ہے۔ اس کا دارالحکومت ''بندر سری بگوان'' ہے۔ یاد رہے ''تنزانیہ'' کے دارالحکومت کا نام بھی ''دارالسلام'' ہے۔ دونوں بڑے اچھے نام ہیں۔ ایسے ناموں کو یاد رکھنا چاہیے۔

برونائی دنیا کا امیر ترین ملک شمار ہوتا ہے۔ اس میں سونا اور پٹرول اتنا ہے کہ اگر یہ عالمِ اسلام کو صرف اضافی دولت خیرات میں دیدے یعنی ''العفو'' (اضافی سرمایہ) بھی دیدے، تو عالمِ اسلام میں کوئی بھوکا، کوئی ننگا، کوئی مقروض نہ رہے گا۔ اگر کم از کم خمس (20 فیصد) بھی دیدے جو اس پر واجب ہے، نفلی خیرات نہیں، تو عالمِ اسلام کو امریکا اور یورپی مالیاتی اداروں سے قرضے لینے کی ضرورت نہ رہے گی، لیکن اس طرح کی اولوالعزمی کے لیے قرونِ اولی کے مسلمانوں والی وہ مبارک دینی سوچ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آفاقی سوچ، ایک عالمی سوچ، پوری امت کو ایک نظر سے دیکھنے کی سوچ..... وہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سوچ ''خلافتِ اسلامیہ'' کی روح ہے۔ یہ اخوتِ اسلامیہ کی بنیاد اور وحدتِ امت کی اساس ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے ہی تو خلافت کے ادارے کو ختم کیا گیا تھا۔

ملائشیا کا جو مشرقی حصہ ہے، اس کے اوپر تھائی لینڈ (بنکاک) ایک انسانی ہاتھ کی شکل میں ہے۔ جس کے ساتھ اس کی کہنی ہے۔ یہ فرضی شکلیں، حقیقی شکلوں کو یاد رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ تھائی لینڈ کی شکل میں نقشے پر ایشیا کا جو ہاتھ لٹک رہا ہے اس کے آخری کنارے پر ملائشیا کا مشرقی حصہ ہے۔ اس کے بعد ملائشیا کے آخری سرے پر جو ناکہ ہے، یہ دنیا کے چھ اہم ترین سمندری دروں میں سے ایک ہے۔ اس ناکے کو ''آبنائے ملاکا'' کہتے ہیں۔ اس سے گذرے بغیر دنیا کا کوئی جہاز بحیرۂ عرب سے بحرالکاہل نہیں جا سکتا۔ یعنی اِدھر ایشیا، یورپ، افریقا اور امریکا سے آکر اُدھر چین، جاپان اور تائیوان (جو صنعتی ممالک ہیں)

کی طرف آبنائے ملاکا سے گذرے بغیر جا ہی نہیں سکتا، کیونکہ اگر وہ انڈونیشیا سے نیچے کا راستہ اختیار کرتا ہے تو یہ بہت لمبا سفر ہے۔ سمندر نہایت غیر موافق ہے۔ سفر کی سہولتیں بھی نہیں ہیں اور بہت زیادہ ایندھن اور وقت خرچ ہوتا ہے۔ الغرض ملائشیا کا یہ کنارہ قدرتی بحری ناکہ تھا۔ اس کو کاٹ کر چھوٹا سا سنگاپور الگ کر دیا گیا۔ یہ بالکل چھوٹا سا ہے۔ اس کی کل آبادی 2009ء کی مردم شماری کے مطابق 49,87,600 ہے۔ یعنی تقریباً پچاس لاکھ، صرف نصف کروڑ۔ نیو کراچی یا لانڈھی کورنگی کے برابر۔ یہ ایسا ملک ہے جس میں ایک ہی شہر ہے، ملک کا نام بھی وہی ہے جو شہر کا ہے۔ لیکن وہ ان کافروں کے حوالے کر دیا گیا ہے، تاکہ مسلمان اکثریت والے ملک ملائشیا کو برونائی کی قدرتی دولت بھی نہ ملے اور سنگاپور کی ٹیکس یا محصول سے حاصل ہونے والی آمدنی یا جہازوں کی مرمت اور ان کو خوراک اور دوائیاں وغیرہ فراہم کرنے سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی اس کو نہ ملے۔ ملائشیا کا دارالحکومت مشرقی حصے میں ''کوالالمپور'' کے نام سے ہے۔

ملائشیا کے نیچے انڈونیشیا ہے، جو تقریباً ساڑھے سترہ ہزار جزائر پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا ''مجمع الجزائر'' ہے اور آبادی کے اعتبار سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ ان سترہ ہزار جزائر کو پانچ بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ''ساٹرا'' اور ''جاوا'' زیادہ مشہور ہیں۔ آپ میں سے اگر کسی نے ''کالا پانی'' کی تاریخ پڑھی ہے تو ''ساٹرا'' کا لفظ ضرور آپ کے ذہن میں ہوگا۔ ''کالا پانی'' جزائر ''انڈیمان'' کا دوسرا نام ہے۔ ان سے خشکی کا قریب ترین حصہ ''ساٹرا'' ہے۔ ساٹرا کی شمال مغربی نوک سے کچھ دور ''جزائر انڈیمان'' یا ''کالا پانی'' ہیں۔ کالا پانی چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔ خشکی کا قریب ترین حصہ ساٹرا ہے۔ ساٹرا کے مشرقی جانب میں ایک ''بورنیو'' صوبہ ہے۔ ساتھ میں دوسرا صوبہ ''سلویسی'' ہے۔ اس کی مشرقی جانب میں آخری جزیرہ ''نیوگنی'' ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ مشرقی حصہ ''پاپوانیوگنی'' تو مستقل ملک ہے۔ یہ عیسائی ملک ہے۔ مغربی حصہ ''نیوگنی'' انڈونیشیا کا صوبہ ہے۔ بورنیو کا بھی یہی حال ہے۔ یہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک ملائشیا میں ہے، ایک انڈونیشیا میں۔ اس کا جو حصہ ملائشیا میں آتا ہے ''ملائشین بورنیو'' کہلاتا ہے۔ جو انڈونیشیا میں آتا ہے، اسے ''انڈونیشین بورنیو'' کہتے ہیں۔ انڈونیشیا ان پانچوں صوبوں ساٹرا، جاوا، بورنیو، سلویسی اور نیوگنی پر مشتمل ہے۔

''نیوگنی اور پاپوانیوگنی'' ان ممالک میں سے ہیں جو ایک ہی نام کے کئی ممالک ہیں۔ ''گنی'' کے نام کے دنیا میں پانچ ممالک ہیں: دو تو یہ ہو گئے ایشیا میں۔ ان دو کے علاوہ تین افریقہ میں ہیں: گنی، گنی بساؤ، استوائی گنی۔ مؤخر الذکر خط استوا کے قریب ہے، اس لیے ''استوائی گنی'' کہلاتا ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا کا آخری ملک ''فلپائن'' شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا دارالحکومت ''منیلا'' ہے۔ ہمارے لیے اس میں دلچسپی کا مرکز ''منڈاناؤ جزائر'' ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایشیا کے ساحلی ممالک میں شافعی المسلک مسلمان زیادہ ہیں۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، فلپائن، سری لنکا اور مالدیپ کے علاوہ برصغیر کے ساحلی علاقے جنہیں جنوبی ہندوستان کہتے ہیں، ''گوا'' اور ''کالی کٹ'' وغیرہ میں بھی شافعی المسلک مسلمان ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان ساحلی علاقوں میں جو تجارت ہوتی تھی، یہ تجارت اکثر یمن والے کرتے تھے (یمن کی مشہور بندرگاہ عدن ہے، حاجیوں کے لیے بھی اور تاجروں کے لیے بھی) عدن والے تجارت کرنے ان ساحلی علاقوں کی طرف نکلتے تھے۔ یمن میں سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مسلک کے لوگ زیادہ تھے، تو جہاں جہاں وہ گئے وہاں وہاں شافعی مسلک کے پیروکار پائے جاتے ہیں۔

مشرقی ایشیا کو آسٹریلیا کے ساتھ ملا کر بھی بیان کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ''آسٹریلیشیا''۔ اسی طرح یورپ اور ایشیا کو ملائیں گے تو کہیں گے ''یوریشیا''۔ نیوزی لینڈ اور فجی وغیرہ کا علاقہ ملا کر جزائر نما ممالک کا ایک گروپ بن جاتا ہے، اسے بھی ''آسٹریلشیا'' میں شامل کیا جاتا ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا کا ایک جزیرہ ہے ''تیمور''۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ مشرقی تیمور اور مغربی تیمور۔ مشرقی تیمور عیسائی ریاست ہے جسے عالمی طاقتوں نے انڈونیشیا سے فوراً آزادی دلوادی تھی۔ آسٹریلیا کے بحری جہاز یہاں مدد کے لیے فوراً پہنچ گئے تھے جبکہ 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان امریکی جہازوں کے انتظار میں رہا۔ امریکا کا بحری بیڑہ مشرقی پاکستان کی مدد کو نہ پہنچا اور بنگلہ دیش بن گیا۔ مشرقی تیمور کا دارالحکومت ''دلی'' ہے۔ یہ بھی ملتے جلتے ناموں

والے علاقوں کے زمرے سے ہے۔ پہلے زمانے میں ''دہلی'' کو بھی ''دلی'' کہا جاتا تھا۔ اب بھارت والوں نے دلی کو ''دہلی''، بمبئی کو ''ممبئی'' اور کلکتہ کو ''کولکتہ'' کر دیا ہے۔ ناموں میں کیا رکھا ہے؟ زنگی کا نام کافور رکھ دیں۔ کون اعتراض کر سکتا ہے؟ برونائی دارالسلام کا اپنا نام بہت اچھا ہے، لیکن دارالحکومت کا نام بندر وانہ سا ہے یعنی ''بندر سری بگوان''۔ ''بندر'' مخفف ہے ''بندور'' کا۔ بندرگاہ کو بندر یعنی ''بندر دروازہ'' اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے گزرے بغیر اور محصول دیے بغیر شہر میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ ہمارے وہ سارے آباء واجداد جو یمن اور عمان سے آئے تھے، ان کے اخلاق دیکھ کر لوگ مسلمان ہو جاتے تھے۔ بحرِ عرب میں ''عدن'' کی بندرگاہ ہے۔ کیونکہ اس کو ایشیا بھی لگتا ہے اور افریقہ بھی۔ یہ بڑی بندرگاہ تھی۔ یہاں کے لوگ تجارت کی غرض سے ایشیا کے ان ساحلی علاقوں کی طرف آتے تھے۔ ان کے معاملات اور کردار دیکھ کر مقامی آبادی مسلمان ہو جاتی تھی۔ بحری تجارت کی ایک مثال ''سراندیپ'' ہے جسے ''سیلون'' یا ''سری لنکا'' بھی کہتے ہیں۔ یہاں مسلمان تاجروں کو پیش آنے والا واقعہ مشہور ہے۔ ان کا جہاز واپس جاتے ہوئے دیبل کے قریب راجہ داہر نے لوٹ لیا تھا۔ اس پر حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو بھیجا تھا۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ سراندیپ یا سری لنکا آنے والے تاجر کافی عرصے کے بعد جب واپس اپنے گھر عرب جانے لگے تو موجودہ پاکستان کا آدھا ساحل ''سند'' ہے (عربی میں بغیر ''ھ'' کے ہے) اور آدھا بلوچستان ہے (جس کا نام مکران تھا) سند کے ساحل پر دیبل نامی بندرگاہ تھی (کراچی سے ذرا مشرق کی طرف ہٹ کے) یہاں کا حکمران راجہ داہر تھا۔ اس کے قزاق لٹیرے سمندر میں مسافروں کے جہاز کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے۔ کوئی چھوٹا جہاز بغیر محافظین کے مل جاتا تو اسے لوٹ لیتے اور مسافروں کو غلام لونڈی بنا لیتے تھے۔ سری لنکا سے مسلمانوں کا جہاز جا رہا تھا۔ اس کا رخ بصرہ کی بندرگاہ کی طرف تھا۔ سند کے ان ڈاکوؤں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ ایک مسلمان عورت نے حجاج بن یوسف کو آواز لگائی کہ تمہارے ہوتے ہوئے ہمیں یہ کافر لوٹ رہے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ حجاج نے جب یہ بات سنی تو غیرت کے مارے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور قسم اٹھائی جب تک ان کو چھڑاؤں گا نہیں، آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ ان کا انتقام لینے کے لیے اس نے اپنے بھتیجے ''محمد بن قاسم'' کو بھیجا، اور مواصلات کا ایسا نظم قائم کیا کہ دیبل سے عراق تک مختصر ترین وقت میں خبر پہنچ جاتی تھی۔ اس قدر تیز رفتار ڈاک کا نظام بنایا ہوا تھا۔ جب حجاج نے یہاں مجاہدین کی جماعتیں روانہ کیں تو مجاہدین کی ضروریات کا اس قدر اہتمام کیا کہ کپڑے سینے کی ''سوئی'' تک بھی ساتھ بھیجی۔ پھر اس نے پوچھا: ایسی کون سی چیز ہے جسے کھانے کو ان کا جی چاہے گا اور وطن کی یاد ستائے گی۔ بتایا گیا یہ لوگ ''سرکہ'' کھانے کے عادی ہیں۔ وہاں انہیں سرکہ نہیں ملے گا۔ مؤرخ ابن الاثیر نے اپنی تاریخ ''الکامل'' میں لکھا ہے اس نے روئی منگوا کر اسے سرکے میں ڈبو ڈبو کر سکھا لیا اور مجاہدین سے کہا اسے لے جاؤ، جب جی چاہے اس پر پانی ڈال کر، نچوڑ کر استعمال کر لینا۔

پھر اس کی عسکری اور انتظامی مہارت دیکھیے۔ وہیں بیٹھ کر فوجوں کو لڑا رہا ہے۔ حکم دیا کہ روز کی خبر اُسے پہنچنا چاہیے۔ ایک موقع پر محمد بن قاسم نے لکھ بھیجا فتح اس وجہ سے مشکل ہو رہی ہے مندر پر ان کا جھنڈا نصب ہے۔ اور ان میں مشہور ہے جب تک یہ اپنی جگہ برقرار رہے گا یہ قلعہ فتح نہیں ہو سکتا۔ ہم منجنیق سے پتھر برساتے ہیں لیکن خطا ہو جاتے ہیں۔ اس نے پوچھا: جھنڈا گرانے کے لیے منجنیق کس زاویے سے استعمال کر رہے ہو؟ بتایا گیا فلاں زاویے سے۔ اس نے وہیں بیٹھ کر حساب جوڑا کہ زاویے میں اتنی تبدیلی کر دو۔ مشہور مؤرخ علامہ ابن اثیر کہتے ہیں کہ اس کے بتائے ہوئے زاویے کے مطابق کر کے جب پتھر پھینکا گیا تو پہلے ہی پتھر سے جھنڈا گر گیا۔ یہ اس زمانے کے ظالم حکمرانوں کی اسلامی غیرت کا حال تھا۔ جب ایک عام عورت نے آواز لگائی تو یہ کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: ''لبیک یا اختی''۔ اس کے برعکس آپ آج کے حکمرانوں کے کردار کا موازنہ کر سکتے ہیں کہ قوم کی بیٹیوں کو کس قدر اطمینان سے غیروں کے حوالے کر کے نوٹ گن گن کر جہنم کے انگارے جمع کرتے ہیں۔ غرض سندھ کی فتح کے لیے یہ راستہ استعمال ہوا تھا۔ پاکستانی ساحل کا دوسرا حصہ مکران ہے۔ مکران یعنی بلوچستان میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں ہی صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعتیں آ گئی تھیں البتہ ''سند'' تابعین کے دور میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح ہوا۔ وہ سندھ کی فتح کے بعد ملتان تک پہنچ گیا۔ آگے چین تک کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا کہ اسے واپس جانا پڑ گیا۔

تاریخ اور جغرافیہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔میں بتارہا تھا ہمارے آباء اجداد ان ساحلی علاقوں میں تجارت کی غرض سے آتے تھے اور ان کے اخلاق اور کردار سے یہاں اسلام پھیلا۔انہوں نے یہاں کے اکثر علاقوں میں جہاد نہیں کیا تھا۔ان ساحلی علاقوں میں جو گول ناک والے لوگ رہتے ہیں، یہ خون والے جانور نہیں کھاتے۔پانی کے جانور کا گوشت کھاتے ہیں،اس لیے ان کی جسمانی ساخت اتنی مضبوط نہیں ہوتی۔ ''لحم'' فقہاء کے بقول''لحومت'' سے نکلا ہے۔جس کا معنی ہے''قوت''۔جس گوشت میں خون ہوتا ہے، طاقت اسی گوشت میں ہوتی ہے۔تو ساحلی علاقے کے لوگ جسمانی اعتبار سے اتنے مضبوط نہیں ہوتے کیونکہ یہ بغیر خون کا سفید گوشت کھاتے ہیں۔یہاں ہمارے بڑوں کو جہاد کی خاص ضرورت پیش نہیں آئی۔ ہندوستان میں بھی یہ صورتحال رہی۔شمالی ہندوستان جو سمندر سے دور ہے، جہاد سے فتح ہوا ہے۔وسطی ایشیا اور افغانستان سے غوری اور غزنوی اور ابدالی کو آنا پڑا، لیکن جنوبی ہندوستان مالابار، کیرالہ، گوا وغیرہ کے ساحلی علاقوں میں جو ساحل پر ہیں، مسلمان تاجروں کے اخلاق، دیانت و امانت اور اصول پسندی کو دیکھ کر لوگ مسلمان ہوئے ہیں یا پھر صوفیائے کرام کے ہاتھوں پر اسلام لائے ہیں۔یہاں بھی جہاد کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

یہ''جنوب مشرقی ایشیا''تھا۔اس کو''آسٹریلیشیا''کا بالائی حصہ بھی کہتے ہیں۔اس میں چھوٹے بڑے بہت سے جزیرے ہیں۔اکثر ممالک ہی جزائر کی شکل میں ہیں۔جزائر کے باب میں ہم کالا پانی اور مالٹا کو کبھی نہیں بھول سکتے۔قبرص اور کریٹ کو البتہ بھول ہی گئے۔یاد ہی نہیں کسی کو قبرص اور کریٹ کہاں ہے؟ علامہ شامی رحمہ اللہ نے''باب صلاۃ المسافر''میں مسئلہ''نیۃ التابع''میں کہہ گئے ہیں:''وہ دلدوز اور افسوسناک واقعہ جو کریٹ کے جزیرے میں پیش آیا تھا۔''ہم قبرص اور کریٹ کو بھول بھی جائیں، لیکن کالا پانی اور جزائر انڈیمان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔کیونکہ ہماری تحریک آزادی کے مجاہدین جنہوں نے یہ تحریک برپا کر رکھی تھی، ان کا تعلق انہی دو جزائر سے تھا۔قیادت مالٹا میں قید تھی۔عام مجاہدین کو انڈیمان میں بھیج دیا جاتا تھا۔ان جزائر کے قریب ترین خشکی کا علاقہ سماٹرا بھی بہت دور ہے۔

سیاسی جغرافیہ ذہن نشین ہوگا تو تاریخی جغرافیہ اچھی طرح سمجھ آئے گا۔ان دونوں کو ذہن میں رکھ کر قرآنی جغرافیہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔سیاسی جغرافیہ میں ممالک کی تقسیم ہر لحہ بدلتی رہتی ہے۔ایک ملک ٹوٹ کر کئی ممالک کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔کبھی کوئی ملک دوسرے پر قبضہ کر لیتا ہے۔ایک''یوگوسلاویہ''کے چھ ملک بن گئے ہیں۔چیکوسلواکیہ کے دو ملک بن گئے ہیں۔یوگوسلاویہ کے چھ میں سے دو ملک مسلمان ہوگئے: بوسنیا اور البانیہ۔ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔البتہ طبعی جغرافیہ میں کہیں سالوں بلکہ صدیوں میں تبدیلی آتی ہے۔کہیں کوئی جزیرہ ڈوب گیا یا کہیں دریا نے رخ تبدیل کر لیا اور دیبل کے بجائے''جاتی''کی طرف بہنے لگا۔یہ نادر بات ہے۔''جاتی''وہ جگہ ہے جہاں آج کل دریائے سندھ سمندر میں گرتا ہے۔

شروع میں بتایا گیا سیاسی جغرافیہ کو یاد کرنے کے متعدد طریقوں میں سے ایک یہ ہے سات براعظموں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے یاد کیا جاتا ہے۔ایشیا کو ہم نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا: مشرقِ بعید، مشرقِ وسطی، وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا، اور جنوب مشرقی ایشیا۔پانچ خطوں یا منطقوں میں تقسیم کرنے کے بعد اب ان منطقوں میں واقع ممالک اور مشہور شہروں کا نام یاد رکھنا آسان ہوگیا۔ممالک کو یاد کرتے ہوئے ہم ممالک کے نام، ان کے صدر مقام اور اہم شہروں کو ذہن نشین کریں گے۔

اہم شہروں کے بارے میں یہ سمجھیں کہ یہ عموماً سمندر یا دریا کے کنارے پر ہوتے ہیں۔اس لیے کہ سمندر کے ذریعہ بین الاقوامی تجارت ہوتی ہے۔"اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ."[الجاثیہ:12] دریا کے کنارے اگرچہ تجارت نہیں ہوتی لیکن میٹھا پانی، مچھلی وغیرہ تو ملتی ہے! اور زراعت تو ساری اسی سے ہوتی ہے۔مثال کے طور پر مصر کے تین مشہور شہر ہیں۔تینوں دریا یا سمندر کے کنارے ہیں۔ایک دریائے نیل کے کنارے، ایک بحر متوسط کے کنارے اور ایک خلیجِ سوئز کے کنارے واقع ہے۔مثل مشہور ہے"مِصْرُ هِبَةُ النِّيْل."۔مصر تو بس نیل کی بخشش پر جیتا ہے۔خلیجِ سوئز

کے کنارے اسماعیلیہ ہے اور دریائے نیل کے کنارے قاہرہ، بحر متوسط کے کنارے اسکندریہ ہے۔ دنیا میں بڑی انسانی آبادیاں علی العموم سمندر یا دریا کے کنارے ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جو مختلف مقامات پر ہیں وہ ''هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ.'' کے تکوینی حکم کے نتیجے میں ہیں۔ یعنی اللہ تعالی نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انسانوں کو زمین پر پھیلا دیا ہے، کبھی کبھی طلبہ پوچھتے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک جگہ شہر ہوتا ہے پھر ایک طویل خالی جگہ چھوڑ کر دوسرا شہر ہوتا ہے، بیچ میں آبادی کیوں نہیں ہوتی؟ ادھر کراچی ہے اور بہت دور حیدرآباد ہے۔ درمیان میں جگہ خالی کیوں ہے؟ تو بھائی! یہ اللہ تعالی کی تکوینی تقسیم کے مطابق ہے۔ 'هو الذی ذرأكم فی الأرض.''

ساتواں سبق

ایشیائے کوچک (ترکی)

آج ہم ایشیائے کوچک یعنی ترکی کو پڑھیں گے۔ ترکی درحقیقت جزیرہ نما ہے۔ اس کے تین طرف پانی اور ایک طرف خشکی ہے۔ شمال میں بحیرۂ اسود، مغرب میں بحیرۂ مرمرہ اور بحیرۂ ایجیہ ہیں۔ جنوب میں بحر متوسط ہے۔ اس جزیرہ نما کو ''اناطولیہ'' بھی کہتے ہیں۔ ترکی اسی لفظ کو ''اناصول'' کہتے ہیں۔ ترکی کی خصوصیت یہ ہے کہ ترکی روس کی طرح بیک وقت دو بڑا عظموں یعنی ایشیا اور یورپ میں پایا جاتا ہے۔ بیچ میں دو درّے ہیں۔ ایک کو ''آبنائے فاسفورس'' کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ قریب میں دوسرا درّہ ''درّۂ دانیال'' ہے۔ درّہ ہمیشہ اس جگہ کو کہیں گے جو خشکی کے دو تنگ راستوں کو الگ کر رہا ہو اور دو سمندروں کو ملاتا ہو۔ تو یہاں تین سمندر ہیں۔ ایک سمندر ''بحر اسود'' دوسرا ''مرمرہ'' اور تیسرا ''بحیرۂ ایجین'' ہے۔ بحر اسود کا شمار ان چار سمندروں میں ہوتا ہے جو چار میں سے کسی ایک رنگ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کو ہم آئندہ تفصیل سے پڑھیں گے۔

اسود اور مرمرہ کو جو درّہ ملاتا ہے وہ ''باسفورس'' کہلاتا ہے۔ مرمرہ اور ایجین کو ملانے والا درّہ ''دانیال'' کہلاتا ہے۔ ترکی کا ایشیائی حصہ اس کے یورپی حصے سے دو درّوں کے ذریعے سے ملتا ہے: ایک باسفورس جس پر ایشیا اور یورپ کو ملانے والا مشہور زمانہ پل ہے جو خوبصورت اور کافی طویل ہے۔ اور دوسرا دانیال۔ یہ دو ہی راستے ہیں۔ آبنائے باسفورس کے پار قسطنطنیہ واقع ہے جو یورپ اور ایشیا کے سنگم پر ہیں۔ یہ یورپ کا مشرقی دروازہ ہے۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے اس کو فتح کرنے والوں کے لیے بشارت دی تھی۔ اس دروازے کو فتح کرلیا جائے تو یورپ یعنی عیسائیت کے مرکز میں داخل ہونے کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یورپ کا دوسرا دروازہ جنوب مغرب کی طرف سے ''جبل الطارق'' ہے۔ نقشے پر جبرالٹر (جبل الطارق) کے سامنے مراکش کا شہر ''طنجہ'' ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''قسطنطنیہ'' سے داخل ہونے کی بشارت دی تھی۔ اس کو جو فتح کرے گا تو وہ دنیا میں آنے والی تین فاتح اقوام میں بڑی قوم کو فتح کرلے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے: سام، حام اور یافث۔ ایک سے گورے لوگ پیدا ہوئے، یورپ ان کا مسکن ہے۔ ایک سے کالے لوگ پیدا ہوئے، افریقا ان کی رہائش گاہ بنی۔ ایک سے سانولے لوگ پیدا ہوئے، ایشیا ان کا مرکز ٹھہرا۔ یورپ والے ''بنوالأ بیض''، افریقا والے ''بنوالأ سود'' اور ایشیا والے ''بنوالأ صفر'' کہلاتے ہیں۔ اگر آپ بنگلہ دیش اور برما کے بیچ میں سے سفر شروع کریں اور اوپر چلیں تو منگولیا اور روس سے آدھی قوم جو ادھر مشرق میں رہتی ہے چپٹی ناک والی ہے اور آدھی مغرب کی جانب کھڑی ناک والی، اور یہ بیچ کی پٹی میں بہار، بنگال، آسام یہ مشترک ہیں۔ ایک گھر میں دو بھائی چپٹی ناک والے ہیں، ایک کھڑی ناک والا۔ یہ ''بشری جغرافیہ'' ہے کہ کونسی قوم کدھر رہتی ہے۔ (یہ ضمن میں آگیا)

گورے لوگوں کا دیس یورپ ہے۔ کالے لوگوں کا افریقا اور سانولے لوگوں کا ایشیا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ سو فیصد ایسا ہی ہوگا، کیونکہ باپ ایک تھا، رنگ ایک تھا، آگے اس میں فرق پڑ جاتا تھا۔ جیسے یہاں کالے گورے دونوں پائے جاتے ہیں۔

یورپ میں داخل ہونے کا ایک دروازہ ایشیا سے ہے۔ یہ ترکی سے ہو کر جاتا ہے۔ ترکی سے یورپ کے مشرق میں داخل ہوا جاسکتا ہے۔ دوسرا دروازہ افریقہ سے ہے۔ یہ مراکش سے ہو کر جاتا ہے۔ مراکش سے یورپ کے جنوب مغرب میں داخل ہوا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں نے دونوں دروازے توڑے ہیں، دونوں سے داخل ہوئے ہیں۔ اِدھر سے سلطان محمد فاتح وسطی یورپ تک آیا (جو ہم آج پڑھیں گے) مشرقی یورپ روس کا پڑوسی ہونے کی وجہ سے سوشلزم (روس) کے ماتحت آگیا تھا۔ مغربی یورپ سارے کا سارا سرمایہ دارانہ نظام کا حامی اور علمبردار تھا۔ ترکی سے مسلمان داخل ہوئے تو وسطی یورپ تک پہنچ گئے تھے۔ مراکش سے طارق بن زیاد کی قیادت میں داخل ہوئے تو فرانس تک روند چکے تھے۔ لیکن دونوں مرتبہ واپس آنا پڑا۔ دونوں مرتبہ گڑبڑ جو ہوئی تھی وہ آپس میں اختلاف اور لڑائی کی وجہ سے ہوئی تھی، جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا تھا۔

پہلی مرتبہ یہ ہوا کہ عثمانی فاتحین ایک کے بعد دوسرا ملک فتح کرتے ہوئے آگے بڑھتے جارہے تھے۔ یورپی حکمرانوں کو ان کے روکنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ آخرکار انہوں نے پرانا طریقہ اختیار کیا۔ ایک یورپی حکمران نے تیمور لنگ کو خط لکھا کہ اگر عثمانی فاتحین نے یورپ کرلیا تو یہ فاتح عالم شمار ہوں گے۔ جبکہ یہ لقب تو تم پر سجتا ہے۔ میں نے اپنی تواریخ کو دیکھ کر یہ بات لکھی تھی۔ ایک بریگیڈیر صاحب نے انسائیکلوپیڈیا سے حوالہ کا عکس لے کر بھیجا کہ یورپی ماخذ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ الغرض تیمور لنگ کا دماغ یورپ کے اسی حکمران نے خط لکھ کر خراب کردیا کہ تم فاتحِ عالم ہو یا یہ سلطنتِ عثمانیہ والے فاتحِ عالم ہیں؟ خلافتِ عثمانیہ کا ایک حکمران تھا ''سلطان بایزید یلدرم''۔ ''یلدرم'' کا معنی ہے: ''بجلی''، اتنا عالی حوصلہ حکمران تھا کہ پورا یورپ مل کر اس سے لڑنے آتا تھا، انگلینڈ تک سارا یورپ مل کر اس سے لڑتے تھے، سب کے شہزادوں کو گرفتار کرتا تھا۔ پھر سب شہزادوں اور کمانڈروں کو قطار میں کھڑا کرکے پوچھتا تھا: ''کیا خیال ہے، تمھارے ساتھ کیا سلوک ہوگا''؟ وہ کہتے تھے: ''تم بہادر ہو اور بہادروں کی عزت کرتے ہو۔'' یہ کہتا: جاؤ! تیاری کرو اگلے سال دوبارہ لڑیں گے۔ روم کے اندر سینٹ پیٹر ایک بڑا گرجا تھا۔ کہتا تھا: یاد رکھو! جتنی بھی تیاری کرو لیکن تمہارے اس گرجے میں اپنے گھوڑے کو دانہ ضرور کھلاؤں گا۔ پورے یورپ کے شہزادوں کو گرفتار کرکے کہتا تھا: جاؤ! جاکر تیاری کرو۔ مردوں کی طرح لڑا کرو اور جو عورتیں تمہارے ساتھ آئی ہیں، کم از کم ان کا خیال کرکے ہی لڑلیا کرو۔ اُن کو کوئی طریقہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس کو کیسے روکیں؟ آدھا یورپ تو فتح کرلیا تھا۔ (آگے مشرقی یورپ کی پٹی ان شاء اللہ پڑھیں گے۔ رومانیہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، سارا اس نے مفتوح بنادیا تھا، اندر گھس کر چیکوسلواکیہ، ہنگری، یوگوسلاویہ۔ جو ٹوٹ کر چھ ملک بن گئے۔ یہاں تک جا پہنچا تھا۔ بقیہ آدھا اس کے لیے ترنوالہ تھا۔)

بایزید نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ قریب تھا کہ وہ اسے فتح کرلیتا۔ اتنے میں تیمور لنگ آپہنچا۔ تیمور لنگ کے حملے کی خبر سن کر اس کو واپس ترکی آنا پڑا۔ تیمور لنگ نے ہندوستان فتح کرلیا تھا۔ اس کو چاہیے تھا ہندوستان کے بعد چین جاتا۔ چین فتح کرلیتا اور بایزید یلدرم یورپ فتح کرلیتا پھر آپس میں مقابلہ کرلیتے کہ فاتحِ عالم کون ہے؟ تیمور لنگ بایزید سے لڑنے کے لیے چین چھوڑ کر ترکی آگیا۔ بایزید کو پتہ چلا تو وہ بھی غیرت مند تھا اُس نے کہا۔ چلو دو دو ہاتھ کرلیتے ہیں، البتہ غلطی یہ کی کہ جس دن جنگ ہونی تھی وہ یورپ سے واپس آیا اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنے کے لیے شکار کے لیے چلا گیا، جس کی وجہ سے تیمور نے پہلے سے اچھی جگہ پکڑلی، اس کے سپاہی تازہ دم، کھائے پیے ہوئے، لڑنے کے لیے تیار۔ یہ بعد میں آیا۔ تھکا ماندا، بھوکا پیاسا۔

ترکی میں ایک جگہ ہے ''سمرنا''۔ سمرنا کے میدان کو دونوں نے منتخب کیا کہ آج فاتح عالم کا یہاں فیصلہ کرتے ہیں۔ بایزید کے سارے سپاہی شکار سے تھکے ہوئے تھے، اور ادھر تیمور نے جگہ بھی اچھی پکڑلی تھی۔ صبح جنگ جب شروع ہوئی تو پہلے مرحلے میں یلدرم نے جنگ جیتی۔ اتنا جواں مرد تھا۔ مصیبت یہ ہوئی کہ تیمور نے وہی حرکت کی جو خسیس لوگ کرتے ہیں۔ بایزید کے لشکر کے اندر تعصب پھیلادیا۔ یہ عثمانی تُرک تھا اور وہ چنگیزی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ بایزید کی فوج میں جو سپاہی کمانڈر اس کے چنگیزی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اُن سے اس نے کہا: اس کے ساتھ مل کر لڑتے ہو، میرے ساتھ کیوں نہیں آتے، تو انہوں نے عین

وقت میں دیکھا کہ پلہ بھاری ہو رہا ہے تو زور لگاتا تھا تاکہ جنگ شام تک بایزید کے حق میں ختم ہو، مگر الٹا اُس کو چھوڑ کر تیمور کے ساتھ مل گئے۔ تیمور نے سلطان بایزید کو قید کر لیا اور پنجرے میں قید کر کے لے گیا۔ آپس کی مخالفت کی وجہ سے یورپ ہم سے رہ گیا۔

دوسری مرتبہ جب اس دروازے سے داخل ہوئے تو اس وقت بھی تقریباً اسی طرح کا معاملہ ہوا۔ ''طارق بن زیاد'' اور ''موسیٰ بن نصیر'' کا ارادہ تھا کہ یورپ کو مغربی جانب سے فتح کرتے ہوئے مشرق تک آ پہنچیں اور شام میں دارالخلافہ دمشق سے زمینی رابطہ قائم کریں۔

انہوں نے پرتگال، اسپین اور فرانس آدھا فتح کر لیا تھا۔ آگے کیا رہ گیا تھا؟ یہ چھوٹا سا سوئزرلینڈ، آسٹریا۔ وسطی یورپ تک پہنچ گئے تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ یہاں سے یورپ کو فتح کر کے ادھر شام آ جائیں گے جہاں بنو امیہ کی حکومت تھی۔ طارق بن زیاد یہ کام کر سکتا تھا کیونکہ اس زمانے میں مسلمان بہت تازہ دم، متحد تھے، اولوالعزم تھے۔ جہاد کے خوگر اور بڑے جوان مرد قسم کے لوگ تھے۔ ان کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ یہ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نُصیر ''ولید بن عبد الملک'' کے کمانڈر تھے۔ اس کے انتقال کے بعد سلمان بن عبدالملک آیا تو اس نے کہا: میں نئے کمانڈر بھیجوں گا، ان سے فتح نہیں کرواتا۔ ان کو واپس بلا لیا تو نئے کمانڈروں سے یہ کام نہیں ہو سکا جو اس وقت میں ہو جاتا، کیونکہ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔

ہم ایشیا کے متعلق پڑھ رہے تھے، اس کے آخری ملک ترکی کا ایک حصہ یورپی ہے اور ایک ایشیائی ہے۔ یہ یورپ اور ایشیا دونوں میں واقع ہے۔ اس کا دارالحکومت پہلے یورپی حصے یعنی قسطنطنیہ میں تھا جس کا نام ''اسلام بول'' تھا۔ پھر استنبول مشہور ہو گیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے یہ بہت غلط حرکت کی کہ مسلمانوں کا دارالحکومت فتح قسطنطنیہ کے بعد سے ''استنبول'' چلا آ رہا تھا تو یہ خبیث، دارالحکومت ''انقرہ'' میں لے آیا۔ یعنی ایشیائی حصہ میں۔ کیونکہ استنبول مسجدوں کا شہر ہے، فاتحین کا شہر ہے، ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شہر ہے، عثمانی سلاطین کی قبریں یہاں پر ہیں۔ جو بھی عثمانی سلطان آتا تھا تو وہ ''متبرکات نبویہ'' والے کمرے میں جا کر جھاڑو دیتا تھا، ابوایوب انصاری کی قبر مبارک پر اس کی امارت ہوتی تھی، وہاں اس کو تلوار سجائی جاتی تھی، ساری یادگاریں وہاں موجود تھی۔ مصطفیٰ کمال ان یادگاروں سے ذہن ہٹانے کے لیے دارالحکومت انقرہ میں لایا اور اس نے دارالحکومت میں پابندی لگائی کہ مسجدیں نہیں بنیں گی۔ ہمارا ایک بڑا مسئلہ ہے ''باہمی اختلافات''، اس نے دو مرتبہ یورپ کو ہمارے ہاتھ سے نکال دیا۔ اختلاف و افتراق بڑی بُری چیز ہے، ادارے کی سطح پر ہو، خانقاہ کی سطح پر ہو، مدرسے یا گھر کی سطح پر ہو، کسی بھی سطح پر ہو۔ جب اس کی بے برکتی سے شب قدر کو اُٹھا لیا گیا ہے تو اور بھی بہت ساری برکتیں رک جاتی ہیں۔ ہمیں اس سے بچنا چاہیے۔ تاریخ ہمیں یہی سبق دیتی ہے۔ ترکی اور انقرہ پر ایشیا کا تذکرہ مکمل ہو جائے گا۔ صرف ہند چینی کے پانچ ممالک رہ جائیں گے جو آگے جا کر ہم جغرافیائی اشتراک میں پڑھ لیں گے اور چھوٹے ممالک جن کے دارالحکومت اور ملکوں کے نام ایک ہی ہیں، وہ رہ جائیں گے تو اس کے بعد ان شاء اللہ اُن کے متعلق پڑھیں گے۔

آٹھواں سبق

براعظم افریقہ (1)

براعظم افریقہ کی شکل ایک انسانی سر کی طرح ہے، جس کی ٹھوڑی کافی لمبی ہے۔ یہ بہت بڑا ہے، اس لیے اس میں چاروں جہتیں نکلتی ہیں۔ بلکہ پانچویں بھی یعنی وسطی افریقہ۔ اوپر شمالی پٹی ہے۔ نیچے جنوبی کنارہ ہے۔ دائیں طرف اس کی بالائی مشرقی پٹی ہے۔ تھوڑا نیچے زیریں مشرقی پٹی ہے۔ علی ہذا القیاس بائیں جانب بھی بالائی مغربی پٹی ہے۔ نیچے زیریں مغربی پٹی ہے اور بالکل بیچ میں وسطی افریقہ ہے۔ اتنا بڑا براعظم ہے کہ چار جہتیں تو اس میں ہیں ہی: شمال، جنوب، مشرق اور مغرب۔ پھر مشرق میں ایک بالائی پٹی ہے اور ایک زیریں مغربی پٹی۔ مغرب میں بھی ایک بالائی پٹی ہے ایک زیریں۔ اس کے بعد پانچویں بھی ہے، یعنی وسطی۔ شمال تو کل آپ نے پڑھ لیا تھا۔ مشرق کو آج پڑھ لیتے ہیں۔

مشرقی افریقہ:

مشرقی بالائی پٹی میں تین ممالک آتے ہیں۔ جو سب سے چھوٹا ہے ''جبوتی'' وہ سب سے اہم ہے، اس لیے کہ وہ دنیا کے چھ اہم ترین بحری درّوں میں سے ایک کے کنارے پر ہے۔ درّے کا نام ہے ''باب المندب''۔ ایک طرف سے یمن کی ایک کہنی نکلی ہوئی ہے اور ایک طرف سے افریقہ کی۔ ان کے بیچ میں ایک تنگ سمندری درّہ ہے، جس کے بیچ سے گذرے بغیر کوئی بحیرۂ عرب سے بحرِ احمر نہیں جاسکتا۔ یعنی ایشیا سے یورپ، امریکا نہیں جاسکتا۔ بحیرہ عرب سے بحرِ احمر نہ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ پورا مشرقِ بعید، پورا ایشیا، پورا ہندوستان، وسطی ایشیا، ان میں سے کوئی ایک سمندری راستے سے یورپ اور امریکا نہیں جاسکتا۔ باب المندب کو چھوڑ کے متبادل راستہ اگر اختیار کرے گا، تو اسے ایسا لمبا راستہ طے کرنا پڑے گا جو سینکڑوں میل طویل بھی ہے۔ پُر مشقت بھی اور پُر خطر بھی۔ اتنا مشکل سفر کرنے کے بعد پھر یورپ یا امریکا پہنچ سکے گا۔ سینکڑوں، ہزاروں میل طویل سفر کرنے کے بعد ایندھن کا خرچ بہت زیادہ بڑھ جائے گا جس سے سامان پر لاگت بہت زیادہ آئے گی، اس لیے راستے سے بچنے کا واحد راستہ ''باب المندب'' ہے۔ اس کے کنارے ایک چھوٹا سا ملک ''جبوتی'' ہے۔ استعمار کا طریقہ تو آپ کو پتہ ہے کہ اگر کوئی ملک دولت یا طاقت رکھتا ہے تو اس کی طاقت کو ختم کرنے کا طریقہ ''تقسیم در تقسیم'' ہے۔ جتنا کوئی ملک چھوٹا اور دولت مند ہوگا، اتنا ہی وہ اپنی دولت کی حفاظت کے لیے کسی طاقتور کا سہارا لے گا اور اسی کا محتاج رہے گا۔ یہاں بھی یہی کیا گیا ہے۔ اس ناکے سے سنگاپور کی طرح یہ چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ لیا گیا ہے۔ اس ملک کا نام ''جبوتی'' ہے۔ یہ ان چھوٹے ممالک میں سے ہے جن کے دارالحکومت کا نام بھی ملک والا ہی ہے۔ اس کے ساتھ مشرق میں کنارے پر صومالیہ ہے۔ صومالیہ بھی اُسی ناکے پر ہے۔ اب آپ کو صومالیہ اور جبوتی سمجھ آ گئے ہوں گے کہ یہاں عالمی طاقتوں کی کیا دلچسپی ہے؟ درحقیقت ان کے تیل سے بھرے ہوئے جہاز گزرنے کا یہ واحد راستہ ہے۔ صومالیہ کا دارالحکومت ''موغادیشو'' ساحل پر ہے۔ جو ملک سمندر کے کنارے ہوگا تو اس کا کوئی بڑا شہر یا دارالحکومت بھی ضرور سمندر کے کنارے ہی ہوگا۔

ساتھ ہی ''اریٹیریا'' ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس پر اسرائیل کی بڑی توجہ اور محنت ہے، تاکہ بحرِ احمر میں اسے ساحل اور بندرگاہ مل سکے۔ ساتھ میں سوڈان ہے۔ مغربی لوگ اس سے ڈرتے ہیں، اس لیے کہ بڑا وسیع اور وسائل سے مالا مال مسلم ملک ہے۔ اسرائیلی اسی لیے ''ایتھوپیا'' کے عیسائیوں کو ورغلاتے ہیں کہ تم سرحد کے پار کام کرو اور اس کے دو ٹکڑے کر دو۔ شمال میں مسلم سوڈان اور جنوب میں عیسائی سوڈان۔ دراصل سرحدی علاقوں میں قبائلی رشتے اور قبائلی تعلقات ہوتے ہیں۔ رشتے ناطے اور صدیوں کے تعلقات، آنا جانا، جیسے پاکستان کے قبائلی علاقوں کا افغانستان سے تعلق رشتہ، ناطہ ہے۔ سوڈان ایک بڑا ملک ہے۔ اس میں معدنیات کثیر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی طاقت تقسیم کرنے کے لیے ایتھوپیا کے عیسائیوں کو ورغلایا جاتا ہے کہ تم ادھر سرحد پار کام کرو تاکہ اسے شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ باتیں آپ نے اخباروں میں پڑھی ہوں گی۔ جنوبی سوڈان، شمالی سوڈان کی گردان سنی ہوگی۔ یہاں پہنچ کر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ افریقہ کی اس خطے کا جسے صحابہ وتابعین کے قدم چومنے اور ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سننے کا اعزاز حاصل ہوا، کی تاریخی حیثیت اور موجودہ کیفیت ایک دیدہ ور عالم ربانی کی زبانی سنوائیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

''یہ مجاہدین گھوڑوں اور اونٹوں پر مصر، لیبیا اور تیونس ہوتے یہاں پہنچے تھے اور انہوں نے مراکش کی آخری حدود تک اسلام کا پرچم لہرا کر دم لیا۔ میرے ایک الجزائری دوست نے بتایا کہ میں ایک مرتبہ کار کے ذریعے قاہرہ تک گیا تھا۔ تقریباً پانچ ہزار کلومیٹر کا یہ سفر میں نے مختلف شہروں میں آرام دہ ہوٹلوں میں رک رک کر کیا۔ لیکن جب قاہرہ پہنچا ہوں تو تھکن کی وجہ سے لبِ دم آچکا تھا اور یہ مجاہدین گھوڑوں اور اونٹوں پر، بلکہ بعض مرتبہ پیدل بھی اس لق ودق صحراؤں اور درندوں سے بھرے ہوئے جنگلوں کو قطع کرتے ہوئے اور قدم قدم پر دشمن کی رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ شمالی افریقہ کی فضاؤں میں ان خدا مست بزرگوں کے عزم اور حوصلے کی نہ جانے کتنی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ اللہ اکبر!

عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ اور ان کی فتوحات:

اس علاقے کی فتح کا اصل سہرا حضرت عقبہ بن نافع ﷛ کے سر ہے جو صحابی تو نہ تھے لیکن آنحضرت ﷺ کی ولادت سے ایک سال قبل پیدا ہوئے تھے۔ مصر کی فتوحات میں یہ حضرت عمر ﷛ کے ساتھ رہے۔ بعد میں حضرت معاویہ ﷛ نے اپنے عہدِ حکومت میں انہیں شمالی افریقہ کے باقی ماندہ حصے کی فتح کی مہم سونپ دی تھی۔ یہ اپنے دس ہزار ساتھیوں کے ساتھ ''مصر'' سے نکل کر دادِ شجاعت دیتے ہوئے تیونس تک پہنچ گئے اور یہاں ''قیروان'' کا مشہور شہر بسایا، جس کا واقعہ یہ ہے کہ جس جگہ آج قیروان آباد ہے وہاں نہایت گھنا جنگل تھا جو درندوں سے بھرا ہوا تھا۔

حضرت عقبہ بن نافع ﷛ نے بربریوں کے شہر میں رہنے کے بجائے مسلمانوں کے لیے الگ شہر بسانے کے لیے یہ جگہ منتخب کی، تاکہ یہاں مسلمان مکمل اعتماد کے ساتھ اپنی قوت بڑھا سکیں۔ ان کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ جنگل تو درندوں اور حشرات الارض سے بھرا ہوا ہے، لیکن حضرت عقبہ ﷛ کے نزدیک شہر بسانے کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی، اس لیے انہوں نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا اور لشکر میں جتنے صحابۂ کرام تھے ان کو جمع کیا۔ یہ کل اٹھارہ صحابہ تھے۔ ان کے ساتھ مل کر حضرت عقبہ ﷛ نے دعا کی اور اس کے بعد آواز لگائی:

''أَيَّتُهَا السِّبَاعُ وَ الْحَشَرَاتُ! نَحْنُ أَصْحَابُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ، إِرْحَلُوا عَنَّا؛ فَإِنَّا نَازِلُونَ، فَمَنْ وَجَدْنَاهُ بَعْدُ، قَتَلْنَاهُ.'' ''اے درندو اور کیڑو! ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب ہیں۔ ہم یہاں بسنا چاہتے ہیں، لہٰذا تم یہاں سے کوچ کر جاؤ! اس کے بعد تم میں سے جو کوئی یہاں نظر آئے گا ہم اسے قتل کر دیں گے۔''

اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوا؟ امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں: ''فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا شَيْءٌ إِلَّا خَرَجَ هَارِبًا، حَتّٰى أَنَّ السِّبَاعَ تَحْمِلُ أَوْلَادَهَا.'' اور مشہور مؤرخ اور جغرافیہ دان علامہ زکریا بن محمد قزوینی (متوفی 682ھ) لکھتے ہیں: ''فَرَأَى النَّاسُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ عَجَبًا لَمْ يَرَوْهُ قَبْلَ ذٰلِكَ، وَكَانَ السَّبُعُ يَحْمِلُ أَشْبَالَهُ، وَالذِّئْبُ أَجْرَاءَهُ،

وَلِحَيَّةٌ وَأَوْلَادُهَا، وَهِيَ خَارِجَةٌ سِرْبًا سِرْبًا، فَحَمَلَ ذَلِكَ كَثِيرًا مِنَ الْبَرْبَرِ عَلَى الْإِسْلَامِ." ''اس روز لوگوں نے ایسا عجیب نظارہ دیکھا جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا کہ درندہ اپنے بچوں کو اٹھائے لے جارہا ہے، بھیڑیا اپنے بچوں کو اور سانپ اپنے بچوں کو۔ یہ سب ٹولیوں کی شکل میں نکلے جارہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر بہت سے بربری مسلمان ہو گئے۔''

اس کے بعد عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے جنگل کاٹ کر یہاں ''شہر قیروان'' آباد کیا، وہاں جامع مسجد بنائی اور اسے شمالی افریقہ میں اپنا مستقر قرار دیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں عقبہ بن نافع افریقہ کی امارت سے معزول ہو کر شام میں آباد ہو گئے تھے۔ آخر میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں دوبارہ وہاں بھیجنا چاہا، لیکن آپ کی وفات ہو گئی۔ بعد میں یزید نے اپنے عہد حکومت میں انہیں دوبارہ افریقہ کا گورنر بنایا۔ اس موقع پر انہوں نے قیروان سے مغرب کی طرف پیش قدمی پھر سے شروع کی اور روانگی سے پہلے اپنے بیٹوں سے کہا: ''إِنِّي قَدْ بِعْتُ نَفْسِي مِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، فَلَا أَزَالُ أُجَاهِدُ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ." ''میں اپنی جان اللہ کو فروخت کر چکا ہوں، لہٰذا اب (مرتے دم تک) اللہ کا انکار کرنے والوں سے جہاد کرتا رہوں گا۔'' اس کے بعد انہیں وصیتیں فرمائیں اور روانہ ہو گئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے الجزائر کے متعدد علاقے تلمسان وغیرہ فتح کیے، یہاں تک کہ مراکش میں داخل ہو کر اس کے بہت سے علاقوں میں اسلام کا پرچم لہرایا اور بالآخر ''اسفی'' کے مقام پر جو افریقہ کا انتہائی مغربی ساحل ہے بحرِ ظلمات (اٹلانٹک) نظر آنے لگا۔ اس عظیم سمندر پر پہنچ کر ہی حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے وہ تاریخی جملہ کہا کہ: "يَا رَبِّ لَوْلَا هٰذَا الْبَحْرُ لَمَضَيْتُ فِي الْبِلَادِ مُجَاهِدًا فِي سَبِيلِكَ." '' پروردگار! اگر یہ سمندر حائل نہ ہوتا تو میں آپ کے راستے میں جہاد کرتا ہوا اپنا سفر جاری رکھتا۔'' "اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ أَنِّي قَدْ بَلَغْتُ الْمَجْهُودَ، وَلَوْلَا هٰذَا الْبَحْرُ لَمَضَيْتُ فِي الْبِلَادِ أُقَاتِلُ مَنْ كَفَرَ بِكَ، حَتّٰى لَا يُعْبَدَ أَحَدٌ دُونَكَ." ''یا اللہ! گواہ رہیے کہ میں نے اپنی کوشش کی انتہا کر دی ہے اور اگر یہ سمندر کے بیچ میں نہ آ گیا ہوتا تو جو لوگ آپ کی توحید کا انکار کرتے ہیں میں ان سے لڑتا ہوا اور آگے جاتا، یہاں تک کہ آپ کے سوا روئے زمین پر کسی کی عبادت نہ کی جاتی۔''

اس کے بعد آپ نے اپنے گھوڑے کے اگلے پاؤں اٹلانٹک کی موجوں میں ڈالے، اپنے ساتھیوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ ہاتھ اٹھاؤ، ساتھیوں نے ہاتھ اٹھا دیے تو عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ نے یہ اثر انگیز دعا فرمائی: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي لَمْ أَخْرُجْ بَطَرًا وَلَا أَشَرًا، وَإِنَّكَ تَعْلَمُ إِنَّمَا نَطْلُبُ السَّبَبَ الَّذِي طَلَبَهُ عَبْدُكَ ذُو الْقَرْنَيْنِ، وَهُوَ أَنْ تُعْبَدَ، وَلَا يُشْرَكَ بِكَ شَيْءٌ، اَللّٰهُمَّ إِنَّا مُدَافِعُونَ عَنْ دِينِ الْإِسْلَامِ، فَكُنْ لَنَا، وَلَا تَكُنْ عَلَيْنَا يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ." ''یا اللہ! میں غرور و تکبر کے جذبے سے نہیں نکلا اور تو جانتا ہے کہ ہم اسی ''سبب'' کی تلاش میں ہیں جس کی آپ کے بندے ذوالقرنین نے جستجو کی تھی اور وہ یہ کہ بس دنیا میں تیری عبادت ہو اور تیرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اے اللہ! ہم دینِ اسلام کا دفاع کرنے والے ہیں، تو ہمارا ہو جا، ہمارے خلاف نہ ہو، یا ذا الجلال والاکرام۔''

اٹلانٹک کے کنارے سے حضرت عقبہ قیروان جانے کے لیے واپس ہوئے، راستہ میں ایک جگہ ایسی آئی جہاں پانی کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ سارا لشکر پیاس سے بیتاب تھا۔ حضرت عقبہ نے دو رکعتیں پڑھ کر دعا کی۔ دعا سے فارغ ہوئے تھے کہ ان کے گھوڑے نے پاؤں سے زمین کھودنی شروع کی، دیکھا تو ایک پتھر نظر آیا، اس پتھر سے پانی پھوٹ نکلا

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یہاں سے آگے بڑھ کر حضرت عقبہ نے یہ سوچ کر کہ راستہ بے خطر ہے، اپنے لشکر کے بیشتر حصے کو قیروان پہنچنے کے لیے آگے بھیج دیا اور خود چند سو سواروں کے ساتھ راستے کے ایک قلعے ''تہوذا'' پر یلغار کے لیے روانہ ہو گئے۔ خیال یہ تھا کہ یہ مختصر نفری اس قلعے کو فتح کرنے کے لیے کافی ہو گی، لیکن قلعہ والوں کی تعداد

بہت زیادہ تھی اوراس پر ستم یہ ہوا کہ حضرت عقبہ کے لشکر میں ایک بربری شخص تھا جو بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، حضرت عقبہ کا دشمن تھا۔ وہ دشمنوں سے مل گیا اور لشکر کے راز دشمن پر ظاہر کر دیے، جس کے نتیجے میں مسلمان چاروں طرف سے گھر گئے۔ حضرت عقبہ نے اس موقع پر اپنے ایک ساتھی ''ابوالمہاجر'' کو، جو قید میں تھے، رہا کر کے ان سے کہا کہ ''تم دوسرے مسلمانوں سے جا ملو اوران کی قیادت کرو، کیونکہ میں شہادت کے لیے اس سے بہتر موقع کوئی اور نہیں سمجھتا'' لیکن ابوالمہاجر نے کہا کہ ''مجھے بھی شہادت کی تمنا ہے۔'' اور یہ دونوں اپنے ساتھیوں سمیت دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ (کامل ابن اثیر: 43/4) چنانچہ حضرت عقبہ بن نافع کا مزار الجزائر میں جنوب کی طرف کافی اندر واقع ہے اور وہ جگہ آج بھی انہی کے نام پر ''سیدی عقبہ'' کہلاتی ہے۔''

(جہانِ دیدہ: 106-111)

حبشہ سے ایتھوپیا تک:

یہ ایتھوپیا وہی ہے جسے قدیم زمانے میں ''حبشہ'' کہتے تھے۔ بحرِ احمر کے مشرقی کنارے (یعنی جزیرۃ العرب کے کنارے) تین بڑی بندرگاہیں ہیں۔ پہلے یمن کی بندرگاہ ''عدن'' آتی ہے۔ پھر مکہ مکرمہ کی بندرگاہ ''جدہ'' آتی ہے اور پھر مدینہ منورہ کی بندرگاہ ''ینبوع'' آتی ہے۔ عدن، جدہ اور ینبوع۔ یہ تین بندرگاہیں ہیں۔ یہ سامنے مکہ مکرمہ ہے۔ یہاں مسلمانوں کو اللہ کا نام لینے پر ستایا جاتا تھا۔ فلسطین والوں کو جب ستایا جاتا تو وہ صحرا پار کر کے مصر چلے جاتے۔ مکہ مکرمہ والوں کو جب ستایا گیا تو وہ سمندر پار کر کے حبشہ آ گئے۔ پہلی ہجرت حبشہ کی طرف اس لیے ہوئی تھی کہ سمندر پار وہ جگہ جو قریب ترین ہو اور آسانی سے پہنچا نہ ہو سکے، وہ حبشہ تھی۔ ایتھوپیا ہی حبشہ ہے۔ اس سے ''اریٹریا'' کو کاٹ لیا گیا ہے۔ اریٹریا میں یہودی رہتے ہیں اور عیسائی بھی زیادہ ہیں۔ یہ یہودی کالے ہیں اور یہودیوں میں تعصب اتنا ہے کہ خود جو گورے قسم کے یہودی ہیں، وہ دو قسم کے ہیں۔ ان میں بھی آپس میں تعصب ہے۔ تو کالے یہودیوں سے کتنا تعصب ہوگا؟ گورے یہودی کی آپس میں تعصب کی داستان کچھ یوں ہے کہ گورے یہودیوں کی ایک قوم کہلاتی ہے ''اشکنازی'' اور ایک ''سفرڈیم''۔ دونوں ایک دوسرے سے سخت پرخاش رکھتے ہیں۔ اشکنازی وہ یہودی ہیں جو فلسطین سے نکالے گئے تو مشرقی ممالک کی طرف نکلے۔ القدس سے جلاوطن ہو کر نکلے تو مشرقی ممالک کو چلے گئے، عراق میں چلے گئے۔ جارجیا اور آرمینیا تک چلے گئے۔ مدینہ منورہ میں آ کر رہنے لگے۔ یہ اشکنازی کہلائے۔ کچھ ایسے تھے جو مغرب یعنی یورپ اور اسپین میں چلے گئے۔ یہ سفرڈیم تھے۔ اسپین کے مسلمان ان اہلِ کتاب کو اپنا چچا زاد سمجھتے تھے۔ بنو اسماعیل اور بنو اسحٰق چچا زاد ہیں۔ بنو اسحٰق دو قسم کے ہیں: یہودی اور عیسائی۔ عیسائیوں کے پاس تو علم نہیں ہے۔ مذہبی علم نہیں ہے۔ انجیل میں تحریف عیسائی اور غیر عیسائی (یعنی یہودی) دونوں نے کی ہے۔ تورات میں تحریف خود یہودیوں نے کی ہے، کسی اور نے نہیں کی، جبکہ انجیل میں تحریف یہودیوں نے بھی کی۔ الغرض! یہود کے کچھ قبیلے تو اِدھر مشرق کو نکل گئے۔ وسط ایشیا میں قفقاز کی تین ریاستیں ہیں۔ آرمینیا، جارجیا اور اُدھر ایران کا اصفہان ہے۔ کچھ قفقاز چلے گئے۔ کچھ اصفہان چلے گئے۔ اصفہان میں پورا محلّہ ''یہودیہ'' کے نام سے آباد ہو گیا۔ یہ اصفہانی کٹر نسلی یہودی ہیں۔ اتنے بنیاد پرست کہ اسرائیل کا ربیِ اعظم بھی اتنا بنیاد پرست نہ ہوگا۔ یہ ایرانی ہیں اور پھر یہودی بھی یعنی کریلا اور نیم چڑھا۔ کچھ مغرب میں وسطی یورپ اور اسپین چلے گئے۔ ان دو قسموں، مشرقی اور مغربی یہودی، دوسرے لفظوں میں اشکنازی اور سفرڈیم کا باہمی تعصب ضرب المثل ہو چکا ہے۔

جب القدس سے یہودی جلاوطن ہوئے تو اُن کو پتہ چلا اُدھر اسپین میں مسلمان بڑے رحمدل ہیں اور اُن کے ہاں اہلِ کتاب کے بڑے حقوق ہیں۔ ان سے شادی بھی کرتے ہیں، ذبیحہ بھی کھاتے ہیں اور ان کو کوئی تکلیف نہیں دیتے۔ جو ایک بار ذمی بن جائے تو اس کو کوئی تنگ نہیں کرتا۔ اس کا بڑا اکرام کرتے ہیں۔ ان کے مذہب میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جس نے کسی اہلِ ذمہ کو امان دی پھر اس سے غدر کیا یا اس کو تنگ کیا تو قیامت کے دن حضور علیہ الصلاۃ والسلام اس پر دعویٰ کریں گے۔ محمدی ہو کر اس دوسرے امتی عیسوی یا موسوی کو تنگ کرتے تھے؟ اس لیے اسپین میں یورپ والے بڑے امن وامان سے رہتے تھے۔ بڑے بڑے

یہاں پر فائز تھے۔ مسلمان اُن کے فن کی، علم کی، امانت کی اور اہل کتاب ہونے کی بڑی قدر کرتے تھے۔ دوسری طرف کچھ یہودی مشرق کی طرف چلے گئے یعنی عراق، ایران، آرمینیا وغیرہ۔ مشرقی یہودی ''اشکنازی'' کہلاتے ہیں اور مغربی یہودی ''سفرادیم'' کہلاتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ مشرقی یہودیوں کا کہنا ہے یورپ میں رہنے کے بعد مغربی یہودیوں کی ثقافت مغرب میں خلط ملط ہو گئی۔ جب کہ مشرق میں ان کو اس کی فکر رہی کہ ان کی نسل اور ثقافت باقی رہے۔ لہٰذا جب اسرائیل بننے کے بعد دونوں قسم کے یہودی اسرائیل آئے تو مغربی یہودی اتنے متعصب تھے کہ جب کسی کاغذ پر دستخط کرتے تو اس پر لکھتے ''خالص ہسپانوی''۔ یہ دونوں گورے ہیں۔ دونوں نسلی یہودی ہیں لیکن ایک دوسرے سے انتہائی تعصب ہے۔ ''تحسبهم جميعا وقلوبهم شتى'' (الحشر: 14) لوگ حیران ہوتے ہیں کہ یہودیت پر تو سارے متفق ہیں۔ پوری دنیا میں اسرائیل کا نام آ جائے تو یہ سارے متفق ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسے ''وقلوبهم شتى'' ہیں؟ لیکن جب کوئی اسرائیل کے اندرونی حالات کا مطالعہ کرے، تو اسے علم ہوتا ہے کہ ان کے دل ایک دوسرے سے کتنے کٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں کوشش یہ ہوتی ہے کہ نیٹ پر زیادہ سے زیادہ اپنے بارے میں معلومات ڈالو۔ کوئی جاپانی صحافی آ جائے تو اس کو ہم اپنے بارے میں معلومات دیتے ہیں کہ ہم ایسا سوچتے ہیں، ایسا کرتے ہیں۔ کیوں ہم اپنے بارے میں دوسروں کو معلومات دیں؟ اُن کے بارے میں معلومات لینی چاہیے بلکہ اُن کے اندر اتر کر اُن کی نفسیات جاننا چاہیے۔ ان کے بارے میں معلومات اکھٹی کرنی چاہیے۔ اُن کے اندر زبردست قسم کی چپقلش ہے حتی کہ اُن کے وزیر اعظم ''اسحاق رابن'' کو ایک یہودی ہی نے قتل کیا تھا۔ یہ وزیر اعظم مسلمانوں کے لیے کم ظالم نہیں تھا، لیکن چونکہ ان کے آپس کے اختلافات زبردست ہیں اور قسم ہا قسم کے اختلاف ہیں اس لیے اسے خود ایک کٹر یہودی نے قتل کیا۔ حال ہی میں (2009ء) میں امریکی ایجنسیوں نے یہ انکشاف کیا ہے 2020ء تک اسرائیل دنیا کے نقشے پر نہیں رہے گا۔ وجہ کیا ہے؟ یہ کہ امریکی قوم ان سے بیزار ہو چکی ہے۔ لیکن صرف اتنی بات اصل وجہ نہیں۔ کسی ملک کے ٹوٹنے کی متعدد وجوہ پائی جاتی ہیں۔ نسلی اختلاف، لسانی اختلاف، گروہی اختلاف، مذہبی اختلاف۔ یہ سب وجوہ اسرائیلی معاشرے میں پائی جاتی ہیں اور یہ دونوں دو انتہاؤں پر کھڑے ہیں۔ کوئی ''سفردی'' اگر ''یشیوا'' (یہودیوں کا مذہبی مدرسہ) میں تعلیم حاصل کرنا چاہے تو وہ اس میں تعلیم تو حاصل کر سکتا ہے، لیکن معلم نہیں بن سکتا، کیونکہ مشرقی یہودی کہتے ہیں یہ صرف ہمارا حق ہے۔ مغربی یہودی تو مغرب میں جا کر بے حیا ہو گئے ہیں۔ ان کو اصلی یہودیت کا کیا پتہ؟ ''یشیوا'' یہود کے مذہبی مدرسے کو کہتے ہیں۔ ان کا اختلاف بہت زیادہ ہے لیکن اسرائیل میں یہودیوں کی آبادی بہت کم ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے اُن میں نرینہ اولاد کم پیدا ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس فلسطینیوں میں شہادت کی برکت سے نرینہ اولاد بہت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ اسرائیلی اپنا انتقام پورے مسلم ممالک سے لیتے ہیں۔ خصوصاً ان ممالک سے جن میں جہاد ہوتا ہے یا مجاہدین سے تعاون ہوتا ہے، ان کو ایسی ویکسین کے قطرے پلائے جائیں جس سے ان کی نسل ختم کی جا سکے۔ یا کم از کم مؤنث نسل زیادہ ہو، نرینہ کم ہو۔ اریٹیریا میں کالے یہودی رہتے ہیں۔ اسرائیل آبادی کی کمی کی بنا پر ان کو لے جا کر اسرائیل میں آباد کر رہا ہے، لیکن ان کو سارے حقوق دینے پر تیار نہیں۔

کسی غیر یہودی جس کو یہ ''گوئم'' یا ''جنٹائل'' کہتے ہیں، اس کا خون یہودی کو نہیں لگنا چاہیے، لیکن مجبوری یہ ہے کہ ان کی نفری کم ہے۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ کوئی یہودی کہیں سے آئے، کوئی کہیں سے۔ تاکہ اسرائیل کی آبادی بڑھے، لیکن آنے والے سے امتیازی سلوک رکھتے ہیں۔ اس کا ریکارڈ الگ رکھتے ہیں۔ کم حیثیت کے یہود سے ان کا سلوک جانبدارانہ اور متعصبانہ ہے۔ لہٰذا یہ انہیں وہاں رکھتے ہیں جہاں یہودیوں پر حملے زیادہ ہوں۔

اریٹیریا کی ایک اور اہمیت بھی ہے کہ اسرائیل کا کوئی کنارہ بحر احمر سے ملا ہوا نہیں ہے۔ اریٹیریا کا دار الحکومت ''سماٹرا'' ہے اور ایتھوپیا کا ''عدیس ابابا'' ہے۔ اریٹیریا کی ایک اور اہمیت بھی ہے کہ اسرائیل کا کوئی کنارہ بحر احمر سے ملا ہوا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو کوئی بحر احمر جیسے اہم ترین سمندر میں جب گزرے گا تو بحر احمر کے ایک طرف ارض الاسلام ہے سر زمین حجاز۔ دوسری طرف مصر اور سوڈان ہیں۔ لہٰذا اس کو کوئی بحر احمر جیسے اہم ترین سمندر میں بندرگاہ نہیں دیتا سوائے اریٹیریا کے۔ اریٹیریا کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ بدنیت یہود سمجھتے ہیں سامنے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ ہے۔ اگر (خاکم

بدھن) کبھی ہمیں مکہ مکرمہ پر حملہ کرنا پڑا تو اسرائیل سے اُڑ کر یا بحری راستے سے آنا مشکل ہوگا۔ اریٹیریا کی بندرگاہ کے ذریعے جانا آسان رہے گا۔

سوڈان اس خطے کا وہ ملک ہے جس میں ابھی دین بھی باقی ہے اور وسائل بھی بہت ہیں۔ اس کے قدرتی ذخائر آج تک استعمال ہی نہیں ہوئے۔ معدنیات بہت پائی جاتی ہیں۔ مسلمان بھی خالص نظریے والے ہیں۔ ان میں زیادہ اینچ پیچ نہیں ہے۔ عقیدے میں، نظریے میں گڑبڑ نہیں ہے۔ کسی کے دباؤ میں نہیں آتے۔ لہٰذا انہیں طاغوت کی یلغار کا سامنا ہے۔ جبوتی چھوٹا سا ملک ہے۔ اس کو کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ سوڈان اتنا بڑا ملک ہے۔ اس کو بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ خلیج عرب کے کنارے چھوٹے چھوٹے ملک واقع ہیں۔ کویت، بحرین، قطر۔ یہاں کبھی کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹتی۔ مکمل امن وامان ہے۔ اس لیے کہ یہاں کے ذخائر سے طاغوت کے مفادات وابستہ ہیں۔ وہ یہاں کسی قیمت پر بدامنی برداشت نہیں کرتا۔

سوڈان کے دارالحکومت کا نام "خرطوم" ہے۔ جس کا لفظی معنی "سونڈ" ہے۔ یہ خرطوم وہ مقام ہے جہاں دریائے نیل کی ابتدائی دو شاخیں نیلِ ازرق اور نیلِ ابیض آکر ملتی ہیں۔ دریائے نیل ایتھوپیا کی ایک جھیل "ٹانا" سے نکلتا ہے۔ نیلِ ازرق خرطوم تک جاتا ہے۔ نیلِ ابیض "وکٹوریہ" نامی جھیل سے نکلتا ہے جو کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا کی سرحد پر بہت بڑی جھیل ہے۔ یہ افریقہ کی پانچ جھیلوں میں سے سب سے بڑی ہے۔ بقیہ چار جھیلوں کے نام یہ ہیں: جھیل ملاوی، جھیل ٹانگانیکا، جھیل ایڈورڈ اور جھیل البرٹ۔ وکٹوریہ جھیل سے تین ممالک کی سرحد لگتی ہے۔ کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا۔ یہاں سے نیلِ ابیض نکلتا ہے اور یوگنڈا سے گذر کر سوڈان میں جاتا ہے۔ سوڈان کے دارالحکومت خرطوم پر جھیل "ٹانا" کا نیلِ ازرق اور جھیل وکٹوریہ کا نیلِ ابیض دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ سوڈان میں معدنیات ہیں۔ دریا اپنے ہیں۔ زمین کاشت والی ہے۔ لیکن چونکہ مسلمان نظریے والے ہیں۔ لہٰذا "أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا۔ [المائدۃ:28] اِن کو خوشحال نہیں دیکھنا چاہتے۔ شمالی اور جنوبی سوڈان کی تقسیم چاہتے ہیں۔ سوڈان کا ایک بڑا شہر تو دریا کے کنارے ہوگیا! دوسرا کہاں ہونا چاہیے؟ سوڈان کا دوسرا بڑا شہر بحرِ اَحمر کے ساحل پر واقع ہے۔ دنیا کے بڑے شہر ہمیشہ ایسے ہی ہوں گے۔ دریا کے کنارے یا سمندر کے کنارے۔

تنزانیہ نقشے پر آپ کے سامنے ہے۔ اس کے دارالحکومت کو "دارالسلام" کہتے ہیں۔ خوبصورت اسلامی نام ہے۔ یہاں پورے بحرِ عرب کو کنٹرول کرنے والا امریکی اڈا تھا۔ اس میں دھماکے ہوئے تھے۔ کینیا تو آپ کو یاد ہونا چاہیے۔ بڑا اہم ملک ہے۔ یہ خطِ استوا کے نیچے ہے۔ خطِ استوا اس سے آگے افریقہ کے ان ممالک: کینیا، یوگنڈا اور کانگو سے بھی گذرتا ہے۔ کانگو دو ہیں: ایک نخرولا کانگو ہے اور دوسرا سوکھا سڑا کانگو ہے۔ ایک چھوٹا کانگو ہے دوسرا بڑا ہے۔ دونوں بھوکے ہیں، لیکن ایک ڈیموکریٹک ریپبلک یعنی ماشاء اللہ سے عوامی جمہوریہ ہے اور ایک سادہ جمہوریہ ہے۔ جمہوریت رنگین ہو یا سادی، اس سے ملتا کچھ نہیں ہے۔ کانگو کے بعد آخر میں "گیبون" ہے۔ خطِ استوا ان افریقی ممالک سے گذرتا ہے۔ آگے جا کر جنوبی امریکا میں برازیل اور بولیویا سے گذرتا ہے۔ تنزانیہ ان تین ملکوں میں سے ہے جو وکٹوریہ جھیل کے پڑوسی ہیں۔ اس جھیل سے دریائے نیل نکلتا ہے۔ انگریزوں کو بڑا شوق تھا کہ دریائے نیل کا منبع دریافت کریں۔ اس لیے کہ حدیث شریف میں اس کا تعلق جنت سے بتایا گیا ہے۔ اس جھیل تک پہنچ گئے، لیکن یہ انہیں بھی سمجھ نہیں آئی کہ اس جھیل کا منبع کیا ہے؟ نیل کا منبع جھیل ہے۔ لیکن اس جھیل کا منبع کیا چیز ہے؟ سبحان اللہ! دریا کسی بڑے پہاڑی چشمے یا برفستانی پہاڑ سے نکلتا ہے۔ بڑا پہاڑی چشمہ "جھیل" کو کہتے ہیں۔ چھوٹا چشمہ بہہ کر نالی کی شکل میں چلتا رہتا ہے۔ جھیل بڑا چشمہ ہوتا ہے۔ اس سے بڑی مقدار میں پانی نکلتا ہے۔ جسے دریا کہتے ہیں۔ دریا جھیلوں سے یا پھر گلیشیروں سے نکلتے ہیں۔ پہاڑوں میں جھیل ہوتی ہے یا ان پر برف جمی رہتی ہے۔ وہ پگھلتی ہے تو دریا بن جاتے ہیں۔ گلیشیر یا پہاڑی چشمے سے دریا نکلتے ہیں۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ گلیشیر تو یہاں کوئی ہے نہیں، ضرور کوئی بڑی جھیل ہوگی۔ وہ دریا کا پیچھا کرتے کرتے جھیل تک پہنچ گئے۔ یہاں تین ملکوں کے یعنی کینیا، تنزانیہ اور یوگنڈا کے سنگم پر جھیل تھی۔ یوگنڈا، کینیا، تنزانیہ وکٹوریہ جھیل کے تین پڑوسی ہیں۔ انگریز اس منبع کے چاروں طرف گھومے، لیکن اس میں اتنا زیادہ پانی کہاں سے آرہا ہے؟ اس کا کسی کو خبر نہیں۔

پھر ہے کینیا ہے۔ اس کا دارالحکومت "نیروبی" ہے۔ یہ افریقہ کا نسبتاً ترقی یافتہ ملک ہے۔ یہ ایک فضائی جنکشن بھی ہے۔ یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا تینوں جگہوں سے بلاواسطہ پروازیں نہیں جاتی۔ نیروبی یا دبئی سے جاتی ہے۔ کینیا، تنزانیہ کے بعد افریقہ کی مشرقی پٹی میں موزمبیق ہے۔ اس کا دارالحکومت "ماپوتو" ہے۔ ساتھ میں سمندر میں مڈغاسکر نامی بڑا جزیرہ ہے۔ جو براعظم افریقہ کا بڑا جزیرہ ہے۔ مڈغاسکر اور موزمبیق کے بیچ میں جو سمندری راستہ ہے انگلش میں "چینل" کہیں گے۔ اردو میں "رودبار" کہتے ہیں۔ "آبنائے" بھی کہتے ہیں۔ وہ اس لیے نہیں کہتے کہ یہ چوڑا ہے۔ اسے "موزمبیق چینل" کہتے ہیں۔ اس کی تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے۔ یورپ میں اسپین سے ہندوستان کا پتہ چلانے کے لیے دو مہم جو نکلے تھے۔ ایک واسکوڈے گاما تھا۔ پہلے تو ہندوستان اس وقت تک کسی نے دریافت نہیں کیا تھا۔ البتہ یورپیوں نے سنا تھا کہ وہاں پر بڑا سونا، بڑا مال اور بڑی معدنیات ہیں۔ اس پر ان کی رال ٹپکتی تھی۔ حقیقت بھی یہی تھی اس وقت ہندوستان دنیا کا خوشحال ترین خطہ تھا۔ یورپی یعنی انگریز، ولندیزی، پرتگالی، فرانسیسی سب یہاں کی دولت لوٹ لوٹ کر امیر ترقی یافتہ ہوئے۔ ہندوستان کی دریافت کے لیے اس سے پہلے جو لوگ آئے تھے وہ افریقہ سے آگے نہیں جا سکے تھے کیونکہ جیسے ہی افریقہ کے آخری جنوبی سرے سے سمندر گھومتا تو وہ ڈر جاتے تھے کہ پتہ نہیں ہم کہاں پھنس جائیں گے؟ جہاز چھوٹا ہے۔ بحری راستے کا پتا نہیں۔ واسکوڈی گاما جب یہاں پہنچا تو اس کے ساتھ جو بحری سوار ملاحوں نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ ملاحوں نے واسکوڈی گاما سے کہا: اگر تم واپس نہ گئے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ وہ عزم کا پکا تھا تو وہ سیاستدان بھی تھا۔ بحری سفر کے نقشے اُن کے سامنے لاکر پھاڑ دیے اور کہا: اگر مجھے قتل کرو گے تو واپس نہیں جا سکو گے۔ کیونکہ واپسی کا نقشہ صرف میرے ذہن میں ہے۔ لہٰذا میرے ساتھ چلو۔ سفر دوبارہ شروع ہوا۔ آخر کار جب افریقہ کے کنارے پہنچے جہاں جنوبی افریقہ کے پاس سمندر گھوم رہا تھا تو ان کو امید ہوگئی کہ اب ہم ہندوستان پہنچ جائیں گے۔ اس گھومنے والی جگہ کا نام رکھا گیا "راس الرجاء الصالح" انگلش میں اسے "کیپ آف دی گڈ ہوپ" کہتے ہیں۔ "کیپ ٹاؤن" بڑی مشہور شہر کا نام اسی بنا پر رکھا گیا۔ یہاں انہیں امید کی کرن نظر آگئی تھی۔ اس "راس" سے گھوم کر وہ موزمبیق کے رہبہ کے پاس ٹھہر گئے کہ آگے ہونے کے سفر کا انتظام کریں۔ اُدھر سانس لے کر جب انہوں نے آگے نیا سفر شروع کیا۔ تو جا کر "کالی کٹ" کی بندرگاہ پر اُترے۔ پہلا یورپی یا پرتگیزی واسکو گاما تھا جو ہندوستان کی سرزمین پر اُترا۔ جگہ کالی کٹ تھی۔ یہاں "گوا" نامی شہر میں پرتگیزیوں کی بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ قدرت اللہ شہاب صاحب نے "شہاب نامہ" میں لکھا ہے جب 1965ء کی جنگ کے موقع پر میں ہالینڈ میں سفیر تھا تو پرتگیزی سفیر میرے پاس آتا تھا اور کہتا تھا: مارو ان انڈین کو، خوب مارو انہوں نے ہمیں مارا ہے۔ وجہ کیا تھی؟ بس یہ کہ انہوں نے ہمیں جنوبی ہندوستان کے ساحل پر واقع شہر "گوا" سے نکالا تھا۔ افریقہ کے کنارے جنوبی افریقہ ہے۔ جنوبی افریقہ ایسا ملک ہے جس کے اندر دو ملک ہیں: لیسوتھو اور سوازی لینڈ۔ یہاں افریقی قبائل رہتے تھے۔ انہوں نے اپنا الگ سے ملک بنایا ہوا ہے۔ لیسوتھو بیچ میں اور سوازی لینڈ ساحل کی طرف ہے۔ خود جنوبی افریقہ کے اپنے چار بڑے بڑے شہر ڈربن، پورٹ الزبتھ، ایسٹ لندن اور کیپ ٹاؤن ساحل پر ہیں۔ اس کا دارالحکومت "جوہانسبرگ" اور "پریٹوریا" ہے۔ ایک سردیوں کا دارالحکومت ہے ایک گرمیوں کا۔ کینیا کا دارالحکومت نیروبی، تنزانیہ کا دار السلام، موزمبیق کا "ماپوتو" ہے۔ یہ افریقی نام ہے۔ افریقی زبان اسی طرح کی ہوتی ہے۔ جیسے چینیوں کی اپنی خاص زبان ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی ہوتی ہے۔

امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ سے میں نے دورۂ تفسیر 1992ء کے سبق میں سنا، فرمایا: "وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ." [الروم:22] زبان کے اختلاف کی عجیب مثالیں ہیں۔ مثلاً اردو میں کہتے ہیں: کس نے کہا، پشتو میں کہتے ہیں: کس ولے دی؟ اور مری والوں کی زبان میں کہتے ہیں: کس نے آکھیا؟ ایک ہی لفظ ہے۔ مثلث الفاء ہے۔ فا پر فتحہ، ضمہ اور کسرہ تینوں پڑھتے ہیں۔ کس نے کہا؟ کس ولے دی؟ کس نے آکھیا؟ یہ "وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ" کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ صرف جنوبی افریقہ میں گیارہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تو مشرقی افریقہ میں یہ ملک ہیں: کینیا (نیروبی) تنزانیہ (دار السلام) موزمبیق (ماپوتو) جنوبی افریقہ (پریٹوریا)۔ اب براعظم افریقہ کی مشرقی پٹی مکمل ہوگئی۔

نواں سبق

جنوبی افریقہ

پچھلے سبق میں بتایا گیا تھا کہ دوسرے براعظموں کی بنسبت براعظم افریقہ کے زیادہ ٹکڑے کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ ایک تو یہ ایشیا کے بعد دنیا کا سب سے بڑا براعظم ہے۔ دوسرے اس میں چھوٹے چھوٹے کئی ممالک آتے ہیں۔ اس کی شمالی پٹی ہم پڑھ چکے تھے۔ مشرقی بھی ہوگئی ہے۔ اس نشست میں جنوبی کو مکمل کرتے ہیں۔ پھر وسطی کی طرف جاتے ہیں۔ پھر دیکھیں گے مغرب میں کیا صورتحال ہے؟

جنوبی افریقہ ایک ملک کا نام بھی ہے، ایک جہت کا نام بھی ہے۔ اس میں پانچ ممالک کو شامل کیا جاتا ہے۔ تین تو یوں ہو جاتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کے اندر دو چھوٹے چھوٹے ملک واقع ہیں۔ ایک کا نام ہے "لیسوتھو" اور دوسرا "سوازی لینڈ"۔ جنوبی افریقہ ان کے اردگرد ہے۔ یہ تین ملک ہو گئے جن میں سے دو "لاک لینڈ" ممالک ہیں، جو چاروں طرف سے کسی دوسرے ملک کی حدود کے اندر ہیں۔ جیسے اٹلی میں "ویٹی کن سٹی" اور "سان مارینو" ہیں۔ اس طرح جنوبی افریقہ میں لیسوتھو اور سوازی لینڈ ہیں۔ جنوبی افریقہ کے اوپر اور اس کے مغرب میں دو اور ملک بھی جنوبی افریقہ میں شمار ہوتے ہیں۔ "بوٹسوانا" کا دارالحکومت "گیبرون" ہے۔ "نمیبیا" کا دارالحکومت "ونڈ ہوک" ہے۔ الغرض جنوبی افریقہ ایک ملک بھی ہے اور پوری جہت بھی ہے، جس کے اندر پانچ ملک: جنوبی افریقہ، لیسوتھو، سوازی لینڈ، بوٹسوانا اور نمیبیا ملک آتے ہیں۔ نمیبیا اور گمبیا کا لفظی تشابہ ہو جاتا ہے۔ نمیبیا جنوبی افریقہ کے اوپر شمال مغرب میں ہے اور گمبیا مغربی افریقہ میں سینیگال کے اندر واقع ہے۔ ان پانچ ملکوں کے دارالحکومت کے نام یوں ہیں: پریٹوریا، میسورو، مباتان، گیبرون اور ونڈ ہوک۔ جنوبی افریقہ کی جہت مکمل ہوگئی۔ اب ہم تاریخ کی طرف جائیں گے اور ذرا دور تک جائیں گے۔ امید ہے آپ حضرات میرے ساتھ رہیں گے۔

امید والا موڑ:

کیپ ٹاؤن جنوبی افریقہ کا مشہور شہر ہے۔ کیپ ٹاؤن کی تاریخ بیان کی گئی تھی کہ اس کو کیپ ٹاؤن کیوں کہتے ہیں؟ "کیپ" انگلش میں "راس" کو کہتے ہیں۔ راس کا معنی ہے: خشکی کا وہ حصہ جو چونچ کی نوک کی طرح سمندر میں آگے تک چلا جائے۔ کیپ ٹاؤن کا معنی ہے "راس پر واقع شہر"۔ جب ہسپانیہ کا سقوط ہوا تو مسلمان جو بحری انکشافات کر رہے تھے وہ ان متعصب عیسائیوں کے ہاتھ لگ گئے، جنہوں نے ہسپانیہ مسلمانوں سے دھوکہ دے کر چھین لیا تھا۔ جوانمردی سے، زورِ بازو سے میدان میں جیت کر نہیں لیا تھا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ ہسپانوی عیسائیوں نے غرناطہ کے مسلمانوں سے معاہدہ کیا آپ قلعے سے باہر آجائیں۔ ہتھیار ڈال دیں۔ آپ کو تمام تحفظات دیے جائیں گے۔ جان، مال، عزت، آبرو، مذہب، عبادت گاہیں سب کچھ کے تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔ معاہدے کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ غداری شروع ہوگئی۔ کہا گیا یا تو عیسائی ہو جاؤ یا اسپین چھوڑ دو۔ ان غدار ممالک، غدار حکمرانوں کے ہاتھوں وہ بحری انکشافات آگئے جو مسلمانوں کے پاس تھے۔ اس کے بعد دو بڑے حادثے ہوئے۔ ایک حادثہ پوری دنیا کے لیے ہوا اور ایک حادثہ ہم برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ہوا۔

جملہ معترضہ کے طور پر ان دونوں کا ذکر کر لیتے ہیں۔

سقوطِ ہسپانیہ کے انسانی دنیا پر اثرات:

پوری دنیا میں یہ حادثہ ہوا کہ ہسپانیہ میں جب مسلمانوں سے اسپین واپس لے لینے کا جشن منایا جا رہا تھا، عین اس وقت ایک جہاز راں مہم جُو، ہسپانوی بادشاہ اور ملکہ کے پاس پہنچا کہ یہ اسپین کیا ہے؟ میں آپ کو ایک نئی دنیا دریافت کر کے دیتا ہوں جہاں بے شمار سونا، چاندی اور لونڈی غلام ہیں۔ آپ مجھے بحری سفر کا خرچہ دے دیں۔ اس وقت مسلمان بحرِ اوقیانوس پار کر کے امریکا پہنچ چکے تھے لیکن یہ خبر عام نہیں ہوئی تھی۔ اُڑتی اُڑتی خبر تھی کہ اس سمندر کے پار بھی کوئی براعظم ہے اور خشکی کا ایک ایسا حصہ ہے جو وسائل سے مالا مال ہے، زرخیز ہے، لوگ جنگلی ہیں۔ تہذیب یافتہ نہیں۔ انہوں نے نئے نئے ہتھیار ایجاد نہیں کیے۔ فنون جیسا کہ ہسپانیہ کے مسلمانوں یا خلافتِ عثمانیہ کے حکمرانوں نے ایجاد کیے تھے، ایسا کچھ وہاں نہیں ہے۔ آسانی سے فتح کیے جا سکتے ہیں۔ اڑتی اڑتی خبر تو تھی لیکن اس کا عام شہرت ابھی نہیں ہوئی تھی۔ "کولمبس" نے اجازت لی۔ ہسپانیہ کے حکمران دو میاں بیوی تھے جنہوں نے دھوکے سے غرناطہ مسلمانوں سے چھینا تھا۔ "فرڈی نینڈ" شوہر تھا۔ "ازابیلا" ملکہ تھی۔ میاں بیوی دونوں کے پاس پہلے دو الگ الگ ریاستیں تھیں پھر ان کی شادی ہوگئی تو متحدہ عیسائی ریاست انہوں نے بنائی۔ دونوں انتہائی متعصب تھے۔ دونوں نے اپنی زندگی کا ہدف یہ طے کیا کہ ہسپانیہ کو مسلمانوں سے، موروں سے، وحشی موروں سے آزاد کرانا ہے۔ ایک طرف تو ان لوگوں کو لالچ تھی کہ کسی طرح ہم کوئی نئی دنیا دریافت کریں، اگر وہاں معدنیات نکلتی ہیں، کوئی خاص چیز پائی جاتی ہے تو ہمارے قبضہ میں آ سکتی ہے۔ سونا چاندی لونڈی غلام ہم قبضہ کریں گے اور بدلے میں عیسائیت پھیلائیں گے۔ ایک طرف اُن عیسائیوں کو یہ لالچ تھی۔ دوسری طرف یہودیوں کی مجبوری تھی کہ نئی دنیا تلاش کی جائے کیونکہ مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں یہودی یہاں بالکل پُرسکون رہتے تھے۔ مسلمان ان کا خاص خیال رکھتے تھے کہ یہ اہلِ کتاب ہیں۔ ان کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ لیکن جب متعصب عیسائیوں کی حکومت آئی جو مسلمانوں اور یہودیوں سے یکساں طور پر نفرت کرتے تھے، بلکہ یہودیوں سے کچھ زیادہ نالاں تھے تو یہودیوں کے لیے جان بچانے کا مرحلہ درپیش تھا کہ جائیں کہاں؟ کچھ تو ہسپانیہ سے نکل کر وسطی یورپ میں آ گئے جہاں خلافتِ عثمانیہ کی حدود تھیں، وہاں آرام سے رہے، لیکن یہ وہ بدبخت تھے جن کی نسل میں سے مصطفیٰ کمال پاشا تھا۔ جن کو "دونمہ" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خاص نسل تھی۔ اندر سے یہودی تھے لیکن بظاہر اسلام قبول کر لیا۔ اُن کے ایک ربّی (یہودی عالم) نے فتویٰ دیا کہ تم کسی بھی وقت مذہب تبدیل کر سکتے ہو۔ اسکی اجازت ہے۔ اصل مذہب چھوڑو نہیں، لیکن ظاہرا کوئی بھی مذہب اختیار کر لو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوسرا مذہب اختیار کر لینے سے یہودیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کے نتیجے میں عجیب عجیب لطیفے ہوئے تھے۔ مثلاً عیسائیوں نے اعلان کیا ہوا تھا یا تو عیسائی ہو جاؤ یا اسپین چھوڑ دو۔ مسلمانوں کو بھی کہہ دیا تھا معاہدہ کرنے کے باوجود بھی اور یہودیوں سے تو کوئی معاہدہ ہی نہیں تھا بس عیسائی ہو جاؤ یا اسپین چھوڑ دو۔ یہودیوں نے کہا: ہم عیسائی ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے کہا: یہ تو نہیں ہو سکتا، ہم عیسائی نہیں ہوتے، جب تک جان ہے تو لڑیں گے، لہٰذا انہوں نے اپنے طور پر جہاد شروع کر دیا۔ انہوں نے کوشش کی کہ لڑتے لڑتے ادھر بحر متوسط کے ساحل کی طرف نکلا جائے۔ یہاں ساحل پر مشہور مسلمان جہاز راں "خیر الدین باربروسا" اپنا جہاز لیے کھڑا تھا۔ وہ ان کو سوار کر کے مراکش پہنچا دیتا تھا۔ یہ اُن کا آج کے مراکشی مسلمانوں پر اور ماضی کے ہسپانوی مسلمانوں پر احسانِ عظیم ہے۔ لیکن یہودیوں نے کہا: کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مذہب تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس پر بڑا عجیب لطیفہ وجود میں آیا۔ ایک مرتبہ جب یہودی مذہب تبدیل کرنے کے لیے پادری کے پاس جمع تھے تو شام کا وقت ہو گیا۔ عیسائی بننے والوں کا رش زیادہ تھا۔ یہودیوں نے جلدی مچائی کہ ہمیں جلد بپتسمہ دو اور عیسائی بناؤ۔ پادری نے کہا: بھئی! کیے دیتا ہوں، صبر کرو۔ لیکن ان کا اصرار تھا یہودی مذہب کے مطابق دعا میں دیر ہو رہی ہے۔ یعنی جلدی مشرف بہ عیسائیت کرو کہ ہم جائیں اور اپنے مذہب کے مطابق دعا کریں۔ یہودیوں کے علماء کے فتاوی کچھ اس قسم کے ہیں۔

ان میں سے کچھ خلافتِ عثمانیہ کی حدود میں چلے گئے اور وہاں جا کر ''مسلمان'' بن گئے اور ادھر اسپین میں رہنے والے ''عیسائی'' بن گئے۔ ان کے لیے مذہب کی تبدیلی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جو خلافتِ عثمانیہ کی حدود میں آکر رہتے تھے۔ ان میں ایک یہودی، جس کا نام ''قرہ صوہ آفندی'' تھا۔ وہ سلطان عبدالحمید دوم کے پاس گیا کہ آپ کی خلافت بہت مقروض ہے۔ اپنی وسیع وعریض حدود میں سے فلسطین کا اتنا سا ٹکڑا ہمیں دیدو۔ آپ کے سارے قرضے ہم اُتار دیں گے۔ وہ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کا دور تھا لیکن سلطان کی رگوں میں عثمانی خلفاء کا خون تھا۔ اس نے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے تھوڑی سی زمین کھرچی اور یہودی نمائندے سے کہا: ''فلسطین مانگتے ہو؟ اگر پورے قرضوں کے عوض ''القدس'' کی اتنی سی مٹی بھی مانگو گے تو نہیں دیں گے۔ اس لیے کہ یہ ہمارے آباء واجداد نے جہاد کر کے لی ہے۔ خرید کر نہیں لی کہ میں بیچ دوں۔'' یہ تو وقف ہے۔ جس طرح مسجد وقف ہو جائے تو کسی کی ملکیت میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح جو جگہ دارالاسلام بن گئی وہ اب دارالحرب والوں کو نہیں دی جاسکتی۔ اگر اس پر قبضہ ہو جاتا ہے تو پوری دنیا کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس کو چھڑائیں۔ واپس لیں اور اسے پھر سے دارالاسلام بنائیں۔ کچھ یہودی استنبول نکل گئے۔ جو ہسپانیہ میں رہ گئے انہیں عیسائیوں کی طرف سے بہت سخت رویے کا سامنا تھا۔ عیسائی حکمران اور پادری انہیں طرح طرح کی سزائیں دیتے تھے۔ عیسائی تاریخ میں بھی وہ سزائیں انتہائی شرمناک سزائیں سمجھی جاتی ہیں جو عیسائی پادری ان یہودیوں کو دیا کرتے تھے۔

عجیب عجیب سزائیں تھیں۔ زندہ آدمی کی کھال اُتروا دیتے تھے یا زندہ جلا دیتے تھے۔ کس بات پر؟ تم نے عیسائیت کا احترام نہیں کیا۔ اب احترام کرنا نہ کرنا ''کلّی مشکک'' ہے۔ کتنا احترام کریں؟ اس کا کوئی معیار مقرر نہیں ہے۔ احترام نہ کرنے کا مطلب: تم نے پادری کو سجدہ نہیں کیا، تم پورا جھکے نہیں، غرض ان کی کیا ہوتی تھی؟ اس مجرم کی جائیداد بحق گرجا ضبط ہو کر پادری کو ملے۔ تو جتنے مروادو، اتنی ہی زیادہ جائیداد ضبط ہوگی اور گرجا کے حصہ میں آئے گی۔ پادری کی دولت میں اضافہ ہوگا۔ یہودیوں کے لیے ہسپانیہ کا متبادل تلاش کرنے کی یہ پہلی مجبوری تھی۔

یہودیوں کی امریکا میں دلچسپی کی وجہ:

یہودیوں کی امریکا کو دریافت کرنے اور اس بحری جہاز راں کولمبس کو خرچ دینے کی دوسری مجبوری یہ تھی کہ اُن کو مسلمانوں کا دور یاد آتا تھا کہ یہودی تو دربارِ خلافت میں مشیر ہوتے تھے۔ وزیر ہوتے تھے۔ بڑی عزت کے ساتھ بٹھائے جاتے تھے۔ مثلاً ''موسی بن میمون'' مشہور یہودی فلسفی اور طبیب ہے ہسپانوی خلفاء کے ہاں بڑے مقام ومرتبہ کا مالک تھا اور مسلمانوں کے مزاج میں جو حلم اور وسعتِ ظرفی ہے، جیسا کہ قرآن شریف نے کہا ہے ﴿فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾ [الصافات:101] حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق جس صفت کی پیش گوئی کی گئی ہے وہ صفت بنو اسماعیل یعنی مسلمانوں میں بھی ہے کہ ان میں حلم بہت ہے۔ کل کا جانی دشمن آج مسلمان ہو گیا تو نماز میں ہمارے ساتھ کھڑا ہوگا۔ ایک تھال میں کھانا کھائے گا۔ کسی چیز میں فرق نہیں ہوگا۔ جو فرق کرے گا وہ اچھا مسلمان ہی نہیں ہے۔ ہم لوگ فرق نہیں کرتے۔ سب معاف ہو گیا۔ "الإِسْلَامُ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَه." اور ادھر حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق پیش گوئی ان الفاظ میں دی گئی ''وَبَشَّرُوْهُ بِغُلَامٍ عَلِيْمٍ.'' [الذاریات:28] کہ صاحبِ علم ودانش اور ذکی وذہین ہے۔ تو یہودی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بہت زیرک اور ذہین۔ جبکہ مسلمان حلیم اور وسیع الظرف ہوتے ہیں۔

بنو اسرائیل یعنی یہودیوں کی مجبوری تھی کہ کوئی اور نئی زمین دریافت ہو جائے اور وہ اس کی طرف ہجرت کر جائیں۔ بالکل ایسے جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے 12 بیٹوں اور ان کی اہلیہ محترمہ نے فلسطین سے مصر کی طرف ہجرت کی تھی۔ اسی طرح ہسپانیہ کے یہود نے کولمبس کے ساتھ اپنے آدمی بھیجے۔ سرمایہ بھی فراہم کیا۔ سرمایہ یہودیوں کا تھا۔ رہنمائی مسلمانوں کی تھی۔ مسلمانوں کے نقشے، مسلمانوں کی رہنمائی کے بغیر کولمبس پار نہیں جاسکتا تھا۔ کولمبس دراصل ہندوستان کی دریافت کو نکلا تھا۔ اس کو اتنا پتا تھا زمین گول ہے۔ اتنا پتا تھا ہندوستان پہنچ کے ہم اپنے قدم جمالیں گے۔ وہ بڑا امیر ملک ہے۔ ہسپانوی کیوں قدم جمالیں گے؟ لوٹ مار کے لیے اور یہودی کیوں وہاں جگہ بنالیں گے؟ اُن کی قسمت میں خدا نے یہ لکھا ہے ﴿لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ

سُوْءَ الْعَذَاب."[انفال:167]"وَإِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا."[الاسراء:8]تم پھر یہی کروگے تو ہم پھر یہی کریں گے۔ان کی قسمت میں ذلت وخواری، دربدری اور جلاوطنی لکھی ہے۔ان دونوں کی مجبوریوں نے اور مسلمانوں کے علم ودانش نے کولمبس کو ہندوستان کو دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا اور میں عرض کر چکا ہوں دو الگ الگ سیاح ہندوستان کی دریافت کے لیے روانہ ہوئے۔واسکوڈے گاما پرتگال سے روانہ ہوا اور اس نے کہا میں افریقا کے جنوب کا رُخ لیتا ہوں۔کولمبس نے کہا میں سیدھا جاتا ہوں اور گھوم کر ادھر چین سے ہوکر ہندوستان آجاؤں گا۔اتنا ان کو پتا تھا کہ زمین گول ہے۔گھوم کر ہم ہندوستان آسکتے ہیں۔

کولمبس جب نکلا تو سیدھا امریکا جانے کے بجائے ہواؤں کے زور سے بھٹک کر کیریبین جزائر کی طرف آنکلا۔ان کو: ویسٹ انڈیز یعنی''جزائرِ غرب الہند'' کہتے ہیں، کیونکہ وہ اس کو ہندوستان سمجھتا رہا۔اس کے مقابلے میں انڈونیشیا کو: ایسٹ انڈیز یعنی''جزائرِ شرق الہند'' کہتے ہیں۔آگے''جغرافیائی اشتراک'' کے سبق میں ہم پڑھیں گے کہ ویسٹ انڈیز چند جزائر کے مجموعے کو کہا جاتا ہے اور ایسٹ انڈیز انڈونیشیا کے ساڑھے سترہ سو جزائر کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ان میں سے پانچ بڑے بڑے ہیں۔ان کے مجموعے کو انڈونیشیا یا ایسٹ انڈیز کہا جاتا ہے۔بہرحال کولمبس جہاں پہنچا اس کا نام''ویسٹ انڈیز'' ہوگیا۔بعد میں یہ امریکا جا پہنچا۔وہاں کی ایک ریاست کا نام ہے:''کنکٹی کٹ''، یہ کنعان کا''موڈیفکیشن'' ہے۔یہ امریکا کی ان تین ریاستوں میں سے ہے جن میں یہودی بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔تینوں جڑواں یعنی مثلث کے کونوں کی طرح اکٹھی ہیں۔نیویارک، نیوجرسی اور کنکٹی کٹ، تینوں قریب قریب ہیں۔جب یہود یہاں پہنچے تو انہوں نے کہا: واہ! ہمیں نیا کنعان مل گیا۔نیویارک کے قریب نیوجرسی اور کنکٹی کٹ ہے۔کنکٹی کٹ کے بارے میں انہوں نے کہا ہمیں نیا کنعان مل گیا اور نیو یارک کا نام''جیو یارک'' بھی لیا جاتا ہے۔تو نیا کنعان (کنعانِ جدید) گویا''کنعانِ قدیم'' واپسی سے پہلے کنعانِ جدید جا پہنچے۔یہ ان کی اصطلاح ہے کہ اصلی یروشلم سے پہلے عارضی یروشلم، کنعانِ قدیم سے پہلے کنعانِ جدید، ایک زمانے میں مسیحا آئے گا جو ہمیں کنعانِ قدیم (فلسطین) میں لے جائے گا، لیکن ابھی فی الحال ہمیں کنعانِ جدید (کنکٹی کٹ) میں گذارہ کرنا ہے۔یہودی اور ہسپانوی اس طرح سے یہاں آپہنچے۔یہاں جو مقامی لوگ انہوں نے دیکھے ان کا نام: ''ریڈ انڈین'' رکھا تھا۔اس کو عربی میں:''الہندی الأحمر'' کہتے ہیں۔

امریکا کو کس نے دریافت کیا؟

لوگ کہتے ہیں کولمبس نے امریکا دریافت کیا تھا یعنی ہندوستان کی تلاش میں نکلا اور پہلے جزائرِ غرب الہند (ویسٹ انڈیز) پہنچا اور پھر اصل بڑے براعظم تک جا پہنچا اور یہاں سے سونا، چاندی، تمباکو وغیرہ لے کر گیا اور ملکہ ازابیلا کو دکھایا۔یہ ملکہ بڑی لالچی تھی اور یہ اپنے شوہر سے زیادہ متعصب تھی۔کولمبس کچھ ریڈ انڈین کو غلام بنا کر لے گیا تھا۔سونا چاندی بہت کچھ لایا اور کہا: دیکھو! ادھر اتنا کچھ مال ہے۔تمہارا خرچہ رائیگاں نہیں گیا۔میں نے یہ سب دریافت کرلیا۔کولمبس نے دریافت کا سہرا اپنے سر لیا، حالانکہ تاریخ میں دو باتیں صاف صاف لکھی ہیں اگر تیسری نہ بھی ہو تو۔ایک یہ بات لکھی ہے کہ آٹھ مسلمان بھائی اس جزیرے تک جا پہنچے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ وہاں سرخ سرخ لوگ رہتے ہیں۔مسلمان جغرافیہ دان''المقدسی'' نے اپنی کتاب میں ان کا قصہ لکھا ہے کہ کشتیاں ان کو ادھر لے گئیں تھیں۔دوسرے مغربی لٹریچر اور مغربی تاریخ داں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ صبح کا دھندلکا جب ہوا تو ایک مسلمان ملاح نے آواز لگائی: ارے! ہم نے مغربی زمین دیکھ لی۔کولمبس نے ڈانٹا: چپ رہو! میں نے کل رات غروب سے پہلے اسے دیکھ لیا تھا۔مغربی تاریخ دانوں کا، جہاز رانوں کا، سمندر پیماؤں کا اتفاق ہے اس زمانے میں اتنا فاصلہ رات مغرب سے صبح فجر تک طے ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ مغرب کے وقت اسے دور سے دیکھ لیتا۔اس نے جھوٹ بولا۔اسے اس جھوٹ کی سزا بھی ملی۔مسلمانوں کی دریافت اس نے اپنے نام کرلی لیکن یہ اس کی بجائے ایک اطالوی سیاح''امریگو واسپیوشی'' کے نام سے موسوم کی گئی اور یہ نیا براعظم بالآخر''امریکا'' کے نام سے مشہور ہوا۔کولمبس اسے اپنے نام لگوانے میں ناکام رہا۔

تیسری دلیل میں کولمبس کے غلط دعووں کی تردید میں یہ دینا چاہتا تھا کہ جب ہسپانوی حریص قزاق یہاں پہنچے تو دیکھا وہاں کے جو سکّے ہیں ان پر عربی

حروف، عربی نام، عربی کلمات لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے عرب یہاں پہلے آئے ہوئے تھے اور وہ ریڈ انڈین کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ عرب مسلمان وہاں تجارت کرتے تھے اسی لیے تو وہ سکے وہاں موجود تھے۔ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ سکے وہاں کیسے پہنچے تھے؟ اس کے متعلق تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ افریقہ کے مسلمانوں نے یہاں تجارتی روابط قائم کر رکھے تھے۔

ایک امریکی محقق ڈاکٹر ادیب رشاد کے مطابق افریقی نژاد مسلمان کولمبس سے 180 سال پہلے امریکا پہنچے تھے۔ ادیب رشاد اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''اسلام، قوم پرستی اور غلامی'' میں رقمطراز ہیں کہ نئے افق اور جہتیں تلاش کرنے والے افریقی نژاد مسلمانوں اور تاجروں نے منسا ابوبکر محمد نامی بادشاہ کی رہنمائی میں براعظم شمالی اور جنوبی امریکہ کے کئی علاقوں کا کھوج لگایا۔ ان میں وہ علاقہ بھی شامل ہے جسے ریاست ہائے متحدہ امریکا کہا جاتا ہے۔ ادیب رشاد کا دعویٰ ہے کہ افریقی نژاد مسلمانوں نے مقامی امریکیوں یعنی امریکا کے اصلی باشندوں سے تجارتی اور سماجی روابط بڑھائے، باہم شادی بیاہ کیے اور انہیں مشرف بہ اسلام کیا۔

افریقی نژاد امریکی مسلمانوں میں روزے رکھنے کی روایت کا سراغ غلامی کے تباہ کن اور پُر مصائب دور سے ملتا ہے۔ اس دور میں نو آبادیاتی نظام کے تحت زیر کاشت رقبوں میں بیگار اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے افریقیوں میں بہت سے فرزندان اسلام تھے۔ مسلمان غلاموں کو روزے رکھنے یا اسلام کے کسی اور رکن پر عمل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جو غلام، نماز روزہ یا کسی اور رکن اسلام پر عمل کرتا ہوا پکڑا جاتا اسے موت یا کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی لیکن کچھ آقا ایسے بھی تھے جو مسلمان غلاموں کو شعائر اسلامی پر عمل کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ وہ رمضان کے دوران اوقاتِ رمضان کی مناسبت سے مسلمان غلاموں کے کام کے اوقات میں ردوبدل کر دیتے تھے اور انہیں نمازوں کی ادائیگی کے علاوہ سحری کھانے اور افطار کرنے کی مہلت دیتے تھے۔

صالب العلی ایک زرعی فارم کے مالک کا غلام تھا۔ البرٹ ربوتو نے اپنی کتاب "Slave Religion" میں لکھا ہے کہ اپنے آقا "جمیز کوپر" کے بقول صالب العلی ایک پکا مسلمان ہے۔ وہ شراب نہیں پیتا، مختلف مواقع پر، خصوصاً رمضان میں روزے رکھتا ہے۔ اگرچہ بہت سے مسلمان غلاموں نے اپنے آقاؤں کے ظلم و جبر سے مجبور ہو کر اسلام سے لاتعلقی اختیار کر لی لیکن کچھ مسلمان غلاموں نے تمام تر ظلم و جبر کے باوجود عیسائیت اختیار کرنے سے انکار کر دیا اور اسلام پر ثابت قدم رہے اور رمضان المبارک کے روزوں سمیت اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کے پابند رہے۔

یرومنوط (Yarrow Manout) بھی ایک ایسے ہی راسخ العقیدہ مسلمان غلام تھے جنہوں نے اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا۔ ان کا ایمان تھا کہ وہ صرف اللہ کے غلام ہیں۔ وہ نہ صرف ماہ صیام کے روزے رکھتے بلکہ تلاوت قرآن کرتے اور دوسرے اسلامی اصولوں کی پابندی کرتے تھے بلکہ لباس بھی روایتی اسلامی وضع کا استعمال کرتے تھے۔

کچھ مسلمان غلام، قدیمی افریقی سلطنتوں سے پکڑ کر لائے گئے تھے۔ پرنس عبدالرحمٰن نے تحقیق اور چھان بین کے بعد سراغ لگایا کہ ان کا سلسلہ نسب مشہور موریہ سلطنت کے بانی خاندان سے ملتا ہے جس نے ہسپانیہ کو فتح کیا اور تہذیب یافتہ بنایا۔ صالح بلائی، سوڈان کے فلاح خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کا سلسلہ نسب مصر کے گڈریئے بادشاہوں سے ملتا ہے۔ جوب بن سلیمان کا سلسلہ نسب شاہ سلیمان اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔

میں نے عرض کیا یہ ایک رُخ تھا جس سے پتہ چلا کہ مسلمانوں نے امریکا دریافت کیا۔ کولمبس نے اس کو اپنے نام لگایا لیکن اللہ نے اس کے نام لگنے نہیں دیا۔ ہوا یوں کہ اٹلی کا ایک سیاح بحری سفروں کا شوقین تھا۔ اس کا نام ''امریگو واسپیوشی'' تھا۔ یہ امریگو لکھاری بھی تھا، کولمبس کی طرح لٹیرا نہیں تھا کہ پیسے لے لے کر یہودیوں اور لالچی ملکاؤں کے لیے نئی دنیا دریافت کر کے کہے کہ ان بے قصور لوگوں کے ملک جاؤ اور لوٹ مچاؤ اور اپنے پیسے کھرے کر لے۔ وہ یہ کام نہیں کرتا تھا بلکہ وہ لکھاری تھا، سیاح تھا، سفرنامے لکھتا تھا۔ اس نے امریکا کا سفر کیا اور واپس آ کر وہاں کی داستان لکھی جو یورپ میں بڑی مشہور ہوئی۔ یہاں کے جغرافیہ دانوں نے مشورہ کیا کہ امریگو کے نام پر اس نئے ملک کا نام رکھا جائے۔ پھر امریگو سے ''امریکا'' ہو گیا۔

واسکوڈے گاما جب نکلا تو اس سے پہلے جب جہاز راس افریقہ کی کھوپڑی سے گھومتے تھے یعنی مغربی افریقہ سے آگے سمندر گھومتا تھا۔ یہ سمندر خطرناک بھی ہے۔ ساحل پر سہولتیں بھی نہیں ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ آگے ساحل ہے یا نہیں؟ جہاز بڑے نہیں ہوتے تھے۔ خوراک اور ایندھن کم ہوتا تھا۔ تو وہ آگے نہیں جاتے تھے۔ گھبرا جاتے تھے۔ واسکوڈے گاما تو ہندوستان کی دریافت کی مہم پر نکلا تھا۔ اس نے کہا آگے وہاں تک جانا ہے جہاں لوگ ابھی تک نہیں گئے۔ ملاح گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا ہم آگے نہیں جائیں گے۔ انہوں نے واسکوڈے گاما کو دھمکی دی اگر واپس نہیں ہوئے تو تمہیں قتل کر دیں گے۔ اس نے اپنے پاس موجود نقشے نکال کر پھاڑ دیے کہ میرے بغیر تم بھی واپس نہیں جاسکو گے۔ کیونکہ سمندری راستے صرف مجھے معلوم ہیں۔ اس پر انہوں نے سفر جاری رکھا اور مغربی افریقہ سے جنوبی افریقہ کی طرف نکلے۔ جب یہاں پہنچے تو یہ وہ جگہ تھی جہاں سے سمندر مڑ رہا تھا۔ ہندوستاں کی دریافت کی کرن نظر آنا شروع ہوگئی تھی۔ انہوں نے اسے نام دیا: ''کیپ آف دی گڈ ہوپ'' (Cap of the good hope) اُن کو اچھی امید کی کرن یہاں محسوس ہوئی کہ یہاں سمندر گھوم رہا ہے اور اب ہم ہندوستان پہنچ جائیں گے۔ اتنا انہیں اندازہ تھا کہ ہندوستان اس طرف ہے۔ جب واسکوڈے گاما یہاں سے گھوما تو موزمبیق کے راجا کے پاس پڑاؤ کیا۔ اس نے انہیں خوراک اور ایندھن دیا۔ جہاز وغیرہ مرمت کیے۔ بحری نقشے دیے۔ نئے رہنما اس کے ساتھ کیے۔ تو اس نے دوبارہ موزمبیق چینل سے سفر شروع کیا اور بحرِ ہند سے ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ تک جا پہنچا۔ یہاں ''گوا'' کے ساحلی علاقے میں پرتگیزیوں کی حکومت کافی عرصہ رہی۔

سقوطِ ہسپانیہ کے بعد دو بڑے حادثے:

میں نے عرض کیا تھا مسلم اسپین کے سقوط سے پوری دنیا کے لیے ایک حادثہ ہوا کہ امریکا مسلمانوں کی دریافت ہوتی آج اس پورے خطے کے وسائل مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتے، اس پورے خطے کی ریڈ انڈین آبادی مسلمان ہوتی۔ اس کے وسائل اسلام کے حق میں استعمال ہوتے۔ پہلا حادثہ عالمی ہوا کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کا عالمی دشمن یہاں پیدا ہوا۔ موجودہ امریکیوں کے آباء واجداد درحقیقت وہ اسپینی عیسائی تھے جن کے منہ کو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا خون لگ چکا تھا۔ غدر، غدر اور غدر۔ یہ لوگ غدر کی بنا پر یہاں آگئے جس میں مسلمانوں کے نقشے استعمال ہوئے۔ دلیل میری بات کی یہ ہے کہ سقوطِ ہسپانیہ کا سن 1492ء ہے اور امریکا کی دریافت کا سن بھی یہی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ ابوعبداللہ غرناطہ کا آخری پرویزی حکمران تھا۔ اگر مسلمانوں کے ساتھ خیانت اور غداری نہ کرتا کہ ہتھیار ڈال دو۔ میں تمہاری جانیں بچانا چاہتا ہوں تو یہ دریافت مسلمانوں کے نام لکھی جاتی۔ یہ ایک عالمی حادثہ ہوا۔

دوسرا حادثہ ہم برصغیر والوں کے لیے ہوا۔ ان بے گناہوں کا خون بھی شاید ابوعبداللہ کے کھاتے میں لکھا جائے گا جو برصغیر میں پہلے پرتگیزیوں کے ہاتھوں، پھر ولندیزیوں کے ہاتھوں، پھر انگریز کے ہاتھوں مارے اور لوٹے گئے۔ سلطنتِ مغلیہ کا زوال بھی اسی غدار اور ایمان فروش کے کھاتے میں جائے گا۔ جب واسکوڈے گاما جنوبی ہند آکر اُترا تو ہندوستان دریافت ہوگیا۔ یورپ والوں کو پتہ لگ گیا کہ ادھر سونے کی چڑیا ہے۔ ان کے اپنے پاس تو کچھ ہے نہیں۔ یہ شمال کے اتنا قریب ہیں کہ سمندر اِن کا ٹھنڈا، زمین پر برف جمی ہوئی ہے۔ آسمان سے کہر برستا ہے۔ کمائیں گے کدھر سے؟ یورپیوں کی اپنی زمین سے کیا نکلتا ہے؟ آسمان سے کیا برستا ہے؟ پوری دنیا کو لوٹنے کے علاوہ اِن کا ذریعہ معاش نہیں ہے۔ یہ عالمی لٹیرے ہیں۔ اِن پرتگیزیوں کے بعد ہالینڈ والے ولندیزی آگئے پھر فرانس والوں نے کہا: ہم کیوں پیچھے رہیں؟ آخر میں یہ خرگوش کا بچہ انگلینڈ آیا۔ اس نے اپنی کالونی قائم کی کیسی کالونی؟ تجارتی کالونی۔ پہلے آکر مغل بادشاہوں کو سر درد کی دوائی دی پھر عیاشی کے ساز وسامان جو ادھر انگریزوں کے ہاں ہوتے ہیں وہ لالا کر بیچے۔ پھر یہ اجازت لی کہ اس صلہ میں آپ ہمیں ساحل پر تجارتی گودام بنانے دیں۔ مغل بادشاہ دریادل تھے۔ اجازت دے دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس بہانے آکر یہاں اُتر گئی اور آج تک اِن کم بختوں نے ہماری جان کو نہیں چھوڑا۔

امریکا کی دریافت اور ہسپانویوں کے وہاں پر قبضے کی بات ہو رہی تھی۔ امریکا کی دو بڑی زبانیں ہیں۔ ہسپانوی اور انگریزی۔ ہسپانویوں کے امریکا پہنچنے

کی تاریخ آپ نے سن لی۔اب انگریزوں کی یہاں تک رسائی کا قصہ سنیں۔انگریز امریکا کیسے پہنچا؟ انگلینڈ کی ایک بندرگاہ ''پلے ماؤتھ'' ہے۔یہاں سے ایک جہاز بھر کر امریکا بھیجا گیا۔اس میں کچھ بدعقیدہ عیسائی سوار تھے جنہیں سزا کے طور پر جلاوطن کر کے سمندر پار بھیجا گیا تھا۔یہ لوگ امریکا پہنچے تو ہسپانویوں کے بعد انگریز کے قدم بھی یہاں گڑ گئے۔آج آدھے امریکی، لٹیرے ہسپانوی ہیں اور آدھے امریکی، بھگوڑے انگریز ہیں۔پہلے تو انہوں نے ریڈ انڈین قبائل کو قتل کیا، پھر انہیں دھوکے سے مارا۔وہ ایسے کہ ان میں چیچک زدہ کمبل تقسیم کیے جس سے سب کو چیچک ہوئی۔امریکہ کی ایک ریاست جارجیا ہے۔ادھر سے سونا نکل آیا تو انگریزوں نے وہاں کے قدیم باسیوں سے کہا: شام سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ۔بھائی! کدھر جائیں؟ دریائے مسی سپی کے پار چلے جاؤ جس کا ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ تھا۔وہ مرتے کیا نہ کرتے، روانہ ہو گئے اور ساتھ میں گھوڑوں اور تانگوں پر یہ انگریز تھے۔جو مر گیا اس کو ادھر ہی ڈال دیا۔باقی کو دریائے مسی سپی کے پار چھوڑ کر آئے۔ریڈ انڈین نے اس المیہ پر نظمیں لکھیں۔دردناک تحریریں لکھیں اور جارجیا سے مسی سپی تک اس سڑک کا نام ''آنسوؤں کی شاہراہ'' رکھ دیا۔سب سے پہلے تو بچھو اپنی جنم دینے والی ماں کو ڈنگ مارتا ہے۔سب سے پہلے ہسپانوی اور انگریزوں نے ریڈ انڈین کی آبادی کو ختم کیا۔آج امریکا کی اصل آبادی جو ریڈ انڈین ہے، ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔یہ ایک راستہ ہے امریکا کو دریافت کرنے کا۔مسلمانوں نے تو دوسرے راستہ سے بھی اسے دریافت کر لیا تھا۔یعنی روس سے درّۂ بیرنگ پار کر کے الاسکا پہنچ گئے تھے۔یہ وسطی ایشیا کے مسلمان تھے جو اوپر شمال سے امریکا تک جا پہنچے تھے۔اس عاجز نے اپنی کتاب ''ہسپانیہ سے امریکا تک'' میں اس داستان کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

جغرافیہ کی تدریس کا مقصد:

آخر میں ایک نکتہ یاد رکھیں: اسکول کالجوں میں جو جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے اس میں غیر مسلموں کی عظمت دل میں بٹھاتے ہیں۔مدارس میں جو جغرافیہ پڑھایا جائے، سیاسی ہو یا تاریخی، اس میں دشمن کی عظمت سامعین کے دل پر نہیں بٹھائی جانی چاہیے، بلکہ میں اپنے آباء واجداد کی عظمت بٹھائی جانے کی وصیت کرتا ہوں۔وہ بہادر تھے۔اولوالعزم تھے۔وسیع الظرف تھے۔رحم دل اور بردبار تھے۔عہد شناس اور اخلاقی روایات کا احترام کرنے والے تھے۔جب ان کے عروج کا زمانہ تھا تو ان کی تاریخ میں غدر کا ایک واقعہ نہیں دکھایا جا سکتا۔اس کے مقابلہ میں انگریز مکار تھے۔دھوکہ اور فریب ان کی فطرت کا دوسرا نام ہے۔وہ کم ظرف اور ظالم تھے۔امریکی انہی کی اولاد ہیں۔غدر، ظلم، سنگدلی اور بے رحمی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ان سے انسانیت اور اخلاق کی امید رکھنا فضول ہے۔جب سے ان کے عروج کا زمانہ آیا ہے انہوں نے دنیا کو کرب واذیت سے دوچار کر رکھا ہے۔ہمارے ہاں کے مغرب زدہ دانش ور کہتے ہیں جب مسلمانوں کی باری تھی تو انہوں نے بھی وہی کچھ کیا تھا جو آج امریکا کر رہا ہے۔یہ بات بالکل غلط ہے۔ان کے عہدِ عروج اور مسلمانوں کے عہدِ عروج میں بہت بڑا فرق ہے، کہ مسلمانوں نے کبھی کسی سے وعدہ خلافی نہیں کی۔غدر نہیں کیا۔زبان دے کر نہیں مکرے۔جبکہ ان کی تاریخ مکر وفریب اور غدر وخیانت سے بھری ہوئی ہے۔مسلمانوں سے ان کا موازنہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

دسواں سبق

یورپ

شمالی یورپ:

آج ہم یورپ شروع کرتے ہیں۔ آپ یورپ کو ملاحظہ کیجیے۔ اوپر کا حصہ شمالی یورپ ہے جس میں تین ممالک ہیں اور بعض ان کے ساتھ چوتھے کو بھی گنتے ہیں جیسے ہم جغرافیائی اشتراکات میں پڑھیں گے۔ ان میں تین تو یہ ہیں: سویڈن، ناروے، ڈنمارک۔ چوتھا فن لینڈ ہے۔ یہ چار ممالک یورپ کے انتہائی شمال میں واقع ہیں۔ دنیا کے بھی آخری شمالی سرے پر واقع ہیں۔ ان کے ساتھ واقع روس کے شمال میں بھی ٹھنڈا برفستان ہے۔ اس میں آبادی نہیں ہے۔ ان تین ممالک کے دارالحکومت جنوب کی طرف ہیں اور آبادی بھی اِدھر ہی ہے کیونکہ شمال میں ٹھنڈ سے انسان مرجاتا ہے۔ یورپ کے شمال میں یہ چار ممالک ہیں جو "سکنڈے نیوین" کہلاتے ہیں۔ فن لینڈ، سویڈن، ناروے اور ڈنمارک۔ ان کے ساتھ واقع تین ریاستیں بھی یورپ میں آتی ہیں۔ ان کو "بالٹک ریاستیں" کہتے ہیں۔ اسٹونیا، لٹویا، لتھوانیا۔ ان کے ساتھ بالٹک سمندر ہے۔ اس سمندر کے کنارے تین بالٹک ریاستیں ہیں۔ ان ریاستوں کے ساتھ روس کا یورپی حصہ "لینن گراڈ" ہے۔

مغربی یورپ:

یورپ کے شمالی حصے سے فارغ ہونے کے بعد برِّ اعظم یورپ کے دائیں اور بائیاں واقع دو حصوں پر نظر ڈالیے۔ دائیں طرف مشرقی پٹی ہے اور بائیں طرف مغربی پٹی ہے۔ مغربی پٹی کے آگے سمندر میں انگلینڈ ہے جو "بڑی جزیرے" کی تعریف میں آتا ہے۔ یعنی برِّ اعظم سے ٹوٹا ہوا ایک جزیرہ۔ مغربی یورپ میں فرانس، اسپین ہیں جن کو مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے روندا ہوا ہے۔ یہاں 17 ہزار مسلمانوں اور ڈیڑھ لاکھ کافروں کا مقابلہ ہوا تھا۔ مسلمانوں کو پتہ تھا کہ سمندر کے سوا واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے لہٰذا انہوں نے واپس جانے کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ اسپین کے ساتھ چھوٹے چھوٹے دو ملک ہیں: پہلا بلجیم ہے، دوسرا ہالینڈ ہے۔ اسپین کے مغرب میں پرتگال ہے۔ یہ پہلے اسپین کا حصہ ہوتا تھا۔ اب الگ ملک بن گیا۔ اب مغربی یورپ کی پٹی مکمل ہو گئی۔ ہالینڈ، بلجیم، فرانس، اسپین، پرتگال۔ اسے پہلے سیدھا پڑھیں پھر الٹا پڑھیں۔ آسانی سے یاد ہو جائے گی۔ یعنی: پرتگال، اسپین، فرانس، بلجیم، ہالینڈ۔ یہ یورپ کی مغربی پٹی ہے۔

مشرقی یورپ:

یورپ کے مشرق میں جو تین ممالک ہیں: بیلا روس، یوکرائن اور مالدووا۔ یہ تینوں سابقہ سویت یونین کے قبضے میں تھے۔ روس نے 15 ملکوں پر قبضہ کیا ہوا

تھا۔ (9 وسطی ایشیا کے، تین مشرقی یورپ کے، تین بالٹک ریاستیں، یہ 15 ہوگئیں۔ آگے کمیونزم کی جو لہر تھی اس نے مشرقی یورپ یعنی پولینڈ، رومانیہ، بلغاریہ کو بھی اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔ جرمنی بھی آدھا کمیونزم نے کھالیا تھا۔ مغربی یورپ والے تھر تھر کانپتے تھے کہ ہم اور ہمارا سوشلزم کہاں جائے گا؟ جرمنی بھی آدھا کمیونزم کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ فن لینڈ بھی روس نے کھڑے کھڑے لپیٹ لیا تھا۔ یہ 16 واں ملک ہوگیا اور 17 واں خود روس تھا تو سارے ملا کر 17 ہوگئے۔ 9 وسطی ایشیا کے، تین مشرقی یورپ کے، 3 بالٹک ریاستیں، فن لینڈ اور سترہواں خود روس تھا۔ یعنی یہ 17 ممالک کمیونسٹ بلاک میں شامل ہوگئے تھے۔ آدھا یورپ کمیونزم کا شکار ہوگیا تھا۔ بقیہ آدھا رہ گیا تھا۔ یہ افغان مجاہدین تھے جنہوں نے یورپ کو اور ساری دنیا کو سرخ ریچھ کے پنجوں سے آزاد کروایا۔ اس کے بدلے میں احسان فراموش دنیا آج جو کچھ ان کے ساتھ کر رہی ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔

مشرقی یورپ کی پٹی میں جب آئیں گے تو آپ کو یہ پانچ ممالک سامنے نظر آئیں گے۔ جو سارے کے سارے کمیونزم کی چھتری تلے آچکے تھے۔ سب سے پہلے ''بیلا روس'' ہے، اس کے نام کے دو ٹکڑے ہیں۔ ان میں سے دوسرے ٹکڑے میں روس کے ساتھ اور پہلے ٹکڑے میں امریکا کے ایک ملک ''بیلائز'' کے ساتھ لفظی اشتراک ہے، جو میکسیکو کے ساتھ ہے۔ بیلا روس، بیلائز اور روس یہ ملتے جلتے نام ہیں۔ دوسرا ملک یوکرائن اور تیسرا ''مالدووا'' ہے۔ مالدووا ''مالدیپ'' سے ملتا جلتا نام ہے۔ مالدیپ، بحر ہند میں مجمع الجزائر ہیں اور مالدووا مشرقی یورپ کا چھوٹا سا ملک ہے جو پہلے روس کے قبضے میں تھا یعنی سویت یونین میں شامل تھا۔ بیلا روس، یوکرائن اور مالدووا کے بعد رومانیہ اور بلغاریہ ہیں۔ ان پانچ ممالک کے بعد ہم مشرقی یورپ کے ممالک کی پٹی میں چھٹے ملک یونان کو بھی شامل کریں گے۔ قدیم تہذیبوں کا مرکز اور علوم وفنون کا گہوارہ۔ جب ان کے عروج کی باری آئی تھی تو اللہ تعالی نے یہاں بڑے بڑے دماغ اور بڑے بڑے فاتح بھی پیدا کیے۔ سکندر جیسا فاتح، جالینوس جیسا حکیم، فیثا غورث جیسا ریاضی دان اور افلاطون، بقراط، سقراط جیسے فلسفی ان میں پیدا ہوئے۔ مگر اب یہاں ایک کوئی عالمی شخصیت پیدا نہیں ہوتی۔ اب یہ لوگ بحری جہازوں کی مرمت کر کے روزگار کماتے ہیں۔

بیلا روس، یوکرائن، مالدووا، رومانیہ، بلغاریہ، یونان۔ یہ چھ ملک یورپ کی مشرقی پٹی میں ہیں۔ ان کے سامنے بحر روم کے ایشیائی ساحل پر واقع ممالک سواحل شام، سواحلِ اسلام اور رباطِ اسلام شمار ہوتے تھے۔ شام کے ساحل کے سامنے یورپ ہے جس کی اکثریت عیسائی ہے۔ فلسطین سے ''پولوس'' عیسائیت کی دعوت لے کر گیا۔ اس نے عیسائیت کی تبلیغ کی تو سارا یورپ عیسائی ہوگیا۔ یہاں کے سارے ممالک مل کر شام کے ساحلوں پر صلیبی جنگ لڑنے آتے تھے۔ شام ساحل بھی ہے، رباط بھی ہے اور سرحدِ بلادِ اسلام بھی ہے۔ سارے مسلمان عرب سے، وسطی ایشیا سے، ترکی سے آکر یہاں پہرہ دیتے تھے تاکہ ''رباط'' یعنی اسلامی سرحدات پر پہرے کی فضیلت حاصل ہوجائے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کا سارا لشکر اپنا نہیں تھا، اس کے لشکر میں رضا کارانہ مجاہدین اور قبائل بہت تھے جو یہ جانتے تھے کہ یہ شخص مخلص ہے۔ صرف اسلام کی خاطر لڑتا ہے نہ کہ سلطنت، غنیمت اور مال کے لیے۔ اُن قبائل میں باہمی دشمنیاں تھیں، لیکن ایوبی کی قیادت میں سارے مل کر بلادِ اسلامیہ کے تحفظ کے لیے پہرہ دیتے تھے۔ صلیبی جنگوں کی یلغار سے تاکہ اگر ٹوٹتا تو شام، حجاز، مکۃ المکرمۃ جو صلیبیوں کا ہدف تھا، خدانخواستہ اس تک وہ پہنچ جاتے۔ ایوبی کو اللہ نے جس دن مصر دیا تو ایوبی نے کہا مجھے یقین ہوگیا اللہ تعالی مجھے فلسطین بھی دے گا۔ اس دن سے اس کے طور طریقوں میں مجاہدانہ اولوالعزمی پیدا ہوگئی۔ مصر اور فلسطین کے بیچ میں صحرائے سینا ہے۔ ایوبی نے کہا کہ جب مجھے طور سینا کا دل ملا تو فلسطین بھی مجھے ضرور ملے گا۔ اس نے شہزادوں والی سب عادتیں چھوڑ دیں اور خالص مجاہدانہ زندگی اختیار کر لی۔

شام میں ''بنوامیہ'' کی حکومت تھی۔ اور عراق کا شہر بغداد ''بنوعباس'' کا پایۂ تخت تھا۔ عباسی خلیفہ ''مامون الرشید'' یونان سے کتابیں لا لا کر ادھر اپنے بنائے ہوئے ادارے ''دارالحکمت'' میں ترجمہ کرواتا تھا۔ منطق، فلسفہ اور طب کی کتابیں منگوا کر ان کا ترجمہ، تلخیص، تسہیل، تہذیب وغیرہ کراتا تھا۔ علوم اور معلومات کی منتقلی پر اس نے اتنی محنت کی کہ یونانی بت پرست تھے، لیکن ان کے فنِ طب کو ''طب اسلامی'' کہتے ہیں اس لیے کہ مسلمانوں نے اس فن کو لے کر اس میں بہت

زیادہ کام کیا۔اسے بہت ترقی دی۔ بہت زیادہ انکشافات واضافات کیے۔اس پر اتنا کام کیا کہ اسے ''طب یونانی'' کے متوازی ''طب اسلامی'' کا نام دے دیا گیا۔

یونان کے دارالحکومت کا نام مشہور ہے ''ایتھنز''۔ایک زمانہ تھا کہ یونان میں بڑے بڑے دماغ پیدا ہوتے تھے۔اب یہاں ساری دنیا کے بحری جہاز آتے ہیں، کیونکہ یونان آج کل کباڑیے مستری کا کام کرتا ہے، یعنی جہازوں کی مرمت کرتا ہے۔اس وقت یہاں دنیا کی بحری جہازوں کی بڑی ورکشاپ ہے۔اب یونان اس کام کی آمدنی پر گزارہ کرتا ہے۔وہ بقراط، سقراط، جالینوس کا دور گیا۔وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔

اس وقت ہم جغرافیہ کی دو اقسام اکٹھی پڑھ رہے ہیں: (1) سیاسی جغرافیہ: جو ہر دن بدلتا ہے اور ہر لحہ بدلنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ (2) تاریخی جغرافیہ: جو سیاسی جغرافیہ کے ساتھ چلتا ہے۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ قرآنی جغرافیہ ہمارے لیے اصل ہے اور جغرافیہ کی بقیہ اقسام ہم بنیاد پکی کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ان معلومات کو آپ ذہن نشین کرلیں تو قرآنی، حدیثی اور سیرتی جغرافیہ ان شاءاللہ بالکل آسان ہو جائے گا۔

گیارھواں سبق: مغربی یورپ

ہسپانیہ

مغربی یورپ میں یہ ممالک واقع ہیں: بیلجیم، ہالینڈ، فرانس اور اسپین۔ ان میں سے اسپین وہ خطہ ہے جس کی وادیوں میں طویل عرصے تک ہماری اذانیں گونجتی رہی ہیں۔ آیئے! اس کو تفصیل سے پڑھتے ہیں۔

اسپین کے اندرونی مشہور شہر یہ ہیں: قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ۔ اس کا ساحلی شہر ''برشلونہ'' ہے جو آج کل ''بارسلونا'' کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ''مالقہ'' ہے جو آج کل ''ملاگا'' کہلاتا ہے۔ یہ جتنے بھی شہر ہیں، سارے مسلمانوں کے آباد کیے ہوئے ہیں۔ ان کو جس دشمن سے سابقہ پڑا تھا وہ میدان میں اتنا مرد نہیں تھا جتنا میدان سے باہر سازشی، غدار، عہد شکن اور انتہائی درجے کا متعصب تھا۔ وہ اگر میدان میں لڑ کر ان سے اسپین لیتا تو کوئی بات نہ تھی۔ جوانمرد معرکے میں ہارتے جیتے رہتے ہیں۔ اس نے عہد اور تحریری معاہدہ کرنے کے بعد غداری کر کے ان سے اسپین چھینا۔

ہسپانیہ کے عیسائیوں نے تاریخ میں بہت غلط قسم کی باتیں پھیلائی ہوئی ہیں۔ میں ایک سفر نامہ پڑھ رہا تھا۔ مصنف لکھتا ہے: مقامی گائیڈ نے قرطبہ سے غرناطہ سفر کرنے کے دوران سیاحوں کو بتایا کہ یہ ''موروں'' کے زمانے کا کنواں ہے اور قرطبہ سے غرناطہ تک سفر کے راستے میں پہاڑی علاقہ ہے، لیکن سڑک پر سہولتیں: کنواں، مسجد، مسافر خانہ، مہمان خانہ مکمل دستیاب تھیں۔ مسلم دور کے آثار جا بجا موجود تھے۔ اس زمانے میں تو یہ چیزیں ہر مسافر کو، چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم، دستیاب تھیں۔ اب صرف آثار تھے۔ سیاح نے کہا: میں نے گائیڈ سے پوچھا: تم تو کہہ رہے تھے مور بہت وحشی اور جاہل تھے (مور مسلمانوں کو کہتے ہیں) تو انہوں نے یہ اتنی ساری چیزیں فلاحِ عامہ کے لیے کیسے بنا دیں؟ مسلمانوں کا رواج تھا جو فوت ہوتا اس کو ثواب پہنچانے کے لیے کنواں بنا دیا جاتا۔ صدقہ جاریہ کے طور پر فی سبیل اللہ مسافر خانے بنا دیے جاتے تھے، جبکہ حکومت الگ سے عوامی سہولتوں کی چیزیں بناتی رہتی تھی۔ اگر اس دور کے مسلمان جاہل اور وحشی تھے تو عوام اور حکومت دونوں نے یہ کام کیسے کیے؟ گائیڈ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ دنیا میں کسی کے پاس اس کا جواب نہیں ہے۔ اسپین فتح کرنے والے مسلمان اگر اتنے اجڈ، گنوار، دیہاتی اور وحشی تھے تو پھر انہوں نے اتنے عظیم الشان قسم کے آثار یہاں کیسے چھوڑے؟ ''باجہ'' نامی شہر نقشے پر دیکھا جا سکتا ہے۔ فقہ مالکی کے مشہور فقیہ ابو الولید باجی یہیں کے رہنے والے تھے۔

ہسپانوی مسلمانوں کے زوال کی وجہ یہ ہوئی کہ اسپین میں چودہ مسلم ریاستیں وجود میں آ گئی تھیں۔ طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔ اس بنا پر مسلمانوں کے ہاتھ سے اسپین چلا گیا۔ پہلے پورے اسپین پر ایک امیر عبدالرحمٰن الناصر کی حکومت تھی۔ یہ بنوامیہ کا ایک مفرور شہزادہ تھا۔ اسلامی دنیا سے بنوامیہ کی حکومت ختم ہوئی تو بنو عباس ان میں سے کسی کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا یہ شہزادہ شام سے فرار ہو کر افریقہ آ گیا اور یہاں سے اندلس جا پہنچا۔ یہاں اس سے پہلے مسلمانوں کی منتشر حکومت تھی۔ اس نے سارے اندلس کو اپنی امارت میں یکجا و متحد کیا۔ اس نے قرطبہ میں جو مسجد بنائی، اس کی تعمیر کے لیے خود اپنی پیٹھ پر اینٹیں ڈھویا کرتا تھا۔

اس نے وقت طے کیا تھا کہ روزانہ اتنے گھنٹے مسجد میں مزدوری کروں گا۔ امیر عبدالرحمٰن الناصر وہاں سے بھاگ کر آیا اور یہاں اس نے اتنی بڑی خلافت قائم کردی۔ ایک مرتبہ بنوعباس کا حکمران ابوجعفر منصور درباریوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حاضرین سے پوچھا: بتاؤ "صقرِ قریش" کون ہے؟ یعنی قریش کا شہباز کون ہے؟ انہوں نے کہا: آپ۔ کہا: میں نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا: آپ کے والد؟ کہا: بالکل نہیں، ہم نے کیا کیا؟ ہم تو اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حکومت آبائی وراثت میں مل گئی۔ قریش کا شہباز تو عبدالرحمٰن ہے جس نے اپنے آبائی علاقے سے ہزاروں میل دور جا کر خلافت قائم کردی۔ اس کو قتل کرنے کے لیے بنوعباس نے ایک آدمی بھیجا۔ اس نے اس آدمی کو پکڑلیا۔ پھر اپنے حاضرین سے پوچھا: اب بنوعباس کو یہ پیغام کون بھیجے گا کہ میرے پیچھے کوئی دوسرا قاتل نہ بھیجنا؟ ایک شخص کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا: میں یہ پیغام لے کر جاؤں گا۔ تو عبدالرحمٰن نے کہا کہ اس کے سر کو حنوط کرو، تھیلے میں ڈالو اور لے جاؤ۔ پھر ایک خط لکھ کر دیا: "یہ آپ کا بھیجا ہوا قاتل ہے۔ مہربانی کرکے آئندہ کسی اور کو نہ بھیجنا۔" اس نے پورے مسلم اسپین کو متحد کرلیا تھا۔ بعد میں کیا ہوا؟ وہ جو ہم دیکھ رہے ہیں ایک اسپین میں چودہ ریاستیں بن گئیں۔ جیسے آج ایک جزیرۃ العرب سے بارہ ملک بن گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے تحفظ کے لیے محتاج ہے کہ کوئی بھی باہر سے اس پر حملہ کرے گا یا آپس میں جنگ ہوئی تو وہ ضرور عالمی طاقتوں سے مدد چاہے گا۔ جو مدد کے لیے آئے گا وہ کس اعزاز کے حصول کے لیے مدد کرے گا؟ وہ ضرور کچھ لے گا۔ یہی سیاست اب بھی ہورہی ہے۔ اسپین میں بھی یہی ہوتا رہا۔ ہم لوگ طوائف الملوکیت میں مبتلا ہوگئے۔ بندر بانٹ کرکے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئے۔ ہر ریاست کا ایک امیر بن گیا جو اپنے تحفظ اور بقا کے لیے عیسائی حکمرانوں سے امداد مانگتا رہا۔ قرضے اور مدد، قرضے اور مدد...... قرض دینے والے ایک ایک کرکے ریاستوں کو نگلتے رہے حتیٰ کہ بات یہاں (غرناطہ) پر آکر کھڑی ہوگئی۔ مسلمانوں کے پاس آخری ریاست غرناطہ رہ گئی تھی تو عیسائیوں نے ان کو دھوکا دیا کہ اگر آپ ہتھیار ڈال دو تو ہم آپ کو ہر چیز کی ضمانت دیتے ہیں۔ آپ کا مذہب محفوظ ہوگا۔ آپ کی مسجدیں، عبادت گاہیں، مدارس، زمین، جائیداد سب محفوظ ہوں گی۔ کسی چیز کو نہیں چھیڑا جائے گا۔

یہاں ایک "پرویزی حاکم" ابوعبداللہ حکمران تھا جو اپنے چچا ابوالحسن سے بغاوت کرکے حکمران بنا تھا۔ اس کا جرنیل ہر روز اس سے اجازت لیتا تھا کہ آج رات اجازت دو۔ میں ان محاصرہ کرنے والوں پہ شب خون مارتا ہوں۔ یہ ہم سے غرناطہ نہیں لے سکتے۔ ابوعبداللہ اندر سے مفاد پرستی کی خاطر دشمن سے مل گیا تھا۔ اوپر سے آج کے مفاد پرست حکمرانوں کی طرح یہ ظاہر کرتا تھا میں آپ لوگوں کی جان و مال بچانے کے لیے ان سے مذاکرات کرتا ہوں۔ اب تاریخ نے ثابت کیا ہے اس وقت دو معاہدے لکھے گئے تھے۔ ایک اپنے لیے لکھتا تھا کہ مجھے اتنا سونا دوگے، اتنی جائیدادیں دوگے اور اتنی لونڈیاں لے جانے کی اجازت دوگے۔ دوسری طرف عوام کے سامنے ظاہر یہ کرتا تھا یہ سب کچھ ہم آپ کے لیے کررہے ہیں۔ آپ کو دشمن سے بچانے کے لیے کررہے ہیں۔ ارے بابا! جب عوام قربانی دینے کے لیے تیار ہیں تو آپ ان کے اتنے ہمدرد کیوں بنے بیٹھے ہیں؟ آج تاریخ نے اس پرویزی راز سے پردہ اٹھادیا ہے اور دو الگ الگ معاہدہ نامے دریافت ہوگئے ہیں۔

ہمارے ضمیر فروش حکمران اندر سے کچھ اور معاہدے کرتے رہتے ہیں اور قوم کو کچھ اور بتاتے رہتے ہیں۔ غرناطہ کا سقوط ہوا تو تین دن نہیں گزرے تھے متعصب عیسائیوں نے اپنی اصلیت دکھانا شروع کردی۔ مسلمانوں نے اپنے دور میں ان کی مملکت میں جو عیسائی رہتا تھا اس سے بہت اچھا سلوک کیا تھا، کیونکہ مسلمانوں کے ہاں عقیدہ ہے کہ "ذمی" کو اگر کسی نے تکلیف پہنچائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں اس سے روز قیامت سوال کروں گا تم نے اس کے ساتھ یہ کیا کیا تھا؟ اس کے مقابلے میں عیسائیوں نے مسلمانوں سے جو معاہدہ کیا اس کی انہوں نے کتنی پابندی کی؟ انہوں نے تین دن بعد ہی کہہ دیا اسپین خالی کردو، تم لوگ تین دن کے اندر اسپین چھوڑ دو۔ اب تین دن کے اندر اسپین چھوڑ کر کیسے مراکش پہنچا جاسکتا تھا؟ کچھ آخری وقت تک لڑتے رہے، کچھ تعاقب کرنے والوں کے ہاتھوں مارے گئے، کچھ کو مشہور مسلم جہاز راں خیرالدین باربروسا نے اپنے بحری جہازوں میں سمندر پار پہنچادیا۔ باہمی اختلاف اور خانہ جنگی کا

یہ انجام ہوا۔ آج آپ دیکھ رہے ہیں ہمارے ہاں کتنی لسانی تحریکیں ہیں؟ یہ جناح پور ہے، یہ پختون خوا ہے، یہ ہزارہ ہے، یہ گریٹر بلوچستان ہے، یہ سندھو دیش ہے، یہ شمالی علاقہ جات ہیں، یہ چترال ہے، یہ گلگت ہے، یہ بلتستان ہے اور...... آخر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے اگر کوئی سبق لے کہ نسلی ولسانی تفریق سے کسی کو کچھ نہیں ملنا۔ ہم صدیوں سے اکٹھے رہتے تھے، اب ایسی نفرت ہوگئی ہے کسی دشمن کو کام کرنے کی ضرورت نہیں، یہ نفرت خود کام کرے گی۔

نقشے پر مراکش کا شہر ''فاس'' دیکھیے۔ ابوعبداللہ ایمان فروش کے بارے میں تاریخ لکھتی ہے ''فاس'' نامی شہر میں اس کے ورثا بھیک مانگا کرتے تھے، لیکن آج ہماری تاریخ کچھ زیادہ تنزل پذیر ہے۔ آج مشرف کے ورثا بھیک نہیں مانگیں گے، بڑی عیاشی کے ساتھ زندگی گذاریں گے، جنرل نیازی کے ورثا بھیک نہیں مانگیں گے، مال روڈ پر کلہ سیدھا کر کے سینہ تان کر پھریں گے۔ یہ بہت بڑا فرق ہے پچھلے زمانے کے مسلمانوں اور ہمارے زمانے کے مسلمانوں میں جو مزید تنزل کی علامت ہے۔ جو شخص ملت کا غدار ہے اس کو خوار ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں تو غدار سب سے زیادہ معزز ہے۔ چار سالہ، آٹھ سالہ دور میں جتنا لوٹا سارا سمیٹ کر حفاظت کے ساتھ انگلینڈ پہنچ جائے گا اور اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔ البتہ تجوریوں کو خالی کرنے کے بعد دوبارہ بھرنے کے لیے آئے تو فلانی لیگ اور فلانی لیگ اسے دوبارہ سر اور کندھے پر بٹھانے کے لیے ساری موجود ہیں۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے ہمارے ساتھ۔ پچھلے زمانے میں کوئی گستاخ رسول پیدا ہوتا تھا تو وہ طبعی موت مر کر دنیا سے نہیں جاتا تھا۔ مدعیِ نبوت پیدا ہوتا تھا تو وہ طبعی موت مر کر دنیا سے نہیں جاتا تھا۔ اس کا گندا خون زمین پر گرتا تھا۔ یہ زمین ٹھنڈی ہو جاتی تھی۔ فتنہ ختم ہو جاتا تھا۔ کوئی غداری کرتا تھا تو اس کی سزا پا کر دنیا سے جاتا تھا۔ اب کسی کو سزا نہیں ملتی۔ نہ روحانی طور پر غلط دعویٰ کرنے والا اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ مرزا قادیانی کی پانچویں نسل انگریز کی آغوش میں بیٹھی ہوئی کام کر رہی ہے۔ آج نہ ہمارے مذہب پر ڈاکا ڈالنے والوں سے کوئی باز پرس کرتا اور نہ دنیاوی طور پر ہم سے غداری کرنے والوں کو کوئی پوچھتا ہے۔ لہٰذا وہ مرنے کے بعد بھی ماشاء اللہ ہیرو بنے رہتے ہیں۔ یہ آخری درجے کے اخلاقی زوال کی انتہائی خطرناک علامت ہے۔

یورپ کی دو مظلوم مسلم ریاستیں

مشرقی اور مغربی یورپ سے فارغ ہونے کے بعد آپ اگر شمالی یورپ کی طرف آجائیں تو دیکھیں گے کہ انتہائی شمال میں بالٹک ریاستیں اور سکنڈے نیوین ممالک ہیں۔ یورپ کی شمالی پٹی میں اگر آپ دیکھیں گے تو یہ دو بڑے ملک آپ کو ملیں گے۔ پولینڈ کو مشرق میں شمار کرتے ہیں اور جرمنی کو مغرب میں شمار کرتے ہیں۔ خطے کے اعتبار سے یہ شمال میں واقع ہیں لیکن پولینڈ مشرقی یورپ میں شمار ہوتا ہے جبکہ جرمنی مغربی یورپ میں۔ اب اگر آپ ان ممالک کو دائیں طرف سے شمار کرتے ہیں تو ترتیب یوں ہوں گی: پولینڈ (وارسا) بیلاروس (منسک) یوکرائن (کیو) مالدوا (چیشیناؤ) رومانیہ (بخارسٹ) بلغاریہ (صوفیہ) یونان (ایتھنز)

اگر آپ اس کو الٹی ترتیب سے لے کر چلنا چاہیں گے تو ترتیب یوں ہوگی: جرمنی (برلن) ہالینڈ (ایمسٹرڈیم) بیلجیئم (برسلز) فرانس (پیرس) اسپین (میڈرڈ) پرتگال (لزبن)۔

وسط میں آجائیں گے تو وسطی یورپ میں آپ کو دو ملک ملیں گے۔ ویسے تو تین ہیں، لیکن صرف ایک کو شمار کیا جاتا ہے یعنی ''آسٹریا'' کو، جس کا دارالحکومت ''ویانا'' ہے جو موسیقی اور سود کا دنیا میں بڑا مرکز ہے۔ یہ دونوں شعبے یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ ہنگری اور سوئزرلینڈ دائیں بائیں ہیں اور آسٹریا درمیان میں ہے۔ ان تینوں کو وسطی یورپ میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن عموماً آسٹریا کو وسطی یورپ کہا جاتا ہے۔ سوئزرلینڈ دنیا کا خوبصورت ترین ملک شمار ہوتا ہے۔ اس کا دارالحکومت ''زیورخ'' ہے نہ ''جنیوا''، بلکہ ''برن'' ہے۔ جیسے کہ جرمنی کا دارالحکومت میونخ'' ہے نہ ''فرینک فرٹ''، بلکہ ''برلن'' ہے۔ عثمانی مجاہدین یورپ فتح کرتے کرتے آسٹریا کی سرحد تک جا پہنچے تھے۔ یہ سارا علاقہ ان کے پاس تھا۔

جب ہم نیچے آتے ہیں یورپ کے جنوب میں تو ہمیں یہ یورپ کی ٹانگ نکلی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اٹلی ہے۔ اس کا دارالحکومت (روم) اس کے گھٹنے میں ہے۔ اٹلی کی شکل ٹانگ کی طرح ہے۔ اس کے پنجے میں بوٹ ہے، کیونکہ مسٹر ہے، بوٹ پہنتا ہے۔ یہ ایڑی ہے، یہ بوٹ کی نوک ہے۔ اس نوک پر جزیرہ واقع ہے جس کا پرانا نام "صقلیہ" تھا۔ مسلمانوں کی جو بحری مہمات اور فتوحات ہیں، ان میں اس جزیرے کا نام ضرور آتا ہے۔ اب اس کا یورپین نام "سسلی" ہے۔ یہ روم اس کے گھٹنے میں ہے۔ اٹلی وہ ملک ہے جس کی حدود کے اندر دو ملک واقع ہیں: ویٹی کن سٹی اور سان مارینو۔ یہ دونوں عیسائیت کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں۔ ایسے ممالک کو "لاک لینڈ ممالک" کہتے ہیں۔ تو یورپ کے جنوب میں ایک یہ ملک آجاتا ہے۔ اب یورپ کے مطالعے کے حوالے سے بات تقریباً مکمل ہو گئی ہے۔

دو باتیں سمجھ لیں! یورپ کی پوری مشرقی پٹی کیمونزم کے پاس تھی پھر سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد یہ ممالک آزاد ہوئے۔ آزاد ہونے کے بعد جب یہ روس کے تسلط سے نکلے تو ان میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ ایک ملک تھا چیکوسلواکیہ (اس کا دارالحکومت پراگ ہے) چیکوسلواکیہ پورا ایک ملک تھا۔ یہ دو حصوں میں ٹوٹ گیا تو ایک حصے کا نام جمہوریہ چیک ہو گیا۔ اس کے شروع میں "زیڈ" (Z) آتا ہے جو سائیلنٹ ہے اور ادھر والے کا نام "سلواک" ہو گیا۔ اسی طرح یونان سے اوپر اور ہنگری و آسٹریا سے نیچے ایک ملک تھا یوگوسلاویہ۔ یہ جب ٹوٹا تو اس سے سات ریاستیں بن گئیں۔ ان سات میں سے دو مسلم ریاستیں ہیں۔ اوپر کون کی شکل کا بوسنیا ہے اور نیچے چھوٹا سا البانیہ ہے۔ وسیع النظر اور روشن خیال یورپ کو یہ برداشت نہیں ہے کہ پورے یورپ میں کوئی مسلم ملک ہو۔ یہ چھوٹا سا "مناکو" دو میل لمبا ہو تو کوئی حرج نہیں۔ یہ "لکسمبرگ" 465 میل کا ہے تو کوئی بات نہیں ہے۔ یہ "اندورا" چھوٹا سا، اسپین اور فرانس کی سرحد پر ہو تو بھی کوئی بات نہیں ہے، یہ ادھر "مونٹینگرو" ہو تو بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ملک ہوں، لیکن پرامن ہوں گے، کوئی ان کو نہیں چھیڑے گا، چاہے وہ ادھر سمندر کے اندر جزیرے کی شکل میں مالٹا کیوں نہ ہو، یہ بھی مستقل ایک ملک ہے۔ انہیں کچھ نہیں کہیں گے لیکن اگر یہ دو مسلمان ملک، دو ریاستیں اگر یورپ میں بن جاتی ہیں تو یہ انہیں برداشت نہیں۔ یوگوسلاویہ میں جب مسلمان قلت میں تھے، ان کے محکوم تھے تو انہیں اعتراض نہ تھا، لیکن جب ٹوٹ پھوٹ ہوئی، دوسرے عیسائی ممالک بنے اور مسلمان ریاستیں بھی وجود میں آئیں۔ دو مسلم ملک اور یورپی یونین کے اندر! یورپ کی حدود کے اندر، عیسائیت کے گڑھ کے اندر تو ان کا وہ خونناک اور وحشتناک چہرہ جس کو یہ چھپائے رکھتے ہیں باہر نکل آیا۔ سربیا کے پاس یوگوسلاویہ کا اصل رہ گیا، بلغاریہ یوگوسلاویہ کا دارالحکومت تھا وہ بھی سربیا کے پاس آیا۔ وہاں کا سربراہ حکمران تھا "میلاسووچ" دنیا کا مسلمہ جنگی مجرم، بوسنیا اور البانیہ کے بے شمار بے گناہ مسلمانوں کا قاتل۔ اس کو عالمی عدالت "ہیگ" میں لے جایا گیا اور بہت بڑی سزا سنائی گئی۔ بہت ہی سخت عبرتناک سزا! کیا؟ ایک کمرے میں بند کیا گیا جس میں ایک چھوٹی سی لائبریری ہے، کچن ہے، واش روم ہے، بیڈروم ہے، ٹی وی لگا ہوا ہے۔ تاکہ کبھی اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنے کے لیے اگر یہ ٹی وی دیکھ لیا کرے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ مجرم کے لیے ٹی وی دیکھنا بہت سخت سزا ہے۔ یہ ان کے انصاف کا معیار ہے۔ الغرض یہ جو دو ملک ٹوٹے، ایک یعنی چیکوسلواکیہ سے دو ملک بن گئے اور دوسرے یعنی یوگوسلاویہ سے سات ملک بن گئے۔ ان سات ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت دو ملکوں میں آئی جو ترکوں کی نسل ہے عثمانی خلفاء، عثمانی ترک جو فاتحین یورپ ہیں، یہ ان کی اولاد ہے۔ یہ وہاں رہتے ہیں۔ اب آپ اہل مغرب کا تعصب دیکھیں۔ ان کا ماحول یورپی ہے۔ ان کا لباس، ان کا پردہ، ان کا حلیہ، ایسی کوئی چیز نہیں جو غیر یورپی نہیں ہو، لیکن ایمان اندر موجود ہے۔ اب جو شکل میں ان اہل مغرب جیسا ہے، صدیوں سے ان کے بیچ میں رہتا ہے۔ مرد اور عورت بھی انہی جیسے کپڑے پہنتے ہیں، انہی جیسی ثقافت ہے۔ نماز کا تصور ان کے ہاں بہت ہی موہوم اور مدھم ہے، لیکن یہ ان (ماڈرن مسلمانوں) کو بھی نہیں بخشتے۔ ان کے لیے انہوں نے اجتماعی قبریں کھود کھود کے زندہ دفن کر ڈالا تھا۔ یہ آپ ذہن سے نکال دیں کہ کبھی ان کا تسلط آپ پر ہوا تو وہ ایک فیصد رحم دلی کی گنجائش رکھیں گے، جبکہ ہم تو ایشیائی ہیں، سانولے ہیں، ہم تو ان کے حساب سے کمی ہیں، ہم تو بنیاد پرست ہیں، ہم تو داڑھی ٹوپی رکھتے ہیں، ہمارے لیے تو ان کے پاس کسی صورت میں قطعاً گنجائش نہیں

ہے۔ جغرافیے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی عالمی سیاست حاضرہ کو سمجھے کہ کس سے رحم کی امید کرتا ہے؟ کس سے معاہدے کرتا ہے؟ کس سے قرضے لینا چاہتا ہے؟ کہاں اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے بھیجتا ہے؟

بوسنیا کے ساتھ ایک بڑا ظلم یہ ہے کہ اس کو تین ممالک میں گھیر لیا گیا ہے۔ ایک طرف تو خود سربیا تھا، متعصب ترین عیسائی، کچھ کمیونسٹ ہیں، کچھ ملحد ہیں، ہر عیسائی تعصب اس میں پایا جاتا ہے۔ نظریاتی، مذہبی، نسلی ہر طرح کا تعصب ہے۔ ایک طرف تو یہ سربیا ہو گیا۔ اوپر سے یہ کروشیائی نسل ہے، یہ بہت ہی متعصب ہے۔ بوسنیا والے اصل میں ترک نسل شمار ہوتے ہیں۔ کروشیا کی نسل ہی الگ ہے اور مذہب بھی الگ ہے۔ یہ نیچے مونٹینگرو ہے۔ ان تین ممالک نے اس کو گھیر لیا ہے۔ اب ظلم کی حد دیکھو! یہ "سلووینیا" چھوٹا سا ملک ہے! اور اس کو سمندر لگ رہا ہے یا نہیں؟ یہ بحیرۂ ایڈریاٹک ہے۔ یہ سمندر اس کو مل رہا ہے جس کے ذریعے یہ دنیا کے معروف سمندر یعنی بحر متوسط میں آسانی سے آجاتا ہے۔ اب دیکھو سلووینیا کے نیچے یہ ہے کروشیا۔ اس کو کتنا لمبا سمندر مل رہا ہے؟ یہاں بوسنیا تک مل رہا ہے۔ تو یہاں سے چھوٹا سا حصہ تو چھوڑنا چاہیے بوسنیا کے لیے۔ لیکن نہیں چھوڑتے، پوری سمندری پٹی اپنے پاس قبضے میں کی ہوئی ہے۔ کہ بوسنیا کو سمندر مل رہے گا تو اس کی تجارت آسان ہو جائے گی۔ ہم سے راہداری لیے بغیر آمد و رفت کر لے گا، لہٰذا اس کا گلا گھونٹ کر رکھو۔

یہ دوسرا ملک البانیہ ہے۔ البانوی نسل کے مسلمان اس میں رہتے ہیں۔ یہ دو مسلم ملک ہیں بوسنیا اور البانیہ۔ یہ دو ملک ٹوٹنے کے بعد دو مسلم ریاستیں وجود میں آگئیں۔ ان کو سمجھنے کا آسان طریقہ کیا ہوگا؟ اصل یوگوسلاویہ مرکز تو سربیا کے پاس چلا گیا۔ یہ مسلمان ترکوں کی نسل ہے۔ تو ترک اور یورپ مل کر ایک نسل وجود میں آگئی۔ بہت کشادہ چہرے والے، بہت خوبصورت، بہت مہمان نواز۔ آبائی خصلتیں تو نہیں جاتیں۔ بہت سخی، بہت بہادر، بہت مہمان نواز۔ وہ والی چیزیں نہیں ہیں جو یورپین کے ہاں ہیں، مہمان آیا ہے تو خود میزبان چائے پی رہا ہے۔ مہمان کو بھی پینی ہے تو جائے اور جا کر باورچی خانے میں بنا لے۔ دو جگری دوست بھی سفر کر رہے ہیں تو ہر ایک ٹکٹ اپنا اپنا دے گا۔

تو اصل یوگوسلاویہ سربیا کے پاس رہ گیا۔ یوگوسلاویہ کا دار الحکومت بلغاریہ تھا۔ یہ سربیا کے پاس رہا۔ بقیہ چھ میں سے دو مسلم ریاستیں بوسنیا اور البانیہ وجود میں آگئیں۔ آپ بوسنیا ہرزیگووینا سنتے رہتے ہیں، یہ "بوسنک" اور "ہرزک" کا مجموعہ ہے، جیسے چیک اور سلواک دو مل کر چیکوسلواکیہ کہلاتے تھے۔ "سرائیو" بوسنیا کا دار الحکومت ہے۔ البانیہ کا دار الحکومت "تیرانہ" ہے۔ یہاں پر ہم یورپ کے سبق کو ایک حد تک مکمل کر گئے ہیں۔ کچھ ممالک دوسرے طریقے میں جغرافیائی ترتیب میں آگئے۔ کچھ تیسرے طریقے میں بھی آئیں گے جن کے دار الحکومت اور اس ملک کا نام ایک ہے۔ کچھ چوتھے میں آئیں گے۔ جہاں مختلف تقسیمیں بنتی ہیں۔ اس سے پورا یورپ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گا۔ انشاء اللہ! یہاں تک یورپ کا ہمارا سبق مکمل ہو گیا ہے۔

اب تمہاری خدمت میں یہ ہے بر اعظم یورپ کی مختلف جہات میں واقع ممالک کو دیکھا جائے تو شمال میں دو بڑے بڑے ملک ہیں: پولینڈ اور جرمنی (وارسا اور برلن) برابر برابر ہیں۔ اب یورپ کے مشرق اور مغرب کی طرف چلتے ہیں۔ مشرق سے شروع کریں اور پولینڈ کو بھی ساتھ لے لیں تو ترتیب یوں ہوگی: پولینڈ (وارسا) بیلاروس (منسک) یوکرائن (کیو) مالدووا (چیشیناؤ) رومانیہ (بخارسٹ) بلغاریہ (صوفیہ) یونان (ایتھنز)۔

اب ہم مغرب سے شروع کرتے وقت اگر جرمنی کو بھی مغربی پٹی میں لے کر چلتے ہیں تو ترتیب کچھ یوں بنے گی۔ جرمنی (برلن) ہالینڈ (ایمسٹرڈیم) بیلجیم (برسلز) فرانس (پیرس) اسپین (میڈرڈ) پرتگال (لزبن)

اب وسطی یورپ میں آجائیں۔ تین ممالک وسطی یورپ کی پٹی میں واقع ہیں۔ درمیان میں آسٹریا (ویانا) اس کے دائیں طرف ہنگری (بوڈاپسٹ) بائیں طرف سوئزرلینڈ (برن)

جنوب میں یہ چھوٹا سا ملک "مناکو" نظر آرہا ہے۔ فرانس، بیلجیم اور سوئزرلینڈ کی سرحد پر لکسمبرگ بھی چھوٹا سا ملک ہے۔ "اندورا" نامی ملک تو فرانس اور

اسپین کی سرحد پر ہے۔ان کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔اگر غضب ٹوٹتا ہے تو بیچارے مسلمانوں پر۔یورپ میں دو ممالک مسلمانوں کے ہیں یعنی ان میں اکثریت مسلمان ہے، بوسنیا اور البانیہ۔ان دونوں کا سابقہ ایسے پڑوسیوں سے پڑا ہے جو بہت ظالم ہیں۔ان کے ذہنوں میں مسلمانوں کے بارے میں بہت شدت پسندی پائی جاتی ہے۔اللہ تعالی ہمارے ان بھائیوں کی مشکل آسان کرے۔یہاں الحمدللہ یورپ کا سیاسی جغرافیہ مکمل ہوا۔

گیارھواں سبق: امریکا

شمالی امریکا:

آج ہم امریکا کی کتابی سیر کریں گے۔ شمالی امریکا میں تین ہی ملک آتے ہیں: آئس لینڈ، کینیڈا اور امریکا۔ امریکا کی کہانی بڑی دلچسپ ہے جو پچھلے سبق میں ہم نے آپ کو سنائی تھی۔ اس کی پچاس ریاستیں ہیں۔ 48 اکٹھی ہیں۔ دو الگ ہیں: الاسکا اور ہوائی۔ اس کا شمالی مشرقی حصہ گنجان آباد ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی کئی ریاستیں ہیں۔ تین تو اکٹھی ہیں جن میں یہودی بہت زیادہ رہتے ہیں: نیویارک، نیوجرسی، کنکٹی کٹ۔ اِن کے اوپر ''میساچوسٹس'' ہے۔ بیچ میں ادھر ''نیو ہمپشائر'' ہے۔ اس کے نیچے آجاؤ تو بہت ریاستیں ہیں۔ ادھر ''میری لینڈ'' ہے، ادھر ''ورجینا''۔ دونوں کے بیچ میں ''ڈسٹرکٹ آف کولمبیا'' ہے، جس کے اندر ''واشنگٹن ڈی سی'' ہے۔ اس کے نیچے ''ایسٹ ورجینیا'' ہے، ساتھ میں ''ویسٹ ورجینیا'' ہے۔ اس کے نیچے ''کیرولینا'' ہے: نارتھ کیرولینا اور ساؤتھ کیرولینا۔ جنوب میں امریکا کی دم ہے۔ اس میں ''فلوریڈا'' نامی ریاست ہے جس کا صدر مقام ہے ''میامی''۔ فلوریڈا کا معنی یہودی اصطلاح میں ہے: ''وہ جگہ جہاں خدا کا ظہور ہوگا''۔

جب آپ شمالی امریکا کے بحری جزائر پڑھو گے تو فلوریڈا کے قریب ایک جزیرہ ہے ''برمودا'' اور ایک جزیرہ ہے ''بہاماس''۔ یہ دونوں آباد ہیں۔ ان دونوں کے درمیان سمندر میں ایک تکون جیسا علاقہ ہے۔ سمندر کی سطح پر ایک فرضی تکون بنتی ہے جیسے نقشے کے اور خطوط فرضی ہیں، ایسے ہی وہ تکون بھی فرضی ہے۔ اس کے بیچ میں بھی جزیرے ہیں۔ وہاں جو گیا ہے، واپس نہیں آیا۔ فضا میں جائے یا سمندر میں۔ اس کی خبر کسی کو نہیں لگی کہ وہ کس اندھیرے غار میں غائب ہوگیا۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے ایک برمودا جزائر ہیں۔ ان کا صدر مقام ''ہملٹن'' ہے۔ یہاں لوگ آتے جاتے ہیں۔ ایک برمودا تکون ہے ''مثلث برمودا''۔ اس کے اندر جا کر کوئی واپس نہیں آیا۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ پتہ نہیں چلتا اندر کیا قصہ ہے؟ ایک نہیں، متعدد عجیب وغریب واقعات پیش آئے ہیں اور اب بھی آتے رہتے ہیں لیکن امریکی میڈیا پر انہیں زیادہ اُٹھانے نہیں دیا جاتا، حالانکہ وہ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ سمندر کی تہہ ڈھونڈ نکالی ہے کہ کہاں زیادہ گہری ہے۔ لیکن برمودا تکون کے متعلق زیادہ بات کرنے نہیں دی جاتی۔ اس جگہ سے اڑن طشتریاں کبھی کبھی نکل کر آتی ہیں۔ ان کے واقعات کو بھی دبا دیا جاتا ہے۔ کوئی تحقیق کرے تو اس کی زندگی کی ضمانت نہیں رہتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب یہ سمندر میں ایک خطہ ہے اور سمندر پر تو کوئی لکیر کوئی حد قائم نہیں رہ سکتی۔ تو اسے تکون کا نام کیوں دیا گیا؟ گول یا چوکور بھی کہا جاسکتا تھا؟ یہ قابلِ غور نکتہ ہے؟ آپ نے بہت سے مونوگرام میں تکون کے اندر سے جھانکتی آنکھ دیکھی ہوگی۔ اس طرح کی شکلیں اس نکتے پر غور کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

وسطی امریکا:

شمالی اور جنوبی امریکا کے بیچ میں وسطی امریکا ہے۔ اس میں دو قسم کے ممالک آئیں گے: ایک وہ جو خشکی سے جڑے ہوئے ہیں اور ایک وہ جو خشکی سے ''ا

سمندر کے بیچ میں جزائر کا مجموعہ ہیں۔ جزائر کے مجموعے کو ہم جغرافیائی اشتراکات میں پڑھیں گے۔ ان کو کہتے ہیں: ''کیریبین ممالک''۔ ان کا سلسلہ ''کیوبا'' سے شروع ہوتا ہے، پھر جمیکا ہے۔ آگے ''ہیٹی'' ہے، پھر ''ڈومنیکن'' ہے، ''پورٹوریکو'' ہے۔ پھر ''ویسٹ انڈیز'' کے جزائر ہیں۔ یہ سلسلہ ''کیوبا'' سے شروع ہوکر ''ویسٹ انڈیز'' پر ختم ہوجاتا ہے۔ یہ ''کیریبین ممالک'' ہیں جو 1492ء میں دریافت ہوئے۔

1492ء وہی سن ہے جس میں اسپین کا سقوط ہوا اور اسی سن میں امریکا دریافت ہوا۔ کولمبس کے جہاز اسپین سے چلے تو آ کر ادھر ''کیریبین'' سمندر میں رکے۔ یہ ''ویسٹ انڈین جزائر'' ہیں۔ عمودی ستون کی شکل میں۔ ان میں ایک اوپر ہے۔ اینٹی گوا اینڈ باربوڈا۔ اسے ''اے اینڈ بی'' کہتے ہیں۔ ایک نیچے ہے ''ٹرینیڈاڈ اینڈ ٹوباگو'' اسے ''ٹی اینڈ ٹی'' کہتے ہیں۔ درمیان میں ''بارباڈوس'' ہے۔ یہاں دنیا کا خوبصورت ترین ساحل ہے۔ بس کیریبین جزائر میں سے یہ تین جزیرے آج بہت ہیں۔ باقی جزائر کے سبق میں آجائیں گے۔ کولمبس ان جزائر کو ہندوستان سمجھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ ہندوستان نہیں ہے اور نہ ہی نئی دنیا ہے۔ یہ تو مجمع الجزائر ہیں جس میں کیرب لوگ رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ وسطی امریکا میں خشکی سے یعنی شمالی امریکا سے جڑے ہوئے جو ممالک ہیں، ان میں دو کے نام یاد رکھو! یہ زیادہ مشہور ہیں: شروع میں ''میکسیکو'' ہے۔ اس کے ساتھ گول دائرے کی شکل میں ایک خلیج ''خلیج میکسکو'' ہے۔ آخر میں ''پانامہ'' ہے۔ اس میں نہر پانامہ بنائی گئی ہے۔ ان دونوں ممالک کی خصوصیت ہے کہ دونوں کے ملک اور دارالحکومت کا نام ایک ہی ہے۔ ''میکسیکو'' کے دارالحکومت کا نام بھی ''میکسیکو سٹی'' ہے اور ''پانامہ'' کا دارالحکومت بھی ''پانامہ سٹی'' ہے۔ آگے ''گوئٹے مالا'' ہے۔ اس کا حال بھی یہی ہے کہ اس کے دارالحکومت کا نام بھی ''گوئٹے مالا سٹی'' ہے۔ وسطی امریکا کے یہ تین ملک یاد رکھو! پہلا، آخری اور درمیانہ۔ تینوں کا نام اور تینوں کے دارالحکومت کا نام ایک جیسا ہے: (1) میکسیکو (میکسیکو سٹی) (2) پانامہ (پانامہ سٹی) (3) گوئٹے مالا (گوئٹے مالا سٹی)۔

پاناما

''پانامہ وسطی امریکہ کا آخری ملک ہے جس کے بعد جنوبی امریکہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ ملک تقریباً تیس ہزار مربع میل کے رقبے میں ہے اور اس کا نقشہ بنایا جائے تو انگریزی کے حرف S کی شکل بنتی ہے۔ اس کے مشرق میں بحرِ اوقیانوس (Altantic Ocean) ہے اور مغرب میں بحر الکاہل (Pacific Ocean)۔ پانامہ سٹی جو اس کا دارالحکومت ہے، بحر الکاہل کے کنارے واقع ہے۔ یہ انتہائی سرسبز علاقہ پہاڑوں، سمندروں اور دریاؤں سے گھرا ہوا ہے اور بحر الکاہل کے کنارے پر خوبصورت اور فلک بوس عمارتوں نے اس کے حسن میں اضافہ کردیا ہے۔ پانامہ خط استواء سے بہت قریب ہے چنانچہ یہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں اور بارہ مہینے موسم ایک جیسا یعنی ہلکا گرم (تقریباً 25 سے 30 درجے تک) رہتا ہے اور طلوع غروب کے اوقات میں بھی بہت کم فرق ہوتا ہے، چنانچہ ہمیشہ بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات۔ نمازوں کے اوقات بھی بہت کم بدلتے ہیں۔ کسی زمانے میں پانامہ مختلف غیر متمدن قوموں کا مرکز تھا جنہیں بعد میں امریکی انڈین کا نام دیا گیا۔ سولہویں صدی میں وسطی امریکہ کے دوسرے علاقوں کی اس کو بھی اسپین نے اپنے قبضے میں لے لیا اور 1821ء میں یہ علاقہ اسپین سے آزاد ہوکر جنوبی امریکہ کے ملک کولمبیا میں شامل ہوگیا۔ پھر کولمبیا سے آزادی کی بھی کئی تحریکیں چلتی رہیں اور آخر کار نومبر 1903ء میں اُس نے کولمبیا سے الگ ہوکر ایک مستقل ملک کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس دوران یہاں اسپینی لوگ افریقیوں کو غلام بنا کر لائے اور ان سے زراعت اور دوسرے محنت کے کام لیے، اس لیے یہاں مقامی باشندوں سے زیادہ افریقی نسل کے لوگ، اسپینی اور یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک کے لوگ بھی آکر آباد ہوگئے۔ انیسویں صدی کے آخر میں پانامہ کینال کی تعمیر کے وقت بنگال اور عرب کے لوگ بھی بڑی تعداد میں یہاں آکر آباد ہوئے، انہی لوگوں میں مسلمان بھی اچھی خاصی تعداد میں

تھے۔

پانامہ کے دو ہی بڑے شہر ہیں، ایک پانامہ سٹی جو بحرالکاہل کے کنارے آباد ہے اور دوسرا کولون جو بحر اوقیانوس کے کنارے واقع ہے۔ کولون فری پورٹ ہونے کی وجہ سے خالص تجارتی شہر ہے اور مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد یہاں تجارت میں مشغول ہے جن میں بھاری تعداد عربوں کی ہے۔ ''(سفر در سفر)

جنوبی امریکا:

شمالی امریکا جب دریافت ہوا تو درحقیقت کولمبس کا جہاز آ کر ویسٹ انڈیز سے لگا تھا اور ان جزائر کو وہ ہندوستان سمجھتا رہا۔ اس کے بعد شمالی اور پھر جنوبی امریکا دریافت ہوئے۔ آج ہم ان شاء اللہ جنوبی امریکا کے بارے میں پڑھیں گے۔ پہلے امریکا کے متعلق ایک بات سمجھ لیجیے۔ امریکا کی اب 50 ریاستیں ہیں۔ 48 تو اکٹھی ہیں اور 49 ویں یعنی الاسکا، یہ کینیڈا سے ذرا اوپر ہے۔ 50 ویں یعنی ''ہوائی'' ذرا فاصلے پر سمندر میں ہے۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ امریکا کی 50 ریاستیں ہیں یا 52؟ پڑھے لکھے لوگ بھی بعض اوقات اس حوالے سے غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ یہ دو ریاستیں الگ شمار کرتے ہیں۔ پچاس اور دو: باون، جبکہ حقیقت میں پچاس ریاستیں ہیں، باون نہیں۔ اس کی آسان دلیل یہ ہے کہ امریکا کے جھنڈے پر پچاس ستارے ہیں۔ یہ پچاس ریاستوں کی علامت ہیں۔

پہلے پہل یورپین اور اسپینش شمالی امریکا میں آباد ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ جنوبی امریکا کی دریافت کا عمل بھی شروع ہوا تو یہ بھی لسانی، مذہبی اور سیاسی طور پر ان کے قبضے میں آ گیا۔ اب مذہب سب کا عیسائیت ہے اور انگریزی اور اسپینش یہاں کی بڑی زبانیں شمار ہوتی ہیں۔

مسلمان مذاکرات کے چکر میں پڑ کر اسپین نہ چھوڑتے اور کچھ عرصہ اسپین میں مزید گذارتے اور ہتھیار نہ ڈالتے تو ان براعظموں کی زبان بھی عربی اور مذہب اسلام ہو سکتا تھا۔ امریکا میں بھی اسلام اور عربی زبان رائج ہو سکتی تھی۔ یہ تو اللہ کی حکمت ہے اور اللہ کی حکمتیں وہی جانے لیکن ظاہری اسباب میں جو ہم نے کوتاہی کی، آج اس کو بھگت رہے ہیں۔ ظاہری اسباب کی حد تک اس کی وجہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف و انتشار، خانہ جنگی اور جہاد سے لگاؤ چھوڑ کر معاہدوں اور مذاکرات پر اعتماد ہے۔

اب جنوبی امریکا کی طرف آیئے: جنوبی امریکا میں دو بڑے ملک ہیں: پہلا برازیل ہے۔ برازیل وہ ملک ہے جن کے دارالحکومت کے بارے میں عام طور پر اکثر لوگوں کو غلطی لگتی ہے۔ اس میں دو بڑے شہر ہیں: ادھر ساحل پر ''ریوڈی جنیرو'' اور دوسرا ''ساؤ پالو''۔ کوئی کہتا ہے دارالحکومت ریوڈی جنیرو ہے، کوئی کہتا ہے ساؤ پالو ہے، حالانکہ اس کا دارالحکومت ''برازیلیا'' ہے۔

جنوبی امریکا کا دوسرا بڑا ملک ارجنٹائن ہے۔ اس کا دارالحکومت بیونس آئرس ہے۔ یہ جنوبی امریکا کے دو بڑے بڑے ملک ہیں۔ اس براعظم کے چھ ملک، ممالک کی اس قسم میں آتے ہیں جن کے نام ملتے جلتے ہیں۔ جیسے افریقہ میں دو ملک ہیں: ''گنی بساؤ'' اور ''گنی''۔ اسی طرح ایک ''عوامی جمہوریہ کانگو'' ہے اور ایک صرف ''کانگو''۔ یہاں بھی ایک ملک کا نام سادہ اور ایک کا ذرا نخرولا ہے۔ جنوبی امریکا کی شمالی پٹی میں ایک ملک ''گیانا'' ہے۔ اس کا دارالحکومت ''جارج ٹاؤن'' ہے۔ یہ اصل گیانا ہے۔ دوسرا گیانا فرانس کے قبضے میں رہنے کی وجہ سے ''فرنچ گیانا'' مشہور ہے۔ ان دونوں ممالک کے بیچ میں ''سری نام'' ہے۔ اس کا نام ویت نام کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ یہ تین ممالک کی پٹی ہے۔ دائیں بائیں ''گیانا'' اور ''فرنچ گیانا'' اور بیچ میں ''سری نام''۔ اسی طرح اس براعظم میں ملتے جلتے ناموں والے دو اور ملک ہیں: ''پیراگوئے'' اور ''یوراگوئے''۔ یوراگوئے ساحلی ملک ہے۔ اس کا دارالحکومت ''مونٹی ویڈیو'' ہے۔ یہ ساحلی شہر ہے۔ ''پیراگوئے'' ارجنٹائن اور برازیل کے بیچ میں ایک پٹی پر واقع ہے۔ اس کا دارالحکومت ''ایسنشن'' ہے۔ ارجنٹائن کے الٹی طرف ریڑھ کی ہڈی کی شکل میں اور ایک پٹی چلی آ رہی ہے۔ یہ چلی ہے۔

اب یہاں دو جوڑیاں ہوگئیں: ایک گیانا، فرنچ گیانا۔ دوسری پیراگوئے اور یوراگوئے۔ ایک تیسری جوڑی جنوبی امریکا کے ایک ملک کی وسطی امریکا کے ایک ملک کے ساتھ بنتی ہے۔ جنوبی امریکا والے ملک کا نام ''ایکواڈور'' ہے اور وسطی امریکا والے کا ''ایسلواڈور'' ہے۔ سیاسی جغرافیہ یاد کرنا ویسے تو کافی مشکل ہے لیکن جغرافیہ دانوں نے آسانی سے یاد کرنے کے کئی طریقے ایجاد کیے ہیں۔ ایک طریقہ یہی ملتے جلتے نام یاد کرنے کا ہے۔ اس کی مدد سے جنوبی امریکا کے یہ چھ ملک آپ آسانی سے یاد کر سکتے ہیں: گیانا اور فرنچ گیانا؛ پیراگوئے، یوراگوئے؛ ایکواڈور، ایسلواڈور۔ جنوبی امریکا کے دو بڑے ملک اوپر برازیل اور نیچے ارجنٹائن ہیں۔ برازیل تو سارے جنوبی امریکا کا بادشاہ ہے۔ اس میں (حجم کے اعتبار سے) دنیا کا سب سے بڑا دریا ''دریائے ایمزون'' ہے۔ اسی دریا کے ساتھ دنیا کے سب سے بڑے جنگلات واقع ہیں۔ اس کا قریبی حریف ارجنٹائن ہے۔ ان دونوں کے بعد جنوبی امریکا میں دو ملک جو بڑے شمار ہوتے ہیں وہ'' وینزویلا'' اور ''کولمبیا'' ہیں۔ یہ کیوں بڑے شمار ہوتے ہیں؟ وینزویلا سامنے واقع امریکا کو آنکھیں دکھاتا ہے۔ اس پورے خطے میں اس جیسا جرأت مند ملک نہیں۔ اس کا صدر ''ہیوگوشاویز'' بہت جرأت مند اور دانش مند آدمی ہے۔ جرأت کے ساتھ دانش بھی ہونی چاہیے۔ اگر کوئی بیل کی طرح دیوار پر سر مارے گا تو کسی کا کیا بگاڑ لے گا؟ دانش بھی ہونی چاہیے اور جرأت بھی۔ طاقت بھی ہونی چاہیے اور بیل کو قابو کرنے کا طریقہ بھی آنا چاہیے۔ وینزویلا کے پاس تیل کی دولت ہے۔ دنیا میں تیل نکالنے والے ممالک کی ایک تنظیم ہے جس کو ''اوپیک'' کہتے ہیں۔ یہ اس کا اہم رکن ہے۔ دنیا میں تیل کی بڑی پیداوار اس کے یہاں ہوتی ہے۔ وینزویلا اور کولمبیا یہ دو ملک اہم شمار ہوتے ہیں۔

دنیا کی چھت:

ارجنٹائن اور برازیل کے بیچ میں ایک ملک ہے ''بولیویا''۔ اس کا دارالحکومت ''لاپاز'' ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بلند ترین دارالحکومت ہے اور یہاں دنیا کی سب سے اونچی جھیل ہے۔ یہ جھیل بولیویا اور چلی کی سرحد پر ہے۔ پیچھے آپ نے پڑھا کہ برازیل میں دنیا کے سب سے بڑے جنگلات ہیں نیز اس سے سب سے بڑا دریا نکل کر بحرِ اوقیانوس میں گرتا ہے۔ یہ پانی کے حجم میں نیل سے بھی بڑا دریا ہے۔ لمبائی میں نیل بڑا ہے۔ پانی کے حجم میں یہ بڑا ہے۔ بولیویا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سب سے بلند جھیل ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دارالحکومت دنیا کے تمام ممالک کے دارالحکومتوں سے زیادہ بلند ترین مقام پر واقع ہے۔ کوہ ہمالیہ میں ایورسٹ پہاڑ کی چوٹی ہے۔ اکثر لوگ چڑھتے ہوئے مر جاتے ہیں۔ جرمن کے لوگوں کو اس کے سر کرنے کا بڑا شوق ہے۔ دو بھائی گئے تھے۔ واپسی میں ایک آخر مر گیا تھا۔ چوٹی سے جو کوئی پھسلا، کہیں نہ کہیں برف کی کھائی میں گرے گا، تو وہی ٹھنڈی قبر ہے۔ اس کے لیے قبر بنانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے بالمقابل یہ بلند ترین مقام ایسا نہیں کہ چوٹی سر کر کے واپس آجاؤ بلکہ یہ ایک تفریحی مقام بھی ہے۔ لوگ بھی بستے ہیں۔ دارالحکومت بھی ہے۔ اس کو ''دنیا کی چھت'' کہا جاتا ہے۔

بولیویا (لاپاز) کے ساتھ پیرو ہے جس کا دارالحکومت ''لیما'' ہے۔ یہ ساحل پر واقع ہے۔ اکثر ممالک کا دارالحکومت دریا یا سمندر کے کنارے ہوگا کہ انسانی زندگی پانی پر قائم ہے، چاہے کھارا ہو یا میٹھا ہو۔

جنوبی امریکا کے اکثر ممالک تقریباً ہوگئے۔ میں ان ممالک کے نام اور ان کے دارالحکومتوں کے نام دہراتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ دہرائیے۔ اس پورے براعظم کا ایک ہی کام ہے۔ سارا دن فٹبال کھیلو اور وقت بچ جائے تو رات کو بھی کھیلو۔ چوبیس گھنٹے کا دھندہ یہی ہے۔ جنوبی امریکا ہوگیا۔ اب آسٹریلیا رہ گیا۔ بہت آسان ہے۔ اس کی تو کل تین اور تین چھ ریاستیں ہیں، ساتویں باہر سمندر میں ہے۔ اس طرح کل سات ریاستیں ہیں۔ اسے ہم ان شاء اللہ اگلے سبق میں پورا کر لیں گے۔

تیرھواں سبق

آسٹریلیا

جنوبی امریکا کا سبق دہرا کر ہم آسٹریلیا کی طرف چلتے ہیں۔ یہ براعظم آبادی میں چھٹے اور رقبے میں ساتویں نمبر پر ہے۔ براعظم مجمد جنوبی اس سے بڑا ہے۔ اس بڑاعظم کو برطانیہ کے ایک مہم جو کیپٹن ''جیمس کک'' نے 1728ء میں دریافت کیا تھا۔ ''آسٹریلیا'' کے معنی لاطینی زبان میں ہوتے ہیں: ''جنوبی ملک''۔ برطانوی جغرافیہ دانوں کو یقین تھا کہ جس طرح سے اُدھر انتہائے مغرب میں دو براعظم دریافت ہوئے ہیں: شمالی وجنوبی امریکا۔ تو جنوب میں بھی ضرور کوئی بڑاعظم ہے۔ اس کیپٹن کو بحری مہمات کا شوق تھا۔ جب کسی میں قدرتی شوق دیکھو تو اس کو اسی کام میں لگانا چاہیے۔ برطانوی حکومت نے اس کی سرپرستی کی اور اس کو اس مہم پر بھیجا۔ اس نے دو کام کیے۔ ایک تو اس نے امریکہ کی پچاسویں ریاست ''جزائر ہوائی'' دریافت کی تھی۔ اس کی بندرگاہ ''پرل ہاربر'' ہے۔ جس پر جاپانیوں نے جنگ عظیم دوم میں حملہ کیا تھا اور پھر بعد میں امریکہ نے ان پر ایٹم بم گرایا۔ دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ براعظم آسٹریلیا بھی آخرکار دریافت کر ہی لیا۔

یہ براعظم بیچ میں غیر آباد ہے۔ اس کے مشرقی حصے میں آبادی زیادہ ہے۔ مشرقی حصے میں تین ریاستیں ہیں: اوپر ''کوئنز لینڈ'' ہے، بیچ میں ''نیو ساؤتھ ویلز'' ہے۔ ''جیمس کک'' نے اس پورے بڑاعظم کا نام ''نیو ساؤتھ ویلز''۔ برطانیہ کے علاقے ''ویلز'' کے نام پر رکھا تھا۔ ساتھ میں اس نے ''نیو'' کا لفظ بڑھا دیا جیسا کہ آپ امریکہ کی بہت سی ریاستوں میں دیکھو گے کہ کسی ریاست کے نام پر نیو کا اضافہ ہے: نیو ہمشائر، نیو یارک، نیو میکسیکو، نیو جرسی۔ تو اس نے ''نیو ساؤتھ ویلز'' نام رکھا۔ ساؤتھ اس لیے کہ یہ براعظم دنیا کے جنوب میں ہے۔ تو پورے براعظم کا نام تو یہ مشہور نہیں ہوا، لیکن بیچ والی ریاست کا یہ نام پڑ گیا۔ نیچے والی ریاست ''وکٹوریہ'' ہے۔ یہ تین مشرق میں ہو گئیں اور پھر اوپر نیچے شمال اور جنوب میں دو ہیں: ''ناردرن ٹریٹوری'' اور ''ساؤدرن آسٹریلیا'' اور ایک مغرب میں ''مغربی آسٹریلیا''۔ تمام ریاستوں کا ایک ایک مشہور شہر ہے۔ دارالحکومت نیو ساؤتھ ویلز میں ہے۔ ''کینبرا'' آخری اور ساتویں ریاست ایک بڑی جزیرہ ہے ''تسمانیہ''، ''ہوبارٹ'' اس کا شہر ہے۔ یہ ساتھ نیوزی لینڈ دو ٹکڑوں میں ہے۔ ایک شمالی آئس لینڈ ایک جنوبی آئس لینڈ۔ شمالی کا صدر مقام ''ولنگٹن'' ہے۔ جنوبی کا ''کرائسٹ چرچ'' ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے اس براعظم کی مقامی آبادی ساڑھے تین لاکھ سے زیادہ تھی۔ یورپیوں نے امریکا کے ریڈ انڈینز کی طرح یہاں والوں پر بھی ظلم کیا۔ ان کے بچے ان سے چھین کر لے گئے اور ان سے کہا یہاں سے اُٹھو اور اُدھر وسط میں جا کر آباد ہو جاؤ۔ اِس طرح سارے مقامی لوگوں کی نسل کشی کر کے یہ اِدھر غالب آ گئے۔ لہٰذا یہاں کی گوری آبادی اصل میں برطانوی مہم جوؤں اور لٹیروں کی نسلیں ہیں۔

خشکی کے بڑے حصے کو تقسیم کرنے کے لیے جہات کا استعمال کرتے ہیں تو اس اصول کے لحاظ سے آسٹریلیا کے حصے کچھ یوں ہیں: ایک نارتھ آسٹریلیا ہے اسے ''ناردرن ٹریٹوری'' کہتے ہیں۔ اس کا شہر ''ڈارون'' ہے۔ جنوبی آسٹریلیا کا شہر ''پرتھ'' ہے۔ آسٹریلیا کے مشرقی حصے میں تین ریاستیں ہیں: سب سے اوپر کوئنز

لینڈ ہے۔ اس کا مشہور شہر ''برسبین'' ہے۔ اس کے نیچے ''نیو ساؤتھ ویلز'' ہے۔ اس میں بڑا شہر ساحل پر ''سڈنی'' ہے اور دارالحکومت ''کینبرا'' اندر ہے۔ اس کے بعد نیچے ریاست ''وکٹوریہ'' ہے۔ اس کا بڑا شہر ''ملبورن'' ہے۔ یہ تینوں مشرقی ریاستیں بحرالکاہل کے کنارے ہیں۔ ساؤتھ آسٹریلیا کا صدر مقام ''ایڈیلیڈ''، ویسٹرن آسٹریلیا کا ''پرتھ'' اور تسمانیہ کا ''ہوبارٹ'' ہے۔

نیوزی لینڈ کے دو حصے ہیں: شمالی اور جنوبی۔ نیوزی لینڈ کا دارالحکومت ''ولنگٹن'' ہے۔ شمالی حصے کا بڑا شہر ''آکلینڈ'' اور جنوبی حصے کا ''کرائسٹ چرچ'' ہے۔

آسٹریلیا کے قریب مشہور جزائر ہیں۔ مثلاً: فیجی، اس کے صدر مقام کا نام ''سموآ'' ہے۔ ادھر ایک اور دلچسپ جزیرہ ''ناؤورو'' ہے۔ یہ دنیا کی سب سے چھوٹی آزاد جمہوریہ کہلاتا ہے۔ یہ ایک ہی جزیرہ اور ایک ہی ملک ہے۔ یہ ان ممالک میں سے ہے جن کے ملک اور دارالحکومت کا نام ایک ہی ہے۔ جیسے مالٹا ایک جزیرہ ہے، ایک ہی ملک ہے۔ ''ناؤرو'' بھی ایک ہی جزیرہ اور ایک ہی ملک ہے۔ مالٹا کا دارالحکومت ''دولٹا'' ہے اور ناؤرو کا وہی دارالحکومت ہے جو اس کا نام ہے۔ ساتھ ایک مجمع الجزائر ہے: جزائرِ سلیمانی یعنی ''سولومن آئی لینڈ''۔ یہ آسٹریلیا کے قریب ہیں۔ اب پتہ نہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے نام پر نام رکھا ہے کسی اور مناسبت سے یہ نام رکھا ہے؟ جنات کی کثرت نے یہ نام رکھوایا ہے یا کیا وجہ ہے؟

جغرافیہ دانوں کے ہاں دو لفظ بولے جاتے ہیں: آسٹریلیا اور آسٹریلشیا۔ ''آسٹریلیشا'' آسٹریلیا اور ایشیا کا مرکب ہے۔ اوپر کے جو قریبی ممالک ہیں انڈونیشیا، مشرقی تیمور، پاپوا نیو گنی اور نیچے نیوزی لینڈ، اس کے علاوہ یہ سارے جزائر جو ابھی پڑھے، یہ براعظم ''آسٹریلیشا'' میں آجاتے ہیں اور جہاں تک آسٹریلیا کا تعلق ہے تو اس کا اطلاق صرف اس برِّ اعظم پر ہوتا ہے جس کی سات ریاستیں ہیں۔ چھ اکھٹی ہیں اور ساتویں تسمانیہ ہے جو ذرا نیچے بڑی جزیرے کی شکل میں ہے۔

چودھواں سبق: مخصوص ممالک

فرضی شکل والے ممالک

دنیا میں کچھ ممالک کی سیاسی، جغرافیائی حدود اس طرح کی ہیں کہ ان کو سرسری نظر سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی چیز کی مخصوص فرضی شکل ہے۔ مثلاً:

افریقہ ''سر'' کی شکل کا ہے۔ قطر کی شکل ''زبان'' کی سی ہے۔ صحرائے سینا ''چھوٹے دل'' اور جزیرۂ عرب ''بڑے دل'' کی شکل رکھتا ہے۔ فلسطین (اسرائیل) خنجر کی شکل سے ملتا جلتا ہے۔ جنوبی امریکا کا ملک چلی ''ریڑھ کی ہڈی'' کی شکل کا ہے۔ اٹلی کی ساخت ایسی ہے جیسے ٹانگ اور بوٹ اور اس کی نوک پر ایک تکونی جزیرہ ''سسلی'' ہے۔ انگلینڈ کی شکل ''خرگوش'' جیسی ہے اور صحرائے سینا کے پاس خلیج عقبہ و خلیجِ سوئز ''خرگوش کے کان'' جیسے ہیں۔ امریکا کی ایک ریاست فلوریڈا ''دم کی شکل'' کی ہے۔ صومالیہ، جبوتی، ایتھوپیا، تینوں مل کر گینڈے کے اکلوتے سینگ کی شکل کے ہیں۔ اس لیے انہیں ''قرنِ افریقہ'' کے ممالک کہتے ہیں۔ ''قرن'' کے معنی ہیں: سینگ۔

لاک لینڈ ممالک

یہ ان ممالک کو کہتے ہیں جو چاروں طرف سے دوسرے ممالک میں بند ہوں۔ اپنا سمندر لگتا ہو اور نہ کوئی کھلی آزاد سرحد۔ یہ ساؤتھ افریقہ میں دو ہیں: سوازی لینڈ اور لیسوتھو۔ اور ملائیشیا کے دو حصوں میں ایک ایک لاک لینڈ ملک ہے۔ ایک مشرقی ملائیشیا سے کاٹ کر ''برونائی'' نکالا گیا۔ یہ معدنیات کے حوالے سے دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ مغربی ملائیشیا سے ''سنگاپور'' الگ کیا گیا۔ یہ عالمی تجارت اور بندرگاہ کی بنا پر دنیا کے امیر ممالک میں سے ہے۔ یہ بحری رہگذر اور آزاد تجارت کا مرکز ہے۔ اسی طرح جرمنی کی سرحد پر یورپ کا ایک ملک ''اندورا'' ہے۔ لوگ دنیا کا سب سے بڑا سود خور ''سوئزرلینڈ'' کو سمجھتے ہیں، لیکن یہ بھی بڑا سود خور ہے۔ یہاں دنیا کے 150 مختلف بینکوں کی شاخیں موجود ہیں۔ فرانس کے ساتھ بحرابیض کے ساحل پر ''مناکو'' نامی ایک ملک ہے جو صرف دو کلومیٹر طویل ہے۔ اٹلی کے اندر دو لاک لینڈ ممالک ہیں اور دونوں عیسائی بنیاد پرستی کی بنا پر وجود میں آئے ہیں: پہلا سان میرینو، یہ ایک عیسائی تبلیغی پادری نے بنا دیا تھا تو اس وقت سے ایسا ہی چلا آرہا ہے۔ دوسرا ''ویٹی کن سٹی'' ہے۔ اس کا کل رقبہ 480 کلومیٹر پر مشتمل ہے یعنی تقریباً نصف کلومیٹر۔ یہ عیسائی دنیا کا مذہبی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ جو بادشاہت اور پاپائیت کے درمیان ایک دوسرے کی بدعنوانیوں پر خاموش مفاہمت کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

جغرافیائی اشتراکات

جغرافیہ دانوں کے ہاں چند ممالک کو ملا کر ایک مشترکہ نام دیا جاتا ہے جو ان متعدد ممالک یا ریاستوں پر بولا جاتا ہے۔ ان اشتراکات کو یاد کر لینے سے''

زمانائی دور جن ممالک کا نام اور محل وقوع از بر ہو سکتا ہے۔ ایسے جغرافیائی اشتراکات تقریباً ہر براعظم میں ہیں۔ چند مشہور یہ ہیں:

1-بالٹک ریاستیں:

یورپ میں دو بڑے جغرافیائی اشتراکات ہیں۔ ایک کا نام "بالٹک ریاستیں" ہے دوسرے کو "سکنڈے نیوین" ممالک کہتے ہیں۔ دونوں کے اندر تین تین ملک آتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک سکنڈے نیوین میں چوتھا ملک "فن لینڈ" بھی شامل کرلیا جاتا ہے تو چار ہو جاتے ہیں۔ بالٹک ریاستوں میں (اگر ہم اوپر سے نیچے آئیں یعنی شمال سے جنوب کی طرف تو) پہلی "اسٹونیا"، دوسری "لٹویا" اور تیسری "لتھوانیا" ہے۔ یہ تینوں روس کے قبضے میں تھیں۔ روس نے جن سولہ ممالک کو ہڑپ کرلیا تھا۔ ان میں سے یہ بھی ہیں۔ اسٹونیا کا صدر مقام "ٹالن"، لٹویا کا "رگا" اور لتھوانیا کا "ولینیس" ہے۔ پہلے پڑھا تھا کہ روس کا ایک حصہ ان تین ریاستوں کے پار ہے۔ جسے "سٹالن گراڈ" کہتے ہیں۔ جب متحدہ روس ٹوٹا تو اِن تین کو آزادی مل گئی اور "سٹالن گراڈ" روس کے پاس ہی رہا۔

2-سکنڈے نیوین:

سکنڈے نیوین ممالک دنیا کے انتہائی شمال میں واقع ہیں۔ اس میں تین بالاتفاق ہیں: ڈنمارک (کوپن ہیگن) یہ ایسے چوہے کی شکل کا ہے جو پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو۔ ناروے (اوسلو) سویڈن (سٹاک ہوم)۔ اگر فن لینڈ (ہلسنکی) کو بھی شمار کیا جائے تو چار ہو جاتے ہیں۔ اس کے دارالحکومت کا نام "ہلسنکی" ہے۔

یہ دنیا کے آخری شمالی کنارے پر ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ یہاں دین کی دعوت لے کر جاتے۔ یہ ممالک عیسائی نہ ہوتے۔ یہ کام ہم نے نہیں کیا، حالانکہ کرسکتے تھے۔ پہلے بتادیا گیا ہے کہ یہ وقت کے اعتبار سے غیر معتدل ممالک میں سے ہیں۔ ان میں دن رات کبھی بہت چھوٹے اور کبھی بہت بڑے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یہ جو آخری کنارہ ہے "ناروے" اور "فن لینڈ" کا، ان کے جو حصے خطِ غیر مسلسل سے اُدھر واقع ہیں تو یہ "غیر معتادہ ممالک" میں آئیں گے کہ جہاں سال میں کبھی نہ کبھی ایسا دن آتا ہے کہ جہاں مسلسل دن یا مسلسل رات ہوتی ہے۔ جب سورج انتہائے جنوب میں خطِ جدی پر گیا ہوگا۔ تو سورج سے وہاں تک کا فاصلہ 90 درجے کا ہو جائے گا۔ لوگ سورج دیکھیں گے ہی نہیں۔ کسی مقام میں سورج طلوع ہونے اور دن وجود میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ سورج اور اس مقام کے درمیان 90 درجے سے کم فاصلہ ہو۔

"آدھی رات کے سورج" کا نظارہ کرنے کے لیے لوگ دسمبر کو یہاں آجاتے ہیں۔ دنیا سے بہت سے لوگ گئے ہوئے ہوتے ہیں اور جب 21 جون ہو تو سورج اُدھر چھپے گا ہی نہیں، دن ہی دن ہوگا، غروب نہیں ہوگا۔

خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں مسلمان "منطقہ غیر معتدلہ" میں پہنچ گئے تھے۔ اِس وقت اِن مسائل کی تحقیق شروع ہوئی کہ یہاں نماز کیسے ہوگی؟ روزے کا کیا حکم ہوگا؟ جبکہ دن یا رات مسلسل ہوتے ہیں۔ غائب ہی نہیں ہوتے۔ تو یہ سکنڈے نیوین ممالک ہیں۔

3-ہند چینی ممالک:

ایشیا کا ایک جغرافیائی اشتراک "ہند چینی (انڈو چائنا) ممالک کا ہے۔ ہندوستان اور چین کے بیچ میں جو ممالک آتے ہیں، وہ پانچ ہیں۔ تین کو "ہند چینی" ممالک کہتے ہیں۔ "ویتنام" (ہنوئی) گھوڑے کی دم کی طرح ہے۔ اس کا دارالحکومت "وینتیان" ہے۔ اس کے ساتھ "کمبوڈیا" ہے۔ اس کا دارالحکومت "نوم پنہ" ہے۔ اس کے بعد "لاؤس" ہے۔ اس کے بعد یہ دو ملک مشہور ہیں: تھائی لینڈ (بنکاک) اور برما (رنگون) ان دو کو اصطلاحاً "ہند چینی" کے ممالک میں شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ ویسے یہ چین اور ہندوستان کے درمیان ہیں۔ تھائی لینڈ نیچے جاکر ملائیشیا سے مل جاتا ہے۔ اس کی سرحد پر ملائیشیا کے قریب مسلمانوں کی اکثریت ہے جیسے ملائیشیا میں ہے۔ موجودہ سیاسی سرحدیں تو بعد میں قائم ہوئیں۔ اس سے پہلے مسلمان دونوں طرف رہتے تھے۔ چین کے جنوبی

حصے کی طرف چلیں۔ چین کی بھی امریکا کی طرح ایک چھوٹی سی دم ہے۔ اس دم کے آگے سمندر میں چین کا ایک بری جزیرہ ''ہینان'' ہے۔ دو چھوٹے سے ملک ہیں: (1) مکاؤ، یہ کل ملا کر 1.95 مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے۔ دو مربع کلومیٹر بھی پورے نہیں ہیں۔ (2)۔ اس کے ساتھ ''ہانگ کانگ'' ہے۔ دارالحکومت اور ملک ایک ہے۔ برطانیہ نے 99 سال کے لیے پٹے پر لیا تھا۔ وہ پورے ہوئے ہیں تو چین کے حوالے کیا ہے، لیکن چین والوں کی عقل مندی دیکھو کہ ابھی تک اس کو اپنے حال پر چھوڑا ہوا ہے۔ کرنسی اور جھنڈا ابھی وہی برقرار رکھا ہے۔ انہوں نے سوچا کوئی بات نہیں ہے۔ برطانیہ یہاں سے رخصت ہو گیا ہے۔ اس کے آثار ختم ہو جائیں تو پھر ہم اپنا کام کرتے رہیں گے۔ ابھی جلدی کیا ہے؟ ملک تو ہمارے پاس ہے۔ لوگوں میں نفرت کیوں پھیلائیں؟ یہاں پر الحمدللہ سیاسی (اور تاریخی) جغرافیہ مکمل ہو گیا۔ اب ہم کل سے ان شاء اللہ طبعی جغرافیہ شروع کریں گے۔

طبعی جغرافیہ

1: مشہور دریا اور جھیلیں

طبعی جغرافیہ سے مراد ہے زمین کی سطح پر موجود طبعی مظاہر مثلاً سمندر، دریا، جھیل اور جزیرے، سمندری درّے، پہاڑ، صحرا، جنگل وغیرہ کا مطالعہ۔ ہم ان اسباق میں ان اہم طبعی مظاہر کا تذکرہ کریں گے جن کی تاریخی، مذہبی یا سیاسی وجغرافیائی اہمیت ہے اور ان کے جاننے سے تاریخ اور قرآنی جغرافیہ کی اہم ابحاث سمجھی جاسکتی ہیں۔

پانچ اہم دریا:

عزیز طلبہ! آج ہم پانچ دریاؤں، دو جھیلوں اور ان جھیلوں کے درمیان میں بہنے والے ایک اہم تاریخی دریا کا مطالعہ کریں گے۔ انسانی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو دنیا کی اہم تہذیبیں انہی دریاؤں کے کنارے آباد تھیں۔ یہیں پھلیں پھولیں، پروان چڑھیں اور تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئیں۔ پانچ دریاؤں کا قرآن وحدیث میں الگ الگ تذکرہ ہے۔ ان میں سے "دریائے نیل" کا تو قرآن مجید میں تذکرہ ہے "وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ، فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ، وَلَا تَخَافِي، وَلَا تَحْزَنِي." [القصص: 7] وہ "یمّ" جس میں فرعون غرق ہوا، نیل نہیں ہے۔ وہ خلیجِ سوئز ہے۔ یہ "یمّ" نیل ہے۔ "فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ، وَلَا تَخَافِي، وَلَا تَحْزَنِي." قرآن مجید میں تو صرف دریائے نیل کا ذکر ہے۔ ان چار نہروں کا حدیث شریف میں ذکر ہے کہ (مِنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ) [صحیح مسلم، کتاب الجلسة: 28/2] یعنی دجلہ وفرات اور جیحان وسیحان۔

پانچ دریا تو یہ ہوگئے۔ یہ اس دنیا کے دریا ہیں، لیکن ان کا تعلق غیر مرئی طور پر جنت سے ہے۔ جس کا ہمارے حواس ادراک نہیں کر سکتے۔ اب دو جھیلوں اور ان کے درمیان میں بہنے والے دریا کی طرف چلتے ہیں۔ اردن اور فلسطین کی سرحد پر دو جھیلیں ہیں۔ "بحیرۂ طبریہ" اور "بحرِ میت" اور ان کو ملانے والا دریا "دریائے اُردن" ہے۔ ان سب کو بیان کرنے کے بعد ہم طبعی جغرافیے کے آخر میں "ختام مسک" کے طور پر دنیا کا سب سے اونچا و نیچا مقام اور سرد و گرم مقام بیان کریں گے۔ اس کے بعد ہم قرآنی جغرافیہ کی طرف نکل جائیں گے۔

پہلے دریا کی تعریف سمجھیے کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ پہاڑوں پر بارش یا برف باری تو وہاں پانی جھیلوں، تالابوں میں جمع ہو جاتا ہے، یا گلیشیر کی صورت میں جم جاتا ہے۔ ان جھیلوں میں سے کچھ میں چشمے کی طرح نیچے سے پانی پھوٹتا ہے۔ پھر یہاں سے بہہ کر یا پگھل کر نکلتا ہے تو اسے "دریا" کہتے ہیں۔ دریا تین قسم کے ہیں: ایک "دوامی" ہے۔ سارا سال مستقل بہتا رہتا ہے، ایک ہے "نوبتی"، مستقل نہیں بہتا، جب زمین دوز چشمے بہتے ہیں یا گرمی میں برف پگھلتی ہے تو بہتا ہے، ویسے

نہیں۔اور ایک خشک، جیسے بلوچستان کے اکثر دریا بارش کے بعد بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔اب پانچ مشہور دریاؤں کی طرف آئیے!

ایک حدیث شریف میں جیحان، سیحان اور دجلہ وفرات کو جنت کے دریا کہا گیا ہے۔یہ چاروں جوڑی دار ہیں۔اللہ کی شان ہے یہ چاروں دریا جن میں سے دو، دو کی جوڑی ہے، یہ نکلتے بھی ایک جگہ سے ہیں یعنی ان کا ''منبع'' ایک ہے، پھر درمیان میں الگ ہو جانے کے بعد آخر میں آکر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور گرتے بھی ایک جگہ ہیں۔دجلہ وفرات عراق میں ہیں اور سیحان وجیحان شام میں۔ایک جوڑی کے بیچ میں ''بنوعباس'' کا دارالخلافہ ''بغداد'' تھا اور دوسری جوڑی کے پاس ''بنوامیہ'' کا دارالخلافہ ''دمشق'' واقع تھا۔دونوں علاقوں کے دینی اور جہادی کارنامے مشہورِ عالم ہیں۔شاید اسی وجہ سے انہیں ''من انہار الجنۃ'' کہا گیا ہے۔

دجلہ وفرات ترکی کی سرحد پر واقع پہاڑی جھیل سے نکلتے ہیں اور الگ الگ بہنے کے بعد پھر ''بصرہ'' کے قریب جا کر ایک ہو جاتے ہیں۔وہاں سے آگے ان دونوں کے ملاپ سے جو دریا بنتا ہے، اسے ''شط العرب'' کہتے ہیں۔اسی پر ایران اور عراق کی مشہور جنگ ہوئی تھی۔پہلے یہ بصرہ کے قریب خلیجِ فارس یا عرب میں گرتے تھے۔پھر یہ ہوا کہ خلیج دور چلی گئی تو یہ دریا اکھٹے ہو کر بہتے ہیں۔اللہ کی شان ایسا نقشہ بن گیا ہے۔پہلے آپ کو بتا دیا گیا ہے طبعی جغرافیہ کبھی بدل جایا کرتا ہے۔

جیحان سیحان سے ملتے جلتے دو دریا جیحون اور سیحون کے نام سے وسطی ایشیا میں ہیں جیحون کا نام آج کی دنیا میں ''دریائے آمو'' ہے۔اس کے ایک طرف ''افغانستان'' ہے اور دوسری طرف وسطی ایشیا کے تین ملک تاجکستان، ازبکستان اور ترکمانستان ہیں۔بیچ میں یہ بطورِ حدِ فاصل ہے۔''ماوراء النہر'' اِدھر والا علاقہ کہلاتا ہے اور اُدھر والا ''خراسان'' کہلاتا ہے جو افغانوں کا مسکن ہے۔''آمو'' سے ''کابل'' تک خراساں ہے۔یہ دونوں دریا (جیحون وسیحون) پاکستان، تاجکستان اور چین کی سرحد پر ''کوہِ پامیر'' نامی پہاڑی سلسلے سے نکلتے ہیں۔یہ دریائے آمو افغانستان یعنی خراسان اور وسطی ایشیا یعنی ''ماوراء النہر'' کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔اس کے بعد یہ ترکمانستان میں چلا جاتا ہے۔پھر ازبکستان میں داخل ہو جاتا ہے اور ''بحیرۂ اُرال'' میں گر جاتا ہے، جس کا پرانا نام ''بحیرۂ خوارزم'' ہے۔

دجلہ اور فرات اتنے ہی قدیم ہیں جتنی انسانی تاریخ قدیم ہے۔انسانی تاریخ کی قدیم تہذیبیں ان کے کنارے یا ان کے بیچ میں جو زرخیز ترین وادی بنتی ہے، میں آباد ہوئیں۔اپنا وقت گزارا، پھر ختم ہو گئیں۔''بابل'' اور ''نینوا'' کی مشہور تہذیبیں یہاں گزریں۔مشہور انبیائے کرام اسی علاقے میں آئے ہیں اور قدیم تاریخ کی مشہور تہذیبیں انہی دو دریاؤں کے کنارے یا ان ہی کے بیچ میں وجود میں آئیں پھر فنا ہو گئیں۔عراق کے اوپر ترکی ہے۔یہ دونوں دریا یہاں کی ایک جھیل سے نکلتے ہیں پھر آگے الگ الگ بہتے ہیں۔باہر والا ''فرات'' ہے اور اندر والا ''دجلہ'' ہے۔آگے جا کر بصرہ کے قریب ''قرنہ'' نامی مقام پر دونوں دریا مل کر ''خلیجِ عرب'' میں گرتے تھے۔پھر یہ خلیج آگے چلتی ہوئی نیچے آگئی اس لیے تقریباً پچاس میل کے علاقے میں یہ دریا پھر مل کر بہتے ہیں۔اس علاقے کو ''شط العرب'' کا نام دیا گیا ہے۔یہ چاروں دریا ایشیا میں واقع ہیں۔

دریائے نیل:

دریائے نیل افریقہ کا بڑا دریا ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کا بھی سب سے طویل دریا ہے۔یہ تین افریقی ممالک کینیا، تنزانیہ اور یوگنڈا کی سرحد پر واقع ایک جھیل سے نکلتا ہے۔اس جھیل کو ان تینوں ممالک نے آپس میں تقسیم کیا ہوا ہے۔آگے جا کر مصر اور سوڈان کی سرحد پر ایک ڈیم بنایا گیا ہے جس سے مصنوعی جھیل وجود میں آگئی۔اس ڈیم کی تعمیر ''جمال عبدالناصر'' کا منصوبہ تھا لہٰذا اُسی کی طرف منسوب کر کے اسے ''جھیل ناصریہ'' کہا جاتا ہے۔اس کے آگے پھر ''اسوان ڈیم'' بنا ہوا ہے۔یہ جھیل ناصریہ جب سوڈان کی حدود میں ہے تو اس کا نام ''نوبیا'' ہے، جب اِدھر مصر کی طرف ہے تو اس کا نام ''ناصریہ'' ہے۔''وکٹوریہ'' نامی جھیل کو ظاہراً ''منبعِ نیل'' کہا جاتا ہے، لیکن کسے معلوم کہ خود اس جھیل کے پانی کا منبع کیا ہے؟ اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے اس کا تعلق جنت سے ہے۔

نیل کی ایک ابتدائی شاخ ''نیلِ ابیض'' ہے۔ ایتھوپیا میں ایک جھیل ''جھیل ٹانا'' ہے۔ اس میں سے نیل کی یہ شاخ نکل کر آتی ہے اور آگے اسی سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے پاس آ کر دوسری شاخ کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے۔ اس کا نام ''نیلِ ازرق'' ہے، خرطوم کے پاس یہ اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ''ناصریہ'' نامی جھیل وجود میں آتی ہے۔ اسوان ڈیم سے نیل ابیض وازرق مل کر ''نیلِ اکبر'' کی شکل میں نکلتے ہیں۔ پھر ''اسکندریہ'' کے قریب بحر متوسط میں جا گرتے ہیں۔ ''اسکندریہ'' بحر متوسط کے کنارے مصر کا ساحلی شہر ہے۔

یہاں دریائے نیل کا ''ڈیلٹا'' بن جاتا ہے۔ ''ڈیلٹا'' کا معنی سمجھیے۔ دریا کی عمر میں تین دور آتے ہیں۔ پہلا عہدِ طفولیت، کسی جھیل سے نکل کر بہنا شروع کرتا ہے۔ دوسرا عہد ہے عہدِ شباب، جب اس میں دائیں بائیں سے ندی نالے آ آ کر شامل ہوتے ہیں تو یہ جوش مارتا ہے۔ شور کے ساتھ پتھروں کو بہاتا ہوا، زمین کو بہاتا ہوا، جوانی کی مستی دکھاتا ہوا چلتا ہے۔ یہ اس کا عہدِ شباب ہے۔ پھر جب پہاڑی علاقے سے گذر کر میدانی علاقے میں پہنچتا ہے تو ادھیڑ عمر ہو جاتا ہے۔ ست رو ہو جاتا ہے اور آخر میں جب فنا کے قریب پہنچتا ہے تو بعض اوقات یہ زمین پر پھیل جایا کرتا ہے۔ اس کو ''ڈیلٹا'' کہتے ہیں۔

دریائے نیل کے شروع میں دو شاخیں ہیں: نیلِ ازرق، نیلِ ابیض۔ ''ازرق'' ایتھوپیا کی جھیل ''ٹانا'' سے نکلتا ہے۔ یہاں سے یہ شاخ نکلتی ہے اور خرطوم تک آتی ہے۔ دوسری شاخ ان تین ممالک کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا کے بالکل درمیان سے نکلتی ہے۔ ان کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے ملک اور بھی ہیں: روانڈا اور برونڈی۔ تنزانیہ نے ان دونوں کو وکٹوریہ جھیل پر سرحد نہیں دی۔ اگر دیدیتا تو جھیل وکٹوریہ کے گرد پانچ ممالک ہو جاتے۔ آج کل اسرائیل کی کوشش ہے ان پانچوں ممالک کو اُبھار کر نیل کے پانی پر دعوی دائر کروائے اور مصر کو پریشان کرے۔

نیل کے منبع کو پہلے مسلمانوں نے دریافت کیا ہے۔ یہ بات تاریخ میں موجود ہے۔ مسلمان انگریزوں سے پہلے یہاں پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک قدرتی جھیل سے نکلتا ہے۔ پھر خرطوم کے قریب ''جھیل ناصریہ'' میں جو مصر اور سوڈان کی سرحد پر بنی ہوئی ہے، گر جاتا ہے۔ یہ مصنوعی جھیل ہے۔ ''اسوان ڈیم'' کی تعمیر سے وجود میں آئی ہے۔ پھر یہ آگے جاتا ہے۔ آخر میں اس کا ''ڈیلٹا'' بن جاتا ہے اور اس جگہ پہنچ کر یہ ست رفتار ہو جاتا ہے اور شیخِ فانی کی طرح ہاتھ پاؤں چھوڑ کے پڑ جاتا ہے۔ آخر کار جا کر سمندر میں فنا ہو جاتا ہے۔ فرعون کا محل اسی دریائے نیل کے کنارے تھا۔ اس سے پہلے امّ موسیٰ اور حضرت عمران کا جھونپڑا اسی کے کنارے تھا۔ اس جھونپڑے کے پچھواڑے میں دریا بہتا تھا۔ حکم ہوا صندوق اس دریا میں ڈال دو۔ وہ بہتا بہتا آگے محل میں پہنچ جائے گا۔ یہ دنیا کا سب سے طویل دریا شمار ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا قرآن شریف میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ اس کے علاوہ حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر ہے اور چار اور دریاؤں کا بھی۔ ایک حدیث میں نیل اور دجلہ ان دونوں کا ذکر ہے کہ یہ دونوں ''أنہار الجنۃ'' میں سے ہیں۔ تو کل پانچ دریاؤں کے بارے میں آگیا کہ یہ ''أنہار الجنۃ'' میں سے ہیں۔ یعنی جنت کی نہروں میں سے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

محدثین نے اس حدیث شریف کے مختلف مطلب بیان کیے ہیں۔ ایک تو ظاہری مطلب کہ ان کا جنت سے کوئی ایسا تعلق ہے جس کا ہم ادراک نہیں کر سکتے۔ دوسرا تاویلی معنی ہے کہ اس کے اردگرد بسنے والے اور اس کا پانی پینے والے لوگ ایسا کام کریں گے کہ اُس سے جنت میں دخول کا استحقاق پیدا ہوگا تو نہر فرات والوں نے اول زمانے میں اسلام کی بہت خدمت کی۔ یہ کوفہ، بصرہ، بغداد سب ادھر ہی ہیں۔ ''بنو عباس'' کا مرکز یہیں تھا۔ وسطی ایشیا کی طرف کی فتوحات یہیں سے ہوئیں۔ حنفی علماء کا مرکز یہی تھا۔ اسلام کی قانون سازی کے لیے بہت بڑا علمی کام یہیں ہوا۔ بڑی بڑی فتوحات یہیں سے ہوئیں۔

دوسرے دو دریا جیحان وسیحان ہیں جو شام کی سرزمین میں واقع ہیں۔ وہاں بھی اِحیاءِ اسلام کے لیے علمی، جہادی اور سیاسی کام ہوا۔ بنو امیہ کا مرکز ''دمشق'' یہیں تھا۔ ان کی دینی وجہادی خدمات معروف ہیں۔ سیحان وجیحان سے ملتے جلتے دو اور نام ہیں جیحون، سیحون۔ جیحون، سیحون والوں نے بھی اسلام کے لیے بہت کام کیا ہے۔ ائمہ ستہ، صحاح ستہ کے مصنفین یہیں پیدا ہوئے۔ میں نے سیاسی جغرافیہ میں کہا تھا کہ ''ازبکستان'' بڑا خوش نصیب ہے۔ بخارا، ترمذ،

تاشقند اور سمرقند چاروں اسی کے پاس ہیں اور اسی کے اندر واقع ہیں۔ آخر زمانے میں آموسے کابل تک خراساں والے عسکری اعتبار سے بڑا کام کریں گے۔ اول زمانے میں علمی اعتبار سے انہوں نے بڑا کام کیا ہے اور عظیم الشان فتوحات کی ہیں۔

وادئ دجلہ وفرات بنوعباس کا مرکز تھا۔ انہوں نے وسطِ ایشیا تک فتوحات کی ہیں۔ شام کی زرخیز زمین ہے۔ اس کے اندر چار ممالک ہیں: شام، لبنان، اردن اور فلسطین۔ اس میں جیحان سیحان واقع ہیں۔ یہاں ''بنوامیہ'' کا مستقر تھا۔ انہوں نے افریقہ اور اندلس تک فتوحات کی ہیں اور بڑے بڑے علمی اور تعمیری کارنامے بھی انجام دیے ہیں۔

پانچ اہم دریاؤں کی ابتدا وانتہا:

عزیز طلبہ! آپ کو بتایا گیا تھا پانچ دریا ایسے ہیں جن کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے یہ ''أنهار الجنة'' میں سے ہیں اور صحیح روایت میں پانچویں کا بھی ذکر ہے۔ آج ہم نے ان پانچوں کو پڑھنا ہے: دجلہ وفرات، سیحان وجیحان اور دریائے نیل۔ دجلہ اور فرات عراق کی سرزمین پر ترکی اور عراق کی سرحد پر پہاڑوں میں ایک جھیل سے اکٹھے نکلتے ہیں۔ تھوڑا آگے جا کر الگ ہو جاتے ہیں۔ الگ الگ بہنے کے بعد آگے جا کر ''قرنہ'' کے مقام پر پھر مل جاتے ہیں۔ اصل میں پہلے یہ خلیج عرب میں گرتے تھے پھر یوں ہوا کہ سمندر اُترنے لگا اور خلیجِ عرب تقریباً پچاس میل نیچے چلی گئی۔ اسی طرح یہ دریا خلیج میں گرنے کے بجائے اکٹھے ہو کر آگے بہنے لگے اور 50 میل تک بہتے چلے گئے۔ دجلہ وفرات کے اس متحدہ دریا کا نام ''شط العرب'' ہے۔ شط العرب یہی 50 میل کا حصہ کہلاتا ہے۔

طبعی جغرافیہ صدیوں میں بدلتا ہے۔ بصرہ ساحلی شہر تھا۔ ساحل دلدلی ہوتا تھا، جانا مشکل ہوتا تھا۔ ماہر جہاز راں ہی جہاز کو ساحل کے قریب لے جاتے تھے۔ ان کو پتا ہوتا تھا کہ کہاں پر پانی زیادہ ہے؟ کہاں کم گہرا ہے؟ اب بصرہ ساحل سے پچاس میل دور ہو گیا ہے۔

ایک حدیث میں ایک اور جوڑی، دجلہ اور نیل کی بیان کی گئی ہے۔ دجلہ کا ذکر تو ہو گیا۔ نیل بھی ''من أنهار الجنة'' ہے۔ اب بات سمجھو! ''من أنهار الجنة'' کا مطلب کیا ہے؟ محدثین نے اس کے مختلف مطلب بیان کیے ہیں۔ حقیقت پر کھیے تو اس کا مطلب ہے کہ جنت کے ساتھ (بعض روایات میں ''سدرة المنتهى'' آتا ہے) اس کا غیر مرئی تعلق ہے۔ جیسے سورج اور جہنم کا غیر مرئی تعلق ہے۔ شدة الحرّ من فيح جهنم. ایسے ہی ان دریاؤں کا جنت سے غیر مرئی تعلق ہے۔ اگرچہ ہم اپنے ناقص حواس سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ حقیقت پر اگر رکھیں تو یہی معنی ہے۔

اگر آپ تاویل پر آئیں گے تو محدثین نے لکھا ہے کہ ان کا پانی پینے والے اور ان کے کنارے بسنے والے ایسا کام کریں گے جو جنت میں داخلے کا سبب ہوں گے۔

ہم قرآنی جغرافیہ میں پڑھیں گے کہ قرآن کریم میں جتنے انبیاء کا تذکرہ آیا ہے، ان میں سے اکثر نیل سے دجلہ تک کے علاقے میں آئے۔ قرآن شریف میں ایک لاکھ پچیس ہزار انبیاء میں سے جن 25 اولوالعزم انبیاء کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ انبیاء نیل سے دجلہ تک کے علاقے اور گرد و پیش میں آئے۔

یہودیوں کا اس خطے پر دعویٰ ہے کہ چوڑائی میں نیل سے دجلہ تک ہماری سرزمین ہے، کیونکہ تورات میں آتا ہے بنی اسرائیل کو خوشخبری دی گئی تھی: ''أرضك يا اسرائيل! من دجلة إلى النيل، ومن الأرز إلى النخيل''۔ ''أرز'' کا معنی ''صنوبر کا درخت'' ہے۔ یہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ یہودی کہتے ہیں چوڑائی میں نیل سے دجلہ تک ہماری سلطنت ہے اور لمبائی میں صنوبر والے خطے سے کھجوروں والی زمین تک ہمارا ملک ہے۔ لبنان میں صنوبر بہت پیدا ہوتا ہے۔ ان کے جھنڈے پر قومی علامت اور قومی درخت کے طور پر لگا ہوا ہے اور مدینہ منورہ میں کھجوریں بہت پیدا ہوتی ہیں۔

یہ کہتے ہیں کہ ہماری اصل مملکت اسرائیل کی حدود یہ ہیں۔ مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں جب اسرائیل نے سفارت خانہ بنانا چاہا تو مصری حکومت نے کہا: دریائے نیل کے اس طرف یہ سفارتخانوں کا علاقہ ہے، اس میں اپنا سفارتخانہ بناؤ تاکہ تمہاری ضروریات آسانی سے پوری ہوں۔ اسرائیلیوں نے کہا نہیں۔

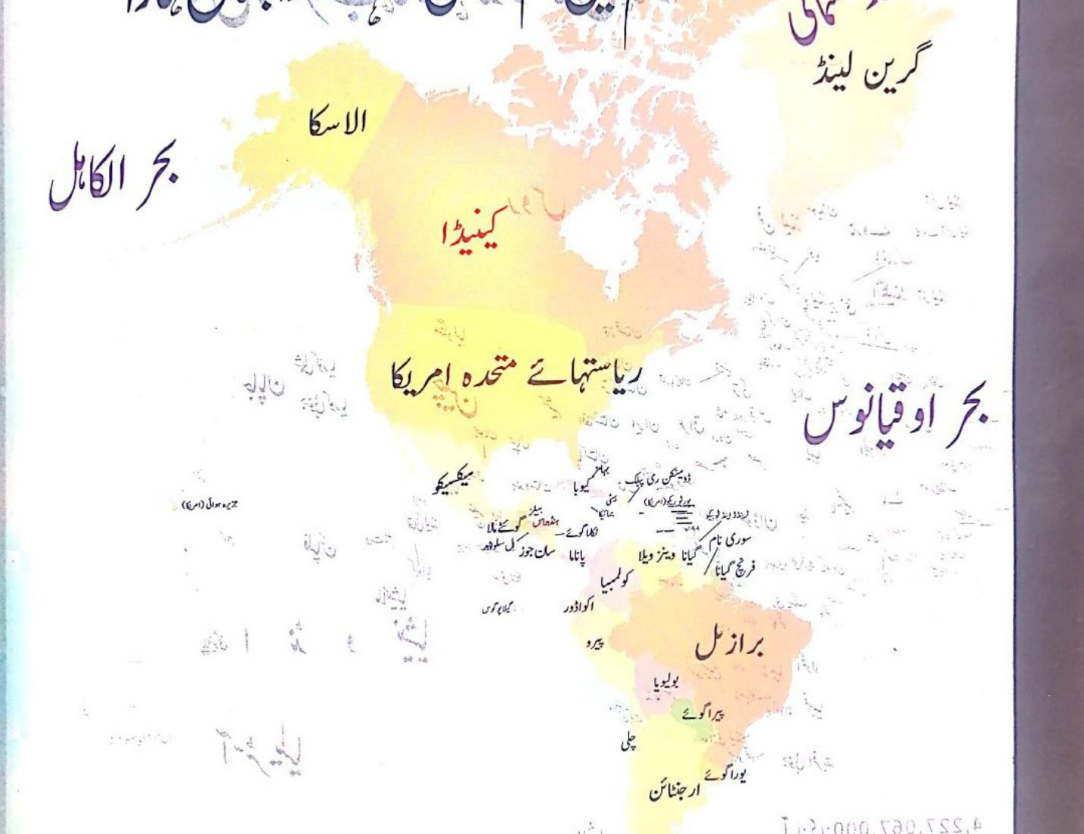
چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا



سات براعظم

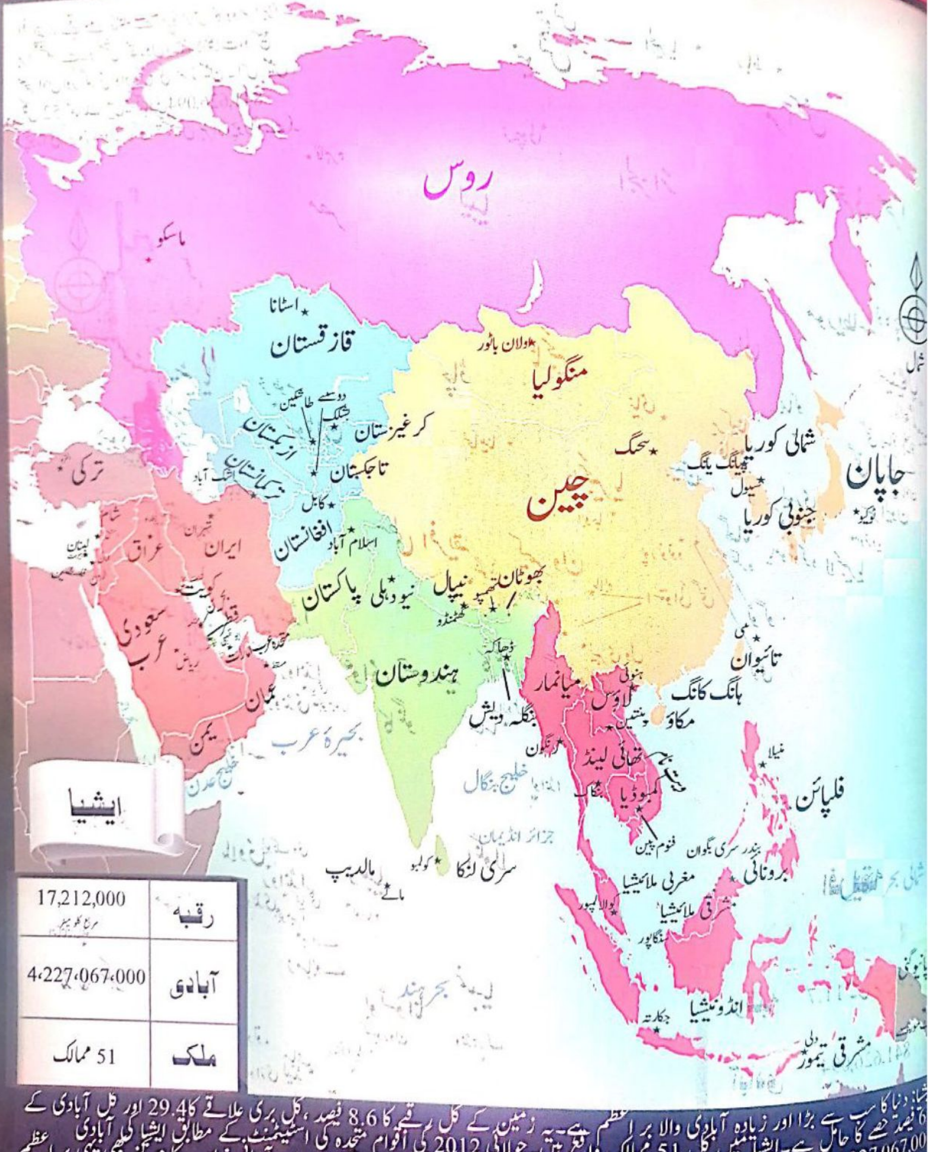
1	ایشیا	آبادی: 4,227,067,000
2	افریقہ	آبادی: 841,626,094
3	شمالی امریکا	آبادی: 552,761,000
4	جنوبی امریکا	آبادی: 400,804,000
5	یورپ	آبادی: 740,021,000
6	آسٹریلیا	آبادی: 22,458,300
7	انٹارکٹیکا	آبادی: مستقل انسانی آبادی نہیں

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا



پانچ بحر اعظم

1	بحر اوقیانوس	رقبہ: 68 ملین مربع میل
2	بحر الکاہل	رقبہ: 35 ملین مربع میل
3	بحر ہند	رقبہ: 29 ملین مربع میل
4	بحر منجمد شمالی	رقبہ: 5 ملین مربع میل
5	بحر منجمد جنوبی	رقبہ: 5 ملین مربع میل

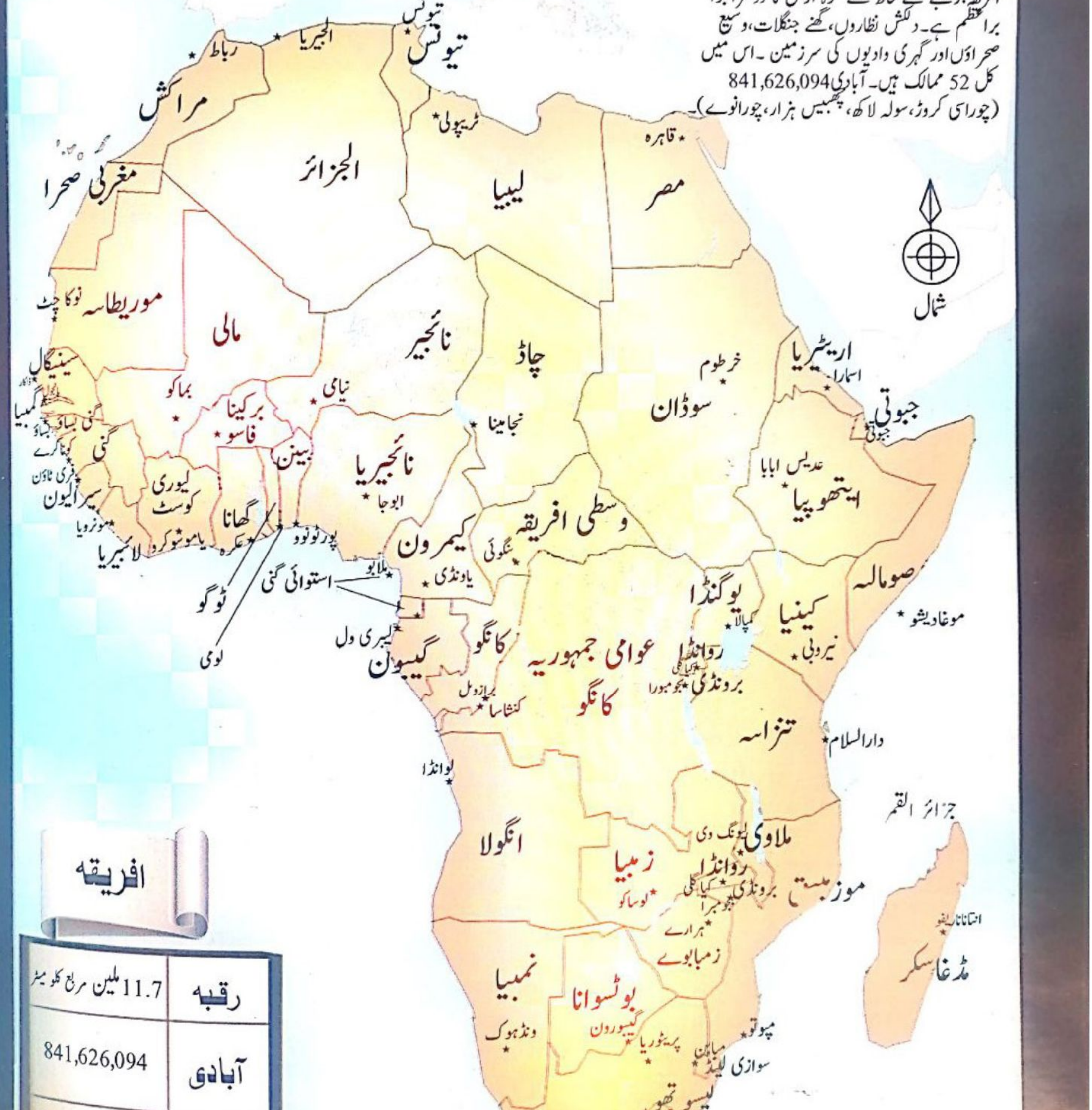


رقبہ	17,212,000 مربع کلومیٹر
آبادی	4،227،067،000
ملک	51 ممالک

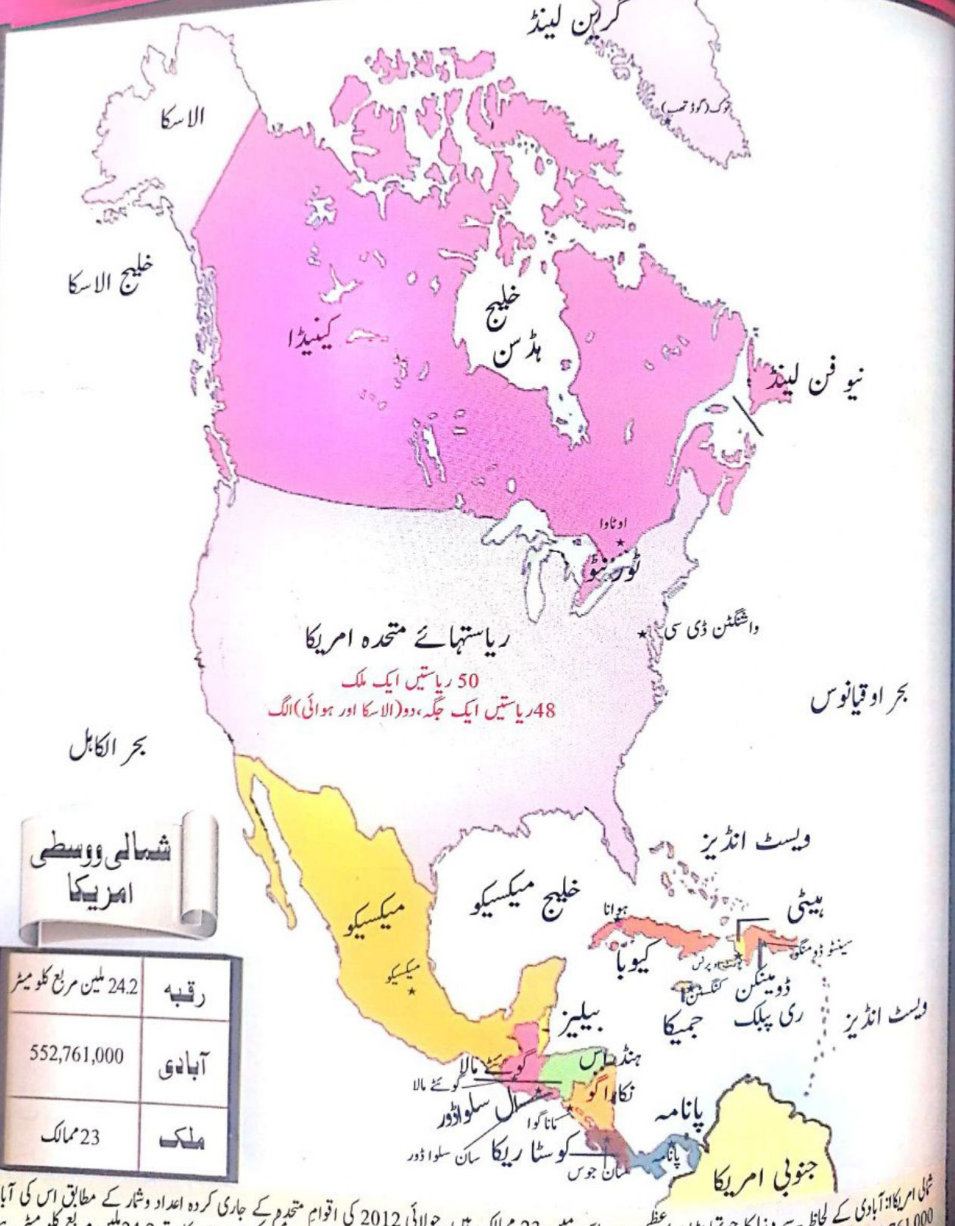
ایشیا: دنیا کا سب سے بڑا اور زیادہ آبادی والا براعظم ہے۔ یہ زمین کے کل رقبے کا 8.6 فیصد، کل بری علاقے کا 29.4 اور کل آبادی کے 60 فیصد حصے کا حامل ہے۔ ایشیا میں کل 51 ممالک واقع ہیں۔ جولائی 2012 کی اقوام متحدہ کی اسٹیمنٹ کے مطابق ایشیا کی کل آبادی 4,227,067,000 (چار ارب بائیس کروڑ، ستر لاکھ، سڑسٹھ ہزار) ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں اور آسمانی مذاہب کا مرکز بھی یہی براعظم خصوصاً اس کا عرب قطعہ اور گرد و پیش کا حصہ رہا ہے۔

سیاسی جغرافیہ

افریقہ: رقبے کے لحاظ سے کرۂ ارض کا دوسرا بڑا براعظم ہے۔ دلکش نظاروں، گھنے جنگلات، وسیع صحراؤں اور گہری وادیوں کی سرزمین ۔اس میں کل 52 ممالک ہیں۔ آبادی841,626,094 (چوراسی کروڑ، سولہ لاکھ، چھبیس ہزار، چورانوے)۔

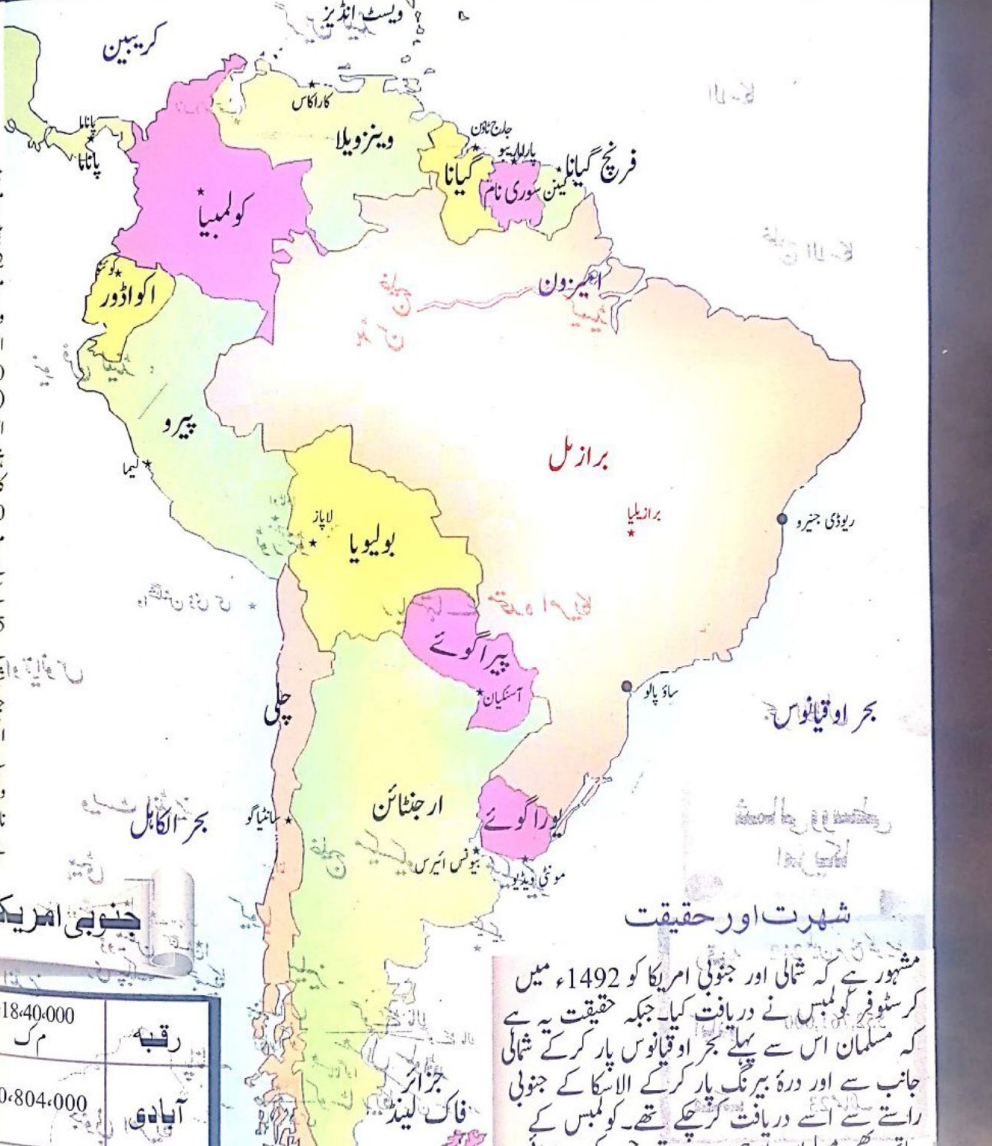


رقبہ	11.7 ملین مربع کلو میٹر
آبادی	841,626,094
ملک	52 ممالک



رقبہ	24.2 ملین مربع کلو میٹر
آبادی	552,761,000
ملک	23 ممالک

شمالی امریکا: آبادی کے لحاظ سے دنیا کا چوتھا بڑا براعظم ہے۔اس میں 23 ممالک ہیں۔جولائی 2012 کی اقوام متحدہ کے جاری کردہ اعداد وشمار کے مطابق اس کی آبادی 552,761,000(پچپن کروڑ، ستائیس لاکھ، اکسٹھ ہزار) ہے۔اس کے بڑے ممالک، کینیڈا، ریاستہائے متحدہ امریکا اور میکسیکو ہیں۔اس کا رقبہ 24.2 ملین مربع کلو میٹر ہے۔



جنوبی امریکا اس میں 14 ممالک ہیں۔ جولائی 2012 کی اقوام متحدہ کے اعداد وشمار کے مطابق اس کی آبادی 400,804,000 (چالیس کروڑ، اسی لاکھ، چالیس ہزار) ہے۔ اس کا کل رقبہ 7،18،40،000 مربع کلومیٹر ہے، جو زمین کے کل رقبے کا 3.5 فیصد بنتا ہے۔

شمالی امریکا اور جنوبی امریکا کا نام اٹلی کے ایک سیاح "امریگو واسپیوشی" کے نام پر رکھا گیا ہے۔

جنوبی امریکا

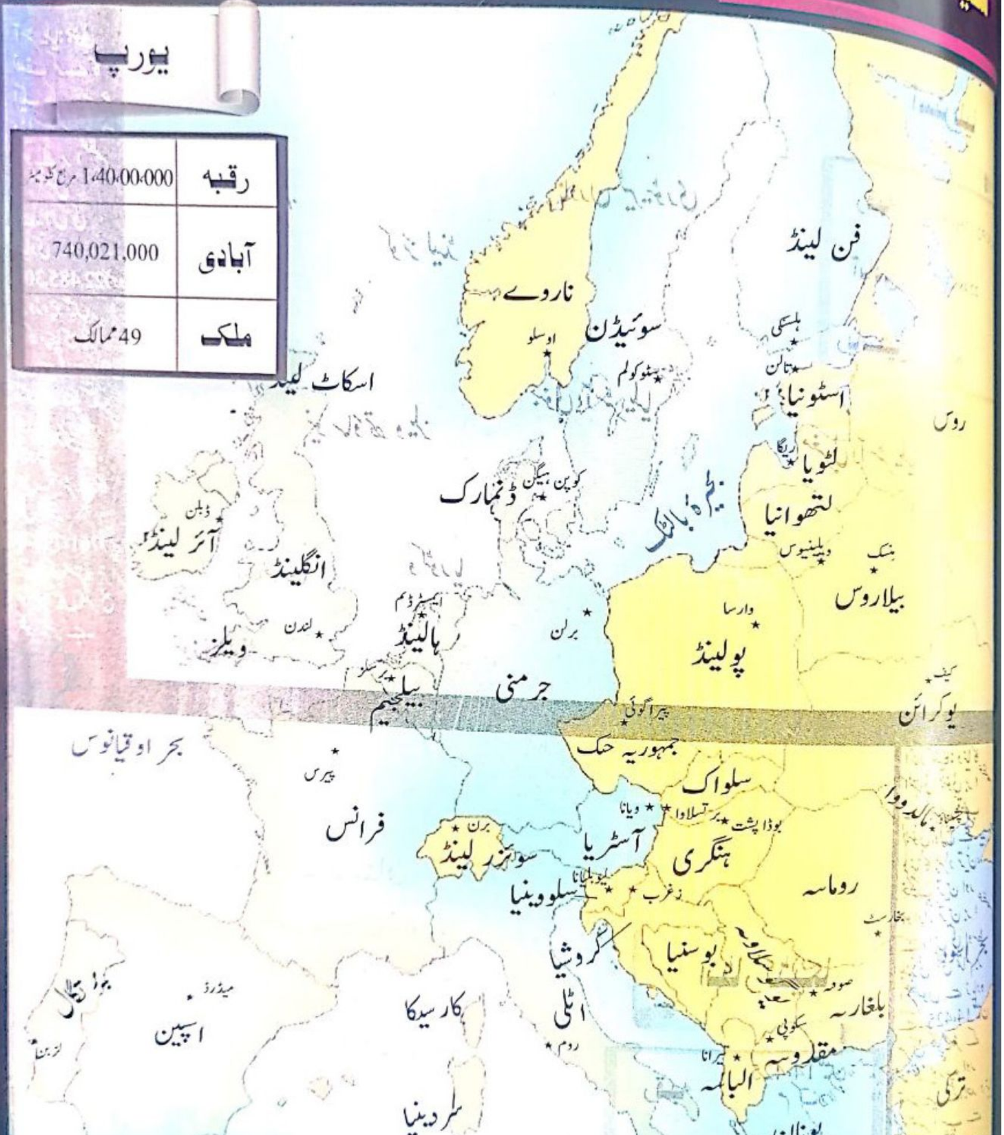
رقبہ	7،18،40،000 م ک
آبادی	400،804،000
ملک	14 ممالک

شہرت اور حقیقت

مشہور ہے کہ شمالی اور جنوبی امریکا کو 1492ء میں کرسٹوفر کولمبس نے دریافت کیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اس سے پہلے بحر اوقیانوس پار کر کے شمالی جانب سے اور درۂ بیرنگ پار کر کے الاسکا کے جنوبی راستے سے اسے دریافت کر چکے تھے۔ کولمبس کے ساتھ بھی مسلمان ملاح موجود تھے جن کی رہنمائی کے بغیر وہ بحر ظلمات پار نہ کر سکتا تھا۔

یورپ

رقبہ	1,40,00,000 مربع کلومیٹر
آبادی	740,021,000
ملک	49 ممالک



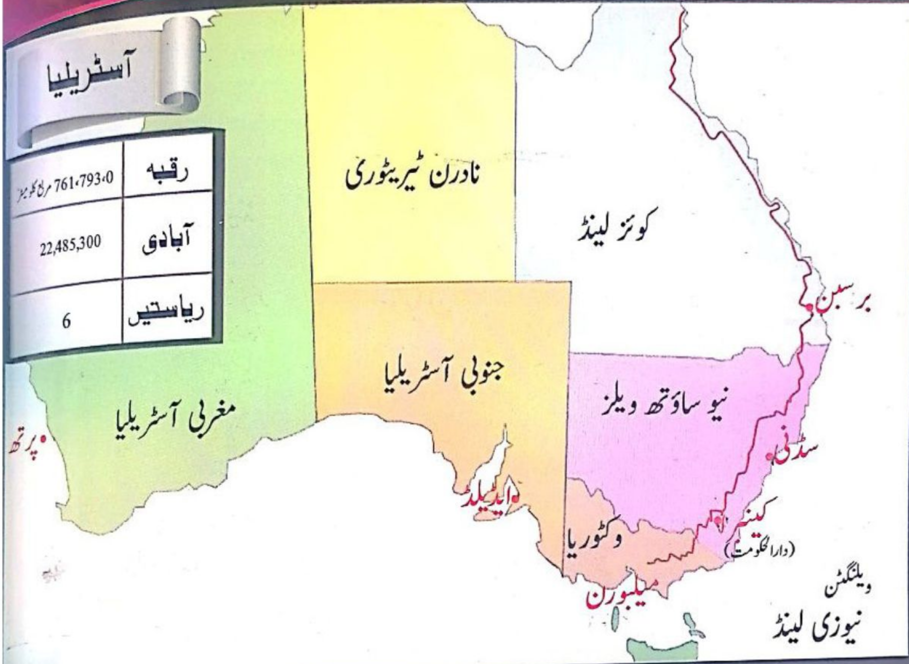
یورپ میں کل 49 ممالک ہیں۔رقبے کے لحاظ سے آسٹریلیا کو چھوڑ کر دنیا کا سب سے چھوٹا براعظم ہے۔جبکہ آبادی کے لحاظ سے یہ تیسرا بڑا براعظم ہے۔اس کا رقبہ ایک کروڑ چالیس لاکھ مربع کلومیٹر ہے،جو زمین کے کل رقبے کا 2 فیصد بنتا ہے اور آبادی 740,021,000 (چوہتر کروڑ،اکیس ہزار) ہے،جو دنیا کی کل آبادی کا 11 فیصد بنتی ہے۔یورپی یونین میں اس وقت 27 ملک اور ناٹو یعنی نارتھ اٹلانٹک میں 28 ملک شامل ہیں۔

سیاسی جغرافیہ

آسٹریلیا: جنوبی نصف کرے کا ایک ملک ہے جو دنیا کے سب سے چھوٹے براعظم پر مشتمل ہے۔ اس کی آبادی 22,485,300 (دو کروڑ، چوبیس لاکھ، پچاسی ہزار تین سو) ہے۔ اس میں چھ ریاستیں اور دو بڑی اور کئی چھوٹی مملکتیں ہیں۔ آسٹریلیا کا کل رقبہ 761،793،0 (چھ ہتر لاکھ، سترہ ہزار نو سو تیس) مربع کلو میٹر ہے۔

آسٹریلیا

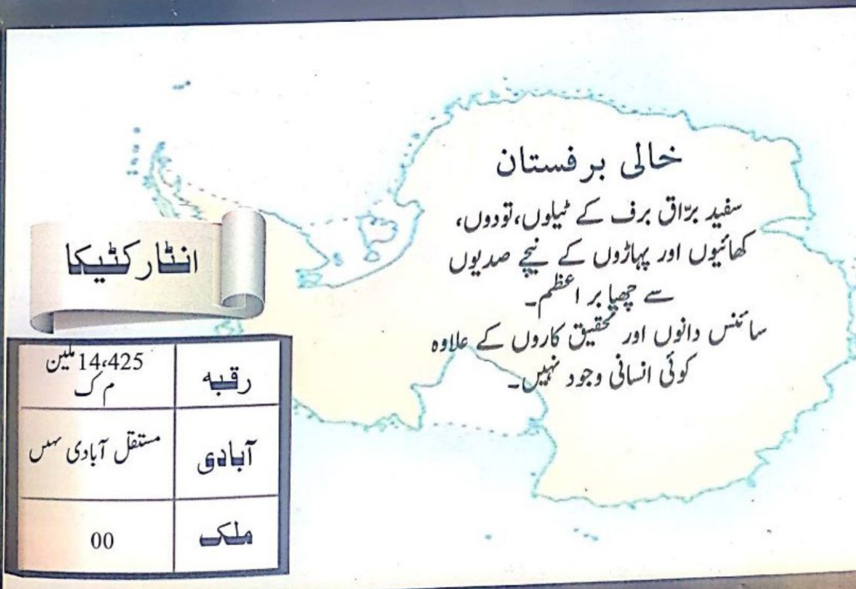
رقبہ	761،793،0 مربع کلو میٹر
آبادی	22,485,300
ریاستیں	6



انٹارکٹیکا: دنیا کا انتہائی جنوبی براعظم ہے، جہاں قطب جنوبی واقع ہے۔ یہ دنیا کا سرد ترین، خشک ترین اور ہوادار ترین براعظم ہے۔ اس کی اوسط بلندی بھی تمام براعظموں سے زیادہ ہے۔ 14،425 ملین مربع کلومیٹر کے ساتھ یورپ اور آسٹریلیا کے بعد دنیا کا تیسرا سب سے چھوٹا براعظم ہے۔ 98٪ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں کوئی باقاعدہ و مستقل انسانی بستی نہیں۔

انٹارکٹیکا

رقبہ	14،425 ملین م ک
آبادی	مستقل آبادی سہس
ملک	00



سرزمینِ اسلام "جزیرہ نمائے عرب" کو کس طرح چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کیا گیا



قدیم شام کے 4 جدید ملک جو پہلے صوبے تھے

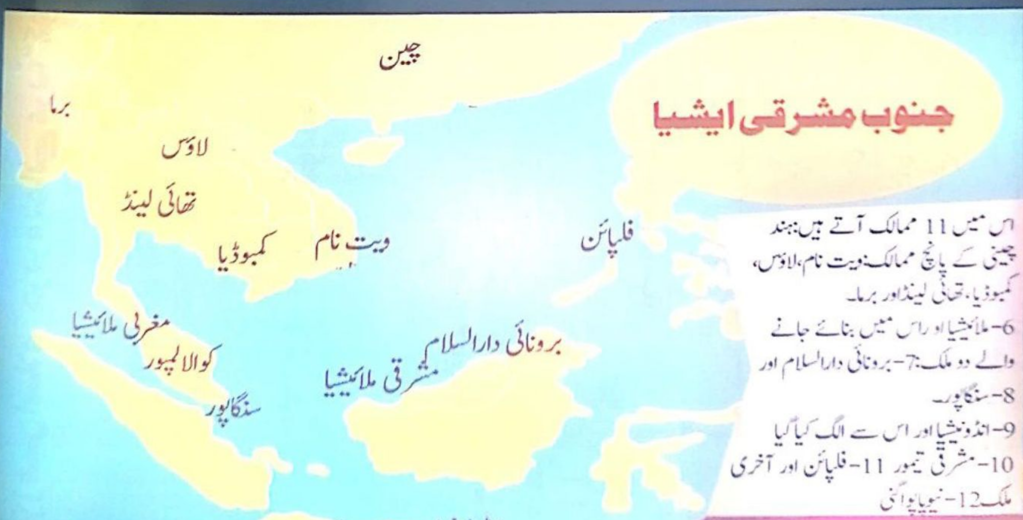
شام
اردن
لبنان
فلسطین

ایک ملک سے 12 ملک

مشرقی جانب	وسطِ عرب	مغربی جانب	جنوبی جانب
عراق		شام	عمان
کویت		اردن	یمن
بحرین	سعودی عرب	لبنان	
قطر		فلسطین	
امارات			

ہند کے تین ممالک: پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے ساتھ بقیہ چار ملک: اوپر سے نیپال، بھوٹان اور نیچے سمندر کی جانب سے سری لنکا اور مالدیپ۔یہ کل سات ہوگئے۔ افغانستان کو بھی شامل کیا جائے تو آٹھ ہوگئے۔ بعض کے نزدیک ایران بھی اسی سارک کا حصہ ہے۔اس طرح نو ممالک ہوگئے۔





اس میں 11 ممالک آتے ہیں: ہند چینی کے پانچ ممالک: ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا، تھائی لینڈ اور برما۔
6-ملائیشیا اور اس میں بنائے جانے والے دو ملک: 7-برونائی دارالسلام اور 8-سنگاپور۔
9-انڈونیشیا اور اس سے الگ کیا گیا 10-مشرقی تیمور 11-فلپائن اور آخری ملک 12-نیوپاپوا گنی

جغرافیائی اشتراکات

11

5،4- وسطی ایشیا، مشرق بعید

وسطی ایشیا میں یہ نو ممالک آتے ہیں:
1- قازقستان 2- کرغیزستان 3- تاجکستان 4- ازبکستان
5- ترکمانستان
چار قفقاز کی ریاستیں: چیچنیا، جارجیا، آرمینیا اور آذربائیجان۔ اس میں سے چیچنیا کو اب نقشوں میں نہیں دکھایا جاتا جو غاصب عالمی استعمار کے خفیہ گٹھ جوڑ اور ظلم کی واضح دلیل ہے۔





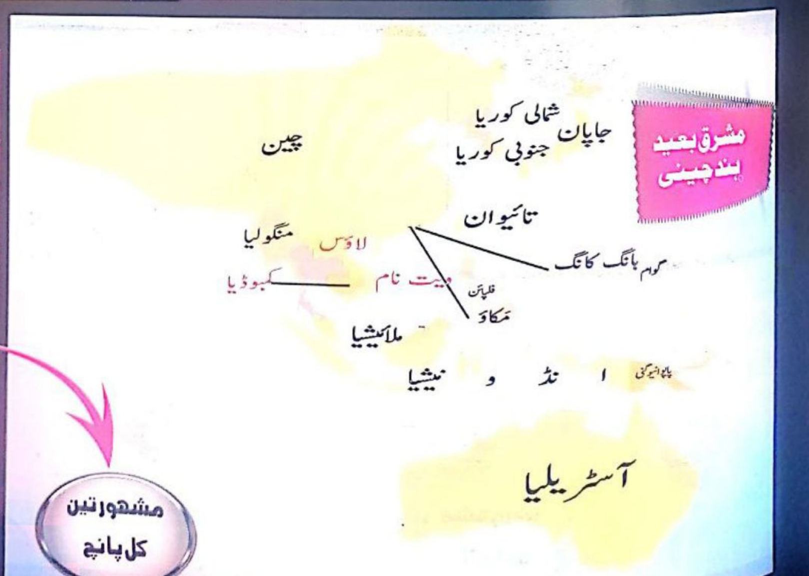
مشرق بعید

1- چین 2- منگولیا 3- جاپان
4- شمالی کوریا 5- جنوبی کوریا
6- لاؤس 7- ویت نام 8- کمبوڈیا 9- تھائی لینڈ 10- برما 11- ہانگ کانگ 12- مکاؤ
13- فلپائن 14- پاپوا نیوگنی
15- انڈونیشیا 16- ملائیشیا
17- برونائی 18- سنگاپور

ہند چینی

اس میں تین ممالک ہیں، ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا۔ بعض جغرافیہ دان اس میں تھائی لینڈ اور برما کو بھی شامل کرتے ہیں۔ یہ ممالک ہند اور چین کے درمیان واقع ہیں اس لیے ان کو ہند چینی ممالک کہا جاتا ہے۔

مشہور تین
کل پانچ





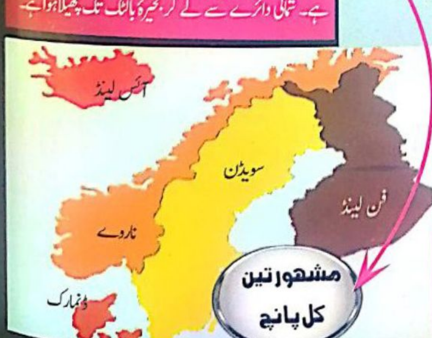
شمالی افریقہ کے عرب ممالک: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو ممالک فتح کیے وہاں اپنی تہذیب و ثقافت کے اتنے گہرے اثرات مرتب کیے کہ وہاں کے لوگوں کی زبان ہی عربی بن گئی۔

مشرقی افریقہ: مشرقی پٹی میں پہلے قرنِ افریقہ کے چار ممالک کی مشترکہ شکل گینڈے کے اکلوتے سینگ کی بنتی ہے۔ ایتھوپیا، اریٹریا، جبوتی، صومالیہ۔ کینیا اور تنزانیہ بھی مشرقی افریقہ میں واقع ہیں۔

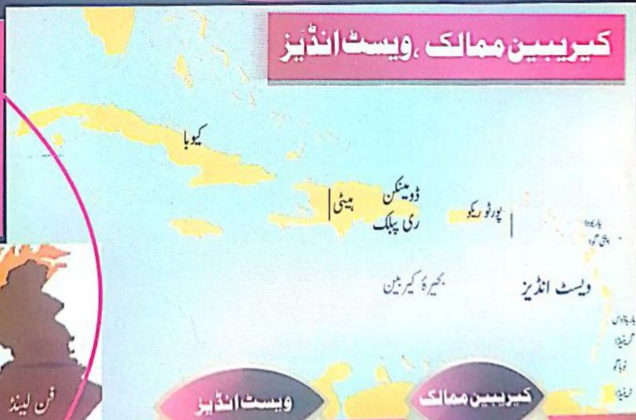
سکنڈے نیوین

یورپ کا سب سے بڑا جزیرہ نما

سکنڈے نیوین ممالک برِ اعظم یورپ کے شمال میں واقع ہیں۔ اس میں پانچ ممالک آتے ہیں: ڈنمارک، ناروے، سویڈن۔ بعض جغرافیہ دان فن لینڈ اور بعض آئس لینڈ کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔ یہ برِ اعظم یورپ کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے۔ شمالی دائرے سے لے کر بحیرۂ بالٹک تک پھیلا ہوا ہے۔



کیریبین ممالک، ویسٹ انڈیز



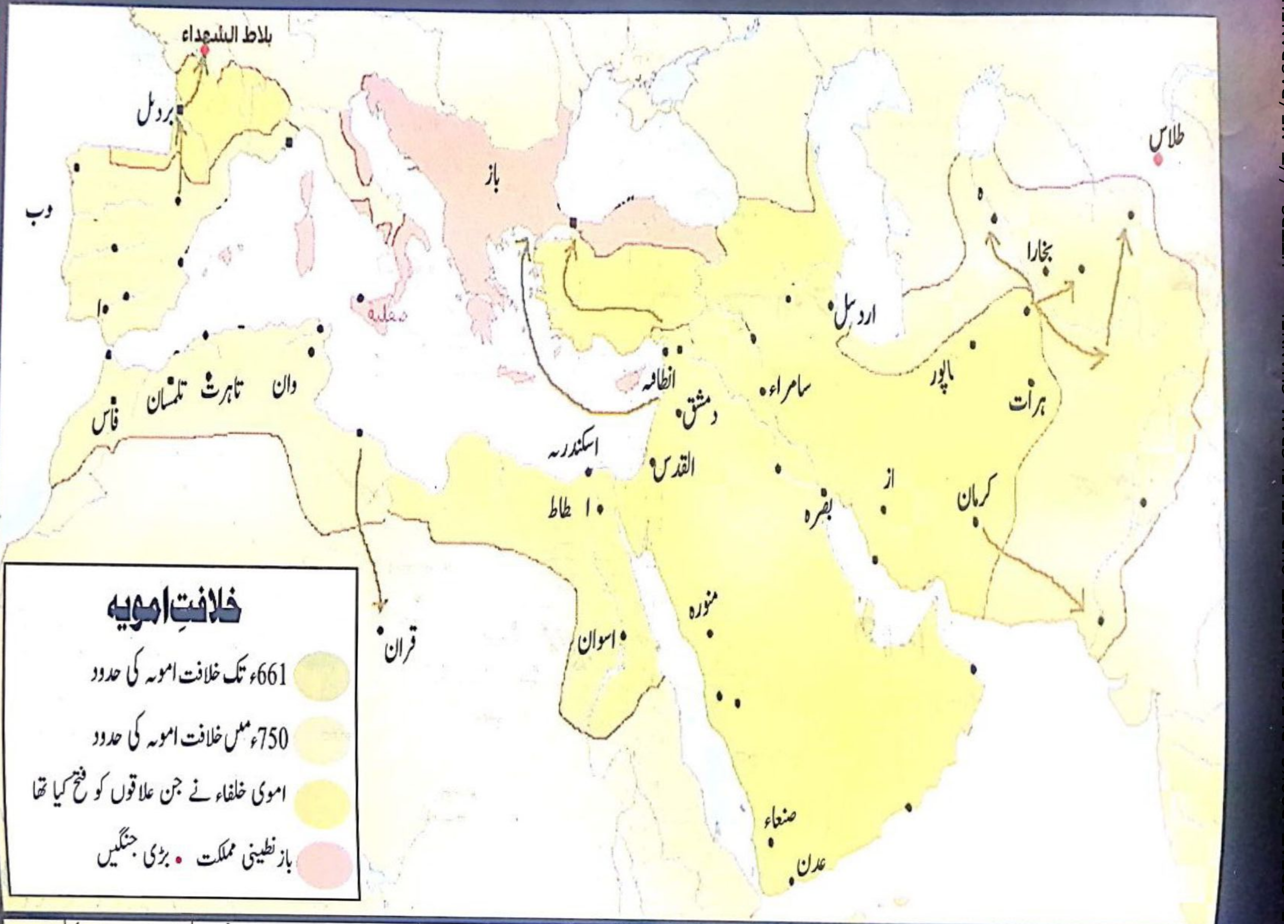
ویسٹ انڈیز

ان جزائر کا مجموعہ ہے جہاں کولمبس ہندوستان کی تلاش میں پہنچا تو کافی عرصے تک اسے ہندوستان سمجھتا رہا۔ اسی لیے اسے غرب الہند بھی کہتے ہیں۔

کیریبین ممالک

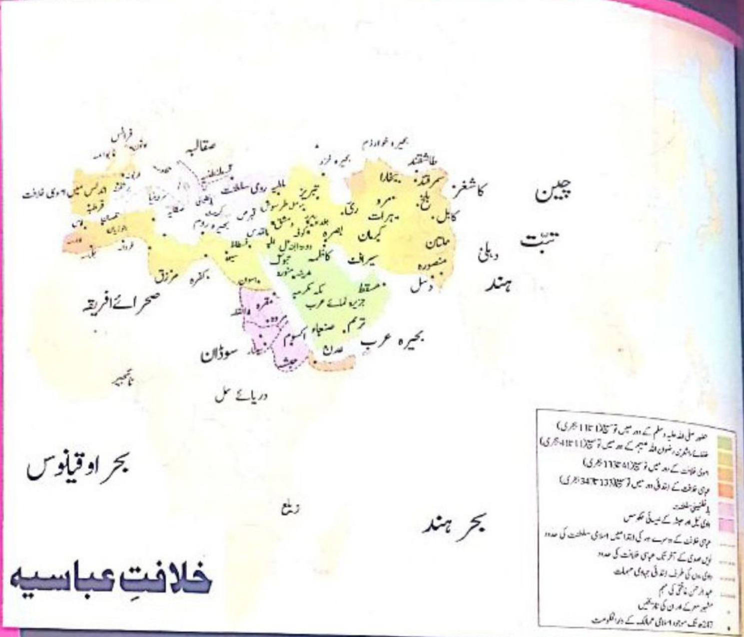
ان میں وسطی امریکا کے یہ مشہور جزیرے شامل ہیں: کیوبا، جمیکا، ہیٹی، ڈومینکن ری پبلک، پورٹوریکو اور ویسٹ انڈیز۔


خلفائے راشدین کے مبارک عہد کی فتوحات
یورپ
القسطنطينية
روما
سردينيا
صقيلة
قرطاجة
قيروان
سبيطلة
عمورية
هرقلة
كريت
قبرص
أرمينيا
أذربيجان
بحر الخزر (قزوين)
طميسة
بلاد ما وراء النهر
طبرستان
جرجان
قومس
كابل
خراسان
سجستان
ایشیا
ملتان
ایران
كرمان
سندھ
ہندوستان
دمشق
القدس
بلادِ شام
الكوفة
البصرة
الإسكندرية
الفسطاط
طرابلس
برقة
مصر
افریقہ
النوبة
عيذاب
سوڈان
مدینہ منورہ
مکہ مکرمہ
جزیرہ نمائے عرب
عمان
یمن
صنعاء
زيلع
معاويه بن أبي سفيان
عبد الله بن أبي السرح
عتبة بن فرقد
الوليد بن عقبة
سعيد بن العاص
سعد بن أبي وقاص
المثنى بن حارثة
حذيفة بن اليمان
النعمان بن مقرن
ابو موسى الأشعري
خالد بن الوليد
ابو عبيد الثقفي
ابو عبيدة بن الجراح
خالد بن الوليد
شرحبيل بن حسنة
يزيد بن ابي سفيان
عمرو بن العاص
عبد الله بن عامر بن كريز
عبد الرحمن بن سمرة
عبد الله بن خازم السلمي
سهل بن عدي الخزرجي
عمرو بن العاص
عبد الله بن ابي السرح
عقبة بن نافع الفهري
أرسل علي بن أبي طالب رضي الله عنه جيشاً بقيادة الحارث بن مرة العبدي لغزو السند
فتنہ ارتداد کے بعد جزیرہ نما عرب کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر متحد ہونا
صدیقی دورِ خلافت کی فتوحات
فاروقی دورِ خلافت کی فتوحات
عثمانی دورِ خلافت کی فتوحات
یہ غزوہ حیدری دورِ خلافت میں مکمل ہوا
فتوحات کے قائدین رضی اللہ عنہم
اس غزوہ میں حسن وحسین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم شریک ہوئے
آیت استخلاف
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا.
النور:55



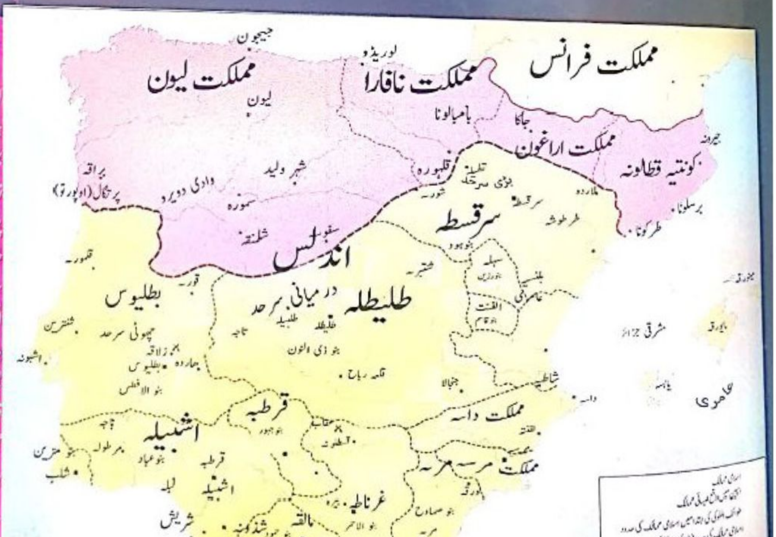
تاریخ اسلام کی دوسری خلافت ہے۔ خلافت امویہ 41ھ سے 132ھ (662-750ء) تک قائم رہی۔ کل مدت خلافت 89 سال ہے۔ سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اور ولید بن عبد الملک سب سے آخری اموی خلیفہ گذرے ہیں۔ 5,019,328 (پچاس لاکھ، انیس ہزار، تین سو اٹھائیس) مربع میل اس کا دائرہ خلافت ہے، جو کسی بھی اسلامی خلافت میں سب سے بڑا دائرہ خلافت ہے۔ ہندوستان، وسطی ایشیا اور افریقہ وہسپانیہ کی فتوحات کا آغاز اسی دور خلافت میں ہوا۔ اس لیے یہ مستشرقین کا سب سے بڑا ہدف تنقید بنی رہتی ہے۔

تیسری اسلامی خلافت ہے۔132ھ سے 656ھ تک قائم رہی۔کل مدت خلافت 524 سال۔البتہ مصر میں عباسی حکومت 923ھ تک رہی۔عباس بن عبد المطلب نے 721ء میں عباسی خلافت قائم کی۔عباس السفاح،ہارون رشید، مستنصر، مستعصم مشہور عباسی خلفاء گذرے ہیں۔اڑتیس لاکھ اکسٹھ ہزار بائیس (3،861،022) مربع میل اس کا دائرہ خلافت تھا۔



خلافتِ ہسپانیہ

اموی خلیفہ ولید اول کے عہد خلافت میں ہسپانیہ فتح ہوا۔فتح کرنے والے جرنیل طارق بن زیاد تھے۔30اپریل 711ء کو طارق بن زیاد کی فوجیں جبرالٹر (جبل الطارق) پر اتریں۔اسپین کی سرزمین پر اترنے کے بعد طارق بن زیاد نے 7ہزار کے مختصر لشکر کے ساتھ پیش قدمی کی اور بالآخر 19جولائی کو ایک لاکھ کے لشکر کا سامنا کیا اور انہیں بدترین شکست دی۔فتح کے بعد انہوں نے بغیر کسی مزاحمت کے دارالحکومت طلیطلہ پر قبضہ کرلیا۔انہیں ہسپانیہ کا گورنر بنادیا گیا۔خلافت ہسپانیہ کا سقوط1429ء میں ہوا۔یاد رہے امریکا کی دریافت کا سن بھی یہی ہے۔



جولائی 1229ء سے اکتوبر 1923ء تک قائم رہی۔ تقریباً 600 سال۔ غازی عثمان اول 1281ء میں پہلے خلیفہ بنے۔ محمد سادس (1922-1918) آخری خلیفہ۔ پہلے صدر اعظم علاؤ الدین پاشا (1331-1320) اور آخری صدر اعظم احمد توفیق پاشا (1922-1920) تھے۔



ایشیا کی چار عظیم مسلم سلطنتیں

ہندوستان میں مسلمانوں کی چار بڑی سلطنتیں بنیں:

پہلی مسلم سلطنت: بانی سلطان محمود غزنوی۔ (582-390) کل 190 سال قائم رہی۔

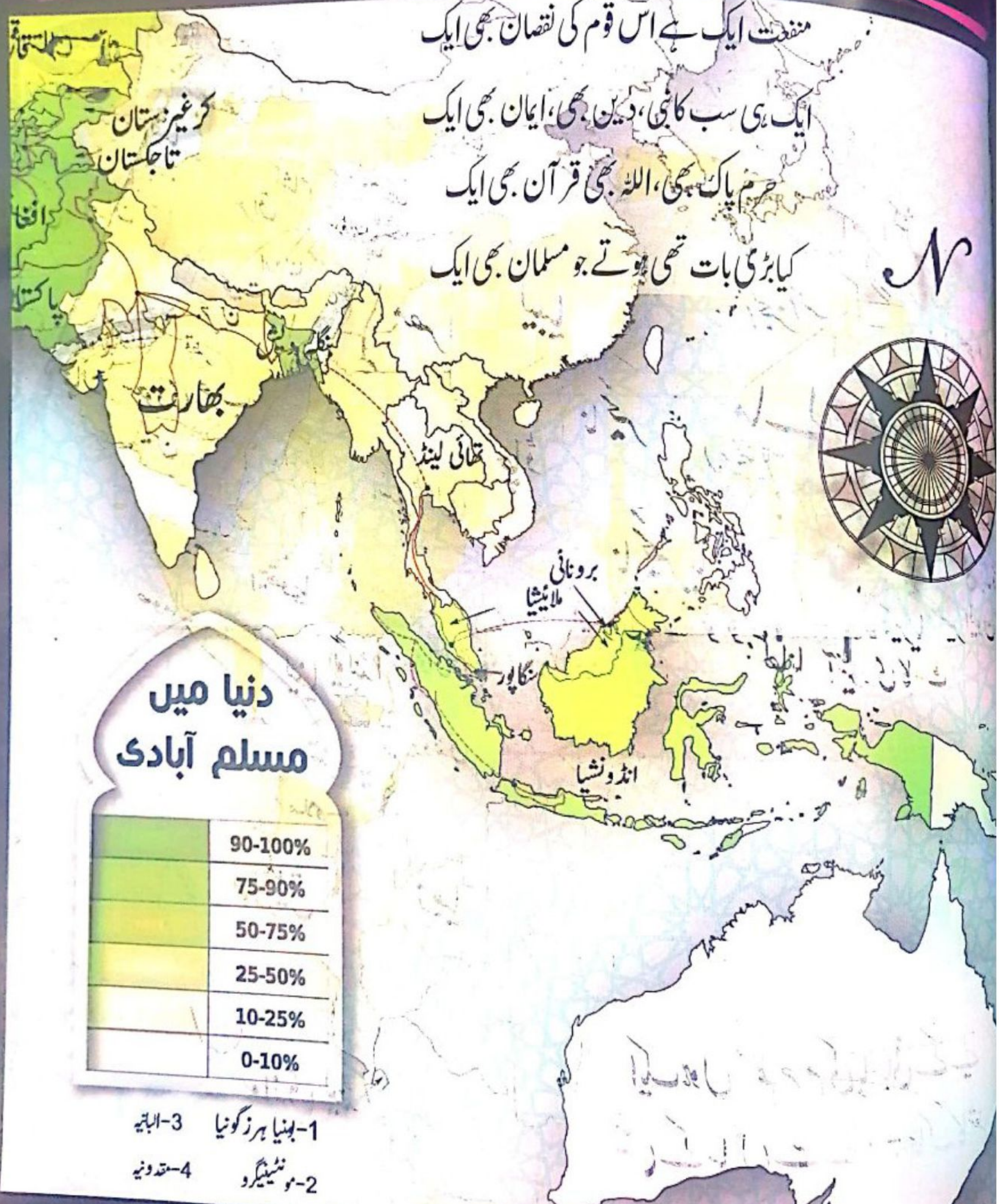
دوسری مسلم سلطنت: بانی سلطان شہاب الدین غوری۔ (1290-582) کل 700 سال قائم رہی۔ چونکہ قطب الدین جسے سلطان غوری نے یہاں کا حکمران بنایا، غلام تھا، اس لیے یہ "خاندان غلاماں" کی حکومت کہلائی۔

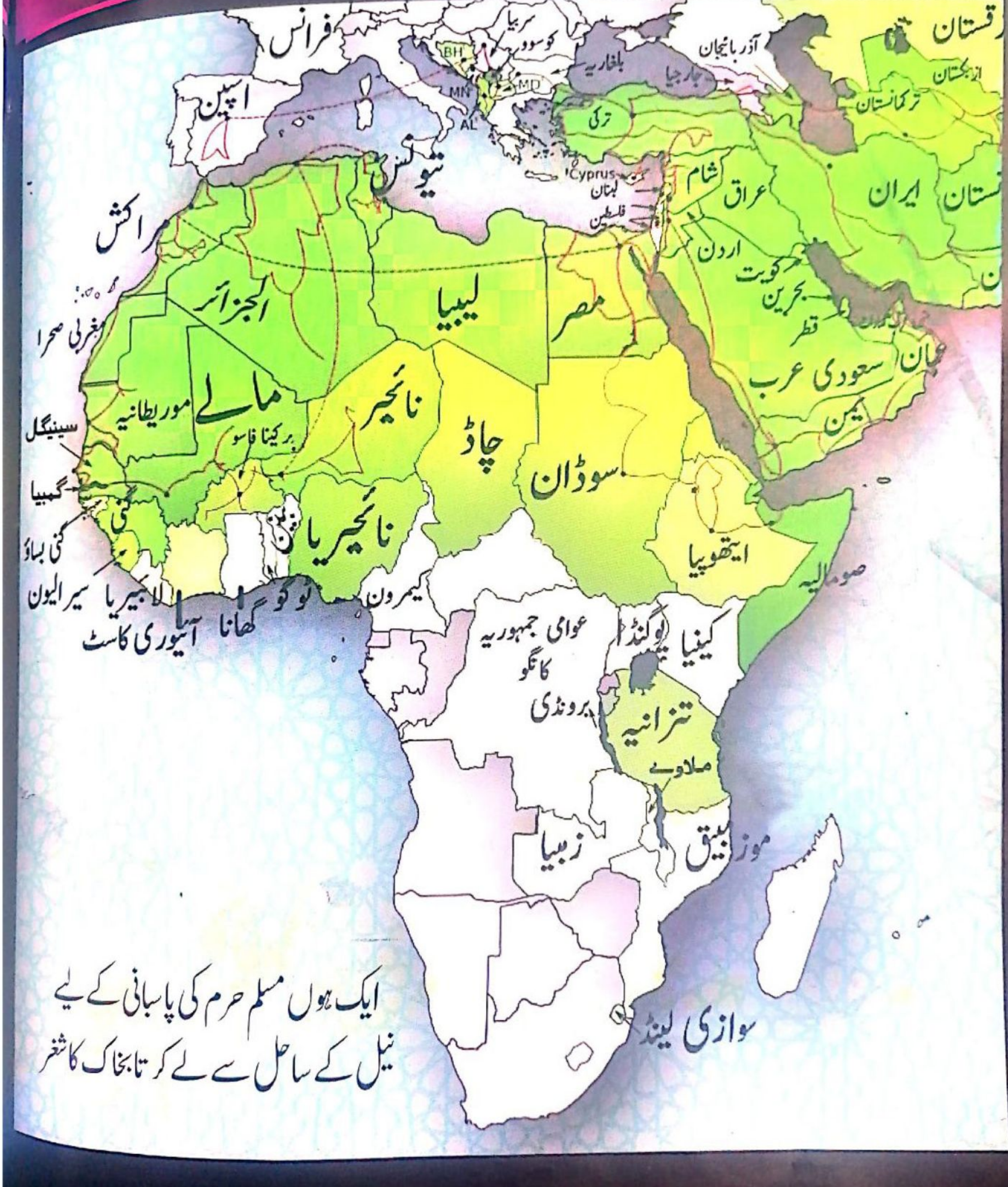
تیسری مسلم سلطنت: سلطان جلال الدین خلجی۔ (1320-1290) کل 30 سال قائم رہی۔

چوتھی مسلم سلطنت: مغلیہ خاندان۔ (1764-1526) کل 300 سال قائم رہی۔

مسلمانوں کی کل مدت حکومت 1200 سال سے متجاوز ہے۔ 1746ء کو انگریزوں نے دہلی سے بنگال تک حکومت قائم کرلی جو آہستہ آہستہ پھیلتی رہی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد 1947ء تک ہندوستان برطانیہ کے زیر نگیں رہا۔



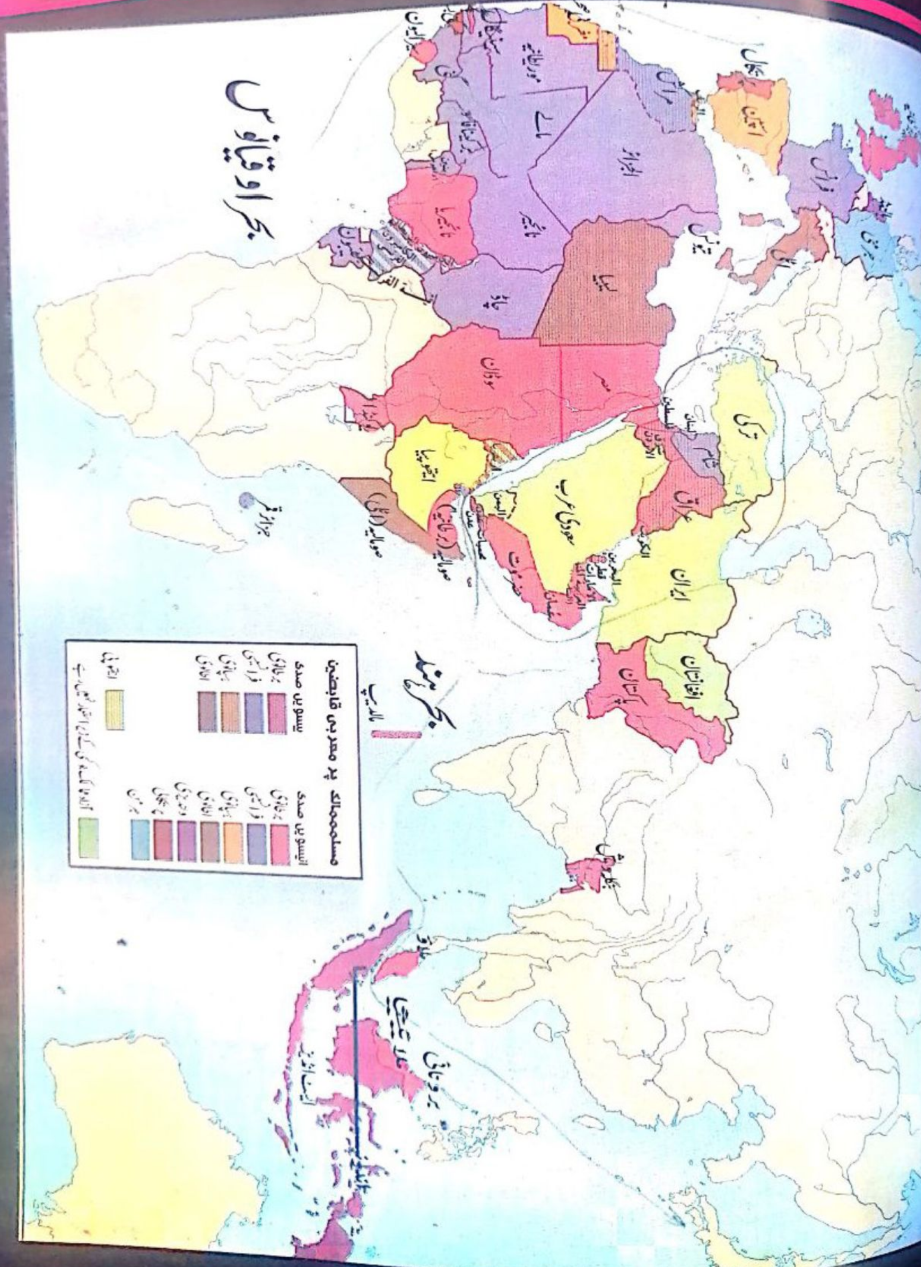

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
کرغیزستان
تاجکستان
بھارت
تھائی لینڈ
برونائی
ملائیشیا
سنگاپور
انڈونیشیا
دنیا میں
مسلم آبادی
90-100%
75-90%
50-75%
25-50%
10-25%
0-10%
1-بوسنیا ہرزگونیا
2-مونٹینیگرو
3-البانیہ
4-مقدونیہ

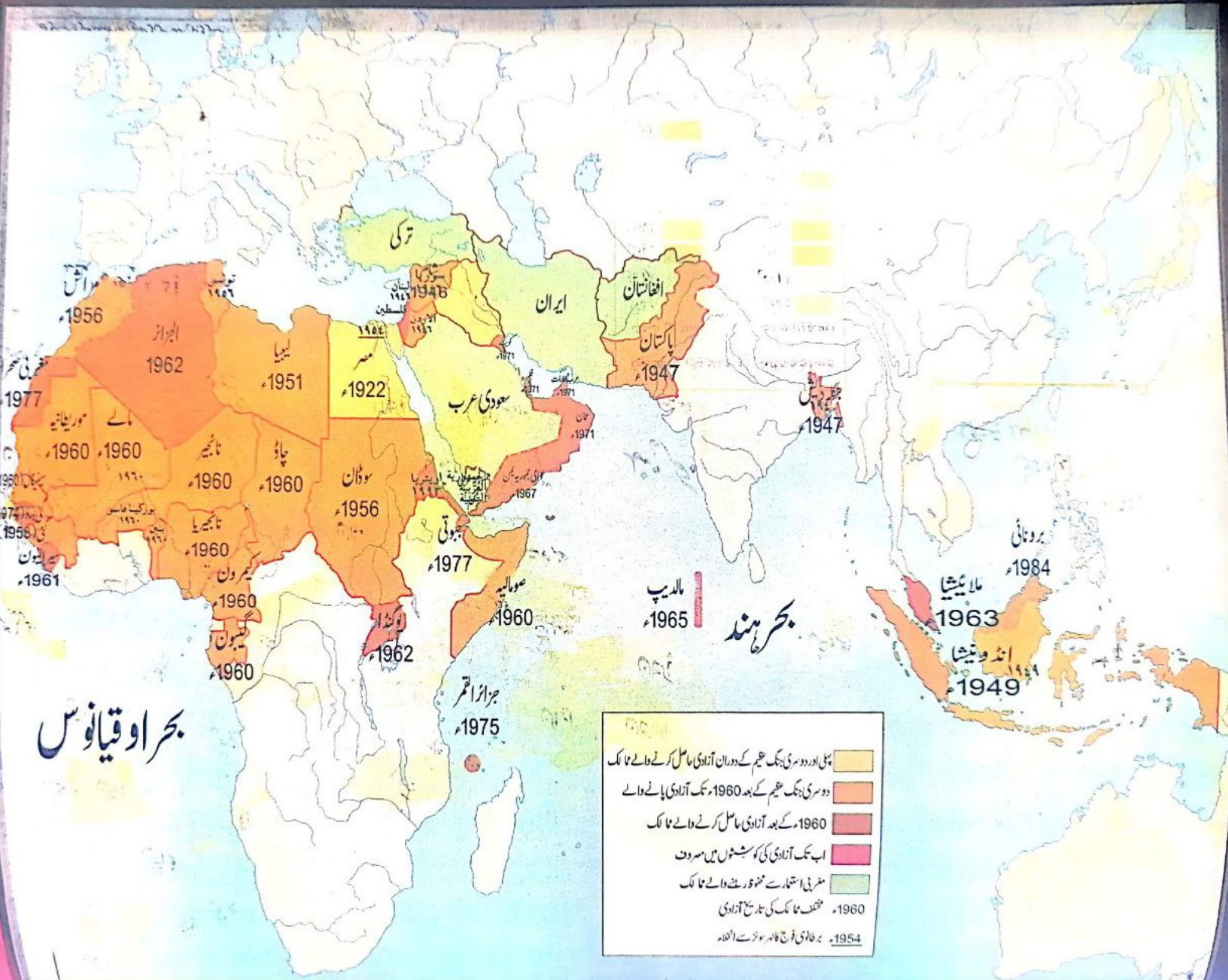


ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

19

مسلم ممالک پر مغربی استعمار کا قبضہ





بحر اوقیانوس
بحر ہند
ترکی
ایران
افغانستان
پاکستان
1947ء
سعودی عرب
مصر
1922ء
1954ء
لیبیا
1951ء
الجزائر
1962
1956ء
1977
موریطانیہ
1960ء
مالے
1960ء
نائجیر
1960ء
چاڈ
1960ء
سوڈان
1956ء
نائجیریا
1960ء
کیمرون
1960ء
گیبون
1960ء
1961ء
یوگنڈا
1962
جبوتی
1977ء
صومالیہ
1960
جزائر القمر
1975ء
مالدیپ
1965ء
سوریا
1946
عمان
1971
1967
1947ء
برونائی
1984ء
ملائیشیا
1963
انڈونیشیا
1949
پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران آزادی حاصل کرنے والے ممالک
دوسری جنگ عظیم کے بعد 1960ء تک آزادی پانے والے
1960ء کے بعد آزادی حاصل کرنے والے ممالک
اب تک آزادی کی کوششوں میں مصروف
مغربی استعمار سے محفوظ رہنے والے ممالک
1960ء مختلف ممالک کی تاریخ آزادی
1954ء برطانوی فوج کا نہر سوئز سے انخلاء

سفارت خانہ ملک سے باہر ہوتا ہے اور ہمارا ملک تو اصل میں نیل تک ہے، لہٰذا سفارت خانہ نیل کے دوسری طرف بنائیں گے۔ اس طرف اندر نہیں بنائیں گے۔ نیل تک تو ہمارا اپنا ملک ہے اور سفارتخانہ ملک سے باہر ہوتا ہے۔ آج تک اسرائیل کا سفارت خانہ دریائے نیل کے پار دوسری طرف ایک کثیر المنزلہ عمارت کی چودھویں منزل پر ہے۔ یہ اپنے نظریے میں اتنے متشدد ہیں۔

سیحان اور جیحان کے ناموں سے ملتے جلتے دو دریا وسط ایشیا میں سیحون اور جیحون کے نام سے ہیں۔ سیحان اور جیحان شام میں ہیں۔ ترکی کے قریب شام کے علاقے سے نکلتے ہیں اور بحر متوسط میں جاکر گرتے ہیں۔ دمشق اسی خطے میں ہے جہاں قرونِ اولیٰ میں احیائے اسلام اور اسلامی فتوحات کے حوالے سے بہت بڑا کام ہوا ہے۔ خلافت بنی امیہ جو خلافت راشدہ کے بعد پہلی اسلامی خلافت تھی، اسی علاقے میں قائم تھی اور خلفائے بنوامیہ نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

جب آپ کسی دریا کا ذکر کریں گے تو آپ کو اس کا منبع اور منتہیٰ بتانا ہوگا۔ یہ دونوں دریا "کوہِ پامیر" سے نکلتے ہیں۔ یہ تاجکستان، افغانستان اور پاکستان کی سرحد پر مشہور پہاڑی سلسلہ ہے۔ ان دونوں کا منبع یہی ہے۔ آگے جاکر یہ دونوں الگ الگ بہنے کے بعد "بحیرۂ اُرال" میں جاکر گر جاتے ہیں جو کہ وسطِ ایشیا میں ایک بڑی کھاری جھیل ہے۔ یہ دنیا کی دو بڑی کھاری جھیلوں میں سے ایک جھیل کہلاتی ہے اور جھیل کا نام نہیں دیا جاتا، بلکہ "بحیرۂ اُرال" کہا جاتا ہے۔ بحیرۂ ارال کا پرانا نام "بحیرۂ خوارزم" اور "بحیرۂ کیاسپین" کا پرانا نام "بحیرۂ قزوین" ہے۔ یہاں پر جاکر جیحون اور سیحون اکٹھے ہوکر گرتے ہیں۔ تو جیحون اور سیحون ایسے دریا ہیں کہ منبع بھی ایک اور منتہیٰ بھی ایک ہی ہے۔

بحیرۂ طبریہ اور بحرِ میت:

پانچ مشہور دریاؤں کا تذکرہ مکمل ہونے کے بعد اب ہم شام کی دو جھیلوں اور ایک دریا کی طرف چلتے ہیں۔ "بحیرۂ طبریہ" اور "بحرِ میت" دو بڑی جھیلیں ہیں۔ پہلی میٹھی ہے دوسری کھاری، بلکہ کھاری ترین۔ پہلی جھیل کو "بحیرۂ طبریہ" کہتے ہیں۔ "طبریہ" ایک رومی حکمران تھا، اس نے اس کے گرد شہر بسایا تھا۔ اس کے نام سے اس جگہ کا نام ہوگیا۔ انگریز اسے "گلیلی" کہتے ہیں۔ یہ لفظ "جلیل" کا "موَنَّث" ہے۔ دوسری جھیل ہے "بحرمیت" یہ اب دو حصوں میں الگ الگ ہوگئی ہے۔ بحرمیت دنیا کی سب سے زیادہ کھاری جھیل ہے۔ بحرمیت کرۂ ارض کا نشیبی ترین حصہ دنیا کا پست ترین پانی کا مجموعہ ہے اور "بحیرۂ طبریہ" اس کے بعد دوسرے نمبر پر پست ترین ہے۔ بحرمیت کے کنارے پہلے زمانے میں ایک بڑا معرکہ روم اور فارس والوں کے درمیان لڑا گیا تھا۔ روم والے شام میں حکمران تھے اور "طبریہ" ایک رومی حکمران کا نام ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اسی طبریہ کے کنارے "سدوم" اور "عمورہ" نامی بستیوں میں رہتی تھی۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ یہ دونوں حضرات عراق سے ہجرت کرکے فلسطین آئے تو دونوں الگ الگ جگہ میں بسنے لگے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام "الخلیل" نامی شہر میں رہتے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام بحرمیت کے کنارے رہتے تھے۔ ان دونوں جھیلوں کے بیچ میں "دریائے اُردن" بہہ رہا ہے جو ان دونوں کو ملا رہا ہے۔ اس کا ایک نام: "نہر شریعت" ہے۔ قرآن کریم میں طالوت اور جالوت کا جو مشہور واقعہ ہے کہ طالوت کے ساتھ اصحاب بدر کی طرح 313 کا عدد تھا اور وصف یعنی تقویٰ بھی بدر کے مسلمانوں والا تھا۔ تو ان کے تقویٰ کا امتحان یہیں ہوا تھا۔ کیا امتحان؟ ﴿إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ﴾ [البقرة:249] امتحان تھا کہ بس گھونٹ دو گھونٹ پی لو اور باقی کوئی حیلہ اور تاویل نہیں کرنا۔ بعض لوگوں نے حیلہ بنایا کہ جہاد کے لیے جائیں گے تو پیاسے مرجائیں گے جہاد نہ کرسکیں گے اور "فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي." [البقرة:249] کو بھول گئے۔ رج کے پانی پی لیا۔ جب پار ہوگئے تو ٹانگوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ حوصلہ ختم ہوگیا اور اپنی جگہ پڑے رہ گئے۔ "لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ." [البقرة:249] ہماری تو طاقت نہیں ہے کہ لڑیں۔ وہ جو تقویٰ پر قائم تھے تو اللہ تعالیٰ تقویٰ کی برکت سے طاقت دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ "كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ." [البقرة:249] ان کی کامیابی کا روحانی سبب تھا تقویٰ پر استقامت۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہتے ہیں یا حیلہ بازی کرکے حرام کو حلال کرتے ہیں۔ ظاہری سبب ایک اور چیز

بن گئی جو یقینی نہیں، البتہ محتمل ضرور ہے۔

بحیرۂ طبریہ سے جو پانی نکلتا ہے، وہ میٹھا اور صحت بخش ہے۔ بیچ میں دریائے اردن کا پانی بھی بہترین ہے۔ جیسے جیسے بحرمیت کے قریب آتا جاتا ہے اللہ کی شان ہے کہ بحرمیت میں جیسے گرتا ہے ناقابل استعمال ہو جاتا ہے۔ بحرمیت کا پانی دنیا کا سب سے زیادہ کھارا پانی ہے۔ اس میں آبی حیات کے لیے زندہ رہنا ممکن نہیں ہے اور اس میں ڈوبنا بھی ممکن نہیں ہے۔ کوئی ڈوب کر مرنا چاہے تو ممکن ہے چلو بھر پانی میں ڈوب مرے، لیکن زمین کے اس پست حصے میں واقع سمندر نما جھیل میں ڈوب سکے گا نہ مر پائے گا۔ اس میں آرام سے لوگ پانی کی سطح پر لیٹے رہتے ہیں، اخبار پڑھتے رہتے ہیں اور دائیں طرف پانی کے اوپر پلیٹ رکھ دیتے ہیں۔ اس میں ناشتے کے لیے سیب دھرا ہوتا ہے۔ سیب کھاؤ اور اخبار پڑھو۔ اہلِ یورپ نے اس کو اب تفریحی مقام بنالیا ہے۔ یہ اردن والے بھی اس میں تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ اس پانی میں کوئی مچھلی کوئی جھینگا کوئی بھی سمندری جانور دریائے اردن کے پانی کے ساتھ بہتا ہوا آ کر گر جائے تو فوراً مر کر اوپر آ جاتا ہے۔ یہ دریا کے اس جھیل میں جس مقام پر آ کر گرتا ہے وہاں پرندے اڑتے رہتے ہیں جو مچھلی مر کر اوپر آتی ہے اس "نمک طافی" کو اچک کر لے جاتے ہیں۔ اب اللہ کی شان ہے کہ پانی کے "مالیکیول" بدل جاتے ہیں یا کیا ہو جاتا ہے؟ بس حقیقت اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے جو خالق دو جہاں ہے۔ "لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ" کا ظاہری مادی سبب یہ ہے کہ یہ پانی پینے کے قابل نہیں ہے۔ یہ وہ جگہ ہے کہ جو سطح سمندر سے 421 میٹر نیچے ہے۔ لوگ 420 بھی کہہ دیتے ہیں۔ 420 کے ہندسے سے آپ چونکیں نہیں۔ اردن جائیں تو "بحرمیت" بھی جا سکتے ہیں۔ جہاں سے نشیب شروع ہوتا ہے اور سڑک نیچے جانی شروع ہو جاتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے آدمی جہاز سے اتر رہا ہے۔

حضرت تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دجال نے دو سوالات کیے تھے جو اس خطے سے متعلق تھے۔ ایک یہ سوال تھا کہ بحیرۂ طبریہ میں پانی ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا: ہے۔ اس نے کہا: عنقریب خشک ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ ہو رہا ہے۔ جب سے اسرائیل بنا ہے یعنی 1948ء میں اور جب سے اس نے "القدس" پر قبضہ کیا ہے یعنی 1967ء میں، اس وقت سے اس کے سوکھنے کی رفتار زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ہماری کتاب "اقصیٰ کے آنسو" میں اس کی دس سال کے فرق سے لی گئی دو تصویریں ہیں۔ ہم نے کہا تھا کہ طبعی جغرافیہ میں تبدیلی آتی ہے لیکن سالوں بعد، صدیوں بعد۔ تو بحیرۂ طبریہ کی حدود تبدیل ہو رہی ہیں۔ سکڑ کر کم ہوتی جا رہی ہیں۔ حدیثِ دجال کی تصدیق ہو رہی ہے۔

دوسرا سوال دجال نے پوچھا تھا "بیسان" باغوں میں کچھ لگتا ہے یا نہیں؟ صحابی نے کہا: لگتا ہے۔ دجال نے کہا: عنقریب نہیں لگے گا۔ "بیسان" نامی باغ اس کے قریب ہے۔ "دجال I" نامی کتاب میں آپ اس کی تصویریں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ نخلستان کیسے اُجڑ رہا ہے۔

دریائے اردن:

یہ دریائے اردن ہے۔ اب ایک حدیث میں آتا ہے: "لَتُقَاتِلُنَّ الْمُشْرِكِيْنَ" تم لوگ مشرکین سے جہاد کرو گے اور تم میں سے بعد کے لوگ دجال سے جہاد کریں گے۔ کہاں؟ نہر اردن، نہر شریعت کے کنارے۔ "أَنْتُمْ شَرْقِيَّهُ وَهُمْ غَرْبِيَّهُ" [مجمع الزوائد] تم مشرق میں ہو گے اور وہ مغرب میں ہوں گے۔ آج اس دریا کے مشرقی جانب اردن ہے اور مغربی جانب اسرائیل بن گیا ہے۔ اسرائیل کا وہ ٹکڑا جو دریائے اردن کے ساتھ لگتا ہے، اس کو کہتے ہیں: دریائے اردن کا مغربی کنارہ" یعنی "ویسٹ بنک"۔ یہ اصل میں نام اور غرض چھپانے کے لیے ایسا بولتے ہیں۔ حقیقت میں ان کو سارا فلسطین (القدس) اس لیے چاہیے کہ ان کے زعم کے مطابق یہ ان کا مذہبی، تاریخی علاقہ ہے اور مغربی کنارہ اس لیے چاہیے کہ اس میں ان کی دو سلطنتیں تھیں۔ شمالی سلطنت کا نام "اسرائیل" تھا۔ اس کا پایۂ تخت "سامریہ" تھا۔ جنوبی سلطنت کا نام "جوڈیا" تھا، اس کا پایۂ تخت "یروشلم" تھا۔ اور اس کے بعد "صحرائے سینا" اس لیے چاہیے کہ یہاں "کوہ طور" ہے۔ پھر یہ تو "ابتدائی اسرائیل" ہے، کنعان کی طرف ابتدائی واپسی ہے۔ ورنہ تو ان کا عقیدہ ہے اللہ تعالیٰ نے دجلہ و نیل کے درمیان کی ساری زمین حضرت یعقوب

السلام کو دے دی تھی۔ "اَرْضُكِ يَا إِسْرَائِيلُ مِنْ دَجْلَةَ إِلَى النِّيلِ، وَمِنَ الْأَرْزِ إِلَى النَّخِيلِ." دجلہ سے نیل اور صنوبر کی زمین یعنی لبنان سے کھجوروں کی سرزمین یعنی مدینہ تک کو یہ اپنی آبائی وراثت (عظیم تر اسرائیل) قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ وراثت مشروط تھی چند گناہوں کے نہ کرنے کے ساتھ جو انہوں نے ظاہر کیے اور ان کی پاداش میں دھتکار کر یہاں سے نکال دیے گئے۔ اب یہ مقدس وراثت امت مسلمہ کے پاس امانت ہے جس کی حفاظت اس پر فرض ہے۔

بعض لوگ بحر میت کے وجود میں آنے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو اٹھا کر جبرئیل علیہ السلام اوپر لے گئے تھے پھر الٹ دیا تو یہ گڑھا پڑ گیا، یہ وجہ غلط ہے۔ اس کو بحر میت اس لیے نہیں کہتے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بستی اس سے باہر تھی۔ ادھر نیچے تھی۔ اس کے اندر والی جگہ پر نہیں تھی کہ یہ گڑھا بن گیا۔ یہ کھاری جھیل حضرت سے پہلے کے وقت سے تھی۔ "بحر میت" اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اتنا کھارا ہے کہ اس کے اندر کوئی ذی روح کوئی آبی جانور نہیں رہ سکتا۔

چند مشہور دریا اور نہریں

یہاں تک تو ان دریاؤں کا ذکر تھا جن کا ذکر قرآن وحدیث میں آیا ہے۔ اب ہم دنیا کے دیگر مشہور دریاؤں اور نہروں کا ذکر کرتے ہیں:

دریائے امیزون:

دریائے امیزون پانی کے حجم کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ طوالت کے اعتبار سے سب سے بڑا نیل تھا۔ امیزون حجم اور پانی کی کثرت کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے۔ یہ برازیل کی مغربی سرحد سے نکلتا ہے اور امیزون کے جنگلات سے گزر کے برازیل کے مشرق میں بحر اوقیانوس میں گرتا ہے۔

ان دریاؤں کے علاوہ دنیا کی تین نہریں ایسی ہیں جو خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ عام طور پر نہریں دریا سے نکلتی ہیں اور زمینوں کو سیراب کرتی ہیں، جبکہ یہ نہریں سمندر سے کاٹ کر نکالی گئی ہیں اور دو سمندروں کو ملاتی ہیں۔

1-نہر کیل:

یہ نہر جرمنی نے بنائی ہے۔ بہت خوبصورت اور صاف ہے۔ جبکہ ہمارے دریاؤں میں دنیا کا گند لا کے ڈالا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں کتنی سختی سے منع کیا گیا ہے کہ پانی میں پیشاب نہ کرو۔ پانی میں کچرا نہ ڈالو۔ لیکن ہم دریاؤں کو کچرا کنڈی بنائے جا رہے ہیں۔ نہر کیل کے مناظر بڑے دل رُبا ہیں۔ اس سے مال برداری آسان ہوگئی ہے۔ پہلے بحری جہازوں کو لمبا چکر لگانا پڑتا تھا۔ ڈنمارک کے اوپر سے جانا پڑتا تھا۔ یہ مصنوعی نہر ہے۔ اس کا پانی میٹھا نہیں ہے۔ سمندر کا کھاری پانی ہے۔

2-نہر پانامہ:

یہ جنوبی امریکا کے ملک پانامہ میں واقع ہے۔ اس کے ایک طرف بحر اوقیانوس ہے۔ دوسری طرف بحر الکاہل ہے۔ بحر اوقیانوس سے انہوں نے نہر نکالی اور ایک جھیل میں لا کے ڈالی۔ یہ قدرتی جھیل ہے۔ پھر ادھر سے نکال کر دوسری جھیل میں ڈالی۔ یہ جھیل مصنوعی ہے۔ پھر وہاں سے نکال کر بحر الکاہل میں پہنچا دیا۔ ایک بندرگاہ ادھر (بحرِ اوقیانوس میں) بنادی اور ایک بندرگاہ اُدھر (بحر الکاہل میں) بنادی۔ نہر سوئز کے دونوں طرف جو سمندر ہے (یعنی ایک طرف بحرِ ابیض اور دوسری طرف بحرِ احمر) اس میں پانی کی سطح برابر ہے، لیکن یہاں اوقیانوس کے پانی کی سطح اونچی ہے اور بحر الکاہل کی نیچی ہے۔ اس کے حل کے لیے انہوں نے بڑے بڑے حوض اور پھاٹک بنائے ہیں۔ ایک جہاز نکلتا ہے تو آگے کا پھاٹک کھول دیتے ہیں اور جب اس کی حد سے نکل جاتا ہے تو بند کر دیتے ہیں۔ حوض میں

پانی کم ہوتا ہے تو پھر بھر دیتے ہیں۔

3-نہر سوئز:

یہ دنیا کی سب سے مشہور اور سب سے اہم مصنوعی نہر ہے۔ فرعون اس کے ساتھ واقع خلیج سوئز میں مارا گیا ہے۔ آپ کو بتایا گیا تھا صحرائے سینا کے ایک طرف فلسطین اور دوسری طرف مصر تھا۔ اس کے دونوں طرف واقع علاقے والوں پر جب کوئی مشکل آتی تو وہ اسے عبور کر کے دوسرے علاقے میں چلے جاتے تھے۔ مصر والے ''بنی اسرائیل'' پر جب مشکل پڑی تو واپس فلسطین جانا چاہتے تھے۔ فرعون اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا اپنی قوم کو لے کر راتوں رات نکل جائیں ''وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ.'' [الشعراء: 52] ان کو لے کر رات کو نکلو۔ تمہارا پیچھا ہوگا۔ اب بعض حضرات کا کہنا ہے جس سمندر میں فرعون غرق ہوا وہ صحرائے سینا میں واقع دو جھیلوں میں سے ایک ہے۔ صحرائے سینا سو میل کی پٹی ہے (خشکی کی پٹی) جو ایشیا اور افریقہ کو ملاتی ہے، اس میں دو قدرتی جھیلیں ہیں۔ ان کو ''مرّہ صغریٰ'' اور ''مرّہ کبریٰ'' کہتے ہیں۔ فرعون بنی اسرائیل کا پیچھا کرتے ہوئے اس میں غرق ہوا تھا۔ مصر سے فلسطین جانے کا اصل راستہ یہی ہے اور بنی اسرائیل اِدھر ہی سے گزر کر جا رہے تھے، لیکن یہ قول راجح نہیں۔ راجح یہ ہے کہ بنی اسرائیل اللہ کے کرنے سے راستہ بھٹک کر ادھر خلیج سوئز کی طرف نکل آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ادھر لے گیا۔ اب آگے دیکھا تو یہ وہ صحرا نہیں ہے جو ہم پار کرتے رہے۔ یہاں تو سمندر بیچ میں آ گیا۔

جب بدر والوں کا امتحان ہوا تو انہوں نے کھڑے ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمیں قریش سے لڑنے کا پوچھتے ہیں۔ لڑنا ہمارا آبائی کام اور فطری شوق ہے۔ آپ اگر سمندر میں گھس جانے کا کہیں تو ہم سارے کود پڑیں گے۔ ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ یعنی جنگ تو جنگ ہے۔ ہم آپ کے حکم پر بظاہر بے معنی نظر آنے والی سمندری موت پر بھی تیار ہیں۔ اِدھر بنی اسرائیل کا حال دیکھو۔ قرآن نے تو صرف اتنا کہا ہے ''إِنَّا لَمُدْرَكُونَ.'' [الشعراء: 62] کہ ہم پکڑے گئے۔ تورات نے بیان کیا ہے کہ وہ بڑبڑانے لگے اور موسیٰ سے کہا ہمیں ادھر مروانے کے لیے لے کر آیا تھا۔ ایسے بے ادب تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: نہ، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ''قَالَ كَلَّا ۖ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ.'' [الشعراء: 62] اب یہاں دو آیتیں ہیں۔ ان کو ملا کر پڑھنے سے اشکال ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے ایمان کا امتحان تھا، وہ کامیاب ہوئے، قوم تو ناکام رہی، لیکن یہ امتحان ہوگا کیسے؟ ابھی پیچھے آیت پڑھی ''أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ.'' [الشعراء: 52] تمہارا پیچھا ہوگا۔ ''وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ.'' [الدخان: 24] اور سمندر کو ایسا ہی چھوڑ دے۔ اب اشکال یہ ہے کہ جب پہلے سے بتا دیا کہ سمندر کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ فرعون غرق ہوگا تو امتحان کیسے ہوا؟ دوسرے مصر میں جب یہ وحی آئی کہ بنی اسرائیل کو لے کر نکل جاؤ۔ اس وقت یہ کہنا کہ سمندر کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ بظاہر بے ربط سی بات بنتی ہے۔ ''اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ'' سے پہلے ''وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا'' بہت عجیب سا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں تو یہ دونوں آیتیں اکٹھی ہیں جس سے یہ دو مرحلے بیان میں اکٹھے ہو گئے ہیں، لیکن وقوع میں الگ الگ ہوئے تھے۔ یعنی رات کو کہہ دیا گیا تھا کہ پیچھا کیا جائے گا چپکے سے نکلنا، جب سمندر کے اُرلے کنارے پہنچ گئے تو حکم ہوا۔ ''اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ.'' لاٹھی مارو۔ جب پار پہنچ گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام دوبارہ لاٹھی مار کر سمندر کو پہلی حالت پر لانا چاہتے تھے تاکہ فرعون پیچھے نہ آ سکے۔ حکم ہوا سمندر کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ جب تمہارا آخری آدمی پار پہنچ جائے گا اور فرعون کا آخری آدمی اندر آ جائے گا تب ہم خود ان راستوں کو ملا دیں گے ''وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ.'' [الدخان: 24] یہ پار پہنچ کر نازل ہوئی ہے۔ پار پہنچ کر یہ حکم ہوا تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ.'' تو اللہ تعالیٰ ایسے ایمان والوں کو اکیلا نہیں چھوڑتے۔ حکم ہوا: مارو لاٹھی۔ ''فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ.'' [الشعراء: 63] تو بارہ راستے بن گئے اور یہ پار ہوئے۔ تبلیغی حضرات صحیح بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بارہ قبیلوں کے ساتھ پار پہنچ گئے اور فرعون اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ اندر آ گیا۔ آخری اسرائیلی پار ہو گیا اور آخری فرعونی اندر آ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہ تو اسی سمندر میں بنے راستے پر چلتے چلتے

بیچ آرہے ہیں۔ وہ پھر لاٹھی مارنا چاہتے تھے کہ سمندر مل جائے اور یہ ہمارے پیچھے نہ آسکیں تو اللہ نے فرمایا: ایسے ہی چھوڑ دو۔ اسے ہم دوبارہ جوڑ دیں گے۔ اب ہوئے معجزات کا انکار کرتے ہیں جیسے سرسید احمد خان، علی گڑھ تحریک کے بانی، جدید تعلیم کے نام پر مغربی تہذیب کی درآمد و تنفیذ کا کارنامہ انجام دینے والا محسن کہتے ہیں: جی! یہ مدوجزر تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام پار کر رہے تھے تو پانی اُترا ہوا تھا اور جب فرعون آرہا تھا تو پھر چڑھ گیا تھا۔ اللہ پاک کہہ رہے ہیں لاٹھی ... فَانْفَلَقَ۔ "لاٹھی مارنے سے سمندر پھٹ گیا، قدرت خداوندی پر مشتمل معجزہ ظاہر ہوگیا اور یہ عقل پرست کہہ رہے ہیں مدوجزر تھا۔ عجیب وقت کا پابند اور اس قسم کا مدوجزر تھا کہ ایک بنی اسرائیلی کو نہ چھیڑا اور ایک فرعونی کو نہ چھوڑا۔ ایسی اندھی عقل پرستی عصر حاضر کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔

نہر سوئز:

اب دیکھو! نہر سوئز کو کیسے بنایا گیا؟ بحرِ احمر سے زمین کو کھودا گیا اور پہلی جھیل (بحیرۂ مرۂ صغری) تک پہنچایا گیا۔ پھر کھودا گیا اور دوسری جھیل (بحیرۂ مرۂ کبریٰ) تک پہنچایا گیا۔ یہاں سے کھود کر بحر متوسط تک پہنچا دیا گیا۔ جہاز ادھر سے داخل ہوتا ہے تو دوسری طرف آکر نکل جاتا ہے۔ یہ نہر زیادہ چوڑی نہیں ہے۔ بس ایک جہاز ادھر جائے گا تو ایک ادھر آئے گا۔ اس سے زیادہ نہیں چل سکتے۔ یہ عالمی بحری شاہراہ کا اہم ترین ناکہ اور شہ رگ ہے۔

طبعی جغرافیہ کا ''ختامِ مسک'':

الحمد للہ! یہ بحث مکمل ہوگئی۔ پانچ جنتی نہریں۔ بحیرۂ طبریہ، بحیرۂ میت اور دریائے اردن۔ اب ہم طبعی جغرافیہ کی آخری بحث یعنی سطح زمین پر سب سے اونچا اور سب سے نیچا مقام نیز سب سے زیادہ سرد اور سب سے زیادہ گرم مقام کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کو قسما قسم بنایا۔ "وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا. أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا. وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا." [النازعات:30، 31، 32] اب دیکھو! کوئی جگہ تو زمین پر بہت اونچی ہے۔ کوئی بہت پست ہے۔ یہ دونوں قسم کے مقامات آپ نے سن لیے۔ نیپال اور چین کی سرحد پر واقع ''کوہ ہمالیہ'' کی ایک چوٹی ''ماؤنٹ ایورسٹ'' دنیا کی بلند ترین چوٹی ہے۔ اور بحر میت دنیا کا پست ترین مقام ''أدنى الأرض'' ہے۔ اس کا ترجمہ ''قریب کی زمین'' کا کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا ترجمہ ''پست ترین زمین'' سے کیا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ یہ زمین کا سب سے پست ترین حصہ ہے۔ یہ ناقابل یقین پیش گوئی قرآن کریم کا معجزہ ہے۔ یہ درحقیقت ایک نہیں دو پیش گوئیاں یا دو معجزے ہیں۔ اس زمانے میں جغرافیہ دانوں نے اس کا کوئی انکشاف کیا تھا، نہ اس دور میں علمِ جغرافیہ نے کوئی ایسی ترقی کی تھی۔ یہ خبر حضور علیہ السلام کی دی ہوئی تھی۔ حضور علیہ السلام نے مکہ میں بیٹھ کر اس وقت کی دو اہم طاقتوں کے درمیان بپا ہونے والے معرکے کے متعلق اطلاع دی: "غُلِبَتِ الرُّومُ." [الروم:2] روم اور فارس میں یعنی اس زمانے کے مشرکین اور اہل کتاب میں معرکہ ہوا ہے۔ رومی جو اہل کتاب ہیں، وہ مغلوب ہوگئے ہیں "فِي أَدْنَى الْأَرْضِ." [الروم:3] یہ ان آیات میں مذکور پہلا معجزہ ہے کہ یہ معرکہ دنیا کی پست ترین جگہ پر ہوا ہے۔ اس زمانے میں کوئی یہ انکشاف نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا بھی سن لیجیے: "وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ." [الروم:3] یہ دوسرا معجزہ ہے۔ بظاہر ایسا ممکن نہ تھا کہ رومی اتنی بڑی چوٹ کھانے کے بعد اتنی جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔ "بِضْعِ سِنِينَ." تین سے نو سال میں روم دوبارہ کیسے جیت سکتا ہے؟ قرآن نے کہا جیتے گا۔ ایک آیت میں دو پیش گوئیاں ہیں۔ ایک ارضیاتی پیش گوئی ہے۔ ایک واقعاتی پیش گوئی ہے۔ ایک کا تعلق جغرافیہ سے اور ایک کا تاریخ سے ہے۔ یہ دو معجزے ہیں جو قرآن کریم کی اس ایک آیت میں جمع ہیں۔ بہرحال دنیا کا سب سے اونچا اور نیچا مقام یہ دو جگہیں ہیں۔ اونچا ''ماؤنٹ ایورسٹ'' ہے۔ 8,848 فٹ بلند یعنی تقریباً 9 ہزار فٹ اور سب سے پست بحر میت جو سطح سمندر سے (420 میٹر) پست ہے۔

اب سب سے زیادہ گرم اور سب سے زیادہ سرد مقام کی طرف چلیں۔ لیبیا، الجزائر اور مراکش ان تین ممالک میں پھیلا ہوا دنیا کا سب سے بڑا صحرا ہے۔

اس کا نام ہے: ''صحرائے اعظم''۔ ان تینوں ممالک یعنی لیبیا، الجزائر اور مراکش میں بڑے شہر سمندر کے کنارے ساحل پر ہیں۔ اندر صحرا کی طرف آبادی نہیں ہے۔ صحرا ہی صحرا ہے۔ لیبیا کے صحرا میں ایک جگہ ''العزیزیہ'' ہے جو دنیا کا سب سے گرم ترین مقام ہے۔ یہاں 58 ڈگری سینٹی گریڈ تک گرمی ریکارڈ کی گئی ہے۔ کراچی میں 42 ڈگری سینٹی گریڈ تک جاتی ہے تو اموات شروع ہو جاتی ہیں۔

سب سے سرد ترین مقام قطب جنوبی میں ''اسٹوک اسٹیشن'' ہے۔ اسٹیشن کا معنی ہے ''کیمپ'' جہاں موسم پر تحقیق کے نام سے سائنسدانوں کا کیمپ ہے۔ پہلے بتایا گیا ہے کہ قدیم جغرافیہ دان سمجھتے تھے قطب شمالی کی طرح جنوبی پر بھی پانی ہے اور نیچے تک جمی ہوئی برف ہے۔ توڑو گے تو پانی نکلے گا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ قطب جنوبی میں نیچے زمین ہے اور آسٹریلیا سے بھی بڑی ہے۔ یہ چھٹے نمبر کا براعظم ہے۔ ساتویں نمبر پر آسٹریلیا ہے۔

اب یہ چار جگہیں تو زمین پر تھیں۔ سمندر میں سب سے گہری جگہ بحر الکاہل میں ہے اور وہ اتنی گہری اس لیے ہوگئی ہے کہ سمندر کی تہہ میں نیچے جا کر ایک خندق نکل آئی ہے۔ اس کو انگلش میں ''ٹرنچ'' کہتے ہیں۔ اس جگہ کا نام ''ماریانہ ٹرنچ'' ہے۔ اوپر بحر الکاہل نامی سمندر پر قریب میں جزیرہ ہے ''گوام''۔ اس کے قریب سمندر آہستہ آہستہ نیچے اترتا ہے پھر اچانک گہرا ہوتا جاتا ہے اور پھر سمندر کا فرش آجاتا ہے۔ یہ خندق اس فرش کے اندر ہے۔

یہ طبعی جغرافیہ کا ''ختامِ مسک'' تھا۔ اب ہم آپ کے سوالات کی طرف آتے ہیں۔

چند سوالات

پہلا سوال:

"طوفانِ نوح کی حدود کیا تھیں؟ طوفانِ نوح پوری دنیا میں آیا تھا یا صرف اسی خطے میں جہاں قومِ نوح بستی تھی؟

جواب:- اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے ہمارے پاس دو ذریعے ہیں۔ ایک ذریعہ روایات ہیں۔ بعض روایات کی رُو سے پہلا قول یہ ہے کہ یہ پوری دنیا پر آیا تھا۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ حجرِ اسود طوفانِ نوح کے دوران جبل ابی قبیس پر تھا۔ اس کے بعد اسے سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت وہاں سے اٹھا کر خانہ کعبہ میں نصب کیا۔ اب قومِ نوح کا مسکن عراق کے قریب ہے جو حجاز سے کافی دور ہے۔ یہاں تک طوفانِ نوح کے آثار پہنچے، مطلب یہی ہوا کہ یہ طوفان جب ارضِ حرم میں بھی آیا تھا تو پھر پوری دنیا پر آیا تھا۔

دوسرا ذریعہ قیاس ہے۔ جغرافیہ دان تو صرف قیاس لگاتے ہیں۔ بعض کا قول ہے پوری دنیا کی بعض جگہوں میں بعض ایسی نباتات اور پتھر ملتے ہیں جو اس بحر اعظم میں کہیں اور ہیں ہی نہیں۔ بڑے بڑے جانوروں کے ڈھانچے ملتے ہیں جو اس براعظم کے ہیں ہی نہیں۔ اس سے لگتا ہے طوفانِ نوح پوری دنیا پر آیا تھا اور یہ پتھر اور حیوان پانی میں بہہ کر ان جگہوں پر چلے گئے۔ بڑے بڑے پہاڑوں پر ایسے آثار ملتے ہیں کہ یہ بلند و بالا پہاڑ کبھی پانی کے نیچے رہا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ تو صرف قومِ نوح پر آیا تھا۔ بقیہ قوموں پر کیوں آیا ہوگا ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا؟ ہم قرآن کریم کو دیکھیں تو ارض و سماء کا عمومی اطلاق ہے: "وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ، وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي." [الھود: 44] اور "وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا." [القمر: 12] اور "لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا." [نوح: 26] اس عمومی اطلاق سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے کہ یہ پوری دنیا پر آیا تھا اور لگتا بھی ایسا ہے کہ جب ایران، ترکی اور عراق کے سنگم پہاڑی علاقے میں پانی 1800 میٹر کی بلندی پر گیا ہے کوہ جودی سطح سمندر سے 1800 میٹر اونچی ہے تو پورے کرۂ ارض پر ایک بار ضرور گیا ہوگا۔ جبھی تو حضرت نوح علیہ السلام کو "آدم ثانی" کہا جاتا ہے اور باقی یہ اشکال کہ ان کی قوم کو تو عذاب ہونا تھا بقیہ دنیا کو کس جرم کی سزا ملی؟ تو بقیہ دنیا میں مشرکین اگر رہتے ہوں یا انسانی آبادی ابھی گئی ہی نہ ہو تو پوری دنیا میں انسانوں کے اعمال کے نتائج تو آتے ہی ہیں۔ نباتات، حیوانات تو انسانوں کے تابع ہیں۔ اور زمین تو الٹ پلٹ ہوتی رہتی ہے۔ دنیا میں جب عمومی عذاب آتا ہے تو سب لپیٹ میں آجاتے ہیں، پھر قیامت کے دن اپنی نیتوں اور اعمال کے مطابق اٹھایا جائے گا۔ یہ کوئی قوی اشکال نہیں ہے۔

دوسرا سوال:

امریکا میں انسان کہاں سے آئے؟ طلبہ پوچھتے ہیں کہ امریکا میں ریڈ انڈین کہاں سے اور کس طرح آئے؟ چاروں طرف سے سمندر میں گھرے اس براعظم میں انسان کیسے پہنچا؟ یہی سوال آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ان کے گرد و پیش واقع چھوٹے بڑے مختلف جزیروں کے متعلق بھی ہوتا ہے جو بہت دور دراز

واقع ہیں۔ وہاں جب آج کا ترقی یافتہ انسان پہنچا تو دیکھا کہ مقامی قبائلی آبادی پہلے سے موجود ہے۔ اس کا جواب میرے بھائی اس آیت میں ہے "وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ." [المؤمنون 79] اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کے انسانوں کو اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے پھیلا دیا ہے۔ آپ اس بات پر غور کریں کہ یہاں لوگ کراچی میں رہتے ہیں پھر اتنا سارا علاقہ چھوڑ کر حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ ایک شہر سے ریل گاڑی روانہ ہوتی ہے۔ اتنی ساری جگہ چھوڑ کر پھر دوسری جگہ آبادی رہتی ہے۔ یہ اکٹھے کیوں نہیں رہتے؟ بیچ میں جگہ کیوں چھوڑی ہوئی ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ جب اللہ نے سات براعظم بنائے تو "وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ." [المؤمنون:79] پھر اس میں انسان پھیلائے بھی۔ دنیا میں جہاں جہاں انکشافی مہمات گئی ہیں، انسان پہلے سے وہاں تھے۔ طوفانِ نوح سے بچنے والے انسان پانی کے ذریعے سے وہاں پہنچ گئے یا اللہ تعالیٰ اپنے قدرت سے ہواؤں کے زور پر یا فرشتوں کے ذریعے یا امر کن سے لے گیا، یا انہوں نے بحری راستہ تلاش کر لیا تھا یا کیا بات تھی؟ مادی وجہ کچھ بھی ہو، اصل تکوینی وجہ امر الٰہی ہے کہ قدرت نے سب کو جگہ جگہ آباد کرنا تھا۔ "يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ. لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ." [الشوری:11] جغرافیہ دان اس کی جو وجہ یا وجوہ بیان کرتے رہتے ہیں، وہ سب قیاس، اندازے اور احتمال ہیں۔

تیسرا سوال:

امریکا کی دریافت مسلمانوں سے کیوں منسوب نہ ہوئی؟

ایک سوال یہ ہوتا ہے: کولمبس کے امریکا دریافت کرنے سے پہلے جب عربی رسم الخط والے سکے وہاں پائے گئے تو مسلمانوں کے نام سے یہ دریافت کیوں مشہور نہیں ہوئی؟

جواب:

بالکل اسی طرح سے جیسے وکٹوریہ جھیل کو مسلمانوں نے دریافت کیا لیکن انہوں نے اس پر اپنے نام کا ٹھپہ نہیں لگایا۔ نظریہ میں فرق ہے۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔ یورپی عیسائی لوگ اسی نظریے سے گئے تھے۔ انکشاف کیا ہی اسی نظریے سے تھا کہ اس میں ہم کو کوئی قیمتی چیز مل جائے گی۔ سونا مل جائے۔ تمباکو مل جائے گا۔ لونڈی غلام مل جائیں گے۔ دوسروں کی ملکیت پر گئے اسی لیے تھے۔ اس لیے اپنے نام کا ٹھپہ تو لگانا تھا۔ مسلمان تو دعوت یا تجارت کے لیے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے نام کا ٹھپہ کیا لگانا تھا؟ انہوں نے تو اللہ کے نام کا ٹھپہ لگانا تھا۔ اس کا کلمہ بلند کرنا تھا۔ ضمنی طور پر مسلمانوں کے نام سے کسی جگہ کا نام پڑ گیا، سو پڑ گیا۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت مسلمانوں کے زوال اور یورپ کے عروج کا زمانہ آ گیا تھا۔ تو اس وقت انکشافاتی مہمات ان یورپیوں ہی کی طرف سے کی گئیں۔ اسپین کے مسلمان تو مشکل سے جان بچا کر مراکش میں آئے۔ انہی یورپیوں کی مہمات دنیا میں زیادہ گئیں اور انہوں نے ہی عیسائیت کی آواز اور اپنے شہزادوں، بادشاہوں کے نام کو دنیا میں زیادہ پھیلایا اور مختلف جگہوں کے نام ان کے نام پر رکھے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ایک طرف سے نائیجیریا کے محمد ابوبکر منسا کی زیر نگرانی افریقی مسلمانوں نے بہت پہلے امریکا دریافت کر لیا تھا۔ دوسری طرف وسط ایشیا کے مسلمان درۂ بیرنگ کو عبور کر کے الاسکا کے راستے امریکا میں داخل ہو چکے تھے۔ بس وہاں کے رہنے والوں کو زبردستی غلام بنا کر ان کی آبائی زمینوں پر قبضہ نہیں کیا۔

چوتھا سوال:

زمین گول ہے تو ہم گرتے کیوں نہیں؟

ایک دلچسپ سوال ہے کہ ہم گیند پر پانی ڈالتے ہیں تو پانی نیچے کی طرف جاتا ہے۔ مائع چیز ہمیشہ پستی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ زمین پر پانی نیچے کیوں نہیں گرتا؟ تو اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ زمین جب گول ہے تو مثلاً ہم برصغیر والے اس کے ایک طرف رہتے ہیں۔ دوسری طرف امریکا والے رہتے ہیں۔

ونا ایک اوپر سمت الراس پر ہوگا۔ دوسرا بالکل نیچے ہوگا۔ تو وہ نیچے کیوں نہیں گرتا؟ جواب ہے: "اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا۔"
الفاطر: [4] تو پانی کا نہ گرنا اور پتھر کا زمین پر چمٹے ہوئے رہنا، رب تعالیٰ کا امرِ تکوینی ہے۔ سائنس دان اسے ''قانونِ کشش'' کہتے ہیں۔ اصل میں امرِ الٰہی
ہے۔ "اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا۔"[الفاطر: 41] یہ ایک نظام کے تحت چل رہا ہے۔ یہ قدرتِ الٰہیہ کے اظہار کا بے مثال نمونہ ہے۔ اس
میں کٹ پٹ، گڑبڑ نہیں ہوسکتی۔

طبعی جغرافیہ:2

سمندری درّے

''درّہ'' تنگ سمندری راستے کو کہتے ہیں جو خشکی کے دوحصوں کو جدا کرتا اور سمندر کے دوحصوں کو ملاتا ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے جب آپ کسی درّے کو بیان کریں گے تو آپ کو چار چیزیں بتانی پڑیں گی۔دو تو خشکی کے وہ حصے بتانے پڑیں گے جو اس نے الگ کیے ہیں اور دو سمندروں کے وہ حصے بتانے ہوں گے جو اس نے ملائے ہیں۔یہ ''وصل وہجر'' بیان کرنا ہوگا اور ''موصول ومفروق'' کا نام لینا پڑے گا۔آیئے! دنیا کے اہم سمندری درّوں سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔روئے زمین پر آٹھ بڑے قدرتی درّے ہیں اور تین مصنوعی۔

آٹھ قدرتی درّے

دنیا میں آٹھ قدرتی درّے ہیں۔ان میں سے چار بہت ہی اہم ہیں۔تین مصنوعی درّے بہت مشہور ہیں،جن میں دو بہت اہم ہیں۔درّوں کے سبق کا خلاصہ یہ ہوا کہ انکی دو اقسام ہیں۔قدرتی اور مصنوعی۔آٹھ قدرتی اور تین مصنوعی۔قدرتی آٹھ میں سے چار ایسے ہیں کہ ساری دنیا کی سیاست اِن کے گرد گھوم رہی ہے اور مصنوعی میں دو بحری تجارت کی ایسی کنجی ہیں جو اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو دیے ہوئے ہیں۔اس طرح دنیا کی شہ رگ،دنیا کی تجارتی کنجی مسلمانوں کے پاس ہے۔بس اسے اسلام اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد میں استعمال کرنے کی دیر ہے۔

پہلا درّہ ''مضیق ہرمز'' ہے۔''مضیق'' کا معنی ہے ''تنگ راستہ'' اور ''ہرمز'' فارسی نام ہے۔''مضیقِ ہرمز'' کے ایک طرف ''عمان'' اور دوسری طرف ''ایران'' ہے۔''مضیق ہرمز'' بحرِ ہند اور خلیجِ عرب کو ملاتا ہے اور عمان اور ایران کو جُدا کرتا ہے۔دوسرا باب المندب ہے۔''باب المندب'' بحرِ ہند اور بحیرۂ احمر کو ملاتا اور یمن اور جبوتی کو جدا کرتا ہے۔

تیسرا مشہور قدرتی درّہ بحرِ متوسط اور بحرِ اوقیانوس کو ملاتا ہے۔اس کو ''درّۂ جبل الطارق'' کہتے ہیں۔دنیا کے جس عظیم فاتح نے اِس کو عبور کیا وہ ''طارق بن زیاد'' تھے۔اس لیے اس کا نام ''جبل الطارق'' پڑ گیا۔انگلش میں یہ ''جبرالٹر'' کہلاتا ہے۔یہ دو بڑے سمندروں کو ملا رہا ہے۔بحرِ اوقیانوس اور بحرِ اوقیانوس ہی کی ایک شاخ ''بحرِ ابیض'' یا ''بحرِ متوسط''۔ان دونوں کو یہ ملاتا ہے۔یہ شاخ اتنی بڑی ہے کہ مستقل سمندر کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے کنارے ایشیا،افریقہ دیورپ یعنی تین براعظموں سے لگتے ہیں۔یہ ایسا سمندری حوض ہے کہ اس کی اہمیت،تجارت،معیشت،سیاست غرض ہر اعتبار سے ہے۔

مضیق ہرمز،باب المندب،جبل الطارق ان تینوں درّوں سے بننے والی شاہراہ کے بیچ میں ایک مصنوعی درّہ ''نہر سوئز'' ہے۔یہ چاروں درّے مل کر دنیا کی سب سے اہم ترین بحری شاہراہ تشکیل دیتے ہیں۔اس شاہراہ کی ایجاد سے پہلے یورپ سے ایشیا یا افریقا سے ہندوستان کا سفر انتہائی کٹھن،دشوار،طویل اور مہنگا شمار ہوتا تھا۔اب یہ بہت آسان ہوگیا ہے۔

«نہر سوئز»، خلیجِ سوئز کے کنارے ہے۔ اس سے قبل ہم نے پڑھا تھا کہ افریقا اور ایشیا کے درمیان بحرِ احمر حدِ فاصل ہے۔ ان دونوں کو سو میل کی خشکی کی ایک پٹی ملاتی ہے۔ اس سو میل کے اوپر والی طرف شمالی جانب میں بحرِ متوسط اور نیچے والی جانب جنوبی جانب میں بحرِ احمر ہے۔ کافی عرصے سے یہ کوشش ہو رہی تھی کس طرح سے یہ دونوں سمندر آپس میں مل جائیں تو بہت بڑا کام آسانی سے ہو سکتا ہے اور بہت بڑا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ کٹھن اور لمبا سفر مختصر ہو سکتا ہے۔

آخر کار فرانس کے ایک انجینئر نے یہ کام کیا۔ اس سو میل کی پٹی کے بیچ میں «بحیرۂ مرۂ کبریٰ و صغریٰ» نامی دو جھیلیں آتی ہیں۔ انہوں نے ایسا کیا کہ صحرائے سینا کے ریتیلے سینے میں نہر کھود کر «بحیرۂ مرہ کبریٰ» میں ڈالی۔ «کبریٰ» سے کھود کر «صغریٰ» میں ڈالی۔ صغریٰ سے کھود کر بحرِ ابیض تک پہنچا دی۔ اس طرح دونوں اہم سمندر مل گئے۔

اللہ کی شان بحرِ متوسط کے سمندر کی جو سطح ہے، بحرِ ابیض کی بھی وہی سطح ہے۔ جب نہر میں پانی چھوڑا گیا اور دونوں سمندروں کو آپس میں ملا گیا تو پانی کی سطح برابر ہوگئی۔ اس نہر کی مشرقی جانب صحرائے سینا ہے اور مغربی جانب مصر ہے۔ اس نہر سے کوئی یورپ سے ایشیا آنا چاہے تو ساڑھے چار ہزار میل کا سفر کم پڑ جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن مصر نے چھڑا لیا۔ اب بظاہر سمجھا جاتا ہے کہ یہاں مصر کا تسلط ہے، لیکن حقیقت میں امریکا، برطانیہ اور فرانس کی آبدوزیں یہاں گھومتی ہیں۔ یہ ممالک یہاں کے دادا گیر ہیں۔

یہ نہر نہ زیادہ چوڑی ہے نہ زیادہ گہری۔ ایک جانب کھڑے ہو کر دوسری جانب کنارے کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک وقت میں کئی جہاز ایک دوسرے کے بازو میں نہیں چل سکتے۔ نمبروار جہاز آتے ہیں۔ اوسطاً گھنٹے گھنٹے بعد جہاز چھوڑتے ہیں۔ وہ فاصلے فاصلے سے چلتے رہتے ہیں۔ یہ تین قدرتی اور ایک مصنوعی درّہ چاروں ایک قطار میں آتے ہیں اور دنیا کی سب سے اہم بحری شاہراہ وجود میں آتی ہے۔ اب آیئے! ان سے فارغ ہو کر ہم پانچویں درّے کی طرف چلتے ہیں۔

بحرِ ہند میں سنگاپور اور انڈونیشیا کے درمیان ایک درّہ ہے «آبنائے ملاکا»۔ جو جہاز بحرِ ہند سے بحرالکاہل یا بالفاظِ دیگر جنوبی ایشیا سے جنوب مشرقی ایشیا یا مشرقِ بعید آنا چاہے تو «آبنائے ملاکا» سے گذرے بغیر نہیں آسکتا۔ اس لیے ملائشیا کے مغربی کنارے پر ایک جزیرے کو (جہاں ناکہ لگتا ہے) کاٹ کر اس کا نام «سنگاپور» رکھ دیا گیا۔ اس ملک کی آمدنی کا ذریعہ یہ ہے کہ وہ تجارتی گذرگاہ ہے۔ مشرقِ بعید کو جانے والے جہاز یہاں رکتے ہیں۔ خوراک، ایندھن لیتے ہیں۔ سامان لادتے اتارتے ہیں تو ان کا روزگار لگا رہتا ہے۔

اب چھٹے اور ساتویں درّے کی طرف آیئے! ترکی کے پاس ایشیا اور یورپ آپس میں ملتے ہیں۔ ان کے درمیان میں چھوٹے چھوٹے تین سمندر قطار کے ساتھ ہیں۔ پہلے «بحرۂ اسود» پھر «بحیرۂ مرمرہ» پھر «بحرِ ایجہ» (ایجین سی)۔ ان تینوں کے درمیان دو درّے ہیں۔ آبنائے باسفورس «اسود» اور «مرمرہ» کو ملاتا ہے۔ درّۂ دانیال «مرمرہ» اور «ایجہ» کو ملاتا ہے۔ یہ دو درّے ہیں۔ پہلا ترکی کے یورپی اور ایشیائی حصوں کو جدا کرتا ہے اور اسود اور مرمرہ کو ملاتا ہے۔ دوسرا ترکی اور یونان کو جدا کرتا ہے اور بحیرۂ مرمرہ اور بحرِ ایجہ کو ملاتا ہے۔

آبنائے باسفورس اور درّۂ دانیال دونوں یورپ کے دو دروازے ہیں۔ ایشیا اور یورپ کے درمیان سمندری حدِ فاصل کو عبور کیا جائے تو ان دو میں سے کسی ایک کے ذریعے یورپ میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ آبنائے باسفورس یورپی کنارے پر ہے۔ اسے فتح کر کے یورپ میں آیا جایا جا سکتا تھا۔ اسی لیے اس کی اتنی اہمیت اور اس کے جہاد کی اتنی فضیلت تھی جو حدیث شریف میں بیان کی گئی۔ اب یہ کتنے درّے ہو گئے؟ آٹھ۔ مضیق ہرمز، باب المندب، جبل الطارق یہ تینوں قدرتی ہو گئے اور بیچ میں مصنوعی نہر سوئز آگئی۔ آبنائے ملاکا بحرِ ہند میں، اور باسفورس اور دانیال ادھر ترکی اور یورپ کے بیچ میں۔ دو قدرتی درّے رد گئے۔ آپ نے ان کا نام بار بار سنا ہوگا۔ ہم آگے کے سبق کی بنیاد شروع سے رکھتے چلے آرہے ہیں۔ اب آگے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ایک درّہ ایسا ہے جو روس اور امریکا کو جدا کرتا ہے اور بحرِ شمال اور بحرالکاہل کو ملاتا ہے۔ اسکا نام ہے ''درّۂ بیرنگ''۔ اس کی خاص اہمیت نہیں ہے، بالکل ٹھنڈے اور ویران سمندر میں کس نے جانا ہے جو ہر وقت برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ درّۂ بیرنگ امریکا کی ریاست الاسکا کو روس سے جدا کرتا اور بحرِ قطب شمالی کو بحرالکاہل سے ملاتا ہے۔

ایک قدرتی درّہ انگلینڈ اور فرانس کے درمیان آجاتا ہے جو انگلینڈ اور فرانس کو جدا کرتا اور بحرِ شمال اور بحرِ اوقیانوس کو ملاتا ہے۔ پیچھے گذرا ہے کہ بڑے سمندروں کے چھوٹے، کم گہرے، ساحلی حصوں کا الگ سے نام رکھ دیا جاتا ہے، جیسے کہ بحرِ ہند کا جو حصہ جزیرۃ العرب کے ساتھ لگتا ہے، اسے ''بحیرۂ عرب'' کہتے ہیں۔ اس اصول کے تحت ''بحرِ شمال'' قطب شمالی کے سمندر کا ایک حصہ ہے اور ''انگلش چینل'' بحرِ اوقیانوس کا ایک حصہ ہے۔ اس درّے کا نام ''مضیق ڈوور'' ہے۔ ''ڈوور'' انگلستان کے ایک ساحل کا نام ہے۔ آج کے درّوں میں یہ مصنوعی درّہ ''سوئز'' بات سمجھانے کے لیے بیچ میں آگیا۔ ورنہ تین مصنوعی درّوں کو ہم آگے سے پڑھیں گے۔

آٹھ قدرتی درّے کیسے بنتے ہیں؟ مضیق ہرمز، باب المندب، جبل الطارق، یہ تینوں ایک راستے پر آتے ہیں۔ کس کو ملاتے ہیں، کس کو جدا کرتے ہیں؟ آپ کے ذہن نشین ہوگیا ہوگا۔ چوتھا قدرتی درّہ ''آبنائے ملاکا'' کا شمار ہوتا ہے۔ پانچواں اور چھٹا ''باسفورس'' اور ''دانیال'' ہیں۔ چھ ہوگئے۔ ساتواں، آٹھواں ''بیرنگ'' اور ''ڈوور'' ہے۔ یہ آٹھ قدرتی درّے ہیں۔ ان میں سے چار پہلے والے بہت اہم ترین ہیں: ہرمز، باب المندب، جبل الطارق اور آبنائے ملاکا۔ یہ چار بہت اہم ہیں۔ بقیہ چار کم اہم ہیں۔ مسلمانوں کے اعتبار سے یہ پہلے تین تو انتہائی زیادہ اہم ہیں۔ ان کے کنارے جو خشکی کا حصہ آتا ہے، وہ مسلمان ممالک میں واقع ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ''ہرمز'' ایران اور عمان کے درمیان، ''باب المندب'' یمن اور جبوتی کے درمیان ہے۔ ''جبرالٹر'' اسپین اور مراکش کے درمیان ہے۔ گویا ہر درّے کے کم از کم ایک کنارے پر تو اسلامی ممالک ہیں۔ لیکن یہ تمام راستے مسلم ممالک میں واقع ہونے کے باوجود مسلمانوں کی دولت کفار تک جانے کا ذریعہ ہیں۔ مسلمانوں کو اس میں سے سوائے تلچھٹ کے اور کچھ نہیں ملتا۔ نئی نسل کے لیے یہ ایک بڑا چیلنج ہے کہ وہ اس صورتحال کا کیا حل نکالتی ہے؟

تین مصنوعی درّے

آج کے سبق کا موضوع تین مصنوعی درّے یا نہریں ہیں: سوئز، پانامہ اور کیل۔ ان کے پڑھنے سے پہلے سمندروں کا سبق دہرالیں۔ دنیا کے پانچ بڑے اور متعدد چھوٹے سمندر ہیں۔ پانچ بڑوں میں سے دو سمندر تو قطب شمالی اور جنوبی پر ہیں اور تین بڑے سمندر اس ترتیب سے ہیں: بحرِ اوقیانوس، بحرالکاہل اور بحرِ ہند۔ یہ پانچ بحرِ اعظم ہوگئے۔ دنیا کے چار سمندر چار رنگوں کے نام پر ہیں: (1) بحرِ اسود (2) بحرِ احمر (3) بحرِ ابیض، اس کو ''بحرِ متوسط'' بھی کہتے ہیں۔ (4) بحرِ اصفر (زرد سمندر)۔ یہ بحرالکاہل کا وہ حصہ ہے جو بنو الاصفر کی سرزمین یعنی چین سے لگتا ہے۔ اس کو ''اصفر'' اس لیے کہتے ہیں کہ چین کا ایک بڑا دریائے زرد (النہر الاصفر) اس میں آکر گرتا ہے۔ یہ بہت مٹی بہا کر لاتا ہے اور جب سمندر میں گرتا ہے تو سارے پانی کو مٹیالا کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کو ''بحرِ زرد'' کہتے ہیں۔ یہ چار سمندر چار رنگوں کے نام پر ہوگئے۔

ان سمندروں میں خلیجیں بھی ہوتی ہیں۔ خلیج عرب کے کنارے سات عرب اور ایک فارسی ملک ہے۔ سات میں سے چار چھوٹے ملک یہ ہیں: کویت، بحرین، قطر، امارات۔ عراق، سعودی عرب اور عمان تین بڑے ممالک ہیں۔ ان سات ملکوں کو ''خلیجی ممالک'' کہتے ہیں۔ یہ ساتوں خلیج عرب کے کنارے واقع ہیں۔ چار تو یہ چھوٹے چھوٹے ممالک ہیں۔ تین بڑے ہیں۔ آٹھواں سامنے ایران ہے۔ ان سات ملکوں میں سمندر کے کنارے جو ریت ہے اس میں اوپر ریت

کا سمندر ہے اور نیچے تیل کا سمندر ہے۔ سعودی عرب کے اس ساحلی علاقے کا نام ''الاحساء'' ہے۔ ابھی آپ پڑھیں گے سعودی عرب میں تین بڑے صحرا ہیں۔ ان میں سے ایک اس ساحلی علاقے میں ہے جس کا نام ''صحراء الدھناء'' ہے۔ ''الدھناء دُھن'' سے ہے۔ شاید اس لیے کہ اس صحرا کی مٹی پرانے زمانے سے تیل کی طرح تھی۔ لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ نیچے تیل ہے، لیکن نام اس کا ''دھناء'' رکھا ہوا تھا۔ ''دُھن'' یعنی تیل جیسی ریت۔

ان سات خلیجی ممالک کو اللہ تعالیٰ نے اتنا دیا ہے کہ پورے عالمِ اسلام سے غربت، افلاس اور جہالت ختم کر سکتے ہیں۔ پورا مال نہیں، صرف واجبی مقدار واجبات مالیہ، زکوۃ اور خمس دے دیں تب بھی۔ اگر یہ صرف زکاۃ اور خمس نکالیں اور مسلمانوں پر خرچ کریں تو خدا کی قسم پورا عالم اسلام مادی اعتبار سے خوشحال ہو سکتا ہے۔

روحانیت تو اس خطے کو ویسے بھی خدا نے دی ہوئی ہے۔ پوری دنیا میں کسی کے پاس ایسے روحانی آثار قدیمہ نہیں ہیں جیسے مسلمانوں کے پاس ہیں۔ عیسائیوں کے ''ویٹی کن سٹی'' میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کبھی نہیں گئے، کبھی قدمِ مبارک بھی وہاں نہیں رکھا۔

یہودیوں کے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔ نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد ہے، نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا روضہ ہے۔ ہمارے پاس تو مادی دولت بھی ہے اور روحانی وراثت بھی۔ اللہ کے فضل سے دونوں موجود ہیں۔ اگر ان کی قدر کی جائے تو دنیا کا نقشہ بدلا جا سکتا ہے۔ معدنی دولت کو غریب مسلمانوں پر خرچ کیا جائے تو کسی غیر مسلم سے قرض مانگنے کی ضرورت نہ پڑے۔ روحانی دولت کو تبلیغ کے ذریعے دنیا پر لٹایا جائے تو ہدایت کے لیے سسکتی انسانیت کو قرار آجائے۔

خلافتِ عثمانیہ کے زمانے میں سعودی عرب کو ''اُرض الاسلام'' کہتے تھے۔ عثمانی خلفاء ارضِ اسلام میں کسی غیر مسلم کو داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ جدہ اور ینبوع دو بندرگاہیں ہیں۔ ''ینبوع'' مدینہ منورہ کی بندرگاہ ہے اور ''جدہ'' مکہ مکرمہ کی بندرگاہ ہے۔ ان کے ساتھ ''اُرض الاسلام'' ہے۔ عثمانی خلفاء کہتے تھے اپنا جہاز ادھر بحر متوسط پر کھڑا کرو! ہمارا جہاز مال اٹھا کر لائے گا اور لے جا کر ادھر ''عدن'' کے پاس چھوڑے گا اور ٹیکس لاؤ! ادھر تمہارا داخلہ بھی منع ہے۔

آج ہم مار کن چیزوں سے کھا رہے ہیں؟ دو چیزوں سے: مفاد پرستی اور بد دیانتی۔ اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینا اور خیانت و بد دیانتی میں مبتلا ہونا۔ ہماری سوچ اجتماعی نہیں اور ہماری نیت بلند اور صاف نہیں رہی۔ کوئی کمی تھی تو شراب اور سود نے پوری کردی۔ موسیقی، زنا کی آواز اور شراب زنا کا مشروب ہے۔ ''قُلْ فِیْهِمَا إِثْمٌ کَبِیْرٌ، وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ، وَإِثْمُهُمَا أَکْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا.'' ''[البقرۃ:219] زنا کرے گا تو (لایَزْنِیْ الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ) [سنن أبی داود، رقم الحدیث:13304] ایسا شخص اللہ کی نظر سے بھی گر جاتا ہے، اپنی نظر سے بھی گر جاتا ہے، بلند حوصلہ نہیں رہتا کہ مشکلات کا سامنا کرے۔ جیسے گندی نالی کا کیڑا ہوتا ہے۔ اسے گندگی کھانے میں مزا آتا ہے۔

بحر متوسط، بحر اوقیانوس کی ایک شاخ ہے۔ بحر اوقیانوس دنیا کا بڑا سمندر ہے۔ یہ تین ہزار میل چوڑا ہے۔ اس کو ''بحر ظلمات'' کہتے تھے۔ عقبہ بن نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے کنارے کھڑے ہو کر کہا تھا: "یارَبِّ! لَو لا هذا الْبَحْرُ لَمَضَیْتُ فِي الْبِلَادِ مُجَاهِداً فِي سَبِیْلِكَ." [بحوالہ جہانِ دیدہ:108]

سمندروں کا سبق دہرا لینے کے بعد تین مصنوعی درّوں کی طرف آتے ہیں۔ ان میں سے ''نہر سویز'' کو آپ نے پڑھ لیا۔ دوسری ''نہر پانامہ'' ہے۔ یہ بھی کافی مشہور ہے۔ یہ جنوبی امریکا میں بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کے درمیان ایک مصنوعی درّہ ہے۔ ہوتا یوں تھا کہ کسی جہاز نے اوقیانوس سے بحر الکاہل میں جانا ہے یا امریکا کے مشرقی ساحل سے مغربی ساحل تک جانا ہے تو اس کو ہزار میل سے زیادہ سفر کر کے ادھر جنوبی امریکا کے آخری کنارے سے گھوم کر جانا پڑتا تھا۔ انہوں نے ایسا کیا کہ وسطی امریکا کے ملک ''پاناما'' سے کھودنا شروع کیا اور اِدھر دوسری طرف تک پہنچا دیا۔ ایک بندرگاہ اِدھر بنائی، ایک بندرگاہ اُدھر بنائی۔ اس کے درمیان سے ایک نہر کھودی اور ایک پہلی قدرتی جھیل میں ڈالی پھر نہر کھودی اور دوسری مصنوعی جھیل میں ڈالی، پھر اس سے نکال کر سمندر میں ڈالی۔ بحری راستہ بن

گیا۔ مشکل یہ پڑی کہ سطح سمندر برابر نہیں تھی تو دریاؤں میں پھاٹک اور حوض بنا لیے۔ ان میں سمندر کا پانی ڈال کر بھرتے رہتے ہیں۔ نہر سوئز میں سطح سمندر قدرتی طور پر برابر تھی۔ یہاں ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں کو خدا نے دی تھیں کئی نہریں کی، لیکن ہم نے سنبھالا نہیں۔

تیسری مصنوعی جھیل جرمنی میں ہے۔ اس کا نام ''نہر کیل'' ہے۔ بالٹک ریاستوں کے کنارے ''بحیرۂ بالٹک'' ہے اور ساتھ ''بحر شمال'' ہے۔ اگر بالٹک ریاستوں یا روس سے کوئی یورپ آنا چاہے تو اس کو لمبا گھوم کر آنا پڑتا تھا۔ لہٰذا خشکی میں سے کھود کر ایک نہر نکالی گئی۔ اسے ''نہر کیل'' کہتے ہیں۔ یہ اتنی اہم نہیں ہے اور نہ ہی سمندر اتنا خاص اہم ہے۔ البتہ بالٹک ریاستوں، سکینڈے نیوین اور روس کے لیے اہم ہے کہ ان کو یورپ تک آسان اور مختصر راستہ مل جاتا ہے۔ یہ تین مصنوعی نہریں ہو گئیں۔

طبعی جغرافیہ:3

خلیج اور راس؛ جھیل اور جزیرے

خلیج اور ''راس'' ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ خشکی جب سمندر کو نوک کی شکل میں کاٹتی چلی جائے تو وہ ''راس'' ہے اور جب پانی خشکی کو کاٹ کر چونچ کی شکل میں دور تک جائے تو اس کو ''خلیج'' کہتے ہیں۔ ''خلیج'' کے تین طرف خشکی ہوتی ہے اور ''راس'' کے تین طرف پانی ہوتا ہے۔ خلیجوں کا رُخ شمال کی جانب ہوتا ہے کیونکہ خشکی شمال کی جانب زیادہ ہے اور ''راسوں'' کا رُخ جنوب کی طرف ہے کہ زمین کے جنوب میں پانی ہی پانی ہے۔

اسی طرح جھیل اور جزیرہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ جھیل کی تعریف ہے: ''خشکی میں گھرا ہوا پانی۔'' جزیرے کا مطلب ہے: ''پانی میں گھری ہوئی خشکی'' پانی جب چاروں طرف سے خشکی میں گھرا ہوا ہو تو اس کو ''جھیل'' کہتے ہیں۔ خشکی جب پانی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو تو اس کو ''جزیرہ'' کہتے ہیں۔

جھیلوں کی کئی اقسام ہیں۔ ایک تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ جھیلیں دریا کی ابتدا ہوتی ہیں یا انتہا، یعنی یا تو یہ دریا کا منبع ہوتی ہیں، جیسے دریائے نیل کا منبع جھیل ''وکٹوریہ'' ہے؛ یا دریاؤں کا منتہیٰ ہوتی ہیں جیسے جیحون اور سیحون دونوں جا کر بحیرۂ ارال میں گر جاتے ہیں جو ایک کھاری جھیل ہے۔ گویا جھیل سے دریا کی ابتدا ہوتی ہے یا دریا کا اس پر اختتام ہوتا ہے۔ یہ میٹھی بھی ہوتی ہیں، کھاری بھی۔ پہاڑ میں بھی ہوتی ہیں اور میدان میں بھی۔

پاکستان کے دریاؤں کا منبع ہم ہندوؤں کے پاس چھوڑ کر آگئے ہیں کہ ہمارے لیے سندھ کافی ہے جس کے اندر پانچ دریا آ کر گرتے ہیں۔ اگرچہ یہ پانچوں دریا بھارت سے نکلتے ہیں۔ ہم نے بھارت سے کہا: تم ان کا منبع اپنے پاس رکھو! کوئی بات نہیں۔ اگر آپ نے کبھی ان کو بند کر دیا تو ہم سوکھے گزارا کر لیں گے۔ یہاں پہنچ کر طبعی جغرافیہ مکمل ہو جاتا ہے اور ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ قرآنی جغرافیہ کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھ سکیں۔ اس لیے آئیے! اس اہم موضوع کا آغاز کرتے ہیں۔

قرآنی جغرافیہ

آج ہم اللہ کے فضل سے جغرافیۂ قرآنی کا درس شروع کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے دورے کا اہم ترین اور مقصودی حصہ ہے۔ آپ جان چکے ہیں کہ علم جغرافیہ ''علم أحوال الأرض'' کا نام ہے۔ یعنی سطح الأرض پر اللہ تعالی کے بنائے ہوئے قدرتی نقوش اور انسان کے بنائے مصنوعی نقوش کا مطالعہ۔ زمین کی پشت پر کیا کچھ پایا جاتا ہے؟ اگر پانی ہے تو کتنی قسم کا ہے؟ اگر خشکی ہے تو کتنی قسم کی ہے؟ جب علم جغرافیہ کا یہ معنی ہے تو قرآنی جغرافیہ کا معنی ہوگا: ''قرآن کریم میں جس مقام کا ذکر آیا ہے، وہ زمین پر کہاں ہے؟ وہ مقام آج کی سیاسی تقسیم کے لحاظ سے کہاں واقع تھا؟ اس کا مطالعہ کرنا'' اس سے فائدہ وہی ہوگا جو قرآن کریم کے سمجھنے سے ہوتا ہے۔ یعنی عبرت اور نصیحت حاصل کرنا۔

قرآن کریم کی خدمت مختلف علوم وفنون کے ذریعے کی گئی ہے۔ جغرافیہ بھی قرآن کریم کا ایک خادم علم ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات کا صحیح فہم علی وجہ البصیرت اس وقت ہوتا ہے جب ان آیات میں مذکور واقعات کا محل وقوع ذہن میں ہو۔ ہمارے اکابر میں تاریخ دانی اور جغرافیہ فہمی عام تھے۔ اسی لیے جب وہ قرآن کریم کی ان آیات سے گزرتے جن میں مثلاً طوفانِ نوح اور کوہِ جودی کا ذکر ہے تو وہ اس طوفان کی ہیبت ناکی کو فوراً سمجھ کر رقت طاری ہوتی اور استغفار ورجوع الی اللہ کرتے۔ عاد وثمود کا اکٹھے ذکر ہو یا شام ویمن کی شکل میں سرزمین عرب کے دو کناروں کا تذکرہ، وہ فوراً اس میں مضمر فوائد کو سمجھ لیتے اور اس سے مطلوبہ اثر لیتے تھے۔ آج ہم اس فن کو نہ جاننے کے سبب ایک طرف تو ان آیات میں پوشیدہ معانی کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے۔ دوسرے مقصودِ قرآن یعنی تذکر وتذکیر کو کما حقہ حاصل نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم ہدایت والی کتاب ہے۔ اس میں قصص کا ذکر ہدایت کی دعوت کے لیے ہے۔ اِن قصص کو سمجھنے کے بعد عبرت اور نصیحت حاصل کرنا، یہ قرآنی جغرافیہ کا فائدہ ہے۔ یہ علم قرآن کریم کے فہم میں معاون ومددگار ہے اور مقصدِ قرآن کریم یعنی ''تذکیر وتذکر'' میں معاون ہے۔ مفسرین نے قرآن کے مضامین کی تقسیم کی ہے کہ قرآن کریم کے مضامین میں عقائد واحکام اور وعد وعید کے بعد بڑا حصہ قصص وامثال کی شکل میں ہے۔ یہ قصص مختلف قسم کے ہیں۔ مشہور اقوام کے بھی ہیں اور کچھ غیر معروف اقوام کے بھی ہیں۔ ان کا کما حقہ، علی وجہ البصیرت سمجھنا قرآنی جغرافیہ جاننے پر موقوف ہے۔ ہم نے لفظ بڑھایا ہے ''علی وجہ البصیرت'' یا ''کما حقہ'' یہ اس لیے کہ قرآن کریم ہر پڑھنے والے کے لیے آسان ہے، لیکن زیادہ گہرائی کے ساتھ، زیادہ بصیرت کے ساتھ بعض مقامات کا سمجھنا جس طرح کچھ دوسرے فنون پر موقوف ہے۔ اسی طرح کچھ مقامات کا گہرا فہم اس فن کی بعض چیزیں سمجھنے پر موقوف ہے۔

اس کی مثال دیکھیے! قرآن جب غزوۂ بدر کا نقشہ کھینچتا ہے: "إِذْ أَنْتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ." [الأنفال:42] یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ دو جملوں میں دنیا کی عظیم جنگ کا نقشہ کھینچ دیا۔ ''العدوة الدنیا'' اور ''العدوة القصوی'' کو قرآنی جغرافیہ کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہاں بدر کے میدان میں جا کر مشاہدہ کرے تو الگ بات ہے۔

دوسری مثال "رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ." [القریش:2] کی حقیقت کو بغیر قرآنی جغرافیہ کے نہیں سمجھ سکتے کہ قریش کے ان دو سفروں پر ان کی ساری

معیشت کا انحصار کیسے تھا؟ تو علمائے تفسیر اس علم کے نکات کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ اسی طرح عرب شاعر اپنے اشعار میں "تہامہ" کی راتوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کو بغیر جغرافیہ کے نہیں سمجھا جاسکتا کہ "تہامہ" کی ساحلی اور ٹھنڈی رات اتنی حسین اور شاعر کے لیے اتنی پرکشش کیوں ہوتی ہے؟ الغرض قرآن وحدیث اور عربی ادب میں مذکور مقامات سے متعلق خاص نکات کی حقیقت کو علم جغرافیہ کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسی طرح کچھ غلط فہمیاں ایسی ہیں جو اس فن کی بعض ابحاث سمجھے بغیر دور نہیں ہوسکتیں۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر نزول کا مقام کوہِ ہمالیہ یا سری لنکا کا ایک پہاڑ بتایا جاتا ہے جبکہ یہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ان کا نزول تو صفا پہاڑ پر ہوا تھا۔ اس پہاڑ کا نام ہی حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام سے نسبت کی بنا پر پڑا۔

جغرافیہ قرآنی کے مطالعہ کے وقت چار موضوعات ہمارے سامنے آتے ہیں: (۱) شخصیات (۲) اقوام (۳) گروہ (۴) متفرق واقعات یا مقامات۔ قرآن کریم میں جن مقامات کا ذکر ہے، ان میں سے کچھ کا تعلق کچھ شخصیات سے ہے اور کچھ کا اقوام یا جماعتوں سے۔

اسی طرح قرآن میں آٹھ گروہ ایسے ہیں جن کا "اَصحاب" کی اضافت کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ جیسے اصحاب الفیل، اصحاب الجنۃ، اصحاب القریۃ، اصحاب الاخدود وغیرہ۔ اس کے علاوہ دو قومیں ایسی ہیں جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے، لیکن ان کی طرف بھیجے گئے انبیاء کا ذکر نہیں۔ قوم سے یہاں انبیائے کرام کی مشہور اقوام مراد نہیں۔ ان کا تذکرہ انبیائے کرام کے تذکرے کے ضمن میں آ گیا ہے۔ یہاں قوم سے مراد وہ قومیں ہیں جن کی طرف بھیجے جانے والے انبیائے کرام کا ذکر قرآن شریف نے نہیں کیا۔ بس قوم سبا اور قوم تبع کے عنوان سے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ان دونوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے احوال کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے، لیکن ان کی طرف مبعوث کیے جانے والے انبیاء کا تذکرہ نہیں ہے۔ چوتھی چیز متفرق قرآنی مقامات ہیں۔ جیسے: مجمع البحرین، بین السدین، مطلع الشمس، مغرب الشمس وغیرہ۔ اس طرح آپ جغرافیۂ قرآنی کو چار ابواب میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

اب یہ چار عنوانات ہوگئے۔ شخصیات، اقوام، گروہ اور متفرق۔ پھر شخصیات میں انبیاء بھی ہیں اور غیر انبیاء بھی۔ پھر قرآن میں مذکور شخصیات انبیاء بھی ہیں اور غیر انبیاء بھی۔ وہ انبیاء جن کا نام قرآن مجید میں ذکر آیا ہے وہ 25 ہیں اور جن کا ذکر تو آیا ہے لیکن نام نہیں آیا وہ تین ہیں: حضرت حزقیل علیہ السلام: "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ." [البقرۃ:243] حضرت سموئیل علیہ السلام: "اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ." [البقرۃ:246] حضرت عزیر علیہ السلام "اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ." [البقرۃ:259] اس کے علاوہ آیت کریمہ: "وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ." [الکہف:60] میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر ہے، لیکن وہ اس وقت نبی نہ بنے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انتقال کے بعد انہیں نبوت کا منصب عطا کیا گیا۔ غیر انبیاء جیسے: حضرت مریم، ذوالقرنین، ہابیل، قابیل، یاجوج وماجوج۔ سیرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں آجاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اسم گرامی قرآن کریم میں پانچ جگہ آیا ہے۔ چار جگہ "محمد" اور ایک جگہ "احمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کی اہمیت کی وجہ سے اس کو الگ باب میں ذکر کیا جاتا ہے۔

چار بڑے باب:

آپ نے سمجھ لیا قرآنی جغرافیہ کے چار بڑے باب ہیں: (1) شخصیات (2) اقوام (3) گروہ (4) متفرق مقامات۔ ہم ان کے مطالعہ کا آغاز کرتے ہیں۔ پہلے ایک اشکال کا جواب سمجھ لیجیے۔

اشکال یہ ہے کہ قرآن عالمگیر کتاب ہے۔ یہ مشرق سے مغرب تک ساری دنیا کے لوگوں کے لیے ہدایت ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں صرف اُن اقوام کا ذکر ہے جو جزیرۃ العرب میں رہتی تھیں تو پھر یہ عالمگیر کتاب کیسے ہوئی؟ باقی جو تہذیبیں ہیں جیسے یورپ والے، چین والے، ہندوستان والے، یہ بھی ترقی یافتہ تہذیبیں تھیں۔ تو ان بڑی بڑی تہذیبوں کی طرف ضرور کوئی نبی مبعوث کیا گیا ہوگا، لیکن آخری اور جامع کتاب قرآن کریم میں ان قوموں کے وطن اور ان کی

طرف بھیجے جانے والے انبیائے کرام کا ذکر نہیں ہے، صرف سرزمینِ عرب کا ذکر اور صرف اُن خاص انبیاء کا ذکر کیوں ہے؟ اسی طرح آسمانی کتابیں جن سابقہ اقوام کی طرف بھیجی گئیں یعنی بنی اسرائیل ان میں سے یہود کا ذکر زیادہ ہے۔ نصاریٰ کا تذکرہ نسبتاً کم ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور قیامت کی صبح تک ہر زمان و مکان والوں کے لیے ہدایت ہے۔ جہاں تک ان چند اقوام کی تخصیص کی وجہ ہے تو ان قوموں میں پانچ اصولی خرابیاں ایسی تھیں کہ پوری دنیا کے لوگوں میں ان خرابیوں میں سے ایک نہ ایک پائی جاتی رہی ہے۔ پانچ بنیادی روحانی بیماریاں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی نبی کی قوم میں پائی جاتی تھیں۔ قرآن کریم میں جن پانچ انبیاء کا بار بار ذکر آتا ہے، اِن کی قوموں میں ان پانچوں میں سے کوئی ایک بیماری پائی جاتی تھی، تو ان کے بار بار تذکرے سے مقصود یہ ہے کہ پوری دنیا والے ان اقوام سے عبرت حاصل کریں۔ اسی طرح بنی اسرائیل میں چالیس فروعی روحانی بیماریاں تھیں تو ان کا تذکرہ اس حوالے سے بار بار ہے۔ پھر چونکہ یہ بیماریاں نصاریٰ کی بہ نسبت یہودیوں میں زیادہ پائی جاتی تھیں، اس لیے اِن کا ذکر نصاریٰ کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ ان اہم اقوام کا ذکر کر کے بقیہ کو انہی پر قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام اقوام کے قصص ذکر نہیں کیے گئے کہ وہ انہی جیسی تھیں۔ لہٰذا سب کا ذکر غیر ضروری ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ جن غیر انبیاء کا ذکر ہے جیسے ذوالقرنین، حضرت مریم علیہا السلام یا مختلف گروہوں کا ذکر ہے جیسے اصحاب السبت، اصحاب الکہف وغیرہ، اسی طرح جن اقوام کا ذکر ہے، ان میں سے اکثر کا تعلق اگرچہ سرزمینِ عرب سے ہے، لیکن ان میں جو بات پائی جاتی تھی وہ دنیا کے تمام لوگوں میں مشترک ہے۔ تمام زمانوں کے لوگوں کی نفسیات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ان کو ایک جیسی نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم نے وہ نصیحت ان چند مشہور اقوام کے ضمن میں پورے عالم کو کر دی ہے۔

پانچ بڑی روحانی بیماریاں:

پانچ مشہور بیماریاں جن میں سے تقریباً ایک نہ ایک، کسی نہ کسی قوم میں پائی جاتی ہے، یہ ہیں: (1) شرک و کفر: یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں نمایاں تھی۔ (2) طاقت پر گھمنڈ: یہ قومِ عاد میں تھی۔ (3) خداداد اور قدرتی صلاحیتوں کا غلط استعمال: انسان میں فطری طور پر کچھ صلاحیتیں ہوتی ہیں، ان کو اللہ کی مرضی کے خلاف استعمال کرنا قومِ صالح کی پیروی کرنا ہے۔ قومِ ثمود میں علم و فن، سائنس و ٹیکنالوجی، ذہن صلاحیت وافر تھی اور قومِ عاد میں جسمانی طاقت بے پناہ تھی۔ (4) مال کی محبت: انسان میں جب ''حبِ مال'' کی بیماری ہوتی ہے تو اس کو یہ فکر ہوتی ہے بس میں کسی طریقے سے مال حاصل کرلوں یا دوسروں سے زیادہ حاصل کرلوں۔ ذریعہ جائز ہے یا ناجائز، اس کی اسے فکر نہیں ہوتی۔ (5) جنسی بے راہ روی اور عریانی و فحاشی: جسمانی تقاضے پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو حلال ذرائع مقرر کیے ہیں، ان سے تجاوز کر کے حرام ذریعوں سے جسم کی پیاس بجھانا۔

ان پانچوں بیماریوں کی وجہ سے سابقہ امتوں کے نام و نشان کو مٹا دیا جاتا تھا، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر حضور کی دعا کے صدقے اجتماعی اور استیصالی عذاب نہیں آتا۔ وقتی یا علاقائی سزا البتہ آتی ہے۔

چالیس چھوٹی بیماریاں:

فروعی بیماریوں کی طرف آیئے! قومِ بنی اسرائیل میں چالیس کے قریب فروعی گناہ پائے جاتے تھے۔ ان گناہوں کی ذیلی شاخوں کو بھی لیا جائے تو شرک کے قریب ہو جاتی ہیں۔ انہی بیماریوں اور گناہوں کے علاج کے لیے اور انہیں چھڑوانے کے لیے بنی اسرائیل کے انبیائے کرام محنت فرماتے تھے اور اسی کے لیے صوفیائے کرام تزکیہ اور سلوک و احسان کی محنت کرواتے ہیں۔ بنی اسرائیل کو ان بیماریوں نے اللہ کی نظر سے گرا دیا۔ قرآن کریم میں وہ بیماریاں اس غرض سے بار

مختلف انداز سے بیان کی گئیں کہ امت محمد یہ ان سے بچے اور ان میں مبتلا ہو کر اللہ رب العزت کے بخشے ہوئے ''مقام اجتبائیت'' سے محروم نہ ہو۔
الغرض قرآن پاک نے پانچ انبیاء کا ذکر اصولی بیماریوں کی وجہ سے کیا اور پھر بنی اسرائیل کا ذکر اس وجہ سے زیادہ کیا ہے کہ ان کے حالات و کردار کے آئینے میں قیامت تک آنے والے انسان اپنا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

آگے چلنے سے پہلے ایک اصول اور ایک گُر کی بات سمجھ لیں۔ اصول یہ کہ قرآن کریم میں انبیاء کا ذکر دو طرح سے آیا ہے: ایک ہے ''قصص الانبیاء'' یعنی جو حالات و واقعات انبیاء پر گزرے۔ مختلف واقعات و احوال۔ دوسرا ہے ''اُنباء الرسل'' یعنی انبیاء کی اقوام کی اُن کے ساتھ کشمکش۔ نافرمان لوگوں کی ہٹ دھرمیاں اور گستاخیاں۔

قرآن پاک میں کل 25 انبیائے کرام کا ذکر ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یاد کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ 25 میں سے 18 نام تو سورۂ انعام کی چار آیتوں میں اکٹھے ہیں۔ پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ "وَتِلْكَ حُجَّتُنَا." [الأنعام: 86-83] والے رکوع کی چار آیات میں 18 انبیاء کا ایک جگہ ذکر ہے۔ باقی سات رہ گئے۔ دو تو اول الأنبیاء اور آخر الأنبیاء ہیں۔ باقی پانچ رہ گئے۔ ان میں سے تین مشہور انبیاء کا ذکر اکثر اکٹھے آیا ہے۔ حضرت صالح، حضرت ھود اور حضرت شعیب علیہم الصلاۃ والسلام۔ اب کم تذکرے والے دو رہ گئے: حضرت ادریس اور حضرت ذو الکفل علیہم السلام۔ تو اس طرح 25 انبیاء کے نام مکمل ہو گئے۔

پانچ بڑے انبیائے کرام علیہم السلام

اب ہم مشہور انبیائے کرام کا مختصر تذکرہ شروع کرتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ان مقدس ہستیوں کے مکمل اور جامع تذکرے کے بجائے ہم ان کی سیرت میں سے صرف جغرافیائی نکات کو موضوع بنائیں گے کہ اس مختصر دورے میں اس پر اکتفا کیے بغیر چارہ نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام کا نزول کہاں ہوا؟ بعض نے کہا ''کوہ ہمالیہ'' کی ''ماؤنٹ ایورسٹ'' نامی چوٹی پر ہوا، بعض نے کہا ''سری لنکا'' کے پہاڑ پر ہوا۔ یہ دونوں اقوال ان دونوں جگہوں کی ایک طبعی جغرافیائی خصوصیت کے پیشِ نظر کہے گئے۔ ورنہ ان دونوں جگہوں کی شریعت میں کوئی روحانی حیثیت نہیں ہے کہ ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کے نزول کے لیے اللہ تعالیٰ ان کا انتخاب فرماتا ہے۔ ہمالیہ کا ذکر اس لیے لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا کہ وہ زمین کا بلند ترین مقام ہے۔ لوگوں نے سوچا کہ آسمانوں سے اترنے کے لیے بلند ترین جگہ کا انتخاب کیا گیا ہوگا۔ یہ نہیں سوچا کہ جو قادرِ مطلق انہیں سات آسمانوں پر سے بخیریت زمین تک لاسکتا ہے، وہ زمین پر اتارنے کے لیے اونچی چوٹی کا محتاج نہیں۔ سری لنکا، ایشیا کے جنوبی کنارے کے آگے سمندر میں جزیرہ ہے، کچھ لوگوں نے اس کو نزولِ آدم کے حوالے سے مشہور کردیا۔ حالانکہ اس کی بھی انسانی تاریخ میں خاص سیاسی، جغرافیائی یا مذہبی حیثیت نہیں ہے۔ شاید یہ جزیرۃ العرب اور حرمین کی اہمیت کم کرنے کیلئے ہوا، کیونکہ جب ساری انسانیت دیکھے گی کہ پہلے انسان کی زمین پر نزول کی جگہ یعنی صفا پہاڑ مسلمانوں کے مقدس مقامات میں سے ہے تو وہ اسے اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل سمجھ کر اسلام سے قریب آئے گی۔ کوئی بعید نہیں کہ اس لیے اِدھر اُدھر کی مناسبتیں ڈھونڈ کر دوسری جگہوں کو مشہور کردیا گیا۔

راجح قول یہ ہے کہ حضرت آدم وحوا کا نزول مکہ کی دو پہاڑیوں پر ہوا: صفا اور مروۃ۔ علامہ شامی نے کتاب الحج میں لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا نزول صفا پر اور حوا علیہا السلام کا مروہ پر ہونے کی وجہ ہی سے حضرت آدم کو ''صفی اللہ'' اور حضرت حوا کے نزول والی پہاڑی کو ''مروہ'' کہتے ہیں کہ عربی میں عورت کو ''امرأۃ'' کہا جاتا ہے۔ اور ''مزدلفہ'' کا نام مزدلفہ اسی لیے ہے کہ یہ ''ازدلاف'' سے ہے بمعنی ''قربت'' کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا یہاں ایک دوسرے سے قریب ہوئے تھے اور ''عرفات'' کا نام عرفات اسی لیے ہے کہ اس کا معنی ہے: ''پہچاننا''، کیونکہ حضرت آدم اور حوا دونوں نے جنت سے نکلنے اور زمین پر اترنے کے بعد یہاں پہنچ کر ایک دوسرے کو پہچانا تھا۔ یہاں دونوں کی پہلی زمینی ملاقات ہوئی تھی۔

پانچ بڑی اقوام

حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرے کے بعد اب پانچ بڑے انبیائے کرام کے قصص کو شروع کرتے ہیں۔

1-حضرت نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام بہت جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ کو ''آدمِ ثانی'' کہا جاتا ہے۔ ان کی قوم کی مسلسل نافرمانی کے سبب پوری دنیا پر طوفان آیا تھا اور اکثر نسلِ انسانی ختم ہوگئی تھی۔ آگے کی نسل آپ کے تین بیٹوں سام، حام، یافث کے ذریعے چلی ہے۔ قوم کی طرف سے آپ کے ساتھ پیش آنے والی کشمکش کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ قرآنِ کریم نے جابجا اس کا مختلف انداز میں تذکرہ کرنے کے بعد ''سورتِ نوح'' میں مستقل اور تفصیلی تذکرہ بھی کیا ہے۔

قوم نوح علیہ السلام زمین پر کہاں رہتی تھی اور طوفان نوح پوری دنیا پر آیا تھا یا صرف اس قوم کے مسکن پر؟ یہ دو اہم سوال ہیں۔ ترکی کے ساتھ قفقاز کی ریاستیں ہیں: جارجیا، آرمینیا، آذربائیجان۔ آرمینیا، ترکی اور ایران کی سرحد پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے۔ اس میں ایک پہاڑ ہے جس کو عربی میں ''جودی'' اور اردو میں ''ارارط'' (یاارارات) کہتے ہیں۔ جودی پہاڑ کی چوٹی آرمینیا اور ترکی کی سرحد کے قریب ہے۔ سمندر اس جگہ سے دور عراق میں بصرہ کے قریب ہے۔ کئی کلو میٹر کا فاصلہ بنتا ہے۔ جودی پہاڑ کی بلندی 1800 میٹر ہے۔ تصور فرمائیں کہ پانی جب سمندر سے اتنا دور اور سطح سمندر سے اتنا بلند ہو تو وہ کس قدر ہولناک طوفان ہوگا؟ جن لوگوں کو اللہ نے نجات دی ان کی کشتی جودی پر آگئی۔ باقی تباہ و برباد ہوگئے۔ یہ واقعہ سنا کر آپ لوگوں کو شرک و کفر کے انجام سے ڈرائیں اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی طرف متوجہ کریں۔ موت و آخرت کی یاددہانی کروا کر توبہ کی ترغیب دیں۔

2,3-عاد و ثمود:

ہم نے پہلے پڑھا تھا کہ دنیا میں پانچ بڑی قومیں گزری ہیں۔ یہ پانچ بڑے خطرناک امراض میں مبتلا تھیں۔ اللہ تعالی نے ان کو سزا دی۔ اب دیکھنے اور عبرت لینے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بیماری ہم میں، ہمارے معاشرے میں، ہمارے متعلقین اور قوم میں تو نہیں پائی جاتی۔ ایک بڑی بیماری یہ ہوتی ہے کہ انسان کو اللہ نے طاقت دی ہوئی ہے تو طاقت کا زعم آجاتا ہے، جیسے قومِ عاد ہے۔ ایک بیماری یہ ہوتی ہے کہ اس کو علم، ہنر، فن دیا ہوتا ہے وہ ''ہمچو ماے من دیگرے نیست'' کے زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ قوم ثمود ہے۔

عاد و ثمود مکہ مکرمہ کے دو مخالف سمت میں تھے۔ جیسے شام اور یمن دو مخالف سمت میں واقع ہیں۔ شام اوپر یعنی شمال میں اور یمن نیچے یعنی جنوب میں۔ اسی طرح اوپر کی جانب قومِ ثمود اور نیچے کی جانب قومِ عاد تھی۔ قومِ ثمود کا علاقہ سارا پتھر ہی پتھر ہے اور قومِ عاد کا مسکن ریت ہی ریت ہے۔ بڑے بڑے ریتیلے ٹیلے اور تودے ہیں۔ ہر طرف ریت ہی ریت ہے۔ ''وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ، إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ.'' [الأحقاف:21] احقاف کا معنی ہے: ''ریت کے ٹیلے''۔ یہ قوم اپنے گناہ کی پاداش میں ریت کے ٹیلوں کے نیچے ایسی دبی کہ اس کا آج نام و نشان نہیں۔ اللہ تعالی نے ریگستان میں اس قوم کو کیسی جگہ دی تھی؟ کیسے انعامات

سے نوازا تھا؟ اللہ پاک خود فرمارہے ہیں: "الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ." [الفجر:8] تو اب وہ شہر جسے "ہزار ستونوں والا شہر" کہتے تھے، جسے "شہرِ بے مثال" کہا جاتا تھا، ریت کے ٹیلوں کے نیچے دبا ہوا ہے، ورنہ دنیا دیکھتی کہ اُس قوم نے کیا کچھ بنایا ہوا تھا۔ عذاب کے آثار میں اتنا نیچے دبا ہوا ہے کہ اگر اس ریت میں کوئی چیز ڈالیں مثلاً لٹو اور اس کے ساتھ ڈوری باندھ کر ہاتھ میں تھامے رکھیں تو وہ ریت آہستہ آہستہ اس کو بھی اندر کھینچ لیتی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اس شہر کو کھود کر برآمد کرنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یمن کے ساتھ ایک بڑا ریتیلا صحرا ہے جس کا نام ہے "الربع الخالی"۔ اس کے مغربی کنارے پر یہ قوم عاد رہتی تھی۔ اس نے کیا کچھ بنایا تھا؟ یہ آج کے انسانوں کو پتا نہیں چل سکتا، کیوں کہ اللہ تعالی نے وہ سارے کا سارا ہزاروں لاکھوں ٹن ریت کے نیچے چھپا دیا ہے۔ پیچھے ہیبت اور عبرت باقی رہ گئی ہے۔

4-قومِ شعیب:

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کہاں رہتی تھی؟ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ "بحرِ احمر" شمال میں جا کر خرگوش کے کان کی طرح دو خلیجوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دائیں والی خلیج کا نام عقبہ ہے۔ اس عقبہ کے دائیں طرف مشرق میں ایک جگہ کا نام "مدین" ہے۔ یہیں قومِ شعیب رہتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر میں تھے تو ایک خیر خواہ نے آکر مشورہ دیا "وَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ يَسْعَى ،قَالَ يَامُوسَى إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ." [القصص:20] یہ آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔ "فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ." [القصص:20] تو آپ "رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ." [القصص:21] پڑھ کر مصر سے نکلے اور صحرائے سینا پار کر کے فلسطین نہیں گئے کہ فرعونی انتظامیہ اپنے آدمی پکڑنے کے لیے بھیج دے گی۔ آپ فلسطین چھوڑ کر نیچے آگئے جہاں مدین واقع ہے، خلیجِ عقبہ کی دائیں طرف۔ وہاں آپ کی ملاقات حضرت شعیب علیہ السلام سے ہوئی۔ یہ قوم فتنۂ مال میں مبتلا تھی۔ مال کی حرص نے اس سے حرام وحلال کی تمیز بھلا ڈالی تھی۔ نہ کماتے وقت جائز ناجائز کا فرق کرتے تھے، نہ کمانے کے بعد اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا کرتے تھے۔

5-قومِ لوط:

یہ قوم کہاں رہتی تھی؟ اردن اور فلسطین کی سرحد پر بحرِ میت کے کنارے آباد تھی۔ "بحرمیت" کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام "جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا." [ھود:28] کی تعبیر کے مطابق بحرمیت والے حصے کو اُٹھا کر اوپر لے گئے اور نیچے گڑھا باقی رہ گیا، ایسا نہیں ہے۔ یہ بحرمیت کی جگہ پر نہیں، اس کے کنارے رہتی تھی۔ اس کی بستیوں کا نام تھا: "سدوم" اور "عمورہ"۔ آج کل یہ جگہ اُردن میں پڑتی ہے۔ یہ قوم اخلاقی بے راہ روی کا شکار تھی اور فتنۂ جنس میں مبتلا تھی۔ سمجھانے اور سمجھاتے رہنے کے باوجود اس میں اتنا آگے چلی گئی کہ بالآخر اس کی تباہی کا فیصلہ آسمانوں سے آگیا۔

یہ پانچ بڑی قوموں کا مسکن ہو گیا۔ اوپر قوم ثمود ہے۔ پتھروں میں رہتی تھی۔ نیچے عاد ہے۔ ریگستان میں رہتے تھے۔ خدا جانے کیا چیز تھے کہ ساٹھ ساٹھ ہاتھ کے اُن کے قد تھے۔ قومِ لوط اردن کی سرحد پر سطحِ سمندر سے 420 میٹر نیچے "بحرِ میت" کے پاس رہتی تھی۔ 420 کے عدد پر آپ چونک گئے ہوں گے۔ یہ روئے زمین پر سب سے زیادہ نچلی جگہ ہے اور یہاں سب سے زیادہ کھارا پانی ہے۔ یہ جزیرۃ العرب میں چار بڑی قومیں تھیں۔ پانچویں قوم (یعنی قومِ نوح) ذرا اوپر وادیٔ دجلہ وفرات کے خطے میں تھی۔

میں نے شروع میں عرض کیا کہ قرآن کریم میں مذکور پچیس انبیائے کرام کا تعلق جزیرۃ العرب اور گرد و پیش سے ہے۔ گرد و پیش سے کیا مراد ہے؟ ایک جزیرۃ العرب کے اوپر کے دو علاقے عراق اور شام اور دوسرے بائیں طرف مصر۔ تو بس یہ تین علاقے ہیں: عراق، شام اور مصر۔ قرآنی انبیاء کا تعلق اسی خطے سے ہے۔ ان میں سے چار بڑی قوموں کا تعلق جزیرۃ العرب سے اور پانچویں کا ذرا اوپر وادیٔ دجلہ وفرات سے ہے۔ جودی پہاڑ یعنی "کوہِ ارارات" جو ترکی

اور ایران کی سرحد پر ہے۔اس کے قریب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی۔ان پانچ اقوام کا مسکن آپ کے ذہن میں آ گیا۔ان کے جرائم بھی سمجھ آ گئے۔اب اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ کسی کو طاقت دی ہے تو رہتا کہاں ہے؟ زرخیز جگہوں میں یا سرسبز وادیوں میں نہیں رہتا، بلکہ یہ ریتلی جگہ میں، ریت ہی ریت میں رہتا ہے،اس کو طاقت دی۔کسی کو علم،فن اور ٹیکنالوجی دی ہے تو وہ کسی دریا یا سمندر کے کنارے بڑے شہر میں نہیں رہتا: پہاڑوں میں رہتا ہے اور پہاڑ تراش تراش کر گھر بناتا ہے۔آپ حیران ہوں گے کہ پہاڑوں میں دو دو منزلہ مکانات ہیں۔پوری کی پوری کالونیاں ہیں۔

جزیرۃ العرب کا تصفیہ:

حضور علیہ السلام نے جزیرۃ العرب کو اپنی زندگی ہی میں شرک وکفر سے پاک صاف اور فتح کیا ہے۔حیات مبارکہ کے آخر میں اندرونی طاقتوں سے فارغ ہونے کے بعد بیرونی طاقتوں سے جہاد کی ابتدا کر دی تھی۔اس مشن کی تکمیل آپ کے خلفاء نے کی ہے۔ہوا یوں تھا کہ عرب کے ایک طرف فارس ہے۔اس نے عراق پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ایک طرف روم ہے۔(روم کا معنی یورپ، گوری چمڑی والے، انگریزوں کا دیس) انہوں نے شام قبضے میں لیا ہوا تھا۔[جملہ معترضہ کے طور پر سمجھو کہ جماعت صحابہ میں تین صحابی ایسے تھے جو باہر سے یعنی فارس، روم اور حبشہ سے آئے ہوئے تھے: سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔] روم نے شام کو، فارس نے عراق کو قبضہ میں لیا ہوا تھا۔عرب کے ہاتھ میں تھا ہی کچھ نہیں سوائے ریگستان کے۔دجلہ فرات کی زرخیز وادیاں فارس والوں نے پکڑی ہوئی تھیں اور یہ فلسطین کی "اَرضِ مُبَارَکٌ لِلعَالَمِینَ" یہ شام کا دمشق "کَثِیرَۃُ الأَشجَار"..... اس پر رومیوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔شام بہت زیادہ خوبصورت ہے۔یہ جو ایک منافق غزوۂ تبوک میں جانے سے بچنے کے لیے کہتا تھا: "اِئذَن لِّي وَلَا تَفتِنِّي." مجھے نہ لے جاؤ فتنے میں نہ ڈالو! اس کو اس بہانے کا موقع اس لیے ملا کہ شام کا حسن دنیا میں بے مثال سمجھا جاتا ہے۔علاقے کا بھی اور لوگوں کا بھی۔شام کا علاقہ بھی بہت خوب صورت ہے اور باشندے بھی بہت زیادہ حسین ہوتے ہیں۔یہ دونوں جگہیں تو قیصر وکسریٰ نے پکڑی ہوئی تھیں باقی ریگستانی حصے میں عرب رہتے تھے۔

عاد وثمود:

ان دونوں طاقتوں نے سارے عرب پر قبضہ کیا ہوا تھا، روم والوں کا نمائندہ عیسائی تھا، غسانی قبیلے سے۔اس نے اس قبیلے سے اپنا وائسرائے بنایا ہوا تھا اور فارس والوں نے "نعمان بن منذر" کو "حیرہ" وغیرہ کا گورنر بنایا ہوا تھا۔مسلمانوں اور ان کی قیادت کے لیے بڑا سخت امتحان تھا کہ ان دو طاقتوں سے کیسے جائے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت اور تدبیر دیکھیے۔آپ کو پتہ چلا رومی حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں تو آپ خود لشکر لے کر ان کی سرکوبی کے لیے نکلے۔آپ تبوک کے لیے چلے تو راستے میں "العلاء" اور "مدائنِ صالح" سے گذرنا پڑا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی جگہوں پر جانے سے منع کیا ہے جہاں عذاب آیا ہو۔(إِلَّا أَن تَكُونُوا بَاكِينَ) الّا یہ کہ سر جھکائے ہوئے روتے ہوئے چلو۔ادھر عذاب کے آثار ابھی بھی ہیں۔

ایک مغالطے کی اصلاح:

ایک بات سمجھ لیجیے: مدینہ منورہ سے شام کے رُخ پر جائیں تو دو آبادیاں آتی ہیں: "مدائنِ صالح" یہ قومِ ثمود نے اپنے ہاتھ سے تراش کر بنائی ہے اور ایک آبادی "العُلا" ہے۔اسے اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر عجیب وغریب پتھروں اور قسما قسم چٹانوں سے بنایا ہے۔ہم نے شروع میں پڑھا تھا کہ ایک ہوتا ہے "آدم ساز خطہ" یہ انسانی ہاتھوں کی کاریگری ہے اور ایک ہوتا ہے "قدرت ساز خطہ" جو رب تعالیٰ کی صناعی ہے۔تو "العُلا" میں قدرتی پتھروں سے ہاتھی بنا ہوا ہے۔پتھروں سے مینار بنا ہوا ہے۔آئسکریمیں بنی ہوئی ہیں۔سب قدرتی ہیں۔دو چٹانیں ایسی ہیں جیسے دو جڑواں بہنیں کھڑی ہیں۔یہ سب قدرتی ہیں۔"العلاء" قدرتی ہے اور مدائنِ صالح انسانوں نے بنایا ہے۔اگر یہ بات آپ کے ذہن میں آ گئی ہے تو آپ ایک تاریخی مغالطہ حل کر لیں گے۔العلا میں موجود ایک

پتھریلے حوض کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ وہ گھاٹ ہے جس میں صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور ایک دوسرے برتن کے متعلق کہا جاتا ہے اس میں دودھ دیتی تھی۔ یہ صحیح نہیں۔ اگرچہ یہاں لکھا ہے ''روضۃ الناقۃ'' لیکن یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ناقہ تو اُدھر تھی مدائنِ صالح میں۔ وہ اِدھر کیا کرنے آئی؟ یہ ''حلیب الناقۃ'' بھی اسی طرح غلط ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اس اونٹنی کے پانی پینے کی جگہ مدائن صالح میں ہے۔ العلا میں نہیں ہے۔ مدائن صالح میں اونٹنی والے گھاٹ پر عثمانی خلفاء نے چار دیواری لگا کر قبلہ رُخ محراب بنادی ہے۔ عثمانی سلاطین ہمیشہ مذہب کو پیشِ نظر رکھتے تھے کہ یہاں لوگ آئیں گے اور عبادت کریں گے تو چلو ادھر قبلہ رُخ جائے نماز بنادو۔ جو آئے دو رکعت نماز تو پڑھ لے۔

غزہ کی بین الاقوامی منڈی:

اہلِ مکہ جب "رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ." [القریش:2] کے تحت تجارت کے لیے شام کو جاتے تھے تو بحرِ میت کے پاس سے گذر کر بحرِ متوسط کے کنارے شام کی ساحلی منڈی ''غزۃ'' جاتے تھے۔ جسے آج کل ''غزہ کی پٹی'' کہتے ہیں۔ پہلے اس کا نام ''غزۃ ہاشم'' تھا۔ یہاں ساحل پر سامنے سے یورپ کا سامان آتا تھا۔ بائیں جانب سے افریقہ کا سامان آتا تھا۔ عرب اپنے ساتھ ہندوستان و یمن سے سامان لے آتے تھے۔ بین الاقوامی منڈی لگ جاتی تھی۔ اہلِ مکہ قریش میں سے اس شخص کو ان تجارتی قافلوں کا امیر بناتے جو بہت دیانتدار اور سمجھدار ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت ہاشم کو سب نے متفقہ طور پر اس قافلے کا تاحیات امیر بنایا ہوا تھا۔ وہ اتنی کثرت سے اس جگہ آیا کرتے تھے کہ اس جگہ کا نام ہی ان کے نام پر ''غزۃ ہاشم'' پڑ گیا۔ الغرض راستے میں ''بحرِ میت'' کے کنارے قومِ لوط کی بستیاں آتی تھیں۔ مکہ والے ادھر تجارت کے لیے جاتے تھے تو ان کو تباہ و برباد حالت میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ "إِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِمْ مُصْبِحِينَ، وَبِاللَّيْلِ." [الصافات:138] "إِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُقِيمٍ." [الحجر:86]

ہم نے جب آثارِ قدیمہ کی بات کی تھی تو کہا تھا کہ اِن جگہوں پر اگر کوئی جائے بھی تو اصل عبرت یہ ہے کہ ایسا کام نہ کرے جو ان معذب اقوام سے سرزد ہوا تھا اور استغفار کرے۔ آج کل بحرِ میت کے کنارے اردن اور اسرائیل دونوں نے تفریح گاہ بنائی ہوئی ہے۔ دنیا پرست لوگ ان آثارِ عذابیہ کے بارے میں کہتے ہیں ''تاریخی اہمیت کی حامل جگہیں''۔ حالانکہ اگر ان کی اہمیت ہوتی تو اللہ تعالیٰ انہیں برباد نہ کرتا۔ یہ ایسے نادان ہیں۔ ادھر فرعون کے مقبرے سے برتن نکال کر لے آتے ہیں اور اس کی نیلامی ہوجاتی ہے۔ تاریخی نوادرات ڈھائی لاکھ ڈالر میں نیلام ہورہے ہیں۔ وہ برتن اصل میں کیا تھا؟ فرعون کی بیوی اسے چارپائی کے نیچے رکھتی تھی کہ رات کے وقت پیشاب کرے گی۔

دو انبیائے کرام کے سسرال:

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دو جلیل القدر انبیاء کی سسرال ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھ دوسرے بنی اسرائیل کے بڑے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یہ قوم ان دونوں کی سسرال ہے۔ آخری زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو اسی قوم سے نکاح کریں گے۔ اس طرح دو انبیاء قومِ شعیب کے داماد بنیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب قیامت کے قریب آسمانوں سے آئیں گے تو حج کریں گے، شادی بھی کریں گے، خلافتِ الٰہیہ بھی قائم کریں گے اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کی آرام گاہ ہوگی۔ قومِ شعیب کا مسکن ''مدین'' آج کل سعودیہ کی حدود میں آتا ہے۔ تو یہ چار بڑے انبیاء ہیں جو عرب میں تھے اور پانچویں حضرت نوح علیہ السلام عراق کے قریب تھے۔ ان اقوام کو کچھ اصولی مرض لاحق تھے جس کی وجہ سے قومیں برباد ہوجایا کرتی ہیں۔ شرک کفر، عقیدے کی خرابی، اپنے علم و طاقت پر فخر، ناپ تول میں کمی بیشی، جنسی بے راہ روی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان چیزوں سے محفوظ فرمائے۔

وحی کے چار مشہور علاقے

قرآن کریم میں بیان کردہ قصص اور واقعات قرآن کریم کے موضوعات اور مضامین کا اہم حصہ ہیں۔ جن حضرات مفسرین اور اہل علم محققین نے قرآن کریم کی آیات میں بیان کیے گئے موضوعات کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، وہ قصص اور امثال سے صرف نظر نہیں کر سکے۔ وہ سب بالاتفاق فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا ایک حصہ عقائد ہے، ایک حصہ احکام ہے، ایک حصہ وعد وعید ہے اور آخر میں آ کر وہ قصص وامثال کو ضرور ذکر کرتے ہیں۔ پھر ان قصص کی کچھ ذیلی تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک ہیں انبیاء علیہم السلام کے قصص، دوسرے ہیں مختلف اقوام اور گروہ یا متفرق شخصیات کے قصص۔ اقوام سے یہاں پر ہم ان پچیس انبیاء کی اقوام کے علاوہ یہ دو قومیں مراد لیں گے: قوم سبا اور قوم تُبّع۔ ان دو قوموں کی طرف جو نبی مبعوث کیے گئے ان کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے، البتہ ان اقوام کا ذکر موجود ہے۔ گروہ سے مراد وہ مختلف لوگ جن کو قرآن کریم نے اصحابُ الکہف، اصحاب الفیل، اصحاب السبت، اصحاب لأ یکہ، اصحاب الجنۃ اور اصحاب القریہ وغیرہ کے نام دیے ہیں۔ قصص کا تیسرا عنوان متفرق قرآنی قصص ہے۔

سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تو قصصِ انبیاء کے ضمن میں آ جاتی ہے، لیکن کبھی کوئی جز اپنی اہمیت کی وجہ سے کُل کے مساوی مان لیا جاتا ہے۔ اس لیے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل الگ کر دیا جاتا ہے۔ یہ انبیاء جن کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے، ان کے متعلق ایک بنیادی بات دہرالیں۔ سبھی ہم نے پہلے لیا تھا، اب مجرد دہرا لیتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے متعلق دہرانے والی بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں جتنے بھی انبیاء کا تذکرہ ہوا ان سب کا تعلق سرزمین عرب یا اس کے آس پاس سے تھا۔ آس پاس سے مراد تین جگہیں ہیں: عراق، شام اور مصر۔ پھر شام کا اہم صوبہ ہے فلسطین۔ شام کے چار صوبوں (شام، لبنان، اردن اور فلسطین) میں سے سب سے زیادہ بابرکت خطہ فلسطین ہے۔ یہ "اَلاَرْضُ الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْهَا لِلْعَالَمِیْنَ." [الانبیاء 71:] ہے۔ اس میں مادی برکتیں بھی ہیں۔ روحانی برکتیں بھی ہیں۔ اوّل زمانے میں یہاں انبیاء بکثرت آتے رہے، آسمانی کتابیں اترتی رہیں اور یہ بڑی بڑی اقوام کی راہ گذر رہا ہے۔ فلسطین سے گذر کر صحرائے سینا پار کر کے مصر چلے جاتے۔ کچھ مشکل آتی تو پھر واپس مصر آ جاتے۔ قدیم زمانے میں یہاں جلیل القدر، اولوالعزم انبیاء آتے رہے۔ آخر زمانے میں یہاں خلافت الٰہیہ کے لیے جو عالمی سطح پر قائم ہوگی، اس کا فیصلہ کن معرکہ یہیں پر لڑا جائے گا۔ اس لیے "اَلاَرْضُ الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْهَا لِلْعَالَمِیْنَ." ہے۔ "للعالمین"، یعنی پہلے زمانے کے لوگ بھی، آخری زمانے کے لوگ بھی، سب کے لیے اس خطۂ ارض میں برکات رکھی گئی ہیں۔ عراق اور شام یا فلسطین کے بعد تیسرا خطہ جہاں کے انبیائے کرام کا تذکرہ قرآن کریم نے کیا ہے، وہ مصر ہے۔ اب گویا کہ چار جگہیں ہو گئیں جن میں آنے والے انبیاء کا تذکرہ قرآن کریم نے کیا۔ (1) سرزمینِ عرب (2) عراق (3) شام اور (4) مصر۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

انبیائے کرام کے چار خطوں کا تذکرہ

(1) سرزمینِ عرب:

وسطی عرب میں جو انبیاء آئے، وہ یہ ہیں: سب سے پہلے نبی بھی اور سب سے آخری نبی بھی اور درمیان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی۔ اِن کے علاوہ دو
بڑی قوموں عاد و ثمود کے نبی یعنی حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام بھی یہیں آئے ہیں۔ قوم صالح اوپر بجانب شمال رہتی تھی اور قوم ہود مکہ مکرمہ سے نیچے
بجانب جنوب رہتی تھی۔ جغرافیہ میں ہمیشہ اوپر سے مراد شمال اور نیچے سے مراد جنوب ہوتا ہے۔ حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام دونوں حضرت ابراہیم
علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ بنو اسحاق فلسطین میں رہے اور بنو اسماعیل کو مکہ مکرمہ میں آنے کا حکم ہوا۔ نبوت کی روحانی وراثت اور قبلہ کی تولیت تبدیل ہو کر بنو اسحاق
سے بنو اسماعیل کی طرف آرہی تھی اور قبلہ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف آرہا تھا۔ اس لیے ایک بیٹے کو یہاں آنے کا حکم ہوا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی
جگہ تو ذہن میں ہے؟ وہ جو دو کھاڑیاں ہیں خلیج عقبہ اور سوئز۔ ان میں سے خلیج عقبہ کی مشرقی جانب میں مدین نامی شہر تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم یہاں ر
ہتی تھی۔ یہ تھے وہ انبیاء جو وسطی عرب میں آئے۔

(2) عراق:

یہاں چار انبیاء آئے: حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر آنے کے بعد، حضرت نوح سے پہلے، حضرت ادریس کا تذکرہ ملتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام تو
آدم ثانی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہم السلام ابو الانبیاء ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام اس منفرد واقعہ والے نبی ہیں کہ ان کی قوم نے عذاب سے ذرا پہلے توبہ کر لی
تھی۔ یہ چاروں انبیاء عراق میں آئے ہیں جہاں بابل اور نینوا کی تہذیبیں تھیں۔ دجلہ اور فرات کے دریا تھے۔ ان کے درمیان دنیا کا زرخیز ترین حصہ ہے۔ یہ صر
ف زراعت کے اعتبار سے ہی زرخیز نہیں، مردم خیزی کے اعتبار سے بھی زرخیز ترین ہے اور دنیا کی مشہور قوموں کے مسکن کے اعتبار سے ہی نہیں، جلیل القدر انبیاء
کے مبعوث ہونے کے اعتبار سے بھی ممتاز ہے۔

(3) شام اور فلسطین:

بنی اسرائیل کے اکثر انبیاء یہاں پر آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے عراق میں رہتے تھے۔ وہاں سے ہجرت کر کے فلسطین تشریف لے گئے تھے۔
وہاں سے مصر چلے گئے تھے۔ مصر میں حضرت سارہ کا واقعہ ہوا تو پھر واپس یہاں فلسطین میں آگئے۔ اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو ایک جگہ بھیجا اور خود دوسری
جگہ ٹھہرے۔ حضرت لوط کو بحر میت کے کنارے سدوم اور عمورہ نامی شہروں میں بھیجا، خود الخلیل میں ٹھہرے۔ اپنے ایک بیٹے اسحاق کو وہیں ٹھہرایا اور دوسرے بیٹے
اسماعیل کو مکہ بھیج دیا جن کی نسل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔ بنی اسرائیل میں سے بہت سارے انبیاء آئے۔ ''بنو اسحاق'' کہہ لو یا پھر چونکہ حضرت یعقوب
علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا تو ''بنو اسرائیل'' کہہ لو۔

بہت سارے انبیاء کے آنے کے باوجود یہ قوم مانتی نہ تھی، پھر نبوت اور وراثت بنو اسماعیل کی طرف منتقل ہوگئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسحاق، پھر پوتے حضرت یعقوب اور پھر آگے کے سارے انبیاء بنو اسرائیل میں سے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے آخری نبی تھے اور ان سے پہلے ان کی بشارت دینے کے لیے آنے والے حضرت یحیٰ علیہ السلام تھے اور ان کے والد حضرت زکریا علیہ السلام تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً چھ سو سال پہلے تشریف لائے تھے۔ یہ چھ سو سال کا زمانہ ''فترت'' کا زمانہ شمار ہوتا ہے، جس میں وحی نہیں آئی اور جب اتنے طویل وقفے کے بعد آئی تو نبوت کی نعمت بنی اسرائیل سے سلب کرلی گئی اور بنو اسماعیل کو دے دی گئی۔ سلب کیوں کرلی گئی؟ اس لیے کہ "یقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ." [آل عمران: 21] انبیائے کرام علیہم السلام کا استہزا و استخفاف اور قتل یہ تو کرتے ہی رہتے تھے، لیکن ان کے لیے آخری تنبیہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور ان سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سچی نبوت سے آگاہی دینے کے لیے حضرت یحیٰ علیہ السلام آگئے تھے۔ اس آخری تنبیہ پر بھی وہ باز نہیں آئے۔ ان کے قتل کے بھی درپے ہوگئے تو اللہ نے ان کو آسمانوں کی طرف اٹھالیا اور نبوت کی نعمت بنو اسماعیل کی طرف منتقل کردی، پھر اس پر بھی ان کو ندامت نہ ہوئی اور اس آخری نبی کے خلاف بھی ویسی ہی کوششیں کیں جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف کی تھیں تو ان کو قدرت الٰہی نے سرزمین عرب سے جلاوطن کیا اور جب یہ آخر زمانے میں یہاں زبردستی واپس آنے کی کوشش کریں گے اللہ ان کو جمع کرکے فلسطین لائے گا "جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا." [اسرائیل: 104] اور حتمی و قطعی سزا دے گا۔ جب ہمارے آخری وعدے کا وقت آئے گا ہم تم کو پھر اسی سرزمین پر جمع کردیں گے۔ چنانچہ آج بنی اسرائیل کے فلسطین میں دوبارہ جمع ہونے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے مجاہدین کے ساتھ مل کر اپنے اور انسانیت کے ان دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔

بنو اسرائیل کو جب فلسطین میں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو صحرائے سینا پار کرکے مصر چلے جاتے تھے۔ مصر میں بنی اسرائیل کی تاریخ کی ابتدا حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوتی ہے اور انتہا ہوتی ہے حضرت موسیٰ اور ہارون پر کہ وہ بنو اسرائیل کو نجات دلاکر فلسطین کی طرف لے آئے تھے۔ ان میں دو بہت بڑے انبیاء آئے: حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام۔ یہ بنو اسرائیل کی تاریخ کا عظیم ترین دور شمار ہوتا ہے، جس میں انہیں دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے بہت زیادہ عروج نصیب ہوا۔ دنیاوی بادشاہت بھی ان کے پاس تھی اور روحانی قیادت بھی ان کے پاس تھی۔ دنیاوی بادشاہت اتنی عظیم تھی کہ پورے روئے زمین پر تھی اور روحانی بادشاہت بھی ایسی کہ پرندے، پہاڑ وغیرہ ساتھ مل کر ذکر کرتے تھے۔ پھر ان پر زوال آتا گیا۔ نافرمانی ان کی عادت بن گئی۔ حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحیٰ علیہ السلام سمجھاتے رہے کہ وہ شخصیت آنے والی ہے جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہوں گے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، پھر وہ شخصیت آئے گی جو پوری انسانیت کے آخری نبی ہوں گے، لیکن انہوں نے گستاخیوں اور نافرمانیوں کی حد کردی، پھر یہ نعمت ان سے چھن کر بنو اسماعیل یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آگئی۔ یہ بنو اسرائیل کی مختصر تاریخ ہے۔ ایک دوران کا مصر میں گزرا ہے جہاں ان کے پہلے پہلے نبی حضرت یوسف اور آخری نبی حضرت موسیٰ و ہارون ہیں۔ علیہم السلام۔

یہ وہ پچیس انبیاء ہیں، جن کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ ان میں سے کچھ حضرات کو ''اولوالعزم من الرسل'' کہا گیا ہے۔ "فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ." [الاحقاف: 35] وہ یہ ہیں: (1) آدم ثانی حضرت نوح (2) ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام (3) بنو اسرائیل کے ابتلا کے دور میں ان کے نجات دہندہ ثابت ہونے والے حضرت موسیٰ (4) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام (5) سب سے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم۔

اب یہاں یہ سوال انسان کے ذہن میں آتا ہے کہ صرف عرب کو خاص کرلینے کا کیا مطلب؟ جبکہ قرآن کائنات کے ہر فرد کے لیے نازل ہوا ہے؟ حضور کی نبوت عرب کے لیے تو مخصوص نہیں تھی، آپ تو رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب ''ہدی للعالمین'' اور ''ذکریٰ للعالمین'' ہے؟ تو اس کا جواب عرض کردیا کہ دراصل قرآن تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے، قصص کی کتاب نہیں ہے۔ اس کے نزول کا اصل مقصد دعوت و تذکیر ہے ''اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى'' ''اِنَّمَا هِيَ

تذکرۃ'' یہ تو صرف نصیحت ہے، تذکیر ہے۔ ان انبیاء اور ان کی اقوام کے درمیان جو دعوت چلی اور پھر جو کشمکش چلی، اس میں بقیہ تمام روئے زمین کے انسانوں کے لیے تذکیر موجود ہے۔ انسانی نفسیات خیر و شر کے لحاظ سے یکساں ہوتی ہیں: اگر حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے توبہ کر لی تو یہ خیر ہوا اور کچھ اقوام آخری وقت میں بھی ماننے پر تیار نہ ہوئیں تو یہ شر ہوا۔ بقیہ دنیا میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسانوں کے کردار، احوال، سوچ، مزاج اور رویہ ملتا جلتا ہے، جب ملتا جلتا ہے تو پھر قرآن کوئی قصص کا انسائیکلوپیڈیا تو نہ ہوا کہ ساتوں براعظم کے ہر شہر و بستی میں پیش آنے والے واقعے کا ذکر کرے۔ کوئی بستی ہو، قریہ ہو یا بستیوں کا مجمع ہو، ان سب کا تذکرہ ضروری نہیں ہے، کیونکہ جلیل القدر انبیاء اور اولوالعزم شخصیات کے تذکرے میں نیز دیگر انبیاء اور شخصیات کے تذکرے میں بقیہ تمام انبیاء اور شخصیات کا تذکرہ خود بہ خود سمٹ کر آ جاتا ہے۔ ان پچیس انبیاء میں سے جو اولوالعزم انبیاء تھے، ان کی اقوام کے تذکرے میں پانچ اصولی بیماریاں جن میں انسان عمومی طور مبتلا ہوئے، وہ خرابیاں جو ان کے نظریات کو لگ جاتی ہیں، ان کا تذکرہ آ جاتا ہے، لہٰذا صرف سرزمین عرب کے انبیائے کرام پر اکتفا کرنے کے باوجود قرآن کریم ایک عالمگیر کتاب ہے اور ہر زمان اور ہر مکان کے انسان کے لیے ہدایت اور رہنمائی دیتی ہے۔ ان کے تذکرے میں ان کو اپنا عکس نظر آتا ہے کہ جو ان پر بیتی ہے وہ ہم پر بھی بیت رہی ہے، مثلاً: ہر انسان اپنے اندر کو جانتا ہے یا اپنی قوم کی نفسیات کو پہچانتا ہے کہ میرے اندر اور میری قوم کے اندر کیا کچھ ہے؟ وہی کچھ ہے جو ان اقوام میں تھا۔ اگر عبرت نہ پکڑی تو وہی کچھ ہو گا جو ان اقوام کے ساتھ ہوا۔

آٹھ خاص گروہ

پہلے باب (پانچ بڑی اقوام) سے فارغ ہونے کے بعد ہم جغرافیۂ قرآنی کے دوسرے باب کی طرف آ جاتے ہیں۔ان بڑی اقوام کے بعد کچھ چھوٹے گروہ تھے جن کے ساتھ خاص خاص واقعات پیش آئے۔انسان کے اندر پیدا ہونے والے شر یا خیر کے جذبات اوران سے جنم لینے والے اعمال ایسے واقعات کا سبب بنتے ہیں۔آٹھ تو وہ ہیں جن کا اصحاب کے نام سے تذکرہ آتا ہے جن کو قرآن ''اصحاب'' کی اضافت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔دو قومیں وہ ہیں جن کی طرف مبعوث ہونے والے نبی کا تذکرہ نہیں ہے۔انبیاء نے ان کو جو دعوت دی اور قوم نے انہیں جو جواب دیا، اس کا تذکرہ نہیں ہے۔بس ان کے حالات کا تذکرہ ہے۔یہ وہ دو مخصوص قومیں ہیں جن کو'' قوم سبا'' اور'' قوم تبع'' کے نام سے الگ سے ذکر کیا جاتا ہے۔

1-اصحاب السبت:

اصحاب السبت بنو اسرائیل کی ایک جماعت تھی جو آج کل کے جغرافیہ کے اعتبار سے خلیج عقبہ کے کنارے رہتی تھی۔بحر احمر جب اوپر شمال کی طرف جاتا ہے تو خرگوش کے کانوں کی شکل میں دو شاخوں کی صورت میں تقسیم ہو جاتا ہے۔اس کی دائیں شاخ ''خلیج عقبہ'' اور بائیں شاخ ''خلیج سوئز'' کہلاتی ہے اور اس کے بیچ میں جو دل کی شکل کا ٹکڑا آ جاتا ہے یہ صحرائے سینا ہے۔جغرافیہ قرآنی کے متعدد مقامات اسی خطے کے اردگرد گھومتے ہیں، کیوں کہ صحرائے سینا کے ایک طرف فلسطین، دوسری طرف مصر اور بیچ میں یہ صحرائے سینا کی ٹکڑی ہے۔فلسطین، مصر اور بیچ میں صحرائے سینا، یہ وہ تین جگہیں ہیں کہ بنو اسرائیل کی پوری تاریخ ان کے گرد گھومتی ہے۔صحرائے سینا کے دائیں جانب والی جو کھاڑی ''عقبہ'' ہے اس کے کنارے پر عقبہ نامی شہر ہے جس کا قدیم نام ''ایلات'' یا ''ایلہ'' ہے۔آج کل کے جغرافیہ میں تین ممالک کی سرحدیں اس کو لگتی ہیں: (1) ایک طرف مصر ہے۔صحرائے سینا مصر کے ساتھ ہے۔(2) اوپر سے اسرائیل خنجر کی طرح آ رہا ہے۔اس کو فلسطین کہنا چاہیے۔کبھی کبھار سمجھانے کے لیے ہم اسرائیل کہہ دیتے ہیں۔(3) تیسری طرف سے ''خلیج عقبہ'' اسرائیل (یا فلسطین) کا سرحدی اور ساحلی شہر ہے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں آج کے اسرائیلیوں کے آباء واجداد کو بندر اور خنزیر بنایا گیا تھا"مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ، وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ۔"[المائدہ:60] یہ وہ بستی ہے جس کے لوگوں کو آزمایا گیا تھا جیسے کہ ہر انسان کو آزمایا جاتا ہے۔ہر قوم کو آزمایا جاتا ہے۔امتحان میں پورا اترتے ہو تو ترقی ملے گی اور ناکام ہو جاتے ہو تو سزا کے مستحق ہو جاؤ گے۔انسانوں کو تقویٰ کی بنیاد پر آزمایا جاتا ہے۔ان کی آزمائش کیا تھی؟"اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ۔"[الاعراف:163] ان کو منع کر دیا گیا کہ ہفتے میں ایک دن عبادت کا ہے۔اس میں تجارت نہ کرو۔اس میں شکار نہ کرو۔چھ دن معیشت، تجارت، شکار.....اور ایک دن عبادت کے لیے خاص ہے۔ان چھ دنوں میں آزمائش کے لیے مچھلی گہرے پانی میں چلی جاتی تھی اور اس ایک دن میں "تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا۔"اس ایک دن مچھلی پانی سے اچھل اچھل کر قلابازیاں لگایا کرتی تھی۔ان کا دل للچاتا رہتا تھا۔اب صبر کرتے تو بڑی ترقی اور برکت پاتے۔دنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔پر ان سے صبر نہ ہوا۔حیلۂ فاسدہ کیا۔حیلہ صحیحہ یا مستحسنہ کیا ہے؟ جس میں مقاصدِ شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو۔احکامِ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے مشکل سے بچنے کا کوئی حل نکالا جائے۔اول تو ان کو کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔کیوں کہ صرف

ایک دن صبر کا ہے اور بتایا بھی گیا ہے کہ اس ایک دن کے تقویٰ پر انعامات کا فیصلہ بھی ہونا ہے۔ باقی چھ دن کھاتے پیتے رہو۔ ہفتے کے دن کچھ کم آئے گا، لیکن کوئی بھوکا تو نہیں مرے گا۔ اب ان کو کوئی مشکل نہیں تھی جو حرج کے درجے کو پہنچتی۔ اضطرار کو پہنچا دیتی۔ ایسی کوئی مشکل نہیں تھی۔ دوسرا یہ کہ احکامِ شرع کے اندر رہ کر کوئی حل نہیں نکالا گیا تھا۔ حنفیہ کے حیلے میں اور بنی اسرائیل کے حیلے میں یہی فرق ہے۔ حنفیہ کا حیلہ احکام شرع کے اندر رہتے ہوئے ''متبادل کی تجویز'' کے لیے ہوتا ہے اور ''دفعِ حرج'' کے لیے ہوتا ہے۔ عموم بلویٰ میں قوم پڑ گئی اس کے حل کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں نہ کوئی بلویٰ تھا نہ کوئی حرج تھا اور نہ ہی احکام شرع کے اندر رہتے ہوئے کوئی حیلہ نکالا گیا تھا۔ انہوں نے یہ کیا کہ سمندر کو کھود لیا اور آگے جا کر حوض بنا دیے۔ مچھلی نالی میں تیرتے ہوئے گڑھے کی طرف جاتی۔ ہفتے کو مچھلی پھنس جاتی اور اتوار کو اسے پکڑ لیتے۔ اب اگر یہ شکار نہیں تو اور کیا ہے؟ شکاری شکار کے لیے اسی طرح کے حیلے کرتا ہے۔ جال لگا کر چلا جاتا ہے پھر دوسرے دن آ کر پکڑ لیتا ہے۔ یہ تالاب کو دریا سے ملا کر چلے جاتے تھے۔ جب مچھلی آ جاتی تو واپسی کا راستہ بند پاتی۔ آسانی سے اسے پکڑ لیتے۔ یہ شکار ہی تو ہوا۔ آپ نے مچھلی کے آنے کا حیلہ کیا ہفتے کے دن، اور جا کر پکڑا اتوار کے دن تو فرق کیا ہوا؟ مچھلی ''تالابی پھندے'' میں ہفتے کے دن ہی پھنس گئی تھی۔ ''حرز'' میں تو آ گئی تھی۔ وہ مباح چیز اس دن ''محرز'' ہوگئی تھی۔ سمندر کا جانور مباح ہے۔ جب محرز ہوا تو مملوک ہوگیا۔ مملوک ہوا تو شکار ثابت ہوگیا۔ لہٰذا اس حیلہ بازی پر ان کو سخت عذاب ہوا اور بندر اور خنزیر بنا دیے گئے۔ پھر تین دن کے بعد مسخ ہو کر مر گئے اور ان کی آگے نسل نہیں چلی۔ یہ موجودہ بندر اور خنزیر پہلے سے تھے اور اب بھی ہیں۔ ان بے چاروں کو یہ الزام نہیں دینا چاہیے کہ یہ حرام خوروں کی نسل ہیں یا حرام خوری کی سزا میں ایسے بنا دیے گئے ہیں۔

جغرافیۂ قرآنی کا درس کیسے؟

اگر آپ یہ واقعہ درس کے طور پر اپنی مسجد میں پروجیکٹر پر پڑھاتے ہیں تو اس میں زبردست قسم کی عبرتیں اور نصیحتیں ہیں۔ مثلاً: مسلمانوں کے لیے آزمائش ہے کہ اذانِ اول ہو جانے کے بعد جمعہ پڑھنے تک کاروبار نہ کرو۔ بنو اسرائیل کے لیے ان کا پورا مقدس دن، صبح سے شام تک ممنوع تھا۔ پورا دن کشتی سمندر میں نہیں لے جا سکتے۔ جال کو سمندر میں نہیں لگا سکتے۔ امت محمدیہ کے لیے آسانی ہے کہ پورا دن نہیں، بس نماز جمعہ کا جو وقت ہوگا، صرف اس میں ممانعت ہے۔ اذان اول کے بعد دکان بند کر دو۔ اور "فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ." [الجمعہ:9] اس کے بعد اللہ کی یاد سے جب فارغ ہو جاؤ تو "ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ." [الجمعہ:10] تھوڑا سا امتحان۔ بس ڈیڑھ دو گھنٹے کا۔ اس کے بعد برکت ہی برکت۔ اب کچھ سستی حکومت کرتی ہے۔ اس کو چاہیے کہ قانون بنائے۔ پورے ملک میں ایک سے دو بجے کے درمیان نماز کا وقت رکھا جائے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں۔ اس ایک گھنٹے کے دوران پورے ملک میں دکانیں بند رکھی جائیں۔ کچھ حکومت کی سستی ہے اور کچھ ہماری بھی کہ ساڑھے بارہ بجے وقت داخل ہوتے ہی اذان دے دیتے ہیں اور نماز پڑھاتے ہیں دو بجے۔ ڈھائی بجے۔ اس ڈیڑھ دو گھنٹے تک ہم اجتماعی گناہ میں مبتلا رہتے ہیں اور قوم کو عذاب والے گناہ میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ حکومت حکم جاری کرتی نہیں، عوام سمجھتے نہیں۔ تو اس کا حل بعض علماء نے یہ نکالا ہے کہ اذانِ اول مؤخر کرو۔ اذانِ ثانی اور خطبہ اپنے وقت پر دو۔ صرف اتنا کرو کہ اذان اول وقت داخل ہونے پر نہ دیا کرو۔ نہ بیان سے پہلے دو۔ بیان ختم ہونے کے بعد دے دو۔ پھر سنتیں پڑھ لو۔ پھر اذان ثانی دو خطبہ پڑھو۔ سب کچھ اپنی ترتیب پر کرو۔ صرف اذانِ اول کو بیان کے اختتام تک مؤخر کر لیا کرو۔

دوسری یہ بات سمجھانے کی ہے کہ ان کی آزمائش بڑی تھی، ہماری تو چھوٹی سی ہے۔ وہ لوگ ناکام ہوئے بندر اور خنزیر بنا دیے گئے۔ ہم تو اللہ کا فضل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کا اندر کا نفس تو بندر خنزیر بن ہی جاتا ہے۔ بندر لالچی اور خنزیر غلاظت پسند ہوتا ہے۔ بندر لالچی بہت ہوتا ہے۔ خنزیر حرام اور گندگی میں منہ ڈالتا ہے۔ احترام جمعہ کی خلاف ورزی کی نحوست سے ہم لوگوں میں یہ اثرات..... یعنی حرام کی حرص اور فحاشی کی لت..... آتے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس واقعے میں ایک اور نصیحت ہے۔ "اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ: لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا نِ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا

شَدِيدًا۔" [الاعراف:164] اس قوم میں تین قسم کے لوگ ہو گئے تھے۔ایک وہ جو یہ حرکت کرتے تھے۔دوسرے وہ جو ان کو سمجھاتے رہتے تھے اور ایک درمیان کا طبقہ تھا۔نیوٹرل، لبرل قسم کا جو کہتا تھا یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔تو دنیا میں جب عذاب آیا۔صرف وہ لوگ بچے جو خود بھی بچتے تھے اور دوسروں کو منع بھی کرتے تھے "مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ۔" [الاعراف:164] لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ہم اللہ کے سامنے عذر پیش کر سکیں گے۔ممکن ہے کچھ لوگ مان بھی لیں۔صرف یہ طبقہ باقی رہا۔باقی دونوں.....جو یہ گناہ کرتے تھے اور جو اس پر خاموش رہتے تھے.....دونوں عذاب کی لپیٹ میں آ گئے۔اس زمانے میں قوم بنی اسرائیل کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔اس کے باوجود آج کل "عقبہ یا ایلہ" میں جو اسرائیلی ساحلی شہر ہے، دنیا کی کون سی بدکاری ہے جو یہاں پر نہیں ہوتی؟ جس جگہ پر ان کے آباؤ اجداد کو ایک حلال چیز بے وقت کھانے پر ایسی سخت سزا ملی، اس جگہ پر اصل حرام چیز خنزیر، شراب، عیاشی، فحاشی، بدکاری دنیا کا کون سا برا اور کالا دھندا نہیں ہے جو اسرائیلی اس جگہ پر نہیں کرتے۔اس پر انہیں مستقبل میں کیا سزا ملے گی؟ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔عقبہ کے آگے "شرم الشیخ" ہے۔یہ پوری دنیا میں انہی کاموں کے لیے مشہور ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات آپ کو بتاؤں۔آپ کو اگر یقین نہیں آتا تو نہ آئے۔میں تو وہ کہوں گا جو میرے علم میں ہے۔یہودی سائنس دان سائنس میں آگے بڑھنے کی بہت زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔خصوصاً خلائی سائنس میں اور جینیٹک سائنس میں۔جینیٹک سائنس کہ حیوانات، نباتات کی ساخت اور تشکیل و تخلیق پر تحقیق کہ چھوٹے سے چھوٹا جز وجود میں کیسے آیا اور اس کی تخلیق کا راز اور کام کا طریق کار کیا ہے؟ مثلاً بیج پر تحقیق کہ بیج کے اندر موجود جو ایک خاص جز ہے۔جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے "وَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا، نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا۔" [الأنعام:100] اس کے اندر ایک چیز ایسی ہے، کوئی ایسا خلیہ ہے کہ اس سے نبات جنم لیتا ہے۔اس کی دریافت کی فکر میں ہیں کہ پھر ہم آگے اپنی مرضی کے بیج بنائیں گے۔جب ہم چاہیں وہ لگے گا اور ہم نہ چاہیں تو نہ لگے گا۔اور انسان پر بھی محنت کر رہے ہیں کہ اس کی تخلیق کا بھی تو کوئی راز ہے۔اس کے خُلیوں پر تحقیق کر کے اس جیسا ہم بنا لیں۔پھر اس کے بعد ہم چاہیں تو بنائیں اور ہم نہ چاہیں تو کوئی نہ بنا سکے۔اپنی مرضی کے خالص یہودی النسل انسان زیادہ سے زیادہ بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی کوشش ہے کہ.....موت و حیات پر قابو پا لیں، انسانی زندگی کے راز پر قابو پا لیں تو کیا ہو جائے؟ "لَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ۔" [البقرة:96] کہ ہمیں موت نہ آئے۔کیوں کہ انہیں یقین ہے کہ موت کے بعد ہماری زندگی بڑی بری ہے۔ہمیں موت آ گئی تو جہنم کے علاوہ ٹھکانا نہ ہوگا۔موت پر قابو پانے کے ساتھ ہمارے آباء و اجداد جو بندر و خنزیر کی شکل میں عالم برزخ میں ہیں، کسی طرح انہیں بھی حیات دنیاوی مل جائے اور وہ بھی واپس آ جائیں۔اس کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔اللہ کے اتنے باغی اور اس درجے کے نافرمان لوگ ہیں۔

درسِ قرآن کا مقصد:

الغرض! آپ جب جغرافیہ قرآنی کا درس دیں تو اصلاحی پہلو کو مدنظر رکھیں۔درسِ جغرافیہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ایک لیپ ٹاپ لے لیں۔ایک پروجیکٹر منگوا لیں۔باوقار آواز میں خطبہ پڑھیں پھر آیات کا ترجمہ کریں پھر تشریح بیان کریں۔پروجیکٹر کی سکرین پر اس واقعہ کا محل وقوع سامعین کو سمجھائیں اور اخلاق کی تہذیب و تربیت کی کوشش کریں۔یاد رکھیے! قرآنی واقعات کی جو ضمنی تفصیلات ہیں، ان میں زیادہ نہ جایئے گا۔ورنہ اصل مقصود سے نظر ہٹ جائے گی۔قرآن کریم خود اس طرف نہیں گیا ہے۔اصل مقصود ہے ان حالات سے عبرت پکڑنا۔یہ مقصود نہیں ہے کہ آدمی آثار قدیمہ کی بھول بھلیوں میں گھومتا رہے۔ادھر کوئی ٹھیکری تلاش کرے کہ جی یہ ان کا برتن تھا۔یہ ان کا سکہ تھا۔یہ ان کالے کرتوتوں والوں کی یادگار تھی۔یہ بالکل مطلوب نہیں ہے۔سامعین کو اس طرف زیادہ نہیں لے جانا ہے۔بس ہلکی سی جھلک دکھا کر واپس لے آنا ہے۔قرآن کریم نے جو بیان کیا ہے اس کا مصداق یہ ہے۔قرآن نے ہمیں یہ سمجھانا چاہا ہے کہ دیکھو انسان کو حرام چیز وافر ملتی ہے۔پھر ترغیب دے دے کر اس کو للچاتی ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ کون صبر کرتا ہے اور کون حیلے کر کے بندر خنزیر بنتا ہے؟ مثلاً بینک کی نوکری کو

لے لیجیے! تھوڑا سا وقت ہے۔ بہت ساری تنخواہ ہے۔ اتنی سہولتیں، اتنی مراعات ہیں اور اس کے مقابلے میں سودی بینک چھوڑ کر حلال نوکری کرنا چاہو گے تو صبح سے شام تک جان گھلانی پڑتی ہے تب جا کر کہیں مہینے کا خرچ مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ اب آپ سامعین کو عبرت کی طرف لے آؤ اور انہیں سمجھاؤ کہ تقویٰ پر جمے رہیں۔ استقامت سے ڈٹے رہیں۔ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ حیات طیبہ دے گا اور مرنے کے بعد تو سکون ہی سکون ہے۔ اور اگر حرام میں ملوث ہو گئے تو بڑی خطرناک چیز ہے۔ یہ اس دنیا میں بھی انسان کو برباد کر دیتی ہے۔ اللہ کی نظر سے گرا دیتی ہے اور آخرت کا مسئلہ تو بہت سخت ہے۔

عزیزو! یہ گزارش یاد رکھنا! ہمارے اکابر نے اسی لیے ضمنی تفصیلات اور ذیلی جزئیات پر توجہ نہ دی کیوں کہ قرآن کریم کا اصل مقصد وعظ ونصیحت نظریاتی وعملی ہے۔ واقعات کی زیادہ گہرائی میں نہیں جانا ہے۔ گہرائی میں تاریخ کا طالب علم جائے تا کہ مزید اس سے استفادہ کر سکے، مزید کچھ عبرت کی باتیں نکال سکے۔ وہ اپنی جگہ کی بات ہے۔ جغرافیۂ قرآنی سے ہمارا اصل مقصود "تذکیر بالقرآن" ہے۔ قرآن کے خادم جتنے علوم ہیں ان سے مقصود یہ ہے کہ قرآن کا جو ہدف ہے، اس کو پورا کیا جائے۔ قرآن کا مقصود ہے: "تصحیح العقائد" اور "تہذیبُ نُفوسِ البشر" کہ انسان کی اصلاح کی جائے۔ اسے اخلاقی گراوٹوں سے بچایا جائے۔ ہمیں اسی مقصد کو درسِ قرآن کا اصل ہدف بنانا چاہیے۔ باقی چیزیں ضمنی اور معاون حیثیت میں ہوں۔

2-اصحاب الرَّس:

اصحاب السبت کے بعد دوسرا واقعہ اصحاب الرَّس کا ہے۔ عرض کیا تھا اس کے معنی کنویں کے ہیں۔ معدنیات والی کان بھی مراد لے سکتے ہیں۔ دنیا میں کچھ لوگوں کا پیشہ کان کنی ہوتا ہے۔ ان کے علاقے میں زمین سے خزانہ اگل پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بیٹھے بٹھائے بہت کچھ دے دیتا ہے، پھر وہ اس کا خمس نہیں ادا کرتے، اس کا حق ادا کرتے ہی نہیں۔ دنیا کی آسائشوں میں مست ہو جاتے ہیں۔ "اصحاب الرَّس" کے محلِ وقوع کی تعیین میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں۔ یہ مدین کے قریب تھے یا ادھر نجد کے صحرا میں۔ اس بحث میں ہم زیادہ نہیں پڑتے۔ اصل سمجھنے کی بات یہ ہے کہ زمین کی پیداوار کا عشر یا کان سے نکلنے والی معدنیات کا خمس نہ دینا یعنی جو اللہ کا حق ہے وہ ادا نہ کرنا، (ان کی شریعت میں نجانے کتنا حق مقرر ہوگا؟) یہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی بات ہے۔ اسی طرح اپنے نبی کی نافرمانی بہت خطرناک چیز ہے۔

3-اصحاب الجنۃ:

اصحاب الجنۃ کا قصہ مشہور ہے۔ ان کا تعلق زراعت سے تھا۔ "اصحاب الرَّس" اپنی معدنیات کا خمس نہیں نکالتے تھے اور یہ لوگ اپنے باغ کا عشر نہیں نکالتے تھے۔ والد نیک، دین دار تھا۔ غریب غربا کو پوچھتا رہتا تھا۔ بیٹے لالچی تھے۔ دنیا پرست تھے۔ انہوں نے دنیا پرستوں والی سوچ اپنائی کہ باپ دیتا رہتا تھا۔ اگر ہم بھی دیتے رہیں گے تو دولت ختم ہو جائے گی۔ ہماری اولاد کے لیے کیا بچے گا؟ باپ کی عادت مشہور تھی۔ فصل کٹنے کے دن غریب لوگ صبح صبح آتے اور اپنا حق لے جاتے تھے۔ بیٹوں نے طے کیا ہم لوگوں کے آنے سے پہلے ساری فصل سمیٹ کر گودام میں بند کر دیں گے اور باغ خالی کر کے بیٹھ جائیں گے۔ جب لوگ آئیں گے تو کہیں گے کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: تمہارے سمیٹنے سے پہلے بھی تو اس کو کوئی لپیٹ سکتا ہے۔ رات کو یہ عزم کر کے سوئے "إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ." [القلم:17] کہ صبح صبح ہم جائیں گے اور فصل کاٹ کر نمٹا دیں گے۔ دن چڑھے جب غریب غربا اور مساکین آتے ہیں، اس سے پہلے ہم فارغ ہو جائیں گے۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ راکھ اڑ رہی ہے۔ رات کو آگ کا ایک تھپیڑا آیا اور ساری وادی کو جلا کر خاک کر گیا۔ سارا باغ راکھ میں تبدیل ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ رات کو یہاں کوئی قافلہ ٹھہرا تھا اور اس نے آگ جلائی ہو۔ پھر صبح چل پڑا ہو اور پیچھے دھول اڑ رہی ہو۔ جہاں کل سرسبز باغ تھا۔ وہاں آج راکھ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ یہ جگہ یمن میں ہے۔ یمن کا دارالحکومت صنعاء ہے۔ یہ جلی ہوئی وادی اس کے قریب ہے۔ اس سے جنوب مغرب کی طرف۔ اس

واقعے سے بھی آپ حاضرین کی اچھی ذہن سازی کر سکتے ہیں۔ دیکھو! پنجاب کے زمین دار عُشر دیتے ہی نہیں۔ سارے پنجاب والے اگر عُشر دیں تو پنجاب کے کسی مدرسے کو کراچی آنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ لیکن وہاں عُشر دینے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ کُل کا کُل اپنا حق سمجھتے ہیں۔ علماء کو چاہیے کہ انہیں ترغیب دیں کہ غربا و مساکین کو ان کا حق دو۔ سب سے زیادہ حق دار تو وہ کسان ہے جو تمہاری زمین میں کام کرتا ہے۔ سب سے زیادہ تو غریب وہی ہے۔ پھر اس کے بعد دیکھو! اپنے علاقے میں بیواؤں، غریبوں، یتیموں اور معذوروں کی خدمت کرو۔ زمیندار اپنے علاقے کے ان مستحق لوگوں کو دیا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ ان کی زمین میں پیدا کرے۔ فقرا کے ساتھ خانقاہوں اور مدرسوں کو دینے کی ترغیب بھی چلاؤ اور اس کے لیے بنیاد اس درس کو بناؤ۔ واقعہ کی تفصیلات مطالعہ کر کے جاؤ۔ قصص القرآن کے نام سے دو کتابیں ہیں: ایک مختصر ہے اور ایک مفصل۔ مفصل مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کی کتاب ہے۔ بہت اچھی ہے۔ اس کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیے۔ مختصر میں اسی نام سے کتاب ہے "قصص القرآن"۔ مصنف، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی صاحب ہیں۔ پاکستان میں لاہور کے ایک ادارے "مکتبہ علم و عرفان" مال روڈ لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔ جس کے پاس وقت نہیں ہے یا حافظہ ساتھ نہیں دیتا کہ مفصل سے تفصیلات یاد کرے تو اس مختصر میں جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ لیں۔ ان شاء اللہ جغرافیہ قرآنی بیان کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔

اب ہم یہاں عالمِ اسلام کی مشہور علمی شخصیت اور بلند پایہ ادیب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے شہرہ آفاق سفرنامے سے اصحاب الجنہ کے متعلق ضروری اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ اس سے اس کے محلِ وقوع کے علاوہ دیگر مفید تفصیلات بھی سامنے آئیں گی۔

"اصحاب الجنۃ کی جگہ ضروان:

"صنعاء شہر سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر ایک جگہ "ضروان" کے نام سے موسوم ہے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم نے سورۃ القلم میں "اصحاب الجنۃ" کا جو واقعہ ذکر فرمایا ہے، وہ "ضروان" میں پیش آیا تھا۔ واقعہ مختصراً یہ ہے کہ ایک نیک اور خدا ترس شخص نے انواع و اقسام کے پھل دار درختوں پر مشتمل ایک وسیع و عریض باغ لگایا تھا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ جب کسی پھل کی کٹائی کا وقت آتا تو وہ سب سے پہلے علاقے کے غربا میں اپنے باغ کی پیداوار تقسیم کیا کرتا تھا اور اس طرح اس باغ کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ ضرورت مندوں پر خرچ ہو جاتا تھا۔

جب اس شخص کا انتقال ہوا اور باغ اس کی "ناخلف اولاد" کی طرف منتقل ہوا تو اولاد نے کہا کہ ہمارا باپ (معاذ اللہ) بے وقوف تھا کہ باغ کی دولت کا بڑا حصہ دوسروں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ ہم اس احمقانہ معمول کو جاری نہیں رکھیں گے۔ چنانچہ جب کٹائی کا وقت آیا تو انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ کوئی غریب آدمی باغ کے پاس نہ جا سکے۔ یہ انتظام کر کے وہ رات کو سوئے، صبح کو دولت کے نشے میں یہ سوچ کر باغ کی طرف روانہ ہوئے کہ آج ہم بلا شرکت غیرے باغ کی پیداوار سے فائدہ اٹھائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی بدنیتی کی بنا پر انہیں یہ سزا دی کہ رات رات میں پورا باغ تباہ ہو گیا۔ جب یہ لوگ صبح کو باغ میں پہنچے تو وہاں کچھ باقی نہ بچا تھا۔

قرآن کریم نے یہ واقعہ عبرت کے لیے بیان فرمایا ہے، لیکن یہ صراحت نہیں فرمائی کہ یہ کہاں پیش آیا تھا۔ اگرچہ بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حبشہ کی کسی جگہ کا واقعہ ہے، لیکن زیادہ تر مفسرین کا کہنا ہے کہ یمن میں پیش آیا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرمایا ہے: "كانوا من قرية يقال لها: ضَرْوَانُ على ستة أميال من صنعاء." (تفسیر ابن کثیر: ۴/۴۰۶)

ترجمہ: "یہ لوگ ایک ایسی بستی کے باشندے تھے جس کا نام "ضروان ہے" اور جو صنعاء سے چھ میل دور واقع ہے۔"

"ضروان" نامی بستی آج بھی صنعاء سے کچھ فاصلے پر موجود ہے (البتہ اب اسے "ض" کے بجائے "ذ" سے "ذروان" لکھنے لگے ہیں) اور یہاں کے علماء نے بتایا کہ یمن میں یہ بات تقریباً تواتر سے مشہور ہے کہ یہی بستی ہے جہاں کا واقعہ قرآن کریم نے سورۃ القلم میں بیان فرمایا ہے۔ خیال ہوا کہ جانے سے پہلے

اس بستی کی اس عبرت گاہ کو بھی دیکھ لیا جائے جسے قرآن کریم نے اس اہتمام سے بیان فرمایا ہے۔

شام کو میری واپسی کی پرواز آٹھ بجے تھی۔ میرے میزبان میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ لے کر پہلے ہی ایئرپورٹ پہنچنے کا وعدہ کر چکے تھے لہذا میں نے سوچا کہ اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ضروان ہوتا جاؤں۔ چنانچہ عصر کی نماز کے بعد تقریباً پانچ بجے ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب بھی ہم سفر تھے۔ ایئرپورٹ جانے والی روڈ سے جب ہم ''ضروان'' جانے والی سڑک پر مڑے تو سامنے سورج افق کی طرف ڈھل رہا تھا اور اس کے متصل ایک پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ شیخ عادل نے بتایا کہ یہ ''جبل ضین'' ہے اور انہوں نے اپنے معتبر اساتذہ سے سنا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وبر بن یحنس ؓ کو صنعاء میں مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا تو یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا قبلہ ٹھیک ''جبل ضین'' نامی پہاڑ کی طرف رکھنا۔ اس وقت سورج کے رخ سے یہ بات بالکل واضح تھی کہ قبلہ ٹھیک ''جبل ضین'' کی سمت واقع ہے۔

تقریباً آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد گاڑی ضروان کی حدود میں داخل ہوئی۔ یہاں ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ ''اصحاب الجنۃ'' کی خاص جگہ بستی سے آگے واقع تھی، چنانچہ ہم بستی والوں سے پتہ پوچھتے ہوئے آگے بڑھے اور ایک پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد نیچے اترے تو ایک عبرتناک منظر سامنے تھا۔ اب تک جتنا علاقہ ہم نے طے کیا تھا اس میں پہاڑوں اور زمین کی مٹی حسب معمول خاکی رنگ کی تھی، لیکن یہ جگہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہیں وہ باغ تھا جو عذاب الٰہی کے نتیجے میں تباہ ہو گیا تھا، پوری کی پوری سیاہ تھی اور نہ صرف سیاہ تھی، بلکہ زمین میں کالے کالے کانٹوں کی طرح کے پتھر اس کثرت سے نظر آ رہے تھے کہ اس پر چلنا دشوار تھا۔ اگرچہ کالے پتھروں کی زمین دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی پائی جاتی ہے، (مدینہ منورہ کے اطراف میں حرہ کے نام سے ایسی کئی زمینیں ہیں) لیکن اس سیاہ فام زمین کا انداز اس ان سے مختلف تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی شدید آگ لگی ہے جس نے پورے علاقے کو بھسم کر دیا ہے اور بہت وسیع وعریض علاقہ اس کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ چونکہ آس پاس کے علاقوں میں اس طرح کی کوئی اور زمین نہیں ہے اس لیے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب کے ہی آثار ہیں جو صدیاں گزرنے کے باوجود اب تک درس عبرت بنے ہوئے ہیں۔

قرآن کریم کی بیان کردہ ایک عبرت گاہ دیکھنے کے خیال سے ہم یہاں تو آ گئے تھے، مگر اس ماحول میں زیادہ ٹھہرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آنحضرت ﷺ نے عذاب الٰہی کے مقامات سے جلدی نکل جانے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ مانگتے ہوئے ہم یہاں سے روانہ ہو گئے۔'' (دنیا مرے آگے: 299)

4- اصحاب الکہف:

اصحاب کہف معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ اہل حق پر کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے ہجرت ضروری ہو جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا ہوتا ہے میدان میں ڈٹ کر کھڑا ہونا مفید ہوتا ہے۔ خود داعیانِ حق کے لیے بھی اور ان عوام کے لیے بھی جن کو اہل حق کی قربانی سے فائدہ ہونا ہوتا ہے۔ کبھی مفید یہ ہوتا ہے کہ میدان میں ڈٹ جائیں، قربانی دیں۔ کبھی مفید یہ ہوتا ہے کہ ہجرت کر جائیں۔ یہ بھی ایک طرح کی قربانی ہے۔ اس سے بھی اللہ تعالی راستے کھول دیتے ہیں۔ یہ اس واقعہ کا پس منظر ہے۔ کچھ اہل حق نوجوانوں پر زمین تنگ کر دی گئی کہ اگر یہاں رہتے ہو تو یہی شرکیہ اور دجالی مذہب قبول کرنا ہوگا۔ جیسے آج کل کیا جاتا ہے۔ یہاں پردے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہاں بچے کو مخلوط تعلیمی نظام میں بھیجنا لازمی ہوگا۔ ٹیکے ضرور لگوانے ہوں گے۔ قطرے ہر حال میں پلوانے ہوں گے۔ دینی تعلیم ممنوع ہوگی۔ بچے کو ڈانٹ ڈپٹ پر سزا ملے گی۔ جنوبی افریقہ میں قانون ہے کہ اگر کسی دکان میں چار ملازم ہیں تو دو عورتوں کو ضرور رکھے گا۔ اس کی اجازت نہیں صرف مردوں کو رکھے۔ غیر شرعی قانون زبردستی ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ عورتوں کو سر ننگا رکھنا لازمی ہے۔ اسکارف نہیں پہن سکتیں۔ مستقبل میں ایسا وقت آنے والا ہے جب سب کا ایک مذہب ہوگا۔ شرکیہ مذہب۔ کسی کو چھپ کر غار میں نماز پڑھنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ بالکل وہی صورت حال ہے جو دجال کے زمانے میں ہوگی۔ حدیث شریف میں بتا دیا گیا ہے۔ ایسے کڑے وقت میں مومن دو میں سے ایک کام کرے۔ یا ہمت کر کے ڈٹ کر میدان میں کھڑا

ہوجائے اوراس نظام کے خلاف بغاوت کردے یا اپنا ایمان بچا کر غیر بندوبستی علاقوں کی طرف، غیر انتظامی، غیر شہری علاقوں کی طرف نکل جائے۔ پہاڑوں اور ایسے علاقوں کی طرف جہاں کالے قانون کی پہنچ نہیں ہے۔ اصحاب کہف نے یہی راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے دعا مانگی "رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا." [کہف:10] آدمی ہمت بھی کرے اور دعا بھی کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ." [کھف:11] ہم نے خود ان کو تھپک تھپک کر لوری دے کر سلایا۔ بقیہ قصہ آپ قرآن کریم اور جغرافیۂ قرآنی کی کتابوں کا مطالعہ کرکے تفصیل سے بیان کریں۔ ہم محل وقوع کے اعتبار سے جو ابحاث ہیں صرف وہ بیان کردیتے ہیں۔

اصحاب کہف کا غار کہاں تھا؟

اس بارے میں تین قول مشہور ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

پہلا قول:

ایک قول امام قرطبی نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' المعروف ''تفسیر قرطبی'' میں بیان کیا ہے کہ ہمارے ہاں بلاد اندلس میں ایسا غار موجود ہے جس میں قرآن کریم کی بیان کردہ ساری نشانیاں ثابت ہوتی ہیں "وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ." [کہف:17] غار کا دہانہ اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا تھا کہ سورج کی روشنی اور حرارت دونوں پہنچتی تھیں۔ ان کو اندھیرا پریشان نہیں کرتا تھا۔ حرارت نہ پہنچنے کی وجہ سے ان کے جسم خراب نہیں ہوتے تھے۔ حرارت وروشنی پہنچنے کے باوجود نہ تیز روشنی ہوتی تھی کہ آنکھیں چندھیا جائیں اور نہ اتنی تیز حرارت ہوتی تھی کہ گرمی لگے، سونے نہ دے۔ ہم نے ان کے لیے بہترین انتظام کیا ہوا تھا۔ علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ ان کے علاقے اندلس میں ایسا غار موجود ہے۔ وہاں کے نوجوانوں کے ساتھ اس واقعے کا پیش آنا علاقے کے لوگوں میں مشہور ہے۔

دوسرا قول:

ایک قول یہ ہے کہ یہ غار ترکی کے علاقے میں تھا۔ ترکی کو ''ایشیائے کوچک'' بھی کہتے ہیں۔ ''اناضول'' یا ''اناطولیہ'' بھی کہتے ہیں۔ ترکی کی حدود میں مشہور شہر تھا ''طرسوس'' اصحاب کہف کا واقعہ اس شہر میں پیش آیا۔ ترکی والوں نے یہاں مسجد بنائی ہے اور یہاں پہاڑوں میں ایسا غار موجود ہے۔ انہوں نے لکھ کر بھی لگایا ہوا ہے۔ یہ اصحاب کہف کا غار ہے۔ تضاد اس میں بھی نہیں ہے۔ غلط یہ دوسرا قول بھی نہیں ہے، کیوں؟ ابھی میں تیسرے قول کے بعد بیان کرتا ہوں۔

تیسرا قول:

راجح تیسرا قول ہے۔ موجودہ اردن کے دارالحکومت عمّان کے قریب پچاس، ساٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر پہاڑی علاقے میں ایک غار دریافت ہوا ہے۔ اگر اصحاب کہف کے غار کو قرآن کے بیان کردہ واقعے اور علامات کی روشنی میں پرکھا جائے تو سب سے زیادہ علامات اس غار پر منطبق ہوتی ہیں۔ یہ راجح بایں معنی ہے کہ بقیہ جو دونوں اقوال ہیں، وہ بھی غلط نہیں۔ محققین فرماتے ہیں یہ واقعہ کسی ایک ہی جماعت کے ساتھ پیش نہیں آیا۔ مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر وطن چھوڑنے والے مختلف زمانوں میں قربانی پیش کرتے رہے ہیں۔ قرآن نے ان میں سے زیادہ قربانی دینے والے، زیادہ صاحب ایمان لوگوں کو چن لیا ہے کہ ان کے واقعے کو بیان کیا ہے۔ بقیہ کا ذکر نہیں کیا۔ بقیہ خود بخود ضمن میں آجاتے ہیں کہ مرکزی واقعہ ایک ہی ہے۔ قرآن کی علامات کسی ایک پر زیادہ منطبق ہوں گی تو ہم کہیں گے راجح یہ ہے اور بقیہ پر علامات کم منطبق ہو رہی ہوں گی، لیکن اصل مرکزی قصہ تو ان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تضاد کسی میں بھی نہیں ہے اور غلط کوئی بھی قول نہیں ہے۔ مرجوح یا راجح بایں معنی ہے کہ قرآن کریم نے

کس کو اصل موضوع بنایا ہے؟ بقیہ کے ساتھ بھی اس طرح پیش آیا ہو تو مستبعد یا محال نہیں ہے۔ ترکی چونکہ بین الاقوامی گذرگاہ ہے۔ یورپ، ایشیا دنیا بھر کے سیاح وہاں جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاں واقع غار کو کافی اہمیت دی ہے۔ اردن ذرا دور ہے اور زیادہ دنیا وہاں جاتی بھی نہیں ہے۔ انہوں نے اسے کوئی زیادہ ترقی نہیں دی۔ ترکی والوں نے یہاں مسجد بنائی ہے۔ "قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا." [کہف: 21] ترکی والوں نے بھی مسجد بنائی ہے۔ ممکن ہے کسی زمانے میں ایسے صاحب ایمان موحدین کی جماعت اس علاقے میں ہو، لیکن قرآن کریم کے مصداق کے اعتبار سے یہ راجح نہیں ہے۔ سیڑھیاں نیچے اتر رہی ہیں۔ انہوں نے جنگلے وغیرہ لگائے ہیں تاکہ آسانی سے نیچے جایا جا سکے۔ سیاحوں کو پوری سہولتیں دی ہوئی ہیں لیکن جو قول زیادہ راجح ہے، جسے ماہرین و محققین اختیار کرتے ہیں، وہ اردن کا ہے۔ بہرکیف! اصل نکتہ جو سمجھنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو فتنے سے بچنے کے لیے اپنے ہم عقیدہ، ہم نظریہ لوگوں کے ساتھ جڑنا چاہیے۔ "كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ." [توبہ: 119] اس سے ایک دوسرے کو تقویت ملتی ہے۔ ایمان پر استقامت رہتی ہے اور ساتھ ہی باطل کے خلاف مزاحمت کرنی چاہیے۔ اگر اندر رہ کر مزاحمت ممکن نہیں ہے تو ہجرت کر جانا چاہیے "وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً." [النساء: 100] اللہ تعالیٰ اس کی مدد و نصرت فرماتے ہیں۔ دنیا آزمائش کا وقفہ ہے۔ یہاں امتحان زیادہ لمبا نہیں ہے۔ جب گذر جاتا ہے تو امتحان میں پورا اترنے والوں کو اللہ پاک آخرت میں بہت نوازیں گے۔ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی مدد اور برکت نازل ہوگی۔ بس یہ نکتہ اس قصے کا حاصل ہے۔

موقع کی مناسبت سے یہاں اردو ادب کے تاریخی اور شاہکار سفرنامے ''جہانِ دیدہ'' سے اصحابِ کہف کے غار کا آنکھوں دیکھا حال بمع مفید توضیحات آپ کو سنواتے ہیں:

''اصحابِ کہف:

''مسیحی مصادر میں تقریباً جزم کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ ترکی کے شہر ''افسس'' کے قریب پیش آیا تھا (جس کا اسلامی نام ''طرسوس'' ہے) اور وہیں پر ایک غار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اصحابِ کہف کا غار ہے۔ شاید انہی مسیحی روایات کے زیر اثر بہت سے مسلمان مفسرین اور مؤرخین نے بھی اصحابِ کہف کا محلِ وقوع ''افسس'' کو ہی بتایا ہے۔ تاہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت تفسیر ابن جریرؒ میں مروی ہے جس میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اصحابِ کہف کا غار ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب (یعنی اردن میں) واقع ہے۔ اس روایت اور متعدد دوسرے قرائن کی بنیاد پر آخر دور کے بہت سے محققین نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ یہ غار اردن میں واقع ہے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہارویؒ نے قصص القرآن میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور متعلقہ تاریخی اور جغرافیائی شواہد کی روشنی میں اسی کو درست قرار دیا ہے کہ یہ غار اردن میں ہے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''ارض القرآن'' میں اردن کے قدیم شہر ''پٹرا'' کو ''رقیم'' قرار دیا ہے۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ نے بھی تفسیر ''معارف القرآن'' میں مفصل بحث کے بعد اسی طرف رجحان ظاہر فرمایا ہے کہ یہ غار اردن میں ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی رائے بھی یہی تھی۔

ان تمام حضرات کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اردن کے مشہور تاریخی شہر ''پٹرا'' کا اصل نام ''رقیم'' تھا جسے رومی حکومت نے بدل کر ''پٹرا'' کر دیا اور غار اسی کے قریب کہیں واقع تھا۔ لیکن 1953ء میں اردن کے محقق ''تیسیر ظبیان صاحب'' کو کسی طرح پتہ چلا کہ عمان کے قریب ایک پہاڑ پر ایک ایسا غار واقع ہے جس میں کچھ قبریں اور مردہ ڈھانچے موجود ہیں اور اس غار کے اوپر ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اس غار کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ یہ جگہ عام راستے سے ہٹ کر واقع تھی، اس لیے کئی کلو میٹر دشوار گزار راستہ طے کر کے وہ اس غار کے دہانے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ''تیسیر ظبیان صاحب'' کے الفاظ یہ ہیں:

''ہم ایک اندھیرے غار کے سامنے کھڑے تھے جو ایک دور افتادہ جگہ اور ایک چٹیل پہاڑ پر واقع تھا۔ غار میں اس قدر اندھیرا تھا کہ ہمارا اندر داخل ہونا مشکل ہو گیا۔ ایک چرواہے نے ہمیں یہ بتایا کہ غار کے اندر کچھ قبریں ہیں اور ان میں بوسیدہ ہڈیاں پڑی ہیں۔ غار کا دروازہ جنوب کی سمت تھا اور اس کے دونوں کناروں پر دو ستون تھے جو چٹان کو کھود کر بنائے گئے۔ میری نظر اچانک ان ستونوں پر بنے ہوئے نقوش پر پڑی تو اس پر ''بیزنطی'' نقوش نظر آ رہے تھے۔ غار کو ہر طرف سے پتھروں کے ڈھیروں اور ملبے نے چھپایا ہوا تھا اور یہاں سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر ایک بستی تھی جس کا نام 'رجیب' تھا۔

تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی تحقیق جاری رکھی، محکمہ آثار قدیمہ کو متوجہ کیا، بالآخر ایک ماہر اثریات ''رفیق رجانی صاحب'' نے ماہرانہ تحقیق کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ یہی غار اصحاب کہف کا غار ہے، چنانچہ 1961ء میں اس کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو اس رائے کی تائید میں بہت سے قرائن و شواہد ملتے چلے گئے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ اس غار کا دہانہ جنوب کی طرف ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پر قرآن کریم کی یہ آیت پوری طرح صادق ہے:

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ. ''اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ طلوع ہوتا تو ان کے غار سے دائیں جانب جھکتا ہوا گزرتا اور جب وہ غروب ہوتا تو ان کے بائیں جانب سے کترا کر گزرتا اور یہ لوگ اُس غار کے کشادہ حصے میں تھے۔''

اس غار میں صورتِ حال یہی ہے کہ دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی، بلکہ طلوع و غروب کے وقت دائیں بائیں سے گزر جاتی ہے اور غار کے اندر ایک کشادہ خلا بھی ہے جس میں ہوا اور روشنی آرام سے پہنچتی ہے۔

2۔ قرآنِ کریم نے یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ بستی کے لوگوں نے اس غار کے اوپر مسجد بنانے کا ارادہ کیا تھا، چنانچہ اس غار کے ٹھیک اوپر کھدائی کرنے اور ملبہ ہٹانے کے بعد ایک مسجد بھی برآمد ہوئی ہے جو قدیم رومی طرز کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ شروع میں بازنطینی طرز کا ایک معبد تھا اور عبدالملک بن مروان کے زمانے میں اسے مسجد بنا دیا گیا۔

3۔ عصرِ حاضر کے بیشتر محققین کا کہنا یہ ہے کہ وہ مشرک بادشاہ جس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اصحابِ کہف نے غار میں پناہ لی تھی، ''ٹراجان'' تھا جو 98ء سے 117 تک حکمران رہا ہے اور اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بت پرستی سے انکار کرنے والوں پر سخت ظلم ڈھاتا تھا۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ''ٹراجان'' نے 106ء میں شرقِ اردن کا علاقہ فتح کر لیا تھا اور اسی نے عمان کا وہ اسٹیڈیم تعمیر کیا تھا جس کا ذکر پیچھے آ چکا ہے اور وہ بادشاہ جس کے عہد میں اصحابِ کہف بیدار ہوئے اس کا نام جدید محققین ''تھیوڈوسیس'' بتاتے ہیں، جو پانچویں صدی کے درمیان میں گزرا ہے۔ دوسری طرف اس نئے دریافت شدہ غار کے اندر جو سکے پڑے ہوئے ملے ہیں ان میں سے کچھ ''ٹراجان'' کے زمانے کے ہیں (موقع اصحابِ الکہف: 35) جس سے اس خیال کو بڑی تقویت ملتی ہے کہ یہی اصحاب کہف کا غار ہے۔

4۔ قرآنِ کریم اصحابِ کہف کو "أَصْحَابُ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ" (غار اور رقیم والے) کہا ہے۔ رقیم کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح میں مختلف آرا بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن بیشتر محققین کا خیال ہے کہ رقیم اس بستی کا نام تھا جس میں ابتداءً یہ حضرات آباد تھے۔ اب جس جگہ یہ غار واقع ہے وہاں سے سو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ''رجیب'' کہلاتی ہے۔ ''رفیق الدجانی'' صاحب کا خیال ہے کہ یہ 'رقیم' کی بگڑی ہوئی شکل ہے، کیونکہ یہاں کے اکثر بدو قاف کو جیم اور میم کو باء سے بدل کر بولتے ہیں (موقع اصحاب الکہف: 118) چنانچہ اب حکومتِ اردن نے اس بستی کا نام سرکاری طور پر 'رقیم' ہی کر دیا ہے۔ بعض قدیم علمائے جغرافیہ نے بھی رقیم کی بستی کو عمان کے قریب بتایا ہے۔ چنانچہ معروف جغرافیہ نگار ''ابوعبداللہ البشاری المقدسی'' اپنی کتاب "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم"

میں لکھتے ہیں:

”والرَّقِيْمُ بَلَدٌ فِيْ شَرْقِ الأَرْدنِ بِالقُربِ مِنْ عُمَّانَ حَيثُ وُجِدَتْ مغارةٌ فيها عددٌ مِن الجُثَثِ غيرِ البَالِيَةِ.“
(موقع أصحاب الكهف:49)

”رقیم شرقِ اردن میں عمان کے قریب ایک شہر ہے جہاں ایک غار بھی پایا گیا ہے جس میں کچھ انسانی ڈھانچے بھی ہیں جو زیادہ بوسیدہ نہیں ہوئے۔“

اس کے علاوہ علامہ حمویؒ نے بھی رقیم کی تشریح کرتے ہوئے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ:

”إِنَّ بالبَلقاءِ بأرضِ العربِ مِنْ نَواحِي دِمشقَ مَوضِعًا يزعَمُونَ أَنَّهُ الْكهفُ والرَّقِيمُ قُربَ عُمانَ.“

”دمشق کے مضافات میں جو عربی زمین بلقاء کہلاتی ہے، اس میں شہر عمان کے قریب ایک جگہ ہے جس کے بارے میں ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہی کہف اور رقیم ہے۔“

5- تیسیر ظبیان صاحب نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان اسی علاقے کے کسی غار کو اصحابِ کہف کا غار سمجھتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں بادشاہ روم کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا تو وہ راستے میں شام و حجاز کے راستے پر ایک پہاڑ سے گزرے جس کا نام ”جبل الرقیم“ تھا۔ اس میں ایک غار بھی تھا جس میں کچھ ڈھانچے تھے اور وہ بوسیدہ نہیں ہوئے تھے۔ نیز تفسیر قرطبی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اس غار سے گزرے تھے اور اسے اصحابِ کہف کا غار قرار دیا تھا۔ ”فتوح الشام“ میں ”واقدی“ نے بھی حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کا ایک طویل قصہ لکھا ہے کہ وہ شام کی طرف جہاد کے لیے روانہ ہوئے اور راستہ بھول گئے، بالآخر بھٹکتے بھٹکتے ”جبل الرقیم“ کے پاس پہنچے تو اسے دیکھ کر پہچان گئے۔ اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ اصحابِ کہف کا غار ہے، چنانچہ وہاں نماز پڑھ کر عمان شہر میں داخل ہوئے۔

(موقع أصحاب الكهف:46,47,103)

بہر کیف! اتنے پرانے واقعے کے محلِ وقوع کے بارے میں حتمی طور پر سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ کہنا تو بہت مشکل ہے، لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اب تک جتنے مقامات کے بارے میں ”مقامِ اصحابِ کہف“ ہونے کی رائے ظاہر کی گئی ہے، ان سب میں جتنے زیادہ قرائن و شواہد اس غار کے حق میں ہیں کسی اور غار کے حق میں اتنے قرائن موجود نہیں ہیں۔ تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی کتاب میں ”افسس“ کے غار سے اس غار کا موازنہ بھی کیا ہے، اس موازنے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ یہ غار عمان شہر سے 7 کلومیٹر جنوب میں واقع ہے اور اردن کی مرکزی شاہراہ جو عقبہ سے عمان تک گئی ہے، اس کا فاصلہ 3 کلومیٹر ہے۔“

(جہانِ دیدہ:222-218)

5- اصحاب القریہ یا اصحاب یاسین:

یہ واقعہ ”اصحاب القریہ“ یا ”اصحاب یاسین“ دونوں ناموں سے مشہور ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ داعی جب آ کر کسی قوم کو دعوت دیتے ہیں تو کم نصیب لوگوں کے انکار کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ یا وہ خالی الذہن ہوتے ہیں یا منکر ہوتے ہیں، یا معاند ہوتے ہیں۔ یعنی اس نے خود بھی عمل نہیں کرنا ہے۔ باطل کو چھوڑنا بھی نہیں ہے اور اہل حق کے خلاف اقدام بھی کرنا ہے۔ یہ دعوت کے دوران پیش آنے والے واقعات کا پس منظر ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ ایسا کرتا ہے کہ مخالفین میں سے ہی کسی کو مدد کے لیے اٹھا دیتا ہے اور ان میں سے کچھ خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو اہل حق کے معاون بننے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ دنیاوی اعتبار سے کمزور مگر ہوتے مخلص ہیں۔ اہل حق کو اس پر کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ”ملأ القوم“ اور ”المترفین“ (سیاسی وڈیرے اور

مراعات یافتہ طبقہ) ہمارے ساتھ نہیں ہیں، ہمارے ساتھ تو یہی گرے پڑے لوگ ہیں۔اس پر احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔سنتُ اللہ یہی ہے۔اللہ رب العزت کی عادت اور طریقہ یہی ہے۔حق کی دعوت والوں کی آزمائش ہوتی ہے۔سیاسی اثر ورسوخ اور دنیاوی دولت والے ان کے مخالف ہوتے ہیں، جبکہ کمزور لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہوجاتے ہیں "وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ." [یس:20] اے میری قوم! ان ہمدرد نبیوں کی بات مان لو، ان کے خلوص کو پرکھنے کا پیمانہ یہ ہے: "لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ." [یس:21] اتباع کس کی کرنی چاہیے؟ خیر خواہ اور پرخلوص آدمی کی "مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا." جو تمہیں سب کچھ دے کر کچھ نہ لینا چاہتا ہو، اور جو ہدایت پر ہو "وَهُمْ مُهْتَدُونَ." اس کی اتباع کرنی چاہیے۔اتباع کی دونوں شرائط ان انبیاء میں موجود ہیں۔ان کی بات مان لو۔آگے کا واقعہ اور انجام مشہور ہے۔دہرانے کی ضرورت نہیں۔اصحاب القریہ کا واقعہ "انطاکیہ" نامی بستی میں پیش آیا ہے۔بحرِ متوسط کے مشرقی کنارے پر واقع ساحلی پٹی "ساحلِ شام" یا "ساحلِ بلاد اسلام" کہلاتی ہے۔یہاں ترکی کے قریب یہ بستی واقع تھی۔اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔یہ مبلغین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد تھے۔اس علاقے میں آثارِ قدیمہ آج بھی موجود ہیں۔قدیم گرجا گھر ہے۔ آپ علیہ السلام کے شاگردوں کو "مسیحی" کا لقب سب سے پہلے اسی بستی میں ملا ہے۔انجیل میں یونہی لکھا ہے۔اس زمانے میں عیسائی مذہب برحق تھا۔

6-اصحابِ اخدود:

"اصحاب الاخدود" یعنی خندق والوں کا واقعہ بھی بڑا سبق آموز ہے۔مسلم شریف میں تفصیل سے روایت ہے۔ان کی قوم میں ایک جادوگر تھا۔بوڑھا ہونے لگا تو اس نے کہا کوئی شاگرد دو۔مرنے سے پہلے اسے اپنا فن سکھادوں۔ایک بچہ جادو سیکھنے کے لیے اس کے پاس جاتا رہا۔راستے میں ایک خدا پرست راہب تھا۔اس نے کہا میں تمہیں اللہ کے مبارک نام سکھادیتا ہوں۔یہ سارے جادو باطل ہیں۔یہ "اسمِ اعظم" برحق ہے۔اس بچے کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے جان پیدا کردی۔آگے کا واقعہ آپ حضرات کو معلوم ہے۔لوگوں کو اسمِ اعظم کی برکت سے شفا ہونے لگی۔ایک درباری بھی اس کے پاس آیا اور ٹھیک ہوگیا۔بادشاہ نے پوچھا: کیسے ٹھیک ہوئے؟ کہا: "بِاسْمِ رَبِّ الْغُلَامِ" پڑھا تو میں ٹھیک ہوگیا۔اس نے کہا: میرے علاوہ بھی تمہارا کوئی رب ہے؟ کہا: ہاں! جو اس بچے کا رب ہے۔اس نے اس بچے کو گرفتار کرنے کا حکم دیا کہ پہاڑ پر لے جاکر گرادو۔وہ بچہ بچ کر آگیا۔بادشاہ نے کہا دریا میں ڈبودو۔وہ پھر بچ کر آگیا پھر خود بچے نے اس کو کہا: یہ نہیں ہوسکتا۔تمہیں مجھ پر قدرت نہیں مل سکتی۔الا یہ کہ مجھے سب لوگوں کے سامنے کسی جگہ لٹکادو، پھر "بِاسْمِ رَبِّ الْغُلَامِ" کہہ کر تیر مارو۔اس کو جب شہید کیا تو سارے لوگ یہ دیکھ کر مسلمان ہوگئے۔زبانی دعوت سے وہ کام نہ ہوتا جو شہادت کے بعد ہوگیا۔یہ بدبخت بادشاہ اتنا کچھ دیکھنے کے باوجود باز نہ آیا۔ایک خندق کھدوادی کہ سب ایمان لانے والوں کو اس میں ڈالو۔وہ بھی ایسے صاحب ایمان تھے۔بے دریغ آگ کی خندق میں کود گئے۔ایک عورت جھجکی تو اس کے بچے نے کہا: "يَا أُمَّاهُ اصْبِرِي، فَإِنَّكِ عَلَى الْحَقِّ." ماں! پروا نہ کرو، کود جاؤ۔یہ دیکھنے میں آگ ہے پھر اس کے بعد نجات ہی نجات ہے۔جیسے کہ حدیث شریف میں آیا ہے دجال کے ساتھ جو آگ ہوگی، وہ پانی ہے۔جو پانی ہوگا، سہولتیں ہوں گی، وہ درحقیقت آگ ہوگی۔اس میں کود جاؤ۔ٹھنڈی ہوجائے گی۔یہ واقعہ جو پیش آیا تھا خندق والوں کا کہ وہ اپنے سامنے دیکھتے تھے خندق کھدی ہوئی ہے۔آگ جل رہی ہے اور موت جیتے جاگتے قبول کرنی ہے، لیکن حق سے نہیں پھرتے تھے۔اس میں اہل حق کے لیے بڑی تقویت ہے حق کے لیے قربانی دینے والوں کے لیے بڑی فضیلت ہے۔اس واقعے کے ذریعے لوگوں کی بہت اچھی ذہن سازی کی جاسکتی ہے۔"اصحاب اخدود" کی جگہ یمن میں نجران کے قریب ہے۔یہاں کھدی ہوئی خندق کے آثار بھی ملتے ہیں۔"اصحاب الجنۃ" اور "اصحاب اخدود" دونوں موجودہ جغرافیہ کے لحاظ سے یمن میں ہیں۔باقی یہ بات یاد رکھیں کہ قرآنی جغرافیہ کے حوالے سے اس پر کبھی اصرار نہ کریں کہ کوئی واقعہ سوفیصد بالجزم یہیں ہوا تھا۔بس یوں سمجھیں اور کہیں ان سے منسوب ہے۔ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔دوسرا نکتہ یہ کہ یہ جو کہتے ہیں: "آثارِ قدیمہ" "قومی یا عالمی ورثہ" ہیں۔یہ لفظ کہتے ہی ذہن قرآن کے مقصدِ تذکیر سے دور چلا جاتا ہے۔ورثہ کا معنیٰ کوئی قیمتی اور انتہائی قابل حفاظت چیز۔جس کے لیے پورا محکمہ ہوگا جو اس

عذاب شدہ، لعنت شدہ حصے کی ایک ایک اینٹ کو سنبھال کر رکھے گا۔ ذہن ادھر چلا جاتا ہے۔ پچھلی قوموں کی ہمارے پاس جو باقیات ہیں، ان کو سنبھال کر رکھنا، ان کو جھاڑ پونچھ کر رکھنا ضروری نہیں۔ ان پر جس وجہ سے عذاب آیا ہے، اس سے بچنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ کچھ الفاظ ذہن بدل دیتے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ والے اور قومی یا عالمی ورثہ کے بورڈ لگانے والے ذہن بدل دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے سامعین کو دوسرا ذہن دینا ہے۔

7-اصحاب الفیل:

اصحاب کے نام سے جو واقعات قرآن نے ذکر کیے ہیں، ان کی فہرست میں اگلا تذکرہ ''اصحاب الفیل'' کا ہے۔ جزیرۃ العرب کے وسط میں بیت اللہ تھا۔ اس سے اوپر تبوک کے پاس قوم ثمود اور نیچے یمن میں قوم عاد ہے۔ ابرہہ بھی یہیں نیچے یمن میں ہوتا تھا۔ یہیں پر "اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ." [الفجر:7] ہے۔ جسے ''ہزار ستونوں والا شہر'' کہا جاتا تھا۔ آج اس کا نام و نشان نہیں ملتا۔ دنیا حیران ہوتی ہے اتنی بڑی یورپی تہذیب ہے۔ اتنی بڑی امریکی تہذیب ہے۔ جس کو دیکھو واپس آ کر قصیدے پڑھتا ہے۔ جی! کیا وہاں کی صفائی؟ کیا وہاں کا نظم و ضبط؟ کیا وہاں کے اصول و قوانین؟ قرآن کہتا ہے: "لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ." [الفجر:8] اس جیسا شہر تو تخلیق نہیں کیا گیا تھا، لیکن ساتھ کہتا ہے: "اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ." [الفجر:14] رب تعالیٰ اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔ تم دنیا کے مظلوم انسانوں کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ جب پکڑ میں آ گئے! خدا کی قسم ایک جھٹکا کافی ہے۔ سارا کرّ و فر ٹھکانے لگ جائے گا۔

یہ آپ کے سامنے نقشے پر ارض حبشہ ہے۔ بیچ میں بحر احمر ہے جو عرب اور حبشہ کو جدا کرتا ہے۔ ادھر عرب رہتے تھے، ادھر حبشی۔ حبشہ کے ایک بادشاہ ابرہہ کو عروج ملا۔ وہ ادھر یمن میں آ گیا۔ اس نے کہا: دنیاوی بادشاہت میرے پاس ہے۔ روحانی مرکز مکہ میں کیوں ہے؟ اس کے دماغ میں فتور سا گیا تھا۔ یمن میں ایک عبادت خانہ بنالیا اور سب کو کہا ادھر آیا کرو۔ آنے والوں کے لیے اس نے بہت کچھ انتظام کیا لیکن کوئی بھی نہ گیا۔ اس نے کہا: جب تک اصل بیت اللہ ختم نہیں ہوگا، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ جب تک اہل حق کا مرکز منہدم نہیں ہوگا، اس وقت تک میرے گھڑے ہوئے جعلی مرکز کے گرد کوئی بھی طواف کرنے نہیں آئے گا۔ اس نے اس وقت کی ناقابل شکست طاقت جمع کی۔ اس وقت عرب میں اونٹ ہوتے تھے۔ افریقہ میں ہاتھی ہوتے تھے۔ اس نے افریقہ کے ہاتھیوں کو لاد کر کشتیوں میں ڈالا اور بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے انہیں سمندر پار لا کر یمن میں اتارا۔ ہاتھیوں کا لشکر تیار کیا۔ اونٹ والوں نے یہ طاقت کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا یہ ان کا سامنا کر ہی نہیں سکیں گے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس وقت کے لحاظ سے ناقابل شکست لشکر لے کر روانہ ہوا اور یہ بھول گیا کہ اگر کعبہ کے اونٹ چرانے والے محافظ میرا سامنا نہیں کر سکتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس گھر کا مالک بھی میری طاقت کو پامال نہیں کر سکتا۔ طاقت کے نشے میں آ کر لوگ آسمان پر موجود خدا کو بھول جاتے ہیں۔ زمینی خداؤں کے اقتدار کے سامنے مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ جب حرم شریف کے قریب پہنچا تو حدود حرم میں داخل ہونے سے پہلے اللہ پاک کا عذاب آ پہنچا۔ یہ ایک قول ہے۔ دوسرے قول کے مطابق مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان ایک نشیبی جگہ ہے، اس کو ''وادی مُحَسِّر'' کہتے ہیں۔ جب یہ وادی محسر میں جب پہنچا تو مہلت ختم ہو گئی۔ اس پر اللہ نے وہ لشکر بھیجا جو اس کے لشکر کے مقابلے میں کوئی مادی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ابابیلیں اور ان کی چونچوں میں پکڑی ہوئی کنکریاں، لیکن ان میں کوئی ایسی ایٹمی طاقت تھی کہ ہاتھی سوار، فیل بان کے سر پر لگتیں تو اس کو ہاتھی سمیت چیرتے ہوئے زمین میں جا گھستی تھیں۔ سارا لشکر ایسا ہو گیا جو قرآن کی بے مثال تشبیہ ہے "كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ." [الفیل:5] بھوسے کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں ہوتی اوپر سے جس طرح جانور اس کو کھا کر خراب کرتے ہیں کہ کھانے کے بعد اسی کو روندتے بھی ہیں، اسی پر لید بھی کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ بے قیمت چیز اور کیا ہوگی؟ ایک تو پہلے سے تھا بھوسہ، اوپر سے جانور نے کھایا ہے، کسی انسان نے نہیں کھایا اور جانور کھانے اور منہ مارنے کے ساتھ پاؤں بھی مارتا ہے، اس پر لید بھی کرتا ہے۔ کسی برباد چیز کے لیے اس سے اچھی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔ اس سارے لشکر کو "كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ." کر چھوڑا۔ اب آپ اس واقعے کو موجودہ عالمی حالات پر بہترین طریقے سے تطبیق دے سکتے ہیں۔ آج یہود و نصاریٰ کی افواج حرمین کے گرد براجمان ہیں، لیکن نہیں جانتیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے ناپاک

ارادوں کی بھی خبر ہے اور وہ ان کے مکروفریب سے بھی پوری طرح واقف ہے۔ اس کی طاقت آج بھی کنکریوں سے ایٹم بم کا کام لے سکتی ہے۔ ''اصحاب الفیل'' کا واقعہ اپنے اندر بڑی عبرت رکھتا ہے۔ جن لوگوں کو اللہ کے مقابلے میں آنے کا شوق ہوجاتا ہے اور حقیقی رب العالمین کے سامنے ان کو اپنی جھوٹی کاغذی خدائی بنا رکھی ہے۔ ایسے لوگ تاریخ کے مختلف ادوار میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے اس قصے میں عبرت کا بے پناہ سامان موجود ہے۔

8- اصحابُ الأ یکہ:

آٹھواں قصہ ''اُصحاب الأ یکہ'' کا ہے۔ ان کی طرف بھیجے جانے والے نبی وہی تھے جو اہل مدین کی طرف بھیجے گئے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام۔ اور ان کا مرض بھی وہی تھا جو قوم شعیب کا تھا یعنی سرمایہ پرستی، مادیت پرستی، مفاد پرستی اور حلال وحرام میں تفریق کیے بغیر دولت کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں پڑنا۔ ان کا انجام بھی تقریباً وہی تھا۔ اس لیے اسے قوم شعیب کے ضمن میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ان کی جگہ مدین سے ذرا اوپر فلسطین سے نیچے تھی۔ یہاں درختوں کے سرسبز جھنڈ تھے جن میں یہ خوشحالی اور سرمایہ دار قوم رہتی تھی، اس لیے انہیں ''اصحاب الأ یکہ'' یعنی ''جھنڈ یا جنگل والے'' کہا جاتا ہے۔ آج کل کے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں اور برے انجام پر اصلاحی بیان کے لیے قومِ شعیب اور اصحاب الایکہ کا قصہ بہترین عنوان بن سکتا ہے۔

یہ آٹھ قصے مکمل ہوئے۔ جن کو قرآن کریم نے اصحاب فلاں، اصحاب فلاں کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کی زندگی میں یہ واقعہ مشہور ہے، ان کو اگر ہم اسی واقعے ہی سے مسمّٰی کردیں تو وہ اسم با مسمّٰی ہوں گے۔ جیسے ''ابُ'' کے لفظ کے ساتھ کنیت ہوتی ہے۔ ابو ہریرہ، ابوتراب۔ اسی طرح اصحاب کی اضافت اسی طرح کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ وہ سات واقعات تھے۔ اگر آپ روز درسِ قرآن دیتے ہیں، یا گرمی کی چھٹیوں میں یا رمضان کے دنوں میں یا اعتکاف کے دنوں میں درس دیتے ہیں تو ایک ایک واقعہ روز بیان کریں۔ یہ آپ پر ہے کہ کیسے اپنی مسجد کا ماحول بناتے ہیں؟ اصل تو قرآن کریم کی آیات پڑھ کر قرآن کا ترجمہ وتفسیر سمجھانا ہے۔ اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ''قرآنی جغرافیہ'' کا ذرا سا سہارا لے لیں۔ بس! اس سے آگے نہیں۔ قرآن کریم کوئی جغرافیہ یا قصص کی کتاب نہیں ہے۔ اصل مقصد..... نصیحت واصلاح..... کی طرف فوراً پلٹ کر آنا ہے۔ یہ دوسرا باب مکمل ہوا جو ''اصحاب'' کے عنوان سے تھا۔

درس:5

دو خصوصی قومیں

دو خصوصی قومیں ایسی ہیں جن کا تذکرہ تو قرآن کریم نے کیا ہے، لیکن ان کی طرف جانے والے داعی نے ان کو کیا دعوت دی تھی؟ ان کا ردعمل کیا تھا؟ اس کا تفصیلی تذکرہ نہیں۔ اجمالی بیان پر غور سے ہی کافی کچھ عبرت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان دو قوموں کے نام ہیں: قومِ سبا اور قومِ تُبّع۔

1-قوم سبا:

ان کے جو حالات قرآن کریم نے بیان کیے ہیں ان پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ ''شکم سیری'' اور ناشکری کے جرم میں مبتلا تھے۔ اس طرح کے جرم میں مبتلا مجرم کی نفسیات یہ ہوتی ہیں کہ اس پر نعمتیں تمام ہوگئی ہوتی ہیں، پھر شکر کرنے کے بجائے وہ کفر پر، ناشکری پر اتر آتا ہے۔ اس انداز میں کہ نعمت نہیں چاہیے، زحمت چاہیے۔ خود آزاری سے لذت کشید کرتا ہے اور خود کو تکلیف دینے سے مزا لیتا ہے۔ ہماری مغلیہ سلطنت پر بھی ایسا ہی دور آیا تھا۔ یہ لوگ لذت پرستی میں اتنا آگے چلے گئے تھے کہ انہیں ایک ایک وقت میں ستر ستر کھانے کھا کر بھی سمجھ نہیں آتا تھا کہ اب کیا کھائیں؟ تب انہوں نے کیا کیا؟ ایسے ایسے کھانے ایجاد کیے جو خود آزاری، خود اذیتی والی لذت پر مبنی ہوں۔ اپنے آپ کو تکلیف دیں۔ کھاتے وقت زبان جلے۔ حسِ ذائقہ کو اذیت پہنچے۔ ناک بہہ رہی ہے۔ آنکھوں سے پانی آرہا ہے۔ ''خود آزاری'' یعنی اپنے آپ کو تکلیف دے کر اس سے مزے لیں۔ یہ ان کی بیماری تھی۔ ہمارے ہاں جو کھانے پائے جاتے ہیں، بارہ مصالحوں والی حلیم، مرغ تنجن، مسور کی دال جس میں اٹھارہ قسم کے مصالحے ڈالے جاتے ہیں۔ یہ سب مغلیہ سلطنتوں کے باورچیوں نے ایجاد کیے تھے۔ اپنے آپ کو شہزادوں اور شہزادیوں کی گھرکیوں سے، ڈانٹوں سے بچانے کے لیے۔ مغل شہزادے کہتے تھے یہ کیا ہے چاندی کے ورق میں لپٹا کھانا لے آتے ہو۔ کوئی ایسی چیز لاؤ جو جسم میں آگ لگا دے۔ واجد علی شاہ رام پور کا نواب تھا۔ اس کے لیے پورے بکرے کی یخنی میں ایک سیر پلاؤ پکتا تھا۔ یہ لوگ باورچیوں سے کہتے تھے آج کوئی ایسی چیز کھلاؤ کہ بس جلا ڈالے۔ ایسا کباب بناؤ، ایسی حلیم بناؤ جس میں مصالحے ہی مصالحے ہوں۔ بقیہ چیزیں صرف چبانے کے لیے ہوں۔ تو جب اس کے دماغ میں فتور آجاتا ہے اس طرح کی نفسیات اس کی طبیعت میں پیدا ہوجاتی ہیں پھر وہ مقصد زندگی سے ہٹ جاتا ہے۔ پھر ''شمشیر و سنان اول اور طاؤس و رباب آخر کا فلسفہ حقیقت بن جاتا ہے۔'' قوموں کے زوال اور پستی کی یہاں پر حد ہوتی ہے۔

قومِ سبا کو اللہ نے زراعت دی تھی۔ انہوں نے بارش کا پانی روک کر اسے حسبِ منشا استعمال کے لیے بند بنائے تھے جو سارا سال زمین کو سیراب کرتے تھے۔ اس کے نتیجے میں اتنی شادابی، اتنی سرسبزی ان کے علاقے میں پیدا ہوگئی تھی کہ جلانے کے لیے عود اور دار چینی کی لکڑی استعمال کرتے تھے خوشبودار لکڑی کھانا پکانے لیے، دھونی دینے کے لیے نہیں، استعمال ہوتی تھی۔ ان کے باغوں میں ایسے میوے پیدا ہوتے تھے، ایسے خوشبودار درخت پھل پھول پیدا ہوتے تھے کہ جب ہوا ان کے علاقے سے چلتی تو بحر احمر کے ساحل تک خوشبو پھیل جاتی تھی۔ جب یہ سفر کرتے تھے تو راستے میں اتنی سہولتیں تھیں کہ گویا موٹر وے بنے ہوئے

تھے۔ ہر جگہ آرام، قیام، طعام کی سہولتیں۔ اس پر اگر یہ لوگ ایسا کرتے کہ جن لوگوں کو یہ سہولتیں میسر نہیں مثلاً: پڑوس میں صحرا میں عرب رہتے ہیں، انہیں استفادہ کا موقع دو۔ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے ان کو دو جن کے پاس یہ سب کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں کچھ دے کر آزمائش میں ڈالا ہے کہ جن کے پاس یہ چیزیں نہیں، انہیں دیتے ہو یا نہیں؟ اس کے بجائے ان کا دماغ خراب ہو گیا۔ "بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا." [سبا:19] یہ کون سا سفر ہے جس میں نہ پسینہ آتا ہے، نہ جسم ٹوٹتا ہے، نہ تھکن ہوتی ہے، نہ جوڑ دکھتے ہیں۔ بس مزے سے صبح اٹھے اور شام کو پہنچ گئے "وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ." [سبا:19] دماغ میں فتور آ گیا تو انہوں نے یہ کام شروع کر دیا۔ خود کو تکلیف دینے کی دعائیں مانگنے لگے۔ رب تعالیٰ فرماتے ہیں کوئی بات نہیں "مَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ." [سبا:19] آج ان کا نام ونشان نہیں ملتا ہے کہ قوم سبا کا کوئی ایک آدمی تو یہاں ہو۔ "جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ." [سبا:15] وہ باغ جہاں کوئی خالی ٹوکرا لے کر گذر ے تو اس کے ٹوکرے میں بھی باغ سے باہر نکلنے تک اتنا پھل آ جائے گا کہ وہ پیٹ بھر کر کھائے گا۔ اس میں کیا پیدا ہوتا تھا؟ "شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ." [سبا:15] پاکستان میں بھی ایسے پوش علاقے ہیں جہاں بہت دولت ہے، سہولتوں کی فراوانیاں ہیں۔ ان لوگوں کو سمجھ نہیں آتا ہم نے گھر کو سامان آسائش سے بھر لیا، بیرون ملک کا سالانہ چکر لگا لیا، نئی گاڑی بھی خرید لی۔ ہر سال کا نیا ماڈل بھی ہم سب سے پہلے لے لیتے ہیں۔ اب ہم کیا کریں؟ اب اس دولت کو کہاں لے جائیں؟ تو وہ خدمت خلق کے بجائے اس کے لیے طرح طرح کے طریقے ایجاد کرتے ہیں۔ گرمیوں میں اِدھر تفریح کے لیے جانا ہے، سردیوں میں اُدھر جا رہے ہیں۔ دولت کا بے تحاشا غلط استعمال۔ ان لوگوں کو یہ قوم سبا کا بنایا ہوا ڈیم یاد رکھنا چاہیے۔ پہاڑوں کے بیچ میں پتھروں سے انہوں نے مضبوط ڈیم بنایا تھا، لیکن پھر کیا ہوا؟ باغات کی جگہ جھاؤ کے درخت رہ گئے۔ زرخیزی، شادابی سب ختم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ ناشکری کے گناہ سے بچائے۔

2-قوم تبع:

قوم تبع بھی یمن کے علاقے میں تھی "أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ، وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ، أَهْلَكْنَاهُمْ، إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ." [الدخان:37] قرآن اس کے بعد کی تفصیل سے خاموش ہے۔ ان لوگوں کا کیا جرم تھا اور یہ کیسے تباہ ہو گئے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں دو حکومتیں رہیں حمیر قبیلے کی۔ یہ اپنی پہلی وسعت میں یمن تک تھیں۔ دوسری وسعت میں یہ آدھے جزیرۃ العرب کی مالک ہو گئی تھیں۔ ان لوگوں پر یہی قوم سبا والا سیلاب آیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ہجرت کی ہے بقیہ عرب کی طرف۔ قحطانی عرب اصل میں یمن کے قبائل تھے۔ یہاں سے ہجرت کر کے وسطی عرب گئے ہیں۔ قحطان یہاں رہتے تھے اور انہی کی دو مشہور بادشاہتیں یہاں گزری ہیں۔ ایک بادشاہت قوم سبا والی تھی، دوسری مملکت حمیر والی تھی۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حمیر کے جو بادشاہ تھے ان کا لقب ''تبع'' ہوا کرتا تھا۔ بڑی سلطنتیں اس علاقے میں ان کو دی گئی تھیں لیکن "أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ." ان کے ساتھ ہوا کیا اور اس کا سبب کیا تھا؟ وہ قرآن نے دو لفظوں میں سمیٹ دیا "أَهْلَكْنَاهُمْ." "ہم نے ان کا نام ونشان نہ چھوڑا اور وجہ کیا تھی؟ ''إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ." "یہ گمراہیوں میں حد سے گذر جاتے تھے اور "إِنَّهُمْ" سارے کا سارا معاشرہ مبتلا ہو جاتا تھا، اس کو سمجھانے والا بھی کوئی نہ رہتا تھا، روکنے والے مظلوم ہو جاتے تھے اور نصیحت کرنے والوں پر ظلم کرتے تھے تو "أَهْلَكْنَاهُمْ" پھر ہم ان کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیتے تھے۔ سبق یہ ملا کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ لوگوں کی اصلاح کے لیے، انسانیت کی خدمت کے لیے، دین اور اہلِ دین کی خدمت کے لیے استعمال کرے۔ یہ دوسرا باب مکمل ہو گیا۔

درس:6

متفرق شخصیات

اگلا باب متفرق شخصیات کا ہے۔اس میں سے ہم نے آپ کے لیے''ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج'' کا قصہ چنا ہے۔

ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج:

ابھی تک جو قصص آپ نے پڑھے، وہ منفی سوچ رکھ کر منفی انجام کا شکار ہونے والے لوگوں کا تھا۔اس کے مقابلے میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالی اقتدار، طاقت، ذہانت، دولت اور صلاحیت دے تو وہ اس کو مثبت کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ان میں بڑا مشہور نام''ذوالقرنین'' کا ہے۔راجح قول کے مطابق یہ نبی نہیں ہیں، البتہ عبدِ صالح ضرور ہیں۔اللہ نے جو کچھ انہیں دیا تھا، اس سے انہوں نے فلاحی ریاست قائم کی۔اپنے علاقے میں فلاحی ریاست قائم کرنے کے بعد ان کو جغرافیائی اکتشافات کا شوق ہوا کہ میں دنیا کے دونوں کناروں کا سفر کروں۔دنیا جہاں جا کر ختم ہوتی ہے، وہاں تک جا سکوں۔ دنیا کے دونوں کناروں تک چلے گئے۔مشرق بعید میں بحر الکاہل تک اور مغربِ اقصی میں بحرِ اوقیانوس تک، لیکن مخلوق آخر مخلوق ہے۔عاجز ہے۔ان کو نہیں پتا تھا کہ بحرِ اوقیانوس کا یہ کنارہ مغربِ اقصی (مراکش) دنیا کا حقیقی آخری کنارہ نہیں ہے۔صرف اب تک کی دریافت شدہ دنیا کا آخری کنارہ ہے۔اس سمندر (بحرِ ظلمات) کے پار دو برِ اعظم (شمالی وجنوبی امریکا) موجود ہیں۔"ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا." [کہف:89] "حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ." [کہف:90] اور "حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ." [کہف:86] مطلع الشمس کیا ہے؟ مشرق بعید اور مغرب الشمس کیا ہے؟ وہی مغرب اقصی جو ہم نے پہلے دن پڑھا تھا۔یہ ان کے دو سفر تھے جو دنیا کے دو کنارے معلوم کرنے کے لیے کیے گئے تھے؟ جغرافیائی اکتشافات کے لیے، انسانیت کی فلاح اور اسے حق کی دعوت دینے کے لیے۔راستے میں کوئی قوم آئے گی، لوگ آئیں گے، ہم ان کی کوئی مدد خدمت کر سکیں گے تو کریں گے۔دو سفروں کے بعد (مشرق کی طرف بھی اور مغرب کی طرف بھی) قدرتی طور پر تیسرا سفر کہاں ہوگا؟ شمال کی جانب۔ان علاقوں کے بیچ میں کون سا علاقہ آتا ہے؟ وسطی ایشیا۔اور شمال کی جانب جب آگے بڑھتے جاتے ہیں تو انتہائے شمال میں جو برفستان وہ''سائبیریا'' کہلاتا ہے۔ہے اس انتہائے شمال سے پہلے جو آخری آبادیاں ہیں، وہ کون سی ہیں؟ قفقاز کی ریاستیں۔اس کے بعد پھر برف زار شروع ہو جاتا ہے؟ آج کل کے زمانے میں بھی وہاں رہنے کا کچھ نہیں ہے۔آج کل کے اس دور میں بھی کوئی خاص انسانی آبادی نہیں۔میں نے آپ کو باتوں باتوں میں کہا تھا کہ روس کی 10 ہزار کلو میٹر چوڑی مملکت میں رہنے کے شہر گن چن کر ہیں: ماسکو، سینٹ پیٹر برگ، یہ دونوں ایشیائی حصے میں ہیں اور لینن گراڈ یورپ میں۔کل یہ تین بڑے شہر ہیں اس کے علاوہ ایک جھیل ہے''بیکال'' نامی اور ایک سائبیریا کا سرد جہنم ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔اس کو کھانے پینے کے لیے نیچے آنا پڑتا ہے۔اسے کیا سپین کا کنارہ چاہیے یعنی گروزنی اور چیچنیا چاہیے۔استراخان اور گروزنی، یہ دو مشہور شہر ہیں بحیرۂ کیا سپین کے کنارے جو روس میں پڑتے ہیں۔تو تیسرا سفر:"ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ." [کہف:93] یہ وسط ایشیا میں تھا۔شمال کی جانب تھا۔آخر میں جا کر جہاں انسانی آبادی

ختم ہوتا ہے، وہاں دو دروں کے درمیان میں ایک "سد" ہے۔ اسے "سد ذوالقرنین" کہتے ہیں۔ یہ مشرق بعید ادھر آتا ہے "حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ، وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا." [کہف:91] وہ ادھر آتا ہے اور مغرب الشمس "وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ." [کہف:86] بحر اوقیانوس کا پانی ہے۔ یہ یہاں سے آگے جزائر خالدات جب نظر آتے ہیں تو وہاں پر پانی ٹمیالا ٹمیالا نظر آتا ہے، کم گہرا پانی ٹمیالا ہوتا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں صاف صاف تصریح ہے کہ یہ مغرب الشمس یہ جگہ تھی جس کے آگے جزائر ہیں انہیں "جزائر الخالدات" کہا جاتا ہے۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ سورج طلوع ہو رہا ہو اور پہاڑی علاقہ ہو تو کیا لگتا ہے کہ سورج کہاں سے نکل رہا ہے؟ پہاڑ کی چوٹی سے نکل رہا ہے۔ اور اگر وہاں سمندری علاقہ ہے تو ایسا لگتا ہے کہ سورج کی تھالی اس گہرے دلدلی چشمے کے اندر اترتی جا رہی ہے۔

امریکا سے ایک بار ایک پمفلٹ آیا تھا جس میں قرآن کریم پر اعتراضات کیے گئے تھے عنوان تھا "قرآن کے سائنسی تضادات"۔ ہم نے کہا ہم بھی پڑھیں۔ امریکیوں کی کتنی عقل ہے؟ پتا چلا فارغ ہیں۔ ان کا ایک اعتراض تھا کہ قرآن کہتا ہے "تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ." دلدلی چشمہ، گدلے پانی والا چشمے میں سورج غروب ہوتا ہے، جب کہ سائنس تو یہ نہیں کہتی۔ حقیقت تو یہ نہیں ہے۔ سورج کہاں جا کر پانی میں آرام کرتا ہے؟ تو ہمیشہ یاد رکھیے قرآن اپنا دفاع خود کرتا ہے۔ قرآن پر اعتراض ہو تو دفاع خود کرے گا۔ امریکی "تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ" پڑھتے ہیں، پیچھے "وَجَدَهَا" نہیں پڑھتے۔ قرآن نے حقیقت نہیں بیان کی ہے۔ قرآن نے دیکھنے والے کا وجدان بیان کیا ہے، دیکھنے والے کا احساس بیان کیا ہے "وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ." اس کو ایسا معلوم ہوا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا۔ اور اس سے مقصد کیا ہے قرآن کا؟ مطلب یہ ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عثمانی میں لکھا ہے کہ ذوالقرنین پوری دنیا کے وسائل کا مالک ہو کر بھی عاجز کھڑا ہوا تھا اور اس دلدلی چشمے کو نہ پار کر سکتا تھا کہ سورج کہاں جا رہا ہے اور نہ سورج کے آخری ٹھکانے کا علم حاصل کر سکتا تھا۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو ماننے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا کے لیے اس میں بڑی عبرت ہے۔ جیسے اس زمانے میں وسائل کی کثرت ذو القرنین کے پاس تھی، آج کی دنیا میں وسائل کی کثرت کچھ بے ایمان طاقتوں کے پاس ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ساری کائنات کے راز ہم نے معلوم کر لیے ہیں۔ ساری چیزیں چھان ماریں۔ حالانکہ یہ سب اللہ کی قدرت کے آگے ہیچ ہے۔ جیسے ذوالقرنین اس زمانے میں سمجھتے تھے، لیکن ان کی سمجھ آخر کار عجز کے اعتراف کے علاوہ کچھ نہیں بتاتی۔

"حَتّٰى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ." انتہائے شمال میں یہ سارا برف زار ہے۔ آخری آبادی بحیرۂ کیسپین اور بحیرۂ اسود کے بیچ میں یہ قفقاز کی ریاستیں ہیں۔ یہ قفقاز کی ریاستیں شمال کی جانب میں بڑی ریاستیں تھیں۔ ان کے آگے یاجوج ماجوج تھے۔ ان ریاستوں والوں نے کہا کہ یہاں شمال سے یاجوج ماجوج آجاتے ہیں اور ہمارے ساتھ ایسا حشر کرتے ہیں۔ "اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ." [کہف:94] اب دیکھو یہ ایک رحم دل بادشاہ ہے، خدا ترس بادشاہ ہے، اپنے وسائل سے مظلوم لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ انہوں نے کہا "هَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا." [کہف:94] ہم خرچہ جمع کر لیں۔ ذوالقرنین نے کہا خرچے کی ضرورت نہیں، خرچہ ہمارے پاس بہت ہے۔ افرادی قوت درکار ہے۔ مدد کے لیے آجاؤ، کام کے لیے، باقی پیسہ ہم خود لگائیں گے۔ تمام رفاہی ٹرسٹوں کو اس اصول پر کام کرنا چاہیے۔ وہ ضرورت مند جن پر خرچ کیا جا رہا ہے، ان کی صلاحیتوں سے بھی کام لینا چاہیے۔ ذوالقرنین نے کہا ہم آپ کے لیے ہمارے وسائل اور آپ کی افرادی قوت سے ایسی دیوار بنا دیں گے کہ وہ اس کو پار نہیں کر سکیں گے۔ اب یہاں پر وہی سوال آ جاتا ہے: یاجوج ماجوج کون تھے؟ اور وہ دیوار اسی روئے زمین پر ہے تو دریافت کیوں نہیں ہوتی؟ اس کو ہم کیوں پار نہیں کر سکتے؟ دوسری طرف کی خبر کیوں نہیں لا سکتے؟

اس کا جواب شروع کرنے سے پہلے ہم آپ کو دنیا بھر کے اہم جغرافیائی مقامات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے والی ایک شخصیت کی زبانی چشم دید روداد سناتے ہیں:

''سدِ ذوالقرنین/دربند کا حصار

''دربند کا سفر:

''میں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں داغستان کے دورے میں دربند کا تاریخی شہر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ دربند ہے جسے ''باب الابواب'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فتح کیا تھا اور وہاں تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبریں بھی ہیں۔ شیخ یحییٰ نے اس سفر کا بڑے ذوق وشوق سے انتظام کیا۔ چونکہ چیچنیا کا علاقہ یہاں سے قریب ہے اور وہاں آزادی کی تحریک چل رہی ہے، اس لیے داغستان میں جگہ جگہ پولیس کی طرف سے چیکنگ ہوتی ہے۔ شیخ یحییٰ نے داغستان کی اسمبلی کو میرے بارے میں بتایا تو وہ بڑی محبت سے اپنی شاندار گاڑی خود چلا کر ہمیں وہاں لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ''مخشکلہ'' اور ''بگ دیل'' کے علماء کو پتا چلا تو انہوں نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ اس سفر میں ہمارے ساتھ ہوں۔ چنانچہ آٹھ دس گاڑیوں پر مشتمل ہمارا قافلہ دربند کے لیے روانہ ہو گیا اور تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کے سفر کے بعد دربند شہر میں داخل ہوا۔ یہاں ایک مسجد کے ساتھ قدیم طرز کا ایک مدرسہ بنا ہوا ہے جس کی سربراہی علاقے کی ایک بااثر شخصیت شیخ سراج الدین کے پاس ہے۔

ہم یہاں نمازِ ظہر کے وقت پہنچے اور نماز اسی مسجد میں ادا کی اور اس کے بعد دربند کے قدیم شہر کی طرف روانہ ہوئے جو ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اور پہاڑ کے اوپر دربند کا مشہور تاریخی قلعہ ہے جو صدیاں گزر جانے کے باوجود اب بھی شان وشکوہ کی تصویر ہے۔ قلعے کے برج سے گردوپیش کا دل آویز منظر ناقابلِ فراموش تھا۔ پہاڑ کے دامن میں دور دور تک پھیلا ہوا دربند شہر، اس کے پیچھے اُفق تک بحرِ خزر (caspian sea) کا نیلگوں پانی اور قلعے کے دائیں بائیں سرسبز پہاڑ اور وادیاں! دیر تک ہمارے تمام رفقاء اس منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

سدِّ ذوالقرنین:

ایک خاص وجہ جس کی بناء پر دربند دیکھنا چاہتا تھا، یہ تھی کہ بعض معاصر علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے حضرت ذوالقرنین کی تعمیر کی ہوئی جس دیوار کا ذکر فرمایا ہے اور جو ''یاجوج وماجوج'' کی قتل وغارت گری سے بچاؤ کے لیے تعمیر کی گئی تھی، وہ دربند شہر میں واقع تھی اور ان حضرات کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس دیوار کے کچھ آثار اب بھی باقی ہیں۔ چنانچہ میں نے اس قلعے کے برج پر پہنچنے کے بعد علاقے کے علماء سے دربند کی اس دیوار کے بارے میں معلومات کیں تو انہوں ایک شکستہ فصیل کی طرف اشارہ کیا جو اس قلعے کے دامن میں نظر آ رہی تھی، لیکن اس دیوار کے ''سدِّ ذوالقرنین'' ہونے کا قرینہ دور دور تک محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دیوار پہاڑ کے دامن سے شروع ہوئی ہے اور دربند شہر کے میدانی علاقے سے گزرتی ہوئی سمندر تک پہنچتی ہے اور یہ پہاڑوں کے درمیاں نہیں ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین نے جو دیوار تعمیر کی تھی وہ دو پہاڑوں کے درمیانی درّے کو بند کرنے کے لیے بنائی تھی۔ قلعے کے جس برج پر ہم کھڑے تھے وہ ایک پہاڑ کے سرے پر واقع ہے اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور پہاڑ ہے اور دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک درّہ بھی ہے، لیکن اوّل تو اس درّے میں کسی دیوار کا کوئی سراغ نہیں ملتا، دوسرے یہ پہاڑ اتنے اونچے نہیں ہیں کہ وہ یاجوج ماجوج جیسی قوم کے لیے ناقابلِ عبور ہوں۔ اس لیے اس درّے میں اگر کوئی دیوار تعمیر بھی کی جاتی تو اس سے یاجوج ماجوج کا راستہ روکنا بعید از عقل معلوم ہوتا ہے۔ تیسرے دربند کی وہ دیوار جو پہاڑوں سے سمندر تک میدانی علاقے میں بنائی گئی تھی، اس کے بارے میں تاریخ میں یہ مذکور ہے کہ وہ نوشیرواں نے دوسری طرف کے حملہ آوروں سے بچنے کی لیے تعمیر کی تھی۔ اس لیے یہاں پہنچنے کے بعد اس بات کا تقریباً یقین ہو جاتا ہے کہ دربند کی اس دیوار کو ''سدِّ ذوالقرنین'' قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی محققانہ کتاب ''قصص القرآن'' میں بھی دربند کی دیوار کو ''سدّ ذوالقرنین'' قرار دینے کی جس دلائل سے تردید کی ہے، یہاں پہنچنے کے بعد ان کی پوری پوری تصدیق ہو جاتی ہے، البتہ کوہِ قفقاز کا یہی پہاڑی سلسلہ جس پر دربند کا قلعہ واقع ہے، مغرب میں مزید آگے بڑھ کر بلند ہوتا گیا ہے اور انہی بلند پہاڑوں کے درمیان ایک ''درّہ دانیال'' کہلاتا ہے اور یہاں ایک لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے کی ایک دیوار کے آثار ملے ہیں۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب کا خیال یہ ہے کہ ''سدّ ذوالقرنین'' اس درّے کو بند کرنے کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔''

(سفر در سفر:175-173)

یاجوج ماجوج کون ہیں؟

اقتباس آپ نے پڑھ لیا، اب ہم ان دونوں سوالوں کی طرف واپس لوٹتے ہیں۔ پہلا سوال کہ وہ کون تھے؟ بعض حضرات نے کہا: دنیا کے دائیں طرف والے آخری کونے میں جاپانی رہتے ہیں اور دوسرے آخری کونے میں انگلینڈ والے رہتے ہیں، جنگ عظیم دوم میں "مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ." [الانبیاء:96] ان دونوں کا معرکہ ہندوستان میں برپا ہوا کہ اگر جاپان جیت جاتا تو آج ہندوستان جاپان کے استعمار کے تحت محکوم ہوتا، اگر انگریز جیت جاتے تو ان کا محکوم ہوتا۔ انگریز جیت گئے۔ تو ان کا محکوم ہو گیا۔ بعض حضرات کا کہنا تھا کہ یاجوج و ماجوج یہ دونوں ہیں۔ ایک دنیا کے ایک طرف رہتا ہے اور دوسرا دوسری طرف رہتا ہے، لیکن قرآن کی جو تعبیرات ہیں ان میں غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یاجوج ماجوج ابھی نہیں نکلے۔ قرب قیامت سے پہلے نکل بھی نہیں سکتے۔ ان کی ''سدّ'' ان شاء اللہ پڑھ کر کھدائی کرنے سے ٹوٹے گی۔ یاجوج ماجوج معروف انسانی اقوام نہیں۔ انسانی مخلوق دو طرح کی ہوتی ہیں: کچھ میں خیر کی طاقتیں غیر معمولی ہوتی ہیں۔ وہ خیر کے لیے غیر معمولی کام دنیا میں کر جاتے ہیں۔ کچھ میں شر کی غیر معمولی طاقتیں ہوتی ہیں۔ یاجوج ماجوج کے اندر شر والی خصلتیں زیادہ ہیں۔ اب آخری زمانے میں کیا ہوگا؟ دنیا کا سب سے بڑا فتنہ ''دجال'' جب نمودار ہوگا تو وہ بھی انسان اور جنات کے مابین قسم کی ایک چیز ہے جو شر کی غیر معمولی طاقتیں لے کر پیدا ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے قتل کر دیں گے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا سمجھنے والے لوگ چونکہ موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو بھیجے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام صاحب ایمان لوگوں کو لے کر ''جبل طور'' پر چلے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان کریں گے کہ ایک ایسی قوم آنے والی ہے جس کا مقابلہ روئے زمین پر کوئی نہیں کر سکتا۔ اس لیے سب کوہِ طور پر چلے جاؤ۔ یہ سب کیوں ہوگا؟ وہ ان کے مقابلے سے عاجز ہو کر کیوں ''کوہ طور'' پر پناہ لیں گے؟ اس لیے کہ لوگ ان کو ''مسیح'' سمجھیں۔ ابن اللہ یا اللہ نہ سمجھیں۔ دنیا کے سب سے بڑے فتنے کو وہ ختم کریں گے، لیکن یہ چھوٹے چھوٹے فتنے ان سے قابو نہیں آئیں گے۔ یہ اسی زمین پر رہتے ہیں۔ اسی انسانی قوم کا ایک تیز طرار، بگڑا ہوا حصہ ہیں، لیکن ان میں شر کی طاقتیں زیادہ ہیں۔ اتنے بسیار خور ہیں کہ ان کے لشکر کے آگے والے لوگ بحیرۂ طبریہ سارا پی جائیں گے تو پچھلے والے کہیں گے کہ ادھر تو کبھی پانی بھی تھا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ ایسی ہوا بھیجیں گے کہ ان سب کو گلے میں گلٹی نکلے گی۔ سب اللہ کے حکم سے مر جائیں گے اور ثابت ہو جائے گا کہ آخری بادشاہی اللہ کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نہیں۔ وہ عبداللہ ضرور ہیں۔ اسی میں ان کی عزت و افتخار ہے۔ لیکن ابن اللہ نہیں۔ الغرض یاجوج ماجوج نہ جاپان ہے نہ انگریز ہے۔ نہ کوئی اور قوم ہے۔ جنات بھی نہیں ہیں۔ انسانی قوم ہی کا حصہ ہیں، لیکن یہ جاپانیوں کی طرح ذرا سخت جان ہیں اور انگریز کی طرح غیر معمولی قسم کی ذہانت رکھتے ہیں۔ شاید یاجوج میں دماغی قوتیں غیر معمولی ہیں اور ماجوج میں جسمانی طاقت غیر معمولی ہے۔ لیکن ہے دونوں کا رجحان شر اور فتنے کی طرف۔

یاجوج ماجوج کہاں ہیں؟

اب دوسرا سوال کہ انہیں دریافت کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو اپنا خاص راز بتایا ہے کہ ایک وقت سے پہلے ظاہر نہیں ہوگا۔ کس مخلوق میں

ہمت ہے یا طاقت ہے کہ اسے کشف کر سکے؟ قرآن نے کہا ہے کہ آخری وقت میں ان کا ظہور ہوگا۔ آخری وقت سے پہلے نہ کوئی دیوار کو ادھر سے پار کر سکتا ہے نہ کوئی ادھر سے پار کر سکتا ہے۔ یاجوج ماجوج یہ دیوار کھودتے رہتے ہیں "فتحت من ردم یاجوج وماجوج" حضور نے فرمایا: اس دیوار میں سے اتنا کھل گیا۔ شہادت کی انگلی کو انگوٹھے کی جڑ میں لگایا کہ اتنا سوراخ کھل گیا۔ یہ دن بھر دیوار میں نقب لگاتے ہیں۔ شام کو تھک کر چلے جاتے ہیں کہ کل آ کے بقیہ کام کریں گے۔ کل تک سوراخ بند ہو جاتا ہے۔ جس دن اللہ کا اذن ہوگا اس دن وہ کہیں گے: "ان شاء اللہ کل بقیہ کام کریں گے" تو رات کو کھودا گیا سوراخ بند نہیں ہوگا۔ دوسرے دن توڑ کر نکل آئیں گے۔ یہ وہی وقت ہوگا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دجال کو ختم کر کے زمین کو فتنوں سے پاک کر کے خلافت الٰہیہ قائم کی ہوئی ہوگی۔ تو یہ ہے "بین السدین" "أَعِينُونِي بِقُوَّةٍ." [کہف:95] افرادی قوت لے آؤ "أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا." [کہف:95] کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ دیوار چین ہے، کچھ کہتے ہیں یہ سدِ مآرب ہے۔ بالکل غلط ہے کیوں کہ قرآن کہتا ہے "آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ." [کہف:96] کہ یاجوج ماجوج والی دیوار لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ دیوار چین پتھر کی ہے۔ لوہے کی نہیں۔ اور قرآن کہتا ہے کہ وہ بین السدین ہے۔ دو دروں کے درمیان ہے۔ دیوار چین تو بین السدین نہیں ہے۔ وہ تو پہاڑوں کے اوپر اوپر جاتی ہے۔ قربِ قیامت سے پہلے سدِ ذوالقرنین دریافت نہیں ہو سکتی۔ دیوار چین پر تو ہر روز سیکڑوں سیاح مڑگشت کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہ سیٹلائٹ، یہ آسمانی انکشافی مشینیں اور زمینی سراغ رساں، عین ان کے سر پر بھی جا پہنچیں تو حق تعالیٰ کی قدرت جب نہیں چاہے گی، کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ کوئی ان کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ جیسے دجال اسی سرزمین پر موجود ہے۔ اسی سرزمین کے کسی جزیرے میں موجود ہے۔ کوئی اس کو برآمد نہیں کر سکتا۔ تابوت سکینہ اسی سرزمین میں کہیں چھپا ہوا ہے، آخری زمانے سے پہلے کوئی اس کو برآمد نہیں کر سکتا۔ تو یہ لوگ بھی اسی سرزمین پر ہیں۔ ان کو کوئی نہیں پہنچ سکتا، نہ یہ باہر آ سکتے ہیں جب تک اللہ کا اذن نہیں ہوگا "فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا." [کہف:98] اس سے پہلے کوئی اس میں ایک سوراخ بھی نہیں کر سکتا، نہ کسی کو طاقت ہے کہ ایک یاجوج اور ایک ماجوج کو باہر لے آئے۔ یہ قوم ایسی ہے کہ اس میں نسل بہت تیزی سے پھیلتی ہے۔ ایسا لگے گا انسانی سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوگا۔ کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ آخر اللہ تعالیٰ کا حکم ان کو تباہ کرے گا۔ اور ثابت ہو جائے گا کہ قادرِ مطلق صرف ایک اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام فتنۂ اعظم "دجالِ اکبر" کو قتل کرنے اور ساری دنیا پر خلافت قائم کرنے کے باوجود اللہ کے مقدس پیغمبر ہیں۔ خدا یا خدائی اوتار نہیں۔ ان کی اطاعت کرنی چاہیے، عبادت نہیں۔ ان کو عبداللہ ماننا چاہیے، الٰہ نہیں۔ اسی میں ان کی تعظیم و توقیر ہے اور اسی میں توحیدِ کامل ہے جو نجات کی شرط ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

نقشہ خوانی

درس:1

نقشے کی چھ علامات:

آپ جب کسی نقشے کا مطالعہ کریں گے تو اس میں چھ چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ اصل میں یہ چار ہوتی ہیں: خطوط، رنگ، شکلیں اور اشاریہ۔ پھر اشاریے میں تین چیزیں ہوتی ہیں: عنوان، رموز اور پیمانہ۔ اس طرح چھ ہو گئیں۔

پہلی چیز ہے خطوط: ہر نقشے میں کم از کم چالیس خطوط ہوتے ہیں: 24 طول بلد، 11 عرض بلد اور 4 خط غیر مسلسل ہوتے ہیں۔ 35 اور 4=39 اور ایک خط منحنی ہوتا ہے تو کل 40 خطوط ہو گئے۔ 35 خط مسلسل ہوتے ہیں۔ 4 خط غیر مسلسل ہوتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے منحنی یعنی ٹیڑھا میڑھا۔ یہ 40 خطوط ہر نقشے میں لازماً ہوتے ہیں۔

دوسری چیز ہے رنگ۔ ہر نقشے میں کم از کم 4 مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ سیاسی جغرافیہ والے نقشے میں جو رنگ ہوتے ہیں، ان کا کوئی خاص مطلب نہیں ہوتا۔ نہ کسی جغرافیائی اصطلاح سے ان کا کوئی تعلق ہوتا ہے۔ دو ملکوں کو الگ الگ ظاہر کرنے کے لیے کوئی بھی رنگ دے سکتے ہیں۔ طبعی جغرافیہ میں کم از کم چار رنگوں کے ذریعے چار الگ چیزیں دکھائی جاتی ہیں۔ طبعی جغرافیہ کا معنی ہے: زمین کی ساخت کا مطالعہ، زمین کی سطح پر پائے جانے والے قدرتی نقوش: صحرا، دریا، پہاڑ، سمندر، سطح مرتفع وغیرہ کو پہچاننا۔ اب یہ چیزیں نقشے پر دکھانے کے لیے اس میں چار رنگ ضرور ہوں گے۔ نیلا رنگ پانی کے لیے۔ سمندر جتنا گہرا ہو گا اتنا ہی رنگ زیادہ گہرا ہو گا۔ جتنا ساحل کے قریب اور کم گہرا ہو گا، اتنا نیلگوں رنگ ہلکا ہو گا۔ اگر برفانی علاقہ ہے تو سفید رنگ کے ذریعے ظاہر کیا جائے گا۔ کتنی گہرائی کے لیے کتنا گہرا رنگ ہو گا؟ یہ حاشیے پر دیے گئے ''جدول'' میں درج ہوتا ہے۔ سطح سمندر سے مساوی مقامات کے لیے ہرا رنگ، بلند مقامات کے لیے پیلا رنگ اور بہت زیادہ بلند مقامات کے لیے بھورا یا پھر خاکی رنگ استعمال ہوتا ہے۔

تیسری چیز نقشے میں ہوتی ہے مختلف شکلیں، جیسے: 16 کونوں والا ستارہ، گھڑیاں وغیرہ۔ اس ستارے میں سمتیں اور گھڑیوں میں وقت کے خطے دکھائے جاتے ہیں۔

ہر نقشے کے ساتھ ایک اشاریہ ہوتا ہے۔ اس میں اوپر نقشے کا عنوان ہوتا ہے۔ یہ بہت ضروری چیز ہے، اس لیے کہ اگر سیاسی نقشہ ہے اور آپ کشمیر کو پاکستان میں نہیں دکھاتے یا بھارت میں دکھاتے ہیں تو بھارت یا پاکستان میں آپ کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ اگر وہ طبعی جغرافیائی نقشہ ہے تو پاکستانی کشمیر ہو یا بھارتی کشمیر، آزاد کشمیر یا مقبوضہ کشمیر، طبعی ساخت کے لحاظ سے تو ایک جیسے ہیں۔ یہ سیاسی خط تو انسانوں نے کھینچا ہے۔ قدرت نے تو دونوں کو ایک جیسے بنایا ہے۔ طبعی جغرافیائی نقشہ اس کو ایک جیسا دکھائے گا، مثلاً کشمیر کا پورا علاقہ پہاڑی ہے تو وہ اسے بھورا دکھائے گا۔ الغرض عنوان ضروری ہے۔

اسی اشاریے کے اندر دوسری چیز ہے رموز کہ اس نقشے میں جو علامات استعمال کی گئی ہیں وہ کیا ہیں؟ مثلاً دارالحکومت کے لیے چوکور مربع استعمال کیا ہے یا دائرہ استعمال کیا ہے؟ ہر ملک کے بڑے شہر کے لیے گول دائرہ لگایا ہے یا ڈاٹ لگایا ہے؟ بندرگاہ، ہوائی اڈے، ریل کی پٹڑی کے لیے کیا علامت اختیار کی ہے؟ یہ ''رموز'' اسی نقشے کے اندر ہوتے ہیں۔

اشاریہ میں تیسری چیز ہوتی ہے ''پیمانہ''۔ اگر آپ نقشے پر دی گئی ایک جگہ سے دوسری جگہ کا فاصلہ ناپنا چاہتے ہیں تو نقشہ کس پیمانے پر بنا ہے؟ اس نقشے کا ایک انچ کتنے میل کے مساوی ہے؟ یہ نقشے پر دیے گئے پیمانے سے معلوم ہوتا ہے۔ آج کل تو پیمانے کے ذریعے فاصلہ ناپنے کی مشقت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، کمپیوٹر میں ایسے پروگرام آگئے ہیں کہ نقشے پر دو مقامات کے درمیان اِدھر سے اُدھر تک خط کھینچو، بیچ میں جتنا فاصلہ ہے فوراً بتا دیتا ہے، لیکن جو نقشہ دیوار پر لگایا جاتا ہے، دیوار گیر نقشہ ''وال میپ'' تو اس میں پیمانے کی یہ دو قسمیں ہوتی ہیں:

(1) خطی پیمانہ: ایک لکیر ہے اور اس میں وقفے وقفے سے فاصلہ دیا ہوا ہے، ادھر سے ادھر تک دھاگا رکھو، اب کتنے میل اس میں آئے؟ اس کو اٹھا کر اس شہر سے اس شہر تک رکھو تو دھاگے کے نیچے جتنے میل آئیں اتنا فاصلہ ان دو جگہوں کے درمیان ہوگا۔

(2) کسری پیمانہ: کسر کی شکل میں ہوتا ہے کہ اس نقشے پر ایک انچ برابر ہے زمین پر اتنے میل کے۔ اوپر انچ دیا ہوا ہے، نیچے اتنے میل یا کلومیٹر جو اس نقشے کے اندر ایک انچ کو ظاہر کرتے ہیں۔ آگے ہم اس کو تفصیل سے پڑھیں گے۔

الغرض! خلاصہ کلام یہ کہ نقشے میں یہ چھ چیزیں ہوتی ہیں: خطوط، الوان، اشکال، اشاریہ۔ یہ جو چوتھی چیز ہے ''اشاریہ'' اس کے اندر یہ تین چیزیں ہوتی ہیں: عنوان، رموز، پیمانہ۔ اب یہ کل چھ ہو گئیں۔ چار اصل اور تین ضمنی چیزیں۔ اب آپ کا دل چاہے تو اس کو چار کہہ لو یا چھ کہہ لو۔ نقشہ خوانی کے سبق کی بنیاد یہی ہے کہ نقشہ بالعموم انہی چھ چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بڑا ہو یا چھوٹا ہو۔ اس سے خالی نہیں ہوتا۔ آئیے! اب ان ''اشیائے ستہ'' کو تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

40-1 خطوط:

پہلی چیز ہے خطوط۔ نقشے میں عموماً 40 خطوط ہوتے ہیں۔ 35 مسلسل، 4 غیر مسلسل اور 1 منحنی ہوتا ہے۔ فلکیات اور جغرافیہ والوں کے ہاں کوئی بھی کرہ ہو، بہت بڑا یا بالکل چھوٹا سا، اس کرے کو وہ 360 درجے میں تقسیم کرتے ہیں۔ آدھا کرہ شرقی ہو جائے گا 180 درجے اور آدھا غربی ہو جائے گا۔ اب ہونا تو چاہیے تھا کہ جب صفر سے شروع کرتے ہیں تو 180 درجے تک 180 خطوط ڈالے جاتے، لیکن اس طرح ان خطوط کے نیچے نقشے میں کوئی اور جگہ پڑھنے کے قابل نہ رہتی۔ لہٰذا یہ کیا گیا کہ وقفے وقفے سے کچھ خطوط کھینچ دیے، مثلاً 15 درجے کے فاصلے پر خط کھینچ دیے، اس لیے کہ سورج جب زمین کے گرد چکر لگاتا ہے تو ایک گھنٹے میں 15 درجے کا فاصلہ طے کرتا ہے، تو پوری زمین کے کتنے درجات ہوئے؟ 360۔ پورا کرہ 360 کا، نصف کرہ 180 کا اور ربع 90 کا۔ اس 360 درجات کو وہ کتنے گھنٹے میں طے کرے گا؟ ایک گھنٹے میں 15 درجے طے کرتا ہے تو 24 گھنٹے میں 360 درجے طے کرے گا۔ پھر سنیے! چار منٹ میں ایک درجہ طے کرتا ہے۔ 15 درجے کو 60 منٹ یعنی ایک گھنٹے میں طے کرے گا اور 360 درجات کو 24 گھنٹے میں، اس لیے ماہرین نے 10 یا 20 درجے پر خط نہیں لگایا۔ انہوں نے 15,15 درجے کے فاصلے سے خط لگائے۔ اس مناسبت کی وجہ سے کہ سورج کا سفر اس رفتار سے ہوتا ہے۔ اس سے ہمیں کئی فوائد حاصل ہوں گے مثلاً: دو جگہیں ہیں ان کے درمیان 30 درجے کا فاصلہ ہے تو ان کے درمیان وقت میں کتنا فرق ہوگا؟ دو گھنٹے کا ہوگا۔ اس آسانی کے لیے انہوں نے 15,15 درجے کے فاصلے سے خط لگا دیے۔ 15 درجے پر ایک لگایا تو 360 پر 24 خطوط لگ گئے۔ اس طرح طول بلد کے کل خطوط 24 ہو گئے۔ یہ لمبے لمبے ہوتے ہیں خربوزے کی قاشوں کی طرح اور قطبین سے گذرتے ہیں۔ اور اس کا ہر بننے والا دائرہ (12 دائرے ہوں گے اور 24 خطوط ہوں گے) دائرہ عظیمہ ہوتا ہے۔ ''دائرہ عظیمہ'' وہ ہوتا ہے جو کرۂ ارض کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یاد رکھیے! طول البلد کا ہر دائرہ، دائرہ عظیمہ ہوتا ہے۔ جغرافیہ دانوں کی اصطلاح میں ''دائرہ

علیہ'' کسے کہتے ہیں؟ جو کرے کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرے۔طول البلد کا ہر دائرہ قطبین سے ضرور گذرتا ہے۔یہ سارے دائرے قطبین پر جا کر جمع ہو رہے ہوتے ہیں۔12 دائرے ہوتے ہیں۔24 خطوط ہوتے ہیں۔12 شرقی طول میں اور 12 غربی طول میں۔تو یہ طول کے خطوط اس طرح ہو گئے جیسے خربوزے کی قاشیں ہوتی ہیں۔یہ کسی بھی نقشے یا گلوب پر کھڑے خط کی شکل میں کھنچے ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ 180 درجے تک ہوتے ہیں۔

صفر درجہ طول البلد سے بالکل دوسری جانب 180 درجہ طول البلد پر جو خط کھنچا ہوا ہے، یہ ''عالمی تاریخ کا خط'' کہلاتا ہے۔لندن میں اگر دن کے بارہ بج رہے ہیں تو یہاں پر رات کے بارہ بج رہے ہوں گے اور سورج جیسے ہی اس خط کو پار کرے گا تو فوراً ہی تاریخ بدل جائے گی، اس لیے اس کو کہتے ہیں ''عالمی خط تاریخ'' (انٹرنیشنل ڈیٹ لائن) یہ ٹیڑھا کیوں ہے؟ اس لیے کہ لندن والا خط (یعنی صفر درجہ طول البلد کا خط) سیدھا لے جانے میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے، لیکن اس خط کو سیدھا رکھنے میں بڑا مسئلہ بنتا ہے۔مثلاً اس کو سیدھا لائیں تو امریکا کی ایک ریاست ہے الاسکا۔سامنے درۂ بیرنگ کے پار روس ہے۔تو اب اگر آپ اس کو سیدھا لاتے ہیں تو یہاں مسئلہ یہ ہوگا کہ امریکا کی ایک ریاست کے کچھ حصے میں ایک دن ہوگا اور کچھ میں دوسرا۔روس کے کچھ حصے میں ایک تاریخ ہوگی کچھ میں دوسری۔ایک ہی ملک میں بیک وقت دو تاریخیں ہوں گی۔ایک ہی ملک کے کچھ حصے میں ایک تاریخ ہوگی، کچھ میں دوسری۔اس لیے اس کو ہر ملک کی جغرافیائی حدود کے مطابق تھوڑا سا ٹیڑھا میڑھا کر دیا تا کہ ایک ملک میں ایک ہی تاریخ رہے۔صفر درجہ طول البلد کا خط ان چالیس خطوط میں سے پہلا خط ہے اور یہ منحنی خط چالیسواں خط ہے۔

اب شرقاً غرباً زمین کا وسط کسے مانا جائے؟ اس میں اختلاف رہا ہے۔شمالاً جنوباً وسط کی تعیین کا مسئلہ تو خط استوا اور قطبین نے حل کر دیا ہے، کیوں کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کا جو بالکل وسط ہے، وہ خط استوا ہے۔اس نے زمین کو شمالاً جنوباً دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا۔اس کو خط استوا کہتے ہی اس لیے ہیں کہ یہ زمین کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔لہٰذا بغیر تنازع کے شمال و جنوب کے وسط کا مسئلہ حل ہو گیا۔مسئلہ اس میں پیدا ہوا کہ ہم ''مبدأ طول البلد'' یا دہ بنیادی نکتہ کسے فرض کریں کہ جسکے آدھی طرف مشرق اور آدھی طرف مغرب ہو؟

قدیم جغرافیہ دان کہتے تھے دیکھو بھائی! زمین ادھر آ کر ختم ہوتی ہے۔افریقہ کے مغربی کنارے مراکش پر۔اس سے آگے جا کر سمندر میں تلاش کیا تو کچھ جزائر ملے۔ان کا نام انہوں نے رکھا ''جزائر خالدات۔'' اسپین کا مشہور مسلمان فلسفی تھا ''ابن رشد'' اس نے ایک افسانہ لکھا: ''حی بن یقظان'' یعنی ''زندہ ولد بیدار''۔ایک فرضی بچہ فرض کیا جس کو لہروں نے اٹھا کر جزیرے میں پہنچا دیا۔ہرنی نے اس کو دودھ پلا کر پالا۔فلسفی کہتا ہے سوال اٹھاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عقل سے پہچانا جا سکتا ہے کہ نہیں؟ وہ کہتا ہے اس بچے نے عقل سے پہچانا کہ دودھ مجھے ہرنی سے ملتا ہے۔جزیرے کی یہ چیز مجھے نقصان دیتی ہے۔یہ فائدہ دیتی ہے۔پہچانتے پہچانتے کہتا ہے کہ وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ان جزائر خالدات کو ''مبدا طول'' ماننے پر کوئی عقلی اشکال نہیں ہے۔اگر آپ طبعی جغرافیہ کی بات کریں تو اسے ''مبدا طول'' ماننا پڑے گا کہ دنیا کے بالکل ایک طرف ہے۔

اگر اسے ایک طرف ہونے کی وجہ سے نہیں مانتے تو پھر مکہ مکرمہ کو مانو، کیوں کہ یہ تین براعظموں کے ملاپ پر ہے اور مشرق بعید اور مغرب اقصیٰ کے وسط میں ہے۔چاروں آسمانی کتابیں اسی جزیرۃ العرب میں نازل ہوئیں۔آپ کی بھی ہماری بھی۔تمام انبیائے کرام یہیں آئے۔آپ کے بھی اور ہمارے بھی۔یہ تو مذہبی اور روحانی وجہ ہے اور جغرافیائی طور پر بھی یہ دنیا کے وسط میں ہے، ادھر ایشیا ہے، ادھر یورپ ہے، ادھر افریقہ ہے۔بالکل بیچ میں سرزمین عرب ہے اور عرب کے بیچ میں مکہ مکرمہ ہے۔تو مکہ مکرمہ کو ''مبدا طول'' ماننا چاہیے۔مسلمان جغرافیہ دان مکہ مکرمہ کو بھی صفر درجہ طول البلد مانتے رہے ہیں۔شرق اور غرب کی تعیین تم نہیں کرو گے کہ ہم سے جو مشرق میں ہے شرقی ہوگا۔جو غرب میں ہے وہ غربی ہوگیا۔نہیں! یہ تم کیسے کرو گے؟ مکہ مکرمہ سے ادھر آدھی دنیا شرق ہے اور ادھر کی آدھی دنیا غرب ہے۔یہ نظریہ بھی ایک عرصے تک چلتا رہا۔

کچھ جغرافیہ دانوں کا کہنا تھا یہ جو سری لنکا ہے، اس کو ''لنکا'' بھی کہتے تھے، سراندیپ بھی کہتے تھے، کچھ جغرافیہ دانوں میں مشہور یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سری لنکا کے ایک پہاڑ پر اترے تھے تو وہ کہتے ہیں کہ چلو دنیا کا وسط اس کو مان لو۔ یہ تین اقوال ہیں: (1) جزائر خالدات (2) مکہ مکرمہ (3) لنکا۔ ان میں سے کوئی بھی قول لیا جائے تو اس کے پیچھے ایک منطق ہے۔ دلیل ہے۔ دھونس اور دھاندلی نہیں ہے۔ لیکن جنگ عظیم دوم میں ہوا یہ کہ یورپ کے ایک جزیرے (انگلینڈ) کے شہر (لندن) کو مبدا طول مان لیا گیا۔ یہ جزیرہ بھی چار حصوں میں منقسم ہے۔ نیچے انگلینڈ ہے۔ اوپر اسکاٹ لینڈ ہے۔ سامنے آئر لینڈ ہے۔ ساتھ میں ویلز ہے۔ چھوٹا سا جزیرہ ہے اور وہ بھی چار حصوں میں تقسیم۔ اکثر کُہر اور دھند چھائی رہتی ہے۔ اس کو ہندوستان والے کہتے تھے سات سمندر پار۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم دنیا کا وسط بغیر کسی طبعی یا جغرافیائی مناسبت کے اسے مانیں گے۔ ہم سے ادھر جو دنیا ہے وہ شرق ہے، ہم سے ادھر جو دنیا ہے وہ غرب ہے۔

عرض البلد وہ خطوط ہیں جو زمین کو شمالاً جنوباً تقسیم کرتے ہیں۔ 90 شمالی اور 90 جنوبی۔ یہ خطوط پڑے ہوئے ہوتے ہیں، کھڑے نہیں ہوتے۔ یعنی افقی ہوتے ہیں، عمودی نہیں ہوتے۔ دائیں سے بائیں ہوتے ہیں، اوپر سے نیچے نہیں۔ یہ پہلا فرق ہے طول البلد سے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ طول البلد کے تمام دائرے ''دائرہ عظیمہ'' ہوتے ہیں۔ جبکہ عرض البلد میں دائرہ عظیمہ صرف خط استوا ہوتا ہے جو زمین کے بالکل وسط میں ہے اور اسے دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے، کیونکہ وسط میں زمین کی گولائی برابر ہے۔ جیسے جیسے شمال کی طرف جائیں گے گولائی کم ہوتی جائے گی۔ ''دائرہ عظیمہ'' نہیں رہے گا۔ آخر میں جا کر وہ دائرہ ہی نہیں رہے گا۔ نقطے میں بدل جائے گا۔

طول البلد کی جو قانونی تعریف ہے وہ یہ ہے کہ طول البلد خط گرین وچ سے کسی مقام کے شرقاً غرباً فاصلہ کو کہا جاتا ہے۔ عرض البلد کی قانونی تعریف کیا ہوگی؟ خط استوا سے کسی مقام کا شمالاً یا جنوباً فاصلہ۔ یہاں سے یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ اگر یہ خطوط طول اور عرض فرضی ہیں تو کھینچتے کیوں ہیں؟ ضرورت کیا ہے؟ ضرورت یہی ہے جو ''فاصلے'' کا لفظ ہمیں بتا رہا ہے۔ زمین تو گول ہے۔ اس کا سر ہے نہ پیر۔ تو اس پر کسی مقام کی تعیین ہم کیسے کریں گے؟ محل وقوع کی پہچان کا ایک طریقہ جہت سے معلوم کرنے کا ہے۔ یہ جگہ دنیا کے مشرق، مغرب میں ہے۔ وہ شمال مشرق میں ہے۔ یہ جنوب مشرق میں ہے۔ آپ کہہ دیتے ہو کہ پاکستان کے شمال مشرق میں ہندوستان ہے۔ شمال مغرب میں افغانستان ہے اور اس کے مغرب کی طرف بحیرۂ عرب ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہوگیا۔ اس گول، بے نام، بے آثار کرّے پر کسی جگہ کی تعیین کا ایک طریقہ تو یہ ہوا۔ لیکن یہ مکمل کام نہیں دیتا۔ اس لیے خطوط وضع کیے گئے ہیں کہ آپ کسی مقام کا طول بتاؤ۔ شرق میں غرب میں وہ کتنے فاصلے پر ہے۔ عرض بتاؤ شمال جنوب میں کتنے فاصلے پر ہے؟ یہ خطوط طول وعرض فرضی ہیں، لیکن کرۂ ارض پر کسی مقام کے محل وقوع کی صحیح تعیین کے لیے، بالکل درست تعیین کے لیے رہنما کا کام دیتے ہیں۔ کسی مقام کا طول وعرض معلوم ہوگا تو اس کا محل وقوع بالضبط متعین ہو جائے گا۔ طول کے دو خطوط کے درمیان جو فاصلہ ہوا سے ''گور'' کہتے ہیں اور عرض کے خطوط کے درمیانی فاصلے کو ''زون'' کہتے ہیں۔ اور طول وعرض کے خطوط کے ملنے سے چار کونوں والا ایک خانہ بن جاتا ہے، اس کو ''گریٹ کول'' کہتے ہیں۔

صفر درجہ طول البلد ہو یا 180 درجہ طول البلد، دوسرے لفظوں میں طول کا مبدا خطِ ''گرین وچ'' ہو یا طول کا منتہا ''عالمی تاریخی خط''، عام آدمی کا دونوں جگہوں تک جانا مشکل ہے۔ البتہ دنیا میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ دین کے حوالے سے ان دونوں جگہوں تک لے گئے۔ آیئے! ان کی زبانی اس کا حال سنتے ہیں:

''انٹرنیشنل ڈیٹ لائن

''شام ساڑھے چار بجے فیجی ایئر کا چھوٹا سا طیارہ ہمیں ''سووا'' سے ''لمباسا'' لے جانے کے لیے روانہ ہوا۔ یہ فیجی کے دوسرے بڑے جزیرے

وینوا(Vanua) کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اسے انگریزی میں Labasa لکھا جاتا ہے، مگر تلفظ "لمباسا" کیا جاتا ہے اور ہندوستانی حضرات کہتے ہیں کہ یہ شہر دراصل "لمباسا" ہے، یعنی اس کا طول عرض کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

اتوار (پیر) 9 جنوری کا دن بھی "لمباسا" میں ہی گزرا۔ دوشنبہ (پیر) 10 جنوری کا پروگرام ہمارے میزبانوں نے اس طرح ترتیب دیا تھا کہ اس میں فیجی کے مختلف شہروں میں وعظ کی مجلسیں بھی ہو جائیں اور ان کے قابلِ دید سیاحتی مقامات کی سیر بھی ہو سکے، جن میں انٹرنیشنل ڈیٹ لائن بھی داخل تھی۔ چنانچہ ہم فجر کے متصل بعد سڑک کے راستے جزیرۂ وینوا کے ایک اور شہر "سابوسابو" (Savusavu) کے لیے روانہ ہوئے جو "لمباسا" سے جنوب میں تقریباً نوے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ صبح کے وقت ہمیں یہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے ایک اور جزیرے "تیونی" (Taveuni) جانا تھا، جس میں انٹرنیشنل ڈیٹ لائن واقع ہے۔ تقریباً پونے نو بجے ہم ایر پورٹ پہنچے۔ یہ بہت چھوٹا سا ایر پورٹ تھا جس میں لاؤنج کی جگہ بس اڈے کی طرح کی بنچیں پڑی ہوئی تھیں، مگر صاف ستھرا ماحول تھا۔ ایک چھوٹا سا طیارہ ہمیں یہاں سے لے کر روانہ ہوا اور سمندر کی سیر کراتا ہوا صرف پندرہ منٹ میں "جزیرۂ تیونی" پہنچ گیا۔ یہاں سے ہم کار کے ذریعے سمندر کے ساتھ ساتھ کافی دور تک چلتے رہے یہاں تک کہ انٹرنیشنل ڈیٹ لائن پر پہنچ گئے۔

انٹرنیشنل ڈیٹ لائن پر:

یہ ڈیٹ لائن ٹھیک 180 طول البلد پر واقع ہے اور یہاں دو بورڈ اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ ان کے بیچ میں آدھے انچ کا خلا ہے۔ یہ خلا ہی ڈیٹ لائن ہے۔ اس ڈیٹ لائن کے بائیں طرف آج اتوار ہے اور دائیں طرف سنیچر اور بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ آپ اگر اس طرح کھڑے ہوں کہ آپ کا دایاں پاؤں دائیں بورڈ کی طرف اور بایاں پاؤں بائیں بورڈ کی طرف ہو تو آپ بیک وقت دو دن میں کھڑے ہوں گے، دایاں پاؤں گزشتہ کل (سنیچر) میں ہوگا اور بایاں پاؤں آج (اتوار) میں۔

جو حضرات اس جغرافیائی حقیقت سے مانوس نہیں ہیں ان کو سمجھانے کے لیے عرض ہے کہ یوں تو دنیا کے گول ہونے کی وجہ سے ہر وقت سورج کسی جگہ طلوع اور کسی جگہ غروب ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لیے دنیا کے تمام خطوں میں دن اور تاریخ کا آغاز ایک وقت پر نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر خطے میں دن کے شروع ہونے کا وقت الگ ہے، لیکن دنیا میں دنوں، تاریخوں اور اوقات کے یکساں تعین کے لیے بین الاقوامی طور پر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کرۂ زمین کو 360 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر حصہ ایک ڈگری یا درجہ کہلاتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان ان درجوں کے تعین کے لیے پورے کرۂ زمین کے گرد ایک خط کھینچا گیا ہے جو طول البلد کا خط کہلاتا ہے۔ اس خط کی ابتداء برطانیہ کی رصد گاہ "گرین وچ" سے ہوتی ہے جو صفر طول البلد پر واقع ہے۔ یہاں سے مشرق میں 180 درجے تک دنیا کا نصف حصہ پورا ہو جاتا ہے اور دوسری طرف مغرب میں 180 درجے تک دوسرا نصف حصہ اور اس طرح زمین کے گول ہونے کی وجہ سے 180 طول البلد پر مشرق و مغرب دونوں کے خطوط مل جاتے ہیں۔

چونکہ سورج مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتا ہے، اس لیے دنیا بھر میں اوقات کا تعین اس طرح کیا جاتا ہے کہ گرین وچ (صفر طول البلد) پر جو وقت ہوتا ہے، مشرق میں طول البلد کے ہر پندرہ درجے پر وقت اُس سے ایک گھنٹہ کم ہو جاتا ہے اور مغرب میں ہر پندرہ درجے پر ایک گھنٹہ بڑھ جاتا ہے، مثلاً گرین وچ پر اگر رات کے بارہ ہوں، تو مشرق میں 15 درجہ طول البلد پر گیارہ بجے ہوں گے اور مغرب میں 15 درجہ طول البلد پر ایک بجا ہوگا۔ اس طرح مشرق میں 180 درجے پر پہنچتے پہنچتے گرین وچ ٹائم سے بارہ گھنٹے کم ہو جائیں گے اور مغرب میں 180 درجے تک پہنچتے پہنچتے بارہ گھنٹے بڑھ جائیں گے اور چونکہ زمین گول ہے، اس لیے دونوں طرف سے 180 درجے ایک مقام پر جا کر مل جاتے ہیں اور مشرق کے آخری نقطے اور مغرب کے آخری نقطے پر وقت کا فرق پورے چوبیس گھنٹے کا ہو جاتا ہے، یعنی دن بدل جاتا ہے۔ ہم جس مقام پر کھڑے تھے وہ ٹھیک 180 درجے طول البلد کا تھا جہاں مشرق اور مغرب دونوں طرف کے طول البلد

کے خطوط آ کر مل رہے تھے اور مشرق کے 180 درجے اور مغرب کے 180 درجے کے درمیان چوبیس گھنٹے کا فرق ہو چکا تھا، لہٰذا مشرق کی طرف ایک دن کم تھا اور مغرب کی طرف ایک دن زیادہ۔ یہ خط جو مشرق و مغرب کے خطوں کو الگ کرتا ہے ''انٹرنیشنل ڈیٹ لائن'' کہلاتا ہے۔ یہ ڈیٹ لائن زیادہ تر سمندر پر گزرتی ہے یا پھر سائبیریا اور انٹارکٹیکا کے علاقوں سے جو عموماً غیر آباد ہیں۔ آباد علاقوں میں فیجی واحد ملک ہے جس کے تین جزیروں پر سے ڈیٹ لائن گزرتی ہے اور تیوونی نامی جزیرے کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ جس نقطے پر ہم کھڑے تھے وہ ٹھیک 180 طول البلد پر واقع ہے، جس کے ایک طرف سنیچر تھا اور دوسری طرف اتوار۔ اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ دنیا میں ہر روز نئی تاریخ کی ابتداء یہاں سے ہوتی ہے اور ہر دن کا نیا سورج سب سے پہلے یہاں طلوع ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ جگہ ''مطلع الشمس'' یا نکلتے سورج کی سرزمین ہے۔ آج 180 طول البلد پر پہنچ کر دنیا کے طول البلد کے دونوں سروں پر حاضری مکمل ہوگئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کے ان سروں کو بندے کے گناہوں کی پردہ پوشی فرما کر ایمان و طاعت اور توبہ و استغفار کے گواہ بنا دے۔ آمین!

یہاں سے چند کلومیٹر مغرب میں جزیرے کے تقریباً آخری کنارے پر مسلمانوں نے ایک مسجد بنائی ہوئی ہے جہاں اس وقت میری تقریر کا اعلان ہو چکا تھا، یہ مسجد ڈیٹ لائن کے مغرب میں واقع پہلی مسجد ہے اور اس کے منتظمین نے بجا طور پر یہ تبصرہ کیا کہ آپ ایک ایسی مسجد میں تقریر کرنے جا رہے ہیں جہاں ہر روز ساری دنیا میں سب سے پہلے فجر کی اذان بلند ہوتی ہے اور یہ بات واقعتاً درست تھی، اس مسجد کو حقیقتاً یہ فخر حاصل ہے۔'' (سفر در سفر:؟)

نقشہ خوانی:2

2- چار غیر مسلسل خط:

ہر نقشے پر چار خط ''غیر مسلسل'' ہوتے ہیں جو زمین پر موسم اور آب وہوا کے اعتبار سے وجود میں آنے والے تین منطقوں کو واضح کرنے کے لیے کھینچے جاتے ہیں۔ پہلا منطقہ سورج کی سڑک کے نیچے ہوتا ہے۔ اس میں جتنے بھی عرض البلد ہیں، جو بھی علاقے آتے ہیں، ان پر سال میں دو مرتبہ سورج کی کرنیں عمودا پڑتی ہیں۔ براہ راست۔ بالکل سیدھی۔ سر پہ آ کر۔ اس لیے تیز گرمی کا احساس ہوتا ہے۔ اسے ''منطقہ حارہ'' کہتے ہیں۔ یہ خط استوا سے 23.50 درجے کے فاصلے تک ہوتا ہے۔ شمالا بھی جنوبا بھی۔ اس کے باہر جو علاقہ ہے اس پر سورج کی کرنیں عمودا کبھی نہیں پڑتیں، ہمیشہ ترچھی ہوتی ہیں، اس لیے وہاں گرمی نسبتا کم ہوتی ہے۔ جتنا دور چلے جائیں گے اتنا ہی حرارت کم ہوتی چلی جائے گی، اس لیے 23.50 درجے سے 66.66 درجے تک جو بیچ کا علاقہ ہے اس کو ''منطقہ معتدلہ'' کہتے ہیں۔ اس سے آگے قطب جنوبی تک ''منطقہ باردہ'' ہے۔ منطقہ معتدلہ میں سے جو علاقہ منطقہ حارہ سے قریب ہوگا، اس میں نسبتا حرارت زیادہ ہوگی اور منطقہ باردہ سے جو قریب ہوگا اس میں نسبتا برودت زیادہ ہوگی۔

یہ تو موسم کے اعتبار سے تین منطقے ہو گئے جنہیں خط غیر مسلسل کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اب وقت کے اعتبار سے تین خطوں کو سمجھیں۔ سورج زمین کو دو چیزیں فراہم کرتا ہے: حرارت اور روشنی۔ روشنی سے دن رات بنتے ہیں اور حرارت سے موسم بنتے ہیں۔ اللہ تعالی نے نظام کچھ ایسا بنایا ہے کہ سورج ہمیں یہ دونوں چیزیں فراہم کرتا رہتا ہے، لیکن بیک وقت حرارت کے اعتبار سے بھی کئی منطقے زمین پر پائے جا رہے ہوتے ہیں اور وقت کے اعتبار سے بھی کئی منطقے زمین پر پائے جا رہے ہوتے ہیں۔ جس طرح حرارت کے اعتبار سے یہ تین منطقے ہیں، اسی طرح وقت کے اعتبار سے بھی تین منطقے بن جاتے ہیں۔ یعنی سورج اپنا کام کر رہا ہے۔ زمین پر اثر ڈال رہا ہے، وہ مؤثر ہے اور زمین اثر پذیر ہے، لیکن ایک ہی وقت میں زمین کے مختلف خطوں میں تین موسم بن رہے ہیں اور ایک ہی وقت میں مختلف خطوں پر تین وقت بھی پائے جا رہے ہیں۔

وقت کے اعتبار سے زمین کو تین منطقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، اس کو ابھی ہم سمجھتے ہیں لیکن پہلے ایک مشہور اعتراض اور اس کا جواب ہو جائے۔

ایک مشہور اعتراض اور اس کا جواب:

اعتراض یہ ہے کہ آپ نے کہا خط استوا کے شمال وجنوب میں 23.50 درجے تک منطقہ حارہ ہے۔ شمال کی طرف خط سرطان تک اور جنوب کی طرف خط جدی تک۔ اس میں شدید گرمی والے علاقے آتے ہیں۔ مکہ مکرمہ اس خط استوا سے 21 درجے کے فاصلے پر ہے تو یہ خط سرطان سے کتنا پیچھے ہوگا؟ ڈھائی درجے! تو مکہ مکرمہ منطقہ حارہ کے اندر ہے، لیکن اس کے ساتھ کچھ فاصلے پر طائف بھی ہے۔ "لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ." [الزخرف:31] یہ قریتین (مکہ وطائف) قریب قریب ہیں۔ دونوں ''منطقہ حارہ'' میں ہیں۔ جبکہ ایک بہت ٹھنڈا ہے، ایک بہت گرم ہے۔ دونوں

ایک ہی منطقے میں ہیں۔ پاکستان میں آپ مری اور سبّی کو لے لیں: یہ ایک ہی ملک اور ایک ہی منطقے میں آتے ہیں، لیکن ایک بہت گرم اور ایک بہت سرد۔ تو سرد والا وہاں سے یہاں کیسے آ گیا؟ اس خطے کے اندر جس کو گرم حصہ قرار دیا گیا ہے، اتنا سرد علاقہ کیسے آ گیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ خط استوا سے فاصلہ موسم تبدیل کرنے والا ایک عنصر ہے۔ آب وہوا پر اثر انداز ہونے والی یہ ایک وجہ ہے۔ کل وجوہات جو کسی علاقے کے ٹھنڈا یا گرم ہونے کا سبب بنتی ہیں، سات ہیں۔ یہ ایک سبب ہے جسے عام اصطلاح میں ''خط استوا سے فاصلہ'' کا نام دیا جاتا ہے کہ خط استوا سے جتنا دور ہوتے جائیں گے تو سورج سے بھی اتنا ہی دور ہوتے جائیں گے، گویا پہلے اعتدال کی طرف جائیں گے، پھر برودت کی طرف چلے جائیں گے۔ یہ تو ایک وجہ ہوئی۔ اب اگر اس منطقے کے اندر کوئی علاقہ آتا ہے تو اس کے گرم ہونے کی ایک وجہ پائی جارہی ہے اور اسی منطقے کے اندر اگر کوئی ایسا علاقہ ہے جس کے ٹھنڈے ہونے کی بقیہ چھ وجوہات پائی جارہی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ غلبۂ اسباب برودت کی وجہ سے ٹھنڈا ہو جائے گا اور اگر اس منطقے کے اندر کوئی ایسا علاقہ ہے جس کے گرم ہونے کی مزید وجوہات بھی پائی جارہی ہیں تو شدید گرم ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ اگر ایسا علاقہ ہے کہ جہاں حرارت کی ایک وجہ ہے کہ سورج سے قرب اور بقیہ چھ وجوہات میں سے ایک سے زیادہ وجوہات اس کی برودت کی پائی جارہی ہیں تو پھر وہ گرم رہے گا یا ٹھنڈا ہو جائے گا؟ ظاہر ہے وہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

کسی مقام کے گرم یا سرد ہونے کی وجوہات:

وہ وجوہات کیا ہیں؟ مثلاً: ایک وجہ تو ہوگئی خط استوا سے فاصلہ۔ دوسری وجہ ہے سمندر سے فاصلہ۔ سمندر سے جو علاقے قریب ہوتے ہیں ان کی آب وہوا معتدل اور مرطوب ہوتی ہے۔ سمندر کا پانی دیر سے ٹھنڈا اور دیر سے گرم ہوتا ہے۔ اس کے اوپر سے چلنے والی ہوائیں اس کے قریب واقع خشکی پر اثر ڈالتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہوگئی سمندر سے فاصلہ۔ وہ یہاں طائف پر اثر انداز نہیں ہے۔ یہاں فاصلہ کم ہے۔ لیکن اگلی وجوہات بھی ہیں: مثلاً سطح سمندر سے بلندی۔ جتنا سمندر سے بلند ہوتے جائیں گے، ہواؤں کی طرف جائیں گے اور اتنا ہی ٹھنڈک بڑھتی جائے گی۔

ایک اور وجہ زمین کی نوعیت ہے، جس کا ایک حدیث شریف میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو زمین کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم جو خود بھی فائدہ اٹھاتی ہے، دوسروں کو بھی فائدہ دیتی ہے۔ یہ چکنی مٹی ہوتی ہے زرخیز۔ پانی کو جذب کر لیتی ہے اور زمین کی کافی گہرائی تک گیلی ہوتی ہے اور سبزہ بھی اگاتی ہے۔ اس زمین کو خود بھی فائدہ ہوا اور نوع انسانی کو بھی اس نے فائدہ دیا۔ دوسری مٹی وہ ہوتی ہے جو اگاتی کچھ بھی نہیں، البتہ پانی ذخیرہ کر لیتی ہے۔ اس کو خود کوئی فائدہ نہیں ہو رہا، لیکن دوسروں کو تو فائدہ دے رہی ہے۔ تیسری قسم وہ ہے کہ نہ پانی کو روک کر ذخیرہ کرتی ہے، سارا پانی جذب ہو کر اندر اتر جاتا ہے۔ گہرائی میں غائب ہو جاتا ہے۔ کافی گہرائی تک کھودو تو بھی خشکی ہے جیسے ریتیلی مٹی اور دوسروں کو اس نے کوئی سبزہ پتی اگا کے فائدہ تو دینا ہی نہیں ہے۔ حدیث شریف میں زمین کی تین قسم کی مثالیں دی گئی ہیں۔ تو ایک وجہ زمین کا ریتیلا یا زرخیز یا چکنا ہونا بھی ہے کہ زمین پر جب بارش پڑ گئی تو اس نے ٹھنڈا رہنا ہے، پانی کو اس نے اپنے اندر رکھ کر دیر تک گیلا رہنا ہے، پھر اس کے اوپر موجود جنگلات اور سبزہ یہ بھی ایک وجہ بن جاتی ہے۔ اب طائف کو اگر دیکھیں سطح سمندر سے اونچا ہے، پھر وہاں کی مٹی خوب زرخیز ہے۔ سبزہ اگاتی ہے، باغات ہوتے ہیں۔ آب وہوا خوب معتدل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس مکہ مکرمہ ''وادی غیر ذی زرع'' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں ظاہری خوبصورتی نہیں رکھی۔ پانی ہے نہ سبزہ۔ خشک پہاڑ ہیں۔ تا کہ دنیا بھر سے لوگ صرف اللہ کی محبت میں کھنچے چلے آئیں اور دنیا بھر کے پھل بھی اگیں کہیں اور آئیں یہاں، تا کہ دنیا کے لیے حق کی نشانیاں ظاہر ہو جائیں۔ یہی حال مری اور سبّی کا ہے۔ اب واپس اصل بحث یعنی موسم کے اعتبار سے تین خطوں کی طرف آتے ہیں۔

وقت کے اعتبار سے تین منطقے:

زمین کی دوسری تقسیم وقت کے اعتبار سے ہے: "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ، لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ." [ال عمران:190] دن رات کے آنے جانے میں بڑی نشانیاں ہیں۔ کیا نشانیاں ہیں؟ ایک ہی سطح زمین ہے جس پر سورج روشنی ڈال رہا ہے، لیکن بیک وقت کئی موسم وجود میں آ رہے ہیں۔ مثلاً شمالی کرے میں الگ موسم ہے اور جنوبی کرے میں الگ موسم ہے۔ ہمارے ہاں موسم کی جو صورتحال ہے، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں اس کے قطعاً برعکس ہو جاتی ہے۔ شمالی اور جنوبی کرے میں الگ الگ موسم تو ہوتا ہی ہے۔ خود شمالی کرے میں دیکھیں تو کہیں حرارت ہے، کہیں اعتدال ہے اور کہیں برودت ہے۔ کوئی سردی سے ٹھٹھر رہا ہے اور کسی کا گرمی سے پسینہ نہیں رُک رہا ہے۔ تو ایک نشانی تو اس اعتبار سے ہوئی کہ مؤثر اور مؤثر کے ایک ہونے کے باوجود بیک وقت مختلف موسم اور مختلف خطے باعتبار آب و ہوا کے وجود میں آتے ہیں۔ دوسرا جب سورج روشنی فراہم کرتا ہے دن رات بنتے ہیں تو اس میں اللہ تعالیٰ نے عجیب عجیب چیزیں رکھی ہیں کہ بیک وقت کئی طرح کے دن رات بنتے ہیں اور اس سے تین طرح کے موسم اور علاقے وجود میں آ جاتے ہیں۔ فقہائے کرام بھی اس سے بحث کرتے ہیں کہ کچھ علاقے ایسے ہوتے ہیں جہاں دن رات معتدل ہوتے ہیں۔ معتدل کا معنی کہ دن اور رات کا فرق بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ کتنا زیادہ نہیں ہوتا؟ مثلاً اگر کوئی خطہ ثلث اور ثلثان تک رہتا ہے یعنی دن رات میں سے کوئی ایک 8 گھنٹے کا اور دوسرا 16 کا۔ بس اس سے زیادہ نہیں بڑھتا۔ اس کے قریب قریب ہوتا ہے۔ تو جغرافیہ دان کہتے ہیں یہ معتدل خطہ ہے۔ لیکن اگر کوئی ثلثان سے بڑھنے لگ گیا۔ 22 گھنٹے کا دن ہو گیا اور دو گھنٹے کی رات ہو گئی۔ اب دن رات دونوں آئے، لیکن اعتدال پر بہت فرق پڑ گیا۔ کوئی بہت طویل ہو رہا ہے اور کوئی چھوٹا سا ہے۔ جغرافیہ دان اسے "منطقہ غیر معتدلہ" کہتے ہیں۔

یہ دو قسم کے خطے ہو گئے۔ ایک خطہ وہ کہ جس میں دن رات سال بھر آتے ہیں اور اعتدال کے ساتھ آتے ہیں۔ یعنی ان میں فرق بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ دوسرا خطہ وہ کہ جس میں دن رات آتے ہیں، پورا سال آتے ہیں لیکن فرق کبھی کبھی بہت بڑھ جاتا ہے۔ تیسری قسم وہ خطہ جس میں سال بھر میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ دن یا رات میں سے کوئی ایک آتا ہی نہیں۔ یہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ منطقہ باردہ سے شروع ہوتا ہے اور جیسے جیسے آگے قطبین تک جاتے جائیں گے، دن یا رات میں سے کسی ایک کا نہ آنا زیادہ ہوتا جائے گا۔ منطقہ باردہ شمالیہ کے خط پر سال میں دو مرتبہ یہ عجوبہ ہوگا۔ ایک مرتبہ تو یہ ہوگا کہ سورج سرے سے ڈوبے گا ہی نہیں۔ دن ہی دن ہوگا اور دوسری مرتبہ سورج جنوب میں گیا ہوگا تو رات ہی رات ہوگی۔ یہ عجیب منطقہ قطب شمالی سے ساڑھے 23 درجے پر ہے۔ اس سے ایک درجہ آگے چلے جائیں تو ساڑھے تیئس درجے میں اگر سال میں دو مرتبہ ایسا ہوتا ہے تو اس میں کتنی مرتبہ ہوگا؟ چار مرتبہ۔ اور آگے بڑھتے جائیں گے تو یہ سلسلہ بڑھتا جائے گا حتیٰ کہ قطبین پر سال میں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہے گی۔ دو مرتبہ نہیں، تین مرتبہ نہیں، سارا سال ہی ایسا ہوگا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دن رات کا بننا اس بات پر موقوف ہے کہ کوئی جگہ سورج کی روشنی کی زد میں آتی ہے یا نہیں؟ اور سورج کی روشنی کی زد میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا فاصلہ سورج سے 90 درجے کے اندر ہو۔ اس سے زیادہ ہوا تو وہ سورج کی روشنی سے محروم ہو جائے گی اور اس میں دن نہیں آئے گا۔ اسے جغرافیہ کی اصطلاح میں "منطقہ غیر معتادہ" کہتے ہیں۔

یہ جو تین منطقے وجود میں آتے ہیں۔ پہلے کا نام ہے معتدلہ، دوسرے کا نام غیر معتدلہ اور تیسرے کا نام ہے غیر معتادہ۔ چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ شروع میں دو خطے ہیں معتادہ اور غیر معتادہ۔ معتادہ کا معنی کہ سارا سال دن رات آتے ہیں۔ غیر معتادہ کا معنی کہ ایسا وقت بھی آتا ہے کہ 24 گھنٹے سورج دیکھنا یا اندھیرے سے چھٹکارا پانا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ پھر معتادہ دو قسم ہے: معتدلہ اور غیر معتدلہ۔ معتدلہ جہاں دن رات میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ غیر معتدلہ جہاں دن رات میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ یعنی ثلث اور ثلثان۔ 8 اور 16 گھنٹے سے زیادہ۔

غیر معتدل یا غیر معتاد علاقوں کا معاملہ دلچسپ ہے۔ نماز کیسے پڑھیں گے وہاں پر؟ جنوبی منطقہ باردہ میں تو آبادی ہی نہیں ہے۔ چند سائنس دانوں یا چند تحقیق کاروں کے علاوہ اور کوئی وہاں نہیں رہتا۔ قطب شمالی میں کچھ ایسے جزیرے ہیں 81 درجے پر یعنی 90 سے کم جو ناروے کے ماتحت ہیں۔ وہاں کوئلہ وغیرہ نکلتا ہے۔ اس پر ناروے اور روس کا یکساں دعوی تھا تو انہوں اتفاق کرلیا کہ لڑائی کی ضرورت نہیں۔ اس ٹھنڈے علاقے میں لڑنا نہیں چاہیے۔ لہٰذا دونوں مل بانٹ کر سفید شفاف برف میں سے سیاہ کالا کوئلہ نکال کر دولت کمار ہے ہیں۔ یہاں کان کنی ہوتی ہے، کوئلہ نکلتا ہے، انسانی آبادی اور انسانی وجود ہے وہاں پر۔ انسان کے جسم کی گرمی وہاں برف کی سردی کو متاثر کرتی ہے۔ سفید برف کے نیچے سے کالا کوئلہ نکلتا ہے۔ اس جزیرے کا نام ہے سوالبرگ اور یہ ناروے کے ماتحت ہے۔ انتہائے شمال میں سکنڈے نیوین ممالک آتے ہیں۔ ان میں سے ایک ناروے ہے دنیا کے شمالی کنارے پر۔ صرف یہاں 81 درجے پر مشہور جزیرہ ہے سوالبرگ۔ 71 درجے پر تو عام لوگ بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ تو بالفرض مثلا مسلمان وہاں کوئی چلا جاتا ہے تو نماز کا کیا کرے گا؟ رات ہی رات ہے یا دن ہی دن ہے؟ 22 گھنٹے کا دن۔ ابھی مغرب پڑھ کے تراویح پڑھی نہیں کہ دو گھنٹے میں سحری کا وقت ہو جاتا ہے۔ تو 22 گھنٹے کا روزہ کیسے رکھے گا؟

حدیثِ دجال کی روشنی میں فقہاء نے ایسے علاقے کے لیے تین الگ الگ حکم بیان کیے ہیں۔ تین مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ قریب ترین جو معتدل علاقہ ہے جہاں معتدل طریقے سے دن رات آتے ہیں اور آسانی سے لوگ روزہ رکھتے اور نماز پڑھتے ہیں۔ اس کا نقشہ اوقات اپنے پاس رکھے اور چوبیس گھنٹے میں پانچوں نمازیں پڑھے۔ چاہے سورج کھڑا ہے سر پر تو مغرب پڑھے۔ سورج کھڑا ہے سر پر افطاری کرے۔ اندھیرا ہے لیکن ظہر پڑھے۔ اجالا ہے لیکن عشا پڑھے۔ بس اس نقشے کے اوقات نماز کے مطابق نماز پڑھے، کیونکہ وقت نماز کی ظاہری علامت ہے۔ اصل علت نہیں، ظاہری سبب ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں وقت کا آنا جانا علت نہیں، سبب ہے۔ علت امرالٰہی ہے "أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ." [بنی اسرائیل: 78] یہ امر علت ہے اور دلوک الشمس سبب ہے۔ اگر سبب کسی وجہ سے نہیں پایا جا رہا ہے، لیکن علت موجود ہے تو امرالٰہی اس کی طرف متوجہ ہے کہ سجدہ کر۔ لہٰذا قریب کے علاقے کا سبب اپنے لیے عمل کی علامت کے طور پر استعمال کرے اور جب تک علت موجود ہے یہ نماز پڑھنے کا پابند ہے۔ اس سے نماز ساقط نہیں ہوئی۔ اب بالفرض اس جزیرے میں کوئی ریاست ہے۔ کوئی ملک ہے۔ وہاں کوئی تبلیغ یا جہاد کے لیے چلا گیا تو نماز اس اصول کے مطابق پڑھے گا کہ قریب کے ملک سے نقشہ منگوالے گا۔ یہ ملک بہت ٹھنڈے ہیں۔ سرد جہنم کی طرح ٹھنڈے۔ یہاں ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ جہنم میں ٹھنڈا عذاب بھی ہوگا یا آگ ہی کا عذاب ہوگا؟ سادات لوگ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو "زمہریری" عذاب ہوگا۔ زمہریر کا معنی ہے ٹھنڈا۔ آگ کا عذاب ہمیں نہیں ہوگا۔ پتہ نہیں انہوں نے یہ روایت اپنے لیے کہاں سے وضع کی ہے؟ یہ بیچ میں جملہ معترضہ آ گیا۔

اب ہم یہاں آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے اس علاقے کے ایک مشاہداتی سفر کی روداد عصرِ حاضر کے محقق عالم اور بلند پایہ ادیب کی زبانی سنواتے ہیں:

"ہونس وگ میں سایہ اصلی:

"دن کے گیارہ بجے کے قریب ہم اس شہر کی بندرگاہ پر اترے تو آسمان بالکل صاف تھا اور دھوپ خوب پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ ہم پچھلے دو روز سے دن کی روشنی ہی میں تھے اور رات کا اندھیرا دیکھے ہوئے تقریباً بہتر گھنٹے ہونے والے تھے، لیکن اس پورے عرصے میں آسمان زیادہ تر ابر آلود رہا تھا، لیکن "ہونس وگ" میں چونکہ دھوپ مکمل پھیلی ہوئی تھی تو یہاں یہ بات واضح طور پر نظر آئی کہ سورج کے "خطِ نصف النہار" سے گزرتے وقت ہر چیز کا سایہ اس کے اپنے حجم سے زیادہ تھا۔ ہمارے معتدل علاقوں میں جب آفتاب "نصف النہار" کے خط پر پہنچتا ہے تو ہر چیز کا سایہ بہت چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اسے فقہاء کی اصطلاح میں "سایۂ اصلی" کہتے ہیں۔ کسی خطے کا عرض البلد جتنا کم ہوگا، وہاں سایۂ اصلی اتنا ہی چھوٹا ہوگا۔ یہاں تک کہ جو ممالک "خطِ استواء" کے نیچے (یعنی صفر عرض البلد پر) رہتے

ہیں وہاں یہ سایہ بالکل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ عصر کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہر چیز کا سایہ اس کے سائز سے دوگنا ہو جائے، لیکن یہ دوگنا ہونا سایۂ اصلی کے علاوہ ہونا چاہیے۔ بعض اہل ظاہر نے فقہا کی اس بات پر اعتراض کیا کہ حدیث میں سایہ کے ایک مثل یا دو مثل ہونے کا تو ذکر ہے، لیکن سایۂ اصلی کا استثنا حدیث سے ثابت نہیں اور فقہائے کرام نے اپنی طرف سے اس استثنا کا اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن یہیں پہنچ کر ان فقہائے کرام کی بات بداہۃً ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر سایۂ اصلی کا استثناء نہ کیا جائے تو ان شمالی علاقوں میں تو عین نصف النہار کے وقت ہی سایۂ ایک مثل سے زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا فقہائے کرام کی بات ''عقلِ عام'' (common sense) کی بات ہے جس کے لیے کسی ''نص'' کی ضرورت نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

''ہونس ووگ'' ایک چھوٹا سا ساحلی شہر ہے اور اس کے بعد قطبِ شمالی تک کوئی اور آبادی نہیں ہے، لہٰذا یہ اس سمت میں دنیا کا آخری شہر ہے۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں کئی گھنٹے اپنے ''معارف القرآن'' کے کام میں مشغول رہا۔ پھر شام کو چھ بجے کے قریب ہم چہل قدمی کے لیے ساحل کی طرف نکلے تو راستے میں چند صومالی مسلمان مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اس چھوٹے سے شہر میں بھی سات آٹھ صومالی اور چار پانچ عراقی مسلمان رہتے ہیں۔ مسجد تو کوئی نہیں، لیکن کسی گھر میں کبھی کبھی نماز جماعت سے پڑھ لیتے ہیں۔ ہم نے اس سے کچھ گزارشات کیں، خدا کرے ان کا کچھ اثر ظاہر ہو اور دنیا کے اس آخری سرے میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام مستقل طور پر بلند ہونے لگے۔

ساحلِ سمندر کے ساتھ سیاحتی یادگاروں کی ایک دکان تھی۔ اس دکان میں ''منطقہ حارہ باردہ'' (arctic region) کے مشہور ''برفانی ریچھ'' کا ایک حقیقی خول رکھا ہوا تھا۔ یعنی کسی نے برفانی ریچھ کو مار کر اس کی آلائشیں نکال کر اس کی کھال اس طرح بنا کر رکھی تھی کہ وہ بالکل زندہ ریچھ معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے اس کے سفید براق بالوں کو ہاتھ لگایا تو وہ اتنے ملائم اور خوشگوار تھے کہ ان پر بار بار ہاتھ پھیرنے کو دل چاہتا تھا۔ ان خوبصورت اور ملائم بالوں کے نیچے بڑی دبیز جلد تھی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا یہ کرشمہ ہے کہ اتنے خوفناک درندے کو اتنا حسین اور اتنا ملائم لباس عطا فرمایا۔ ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ یہ گناہوں کی لذّت اور رنگینی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ان کے ظاہر میں حسن اور لذّت ہے، لیکن انجام کے اعتبار سے وہ ایک خطرناک درندے سے کم نہیں جو انسان کی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔ ہاں! اگر کوئی شخص اس درندے کو شکار کر کے اس میں سے گناہ کا عنصر نکال پھینکے تو وہ اس کے حسن اور لذّت سے دنیا میں بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

اسی دکان میں اس علاقے میں سورج کی گردش کا نظارہ کرنے والی ایک تصویر بھی ملی جس میں کسی شخص نے رات کے آٹھ بجے سے صبح کے چار بجے تک ہر گھنٹے پر سورج کی مختلف پوزیشنوں کی تصویریں لے کر ان تمام تصویروں کو ایک ساتھ جوڑ دیا تھا۔ اس تصویر سے واضح ہوتا ہے کہ رات آٹھ بجے کے بعد بارہ بجے تک سورج کس طرح بتدریج مغرب کی سمت نیچے آتا ہے، لیکن بارہ بجے افق کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد دوبارہ شمال کی طرف بلند ہونا شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ رات کے چار بجے وہ شمال میں اتنا ہی بلند ہو جاتا ہے جتنا آٹھ بجے وہ جنوب میں تھا۔ ان ساری تصویروں کو ملانے سے ایک سنہری ''گلوبند'' کا سا منظر سامنے آتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ جنوب اور شمال میں اس کی اونچائی میں کہیں بال برابر فرق نہیں آتا۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ.

سورج کو غروب تو ہونا ہی نہیں تھا، اس لیے ہم نے مغرب کی نماز ساڑھے دس بجے (10.30) بجے ایسے وقت ادا کی جب سامنے دھوپ خوب پھیلی ہوئی تھی۔ ''ہونس ووگ'' کے شہر سے تقریباً 30 کلومیٹر کے فاصلے پر وہ مشہور جگہ ہے جو ''نارتھ کیپ'' (North Cape) کے نام سے معروف ہے۔ یہ کوئی بستی نہیں بلکہ شمال میں دنیا کی خشکی کا آخری کنارہ ہے، جس کے بعد قطبِ شمالی تک اس سمندر کے سوا کچھ نہیں ہے جو آگے جا کر سردی سے منجمد ہو گیا ہے اور اسے ''بحرِ منجمد شمالی'' کہا جاتا ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ دنیا کے اس آخری سرے پر ہم آدھی رات (12 بجے شب) کے وقت پہنچیں اور نماز عشاء بھی وہیں ادا کریں۔ چنانچہ تقریباً

گیارہ بجے رات ہم ایک کوچ میں سوار ہوکر ''نارتھ کیپ'' کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر سے نکلنے کے بعد پہاڑوں، وادیوں اور سمندری خلیجوں کا ایک خوبصورت سلسلہ شروع ہوگیا اور ایک بات میں نے یہ نوٹ کی کہ کئی سال پہلے میں جنوبی افریقہ کے جنوبی سرے (South Cape) تک بھی گیا ہوں جسے جنوب کی طرف دنیا کا آخری کنارہ کہنا چاہیے، وہاں کی زمین کا اتار چڑھاؤ اور عمومی منظر بھی اس شمالی سرے سے کافی ملتا جلتا تھا۔ فرق یہ ہے کہ یہاں کے پہاڑوں پر جگہ جگہ برف پڑی نظر آرہی تھی اور سردی نقطہ انجماد کے قریب قریب تھی، لیکن ''ساؤتھ کیپ'' کا عرض البلد چونکہ اتنا زیادہ نہیں ہے (وہ تقریباً 25 درجے عرض البلد پر واقع ہے) اس لیے وہاں سردی اور برف کا یہ منظر نظر نہیں آتا، لیکن زمین کا عمومی منظر خاصا ملتا جلتا ہے۔ جس خالق کائنات نے یہ زمین اور اس کے مختلف علاقے پیدا فرمائے ہیں، وہی اپنی تخلیق کے راز جانتا ہے۔ انسان کے پاس ان عجائب قدرت پر حیرت کے سوا اور کیا ہے؟

نارتھ کیپ:

بارہ بجے کے قریب ہم نارتھ کیپ پر جا اُترے۔ یہ 71 درجے 10 دقیقے اور 21 ثانیے کے عرض پر واقع ایک سطحِ مرتفع کا کنارہ ہے جو ''بحرِ منجمد شمالی'' پر جھانکتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کنارے پر شمال میں دنیا ختم ہوگئی ہے اور اس کے بعد قطبِ شمالی تک اس رخ پر کوئی خشکی نہیں ہے۔ ہم یہاں پہنچے تو دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کا ایک ہجوم تھا جو دنیا کے آخری سرے سے ''آدھی رات کا سورج'' دیکھنے کے لیے یہاں جمع تھے۔

سردی اس قدر شدید اور برفانی ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ پہنے ہوئے تمام کپڑے ناکافی معلوم ہو رہے تھے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ گرمی کے موسم میں (جب کہ مہینوں سے یہاں رات نہیں آئی اور افق پر سورج مسلسل موجود ہے) سردی کا یہ عالم ہے تو سردی کے موسم میں جب کہ مہینوں سورج کی شکل نظر نہیں آتی ٹھنڈک کا یہاں کیا عالم ہوگا؟ تھوڑی دیر اس ٹیلے سے سامنے کے سمندر کی کرنوں کا منظر دیکھنے کے بعد زیادہ دیر کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہوئی تو ہم قریب بنے ہوئے ایک شیشہ بند ہال میں چلے گئے اور جب رات کے سوا بارہ بجے تو دوبارہ باہر نکل کر ''نارتھ کیپ'' کے آخری سرے پر بنے ہوئے ایک چبوترے پر پہنچے۔ سورج اپنے آخری نقطے تک پہنچنے کے بعد بلند ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اس وقت افق پر کچھ ''مہین بادل'' آگئے تھے، مگر سورج کی کرنیں بادلوں کے کناروں سے آسمان کی طرف اُٹھ رہی تھیں اور انہوں نے ماحول کو منور کیا ہوا تھا۔ اس چبوترے پر کھڑے ہوکر ہم نے بلند آواز سے اذان دی اور اس کے بعد عشاء کی نماز باجماعت ادا کی۔

رات کے ایک بجے ہم یہاں سے شہر کی طرف واپس ہوئے تو سورج کی روشنی پہلے سے زیادہ ہوگئی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ قطبِ شمالی کی طرف منسوب بارہ سنگھے (Reindeers) چرتے ہوئے نظر آئے۔ ان دلنواز مناظر سے لطف اندوز ہوکر رات رات کو تقریباً دو بجے ہم دوبارہ قیام گاہ پہنچے۔ یہ ہماری تیسری رات تھی جس میں سورج غروب نہیں ہوا تھا اور دو بجے کے بعد فجر پڑھ کر سونے کے لیے ہمیں کمرے میں مصنوعی اندھیرا پیدا کرنا پڑا تھا۔

ان مقامات پر نماز کا حکم:

آگے بڑھنے سے پہلے میں اسی مرحلے پر اس سوال کا جواب دے دوں کہ ان جیسے مقامات پر جہاں مہینوں سورج غروب نہیں ہوتا نمازوں کی ادائیگی کا طریقہ ہے؟ صورتحال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ سوال تو سامنے نہیں آیا تھا کہ جن خطوں میں دن ہی دن یا رات ہی رات رہتی ہے وہاں نماز کیسے پڑھی جائے گی؟ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور واقعے کے ضمن میں اس سلسلے کی ایک اصولی ہدایت عطا فرمادی تھی۔

صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دنیا میں چالیس دن رہے گا۔ ان چالیس دنوں میں سے ایک دن ایک سال کے برابر، ایک دن ایک مہینے کے برابر اور ایک دن ایک ہفتے کے برابر ہوگا اور باقی دن تمہارے عام

دن جیسے ہوں گے۔ اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھ لیا کہ ''جو دن ایک سال کے برابر ہوگا، کیا ہمارے لیے اس دن میں صرف ایک ہی دن کی نمازیں کافی ہوں گی؟'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا، اُقْدُرُوْا لَهٗ قَدْرَهٗ." یعنی ''نہیں، اس کے لیے اندازے سے وقت مقرر کرنا۔'' میں پیچھے لکھ چکا ہوں کہ بلغار جیسے علاقے جن میں عشاء کا وقت نہیں آتا، ان میں راجح قول کی بنیاد پر عشاء کی نماز حساب لگا کر پڑھنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی بنیاد یہی حدیث ہے۔

قدیم فقہائے کرام کے زمانے میں مسلمانوں کی آبادی ایسے علاقوں تک ہی پہنچی تھی جہاں شفق غائب نہیں ہوتی، مگر 24 گھنٹے میں دن رات دونوں آجاتے تھے۔ رہے قطبین کے قریب کے وہ علاقے جہاں 24 گھنٹے میں دن اور رات کا دورہ مکمل نہیں ہوتا۔ ان میں مسلمانوں کی آبادی نہیں پہنچی تھی، اس لیے ان علاقوں کے حکم سے قدیم فقہا نے بحث نہیں فرمائی، لیکن جب سے ان علاقوں میں بھی مسلمان پہنچ گئے ہیں، اس وقت سے فقہائے عصر نے ان علاقوں کے احکام پر بھی بحث کی ہے اور بحث کا مرکزی نقطہ وہی ہے جو بلغار کے سلسلے میں پیش آیا۔ یعنی نماز کے وقت کی معروف علامتوں کے نہ آنے کی صورت میں نماز فرض بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ جو لوگ بلغار جیسے شہر میں عشاء کی نماز کو فرض نہیں مانتے، ان کا کہنا یہ ہے کہ جن علاقوں میں کئی مہینوں تک دن رہتا ہے ان میں پورے عرصے میں پانچ ہی نمازیں فرض ہوں گی، لیکن میں پیچھے عرض کر چکا ہوں کہ دلائل کے نقطہ نظر سے یہ قول کمزور اور مرجوح ہے اور دجّال کے بارے میں جو حدیث اوپر لکھی گئی ہے، اس اصول سے واضح طور پر برآمد ہوتا ہے کہ جب دن اتنا لمبا ہو جائے کہ 24 گھنٹے میں شب وروز کا دورہ مکمل نہ ہو تو اوقات نماز کی معروف علامتوں کا اعتبار نہیں رہتا، بلکہ ایسے موقع پر حساب لگا کر نمازیں ادا کرنی چاہییں۔ اب ان علاقوں میں نماز حساب لگانے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف تجویزیں پیش کی گئی ہیں، لیکن سب سے راجح، بہتر اور قابل عمل تجویز یہ ہے کہ ان علاقوں سے قریب علاقہ جہاں دن رات پورے ہو جاتے ہوں، اس میں جس نماز کا جو وقت ہو، ان علاقوں میں بھی اس وقت میں نماز پڑھی جائے۔ مثلاً اگر قریب ترین معتدل علاقے میں نماز مغرب 9 بجے ہوتی ہے اور عشاء ساڑھے دس (10.30) بجے تو یہاں بھی مغرب اور عشاء کی نماز بالترتیب 9 بجے اور ساڑھے دس (10.30) بجے پڑھی جائے، چاہے اس وقت سورج افق پر موجود ہو۔

پھر اس تجویز پر عمل کرنے کے بھی دو طریقے ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ معیار کسی ایسے قریبی شہر کو بنایا جائے جس میں پانچوں کے اوقات اپنی معروف علامتوں کے ساتھ آتے ہوں۔ چنانچہ رابطۂ عالم اسلامی کی ایک قرارداد میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ جو علاقے 45 درجے عرض البلد پر واقع ہیں ان کو معیار قرار دے کر غیر معتدل علاقوں میں تمام نمازوں کا وقت 45 درجے کے اوقات کے مطابق متعین کیا جائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی ایسے شہر کو معیار بنایا جائے جو ان غیر معتدل علاقوں کے قریب ہو اور اس میں نمازوں کے اکثر اوقات آتے ہوں، خواہ وہاں شفق غائب نہ ہوتی ہو۔ اس طریقے کے مطابق ''ترمسو'' وغیرہ میں جب دن ہی دن رہتا ہے اس وقت نمازیں ''اوسلو'' کے اوقاتِ نماز کے مطابق پڑھی جاسکتی ہیں۔

ان دو طریقوں میں سے پہلا طریقہ احتیاط کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عملی آسانی دوسرے طریقے میں ہے۔ خاص طور پر ایسے شہروں میں جہاں مسلمان اکا دکا آباد ہیں اور انہیں 45 درجے عرض البلد کے اوقات کا پتا لگانا آسان نہیں۔ لہٰذا ''ترمسو'' اور اس سے اوپر کے شہروں میں اگر ''اوسلو'' کے اوقاتِ نماز کی پیروی کی جائے تو یہ جائز اور درست ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثِ دجّال میں یہ اصول تو بیان فرما دیا کہ نمازیں اندازہ کر کے پڑھی جائیں، لیکن اندازہ کرنے کا مفصل طریقہ بیان نہیں فرمایا۔ شاید اس میں حکمت یہی ہو کہ اندازے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں اور جس جگہ جو طریقہ زیادہ قابل عمل ہو کہ اس میں زیادہ تنگی لازم نہ آئے، وہاں وہ طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ ''ترمسو'' میں جس مسلمان سے ملاقات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ اس نے یہی بتایا کہ یہاں کی کمیونٹی اوسلو کے حساب سے نمازیں پڑھنے کا معمول ہے۔

ترمسو اور نارتھ کیپ میں سورج کی گردش کا حال دیکھنے کے بعد اس بات کا مزید اندازہ یقین کے قریب قریب ہو گیا اور وہ یہ کہ جن حضرات نے یہ فرمایا ہے

کہ جن علاقوں میں کئی ماہ تک سورج غروب نہیں ہوتا، وہاں ان پر کئی مہینوں میں مجموعی طور پر صرف پانچ نمازیں ہی فرض ہیں، ان کا یہ فرمانا ان علاقوں کا مشاہدہ نہ کرنے پر مبنی ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ سمجھا ہے ان پر کئی ماہ میں مغرب کی طرح ظہر کا وقت صرف ایک مرتبہ اور عصر کا وقت صرف ایک مرتبہ آئے گا۔ حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ یہاں سورج خطِ نصف النہار سے ہر روز گزرتا ہے۔ لہٰذا ہر 24 گھنٹے میں سورج کا سایہ (سایہ اصلی کو چھوڑ کر) ایک مثل اور دو مثل ہوتا ہے۔ گویا ہر 24 گھنٹے میں یہاں ایک ایک مرتبہ ظہر اور عصر کا وقت ضرور آتا ہے اور یہ کہنا درست نہیں کہ تین ماہ کے دوران ظہر اور عصر کا وقت صرف ایک بار آتا ہے۔ لہٰذا ظہر اور عصر کی فرضیت ان حضرات کے قول پر بھی ہوتی ہے، جو نماز کی فرضیت کے لیے وقت کو "علتِ تامّہ" مانتے ہیں اور یہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کہ یہ تین ماہ پورے کے پورے ایک دن کے حکم میں ہیں اور ان تین ماہ میں صرف پانچ نمازیں ہی فرض ہوں گی کیونکہ جب ہر 24 گھنٹے میں ایک ایک مرتبہ ظہر اور عصر کی نمازوں کا وقت آتا ہے اور یہ نمازیں اپنے اوقات کے ساتھ فرض ہوتی ہیں تو معلوم ہوا کہ 24 گھنٹے میں ایک دن پورا ہو جاتا ہے اور پورے تین ماہ کو ایک دن قرار دینا درست نہیں۔

ہاں البتہ قطب شمالی؛ یعنی ٹھیک 90 عرض البلد پر ظاہر یہ ہے کہ سورج کی گردش مکمل طور پر محوری ہوتی ہوگی اور اس میں اشیا کا سایہ چوبیس گھنٹے ایک ہی طرح کا رہتا ہوگا، اس لیے ٹھیک اس جگہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ظہر اور عصر کا تعین سائے سے کرنا مشکل ہوگا، اگرچہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہاں بھی جب سورج خطِ نصف النہار سے گزر جائے تو اسے ظہر کا وقت سمجھنا چاہیے۔ (احسن الفتاوی: 2-126)

بہر صورت! ٹھیک 90 عرض البلد پر تو کسی انسان کا پہنچ کر نماز پڑھنا ابھی تک ایک موہوم مفروضہ ہے، لیکن شمالی منطقۂ باردہ (Arctic zone) کے بیشتر علاقے ایسے ہیں جن میں ظہر اور عصر دونوں کی علامتیں کسی شبہے کے بغیر پائی جاتی ہیں، لہٰذا چوبیس گھنٹے میں ان کا ایک دن پورا ہو جاتا ہے، خواہ سورج غروب نہ ہو۔ لہٰذا اگر تین مہینے تک وہاں سورج غروب نہیں ہوا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ تین مہینے ایک دن ہیں بلکہ یہ واقعتاً تین مہینے ہی ہیں، جن میں ہر روز ظہر اور عصر کا وقت آتا رہا ہے، لہٰذا باقی نمازیں بھی چوبیس گھنٹے کے اندر ہی ادا کرنی ضروری ہوں گی اور پورے تین ماہ میں صرف پانچ نمازیں پڑھنے کا تصور ان مقامات پر بداہۃً غلط ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان مقامات پر بھی چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں ہی پڑھنی ضروری ہیں، البتہ مغرب، عشاء اور فجر کے اوقات کے تعین میں اس منطقہ باردہ (Arctic zone) کے لوگ جو 30ء66 عرض البلد سے اوپر رہتے ہیں، غیر معتدل ایام میں یا تو اوسلو کے اوقات کو معیار بنا سکتے ہیں، یا 45 عرض البلد کے کسی شہر کو اور اوسلو میں عشاء کے وقت کی تفصیل میں پیچھے ذکر کر چکا ہوں۔" (دنیا میرے آگے: 327-331)

موسم کے اعتبار سے جو تین منطقے بنتے ہیں، اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہوتا کہ منطقہ معتدلہ میں کوئی زیادہ گرم یا سخت سرد علاقہ ہوگا ہی نہیں۔ شدید آب و ہوا والی جگہ ہوگی ہی نہیں۔ یا منطقہ حارہ میں برودت کا نام و نشان ہی نہیں ہوگا۔ ایسی جگہ ہی نہیں ہوگی جہاں برف نہیں پڑتی۔ آپ سبّی کو دیکھ لیں۔ نیچے زمین دیکھو کیسی سخت ہے۔ انتہائی سنگلاخ، ایک پتہ نہیں اگاتی، سبزے کا کوئی نام و نشان ہی نہیں۔ سورج جب پڑے گا تو اس نے گرم ہی رہنا ہے، رات کو ٹھنڈا ہونا ہی نہیں، ادھر مری چلے جائیں اور زمین کو کھودیں کہ کتنے فٹ تک وہ چکنی اور گیلی ہے۔ سورج اپنا کام کر کے جائے، لیکن اس نے ٹھنڈک برقرار رکھنی ہے۔ سبزہ اگائے گی۔ بارشیں زیادہ ہوں گی۔ سطح سمندر سے بلند بھی ہے تو ٹھنڈی ہوائیں، سطح سمندر سے بلندی اور زمین کی ساخت اتنی ساری چیزیں مل کر اس کی برودت کا سبب بن رہی ہیں تو ایک خطِ استوا سے فاصلے والا حرارت کا سبب اس کا کیا بگاڑے گا؟ کمرہ چھوٹا سا ہے، اے سی بہت بڑا لگایا ہوا ہے یا کمرہ بہت بڑا ہے اے سی کمزور طاقت کا ہے اور کھڑکیاں کھلی رکھی ہوئی ہیں تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک سبب کسی چیز کا ہو، لیکن چار سبب اگر مخالف ہوں تو جس چیز کے اسباب زیادہ ہوں گے وہی نتیجہ غالب ہوگا۔

یہ ایک ضمنی سوال کا جواب تھا جس سے فارغ ہو کر اب ہم وقت کے منطقوں کی طرف جا رہے ہیں۔ ایک طولِ بلد سے دوسرے طولِ بلد کے درمیان جو فاصلہ بنتا ہے اسے کیا کہتے ہیں؟ ''گور''۔ ایک گور سے دوسرے گور تک یا ایک طولِ بلد سے دوسرے طولِ بلد تک سورج چار منٹ لگائے گا۔ زمین پر ایک طول بلد کتنے میل کا ہوگا؟ زمین کی گولائی بالکل وسط میں یعنی خط استوا پر سب سے زیادہ ہے، یہاں یہ فاصلہ تقریباً 69 میل کا ہوتا ہے۔ گویا سورج چار منٹ میں 69 میل طے کرے گا۔ ایک درجہ طول بلد اور 69 میل۔ یہ دو الگ الگ پیمائشیں ہو گئیں۔ اگر چار منٹ میں 69 میل تو ایک منٹ میں کتنے میل؟ تقریباً 17 میل (یعنی کسر کے بغیر) چار منٹ میں 69 میل اور ایک منٹ میں تقریباً 17 میل بنتے ہیں۔

آب وہوا پر اثر ڈالنے والی ایک تو وہی چیز ہے خط استوا سے فاصلہ۔ دوسری چیز ہے سمندر سے فاصلہ۔ تیسرے سطح سمندر سے بلندی۔ چوتھے ہواؤں کا رخ۔ اللہ تعالیٰ کبھی ہواؤں کو موافق سمت سے چلاتے ہیں تو کبھی مخالف سمت سے چلاتے ہیں۔ فرشتوں کو حکم دیا ہوا ہے اور انہوں نے ہواؤں کو لگام میں ڈال رکھی ہیں۔ اگر ٹھنڈے علاقے کی ہوائیں آئیں گی تو کہیں گے جی کوئٹہ سے ہوائیں آئی ہیں، موسم سرد ہو گیا ہے۔ گرم علاقے سے ہوا سرد علاقے کی طرف آتی ہے تو فوراً موسم تبدیل ہو جاتا ہے۔ کراچی والوں کو تو اس کا سب سے زیادہ تجربہ ہے۔ آن کی آن میں یہاں کا موسم بدل جاتا ہے۔ اور کیا چیز موسم پر اثر ڈالتی ہے؟ بحری روئیں۔ سمندر ٹھنڈا بھی ہوتا ہے اور گرم بھی۔ ٹھنڈے علاقے کے سمندر سے ایک دریا چلتا ہے سمندر کے اندر ہی۔ دونوں طرف سطح سمندر پر پانی کھڑا ہوا ہے۔ اس کے بیچ میں دریا چل رہا ہے اور رو بہہ رہی ہے۔ ان سمندروں دریاؤں، بحری رووں کے ذریعے ٹھنڈے علاقے کا پانی گرم سمندر میں آتا ہے۔ اور گرم کا ٹھنڈے میں جاتا ہے۔ "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ." [الرحمٰن:19,20] دائیں بائیں اور کچھ گہرائی تک سمندر کھڑا ہوا ہے۔ درمیان میں پانی کا کٹاؤ ہے اور بیچ میں دریا چل رہا ہے۔ جب ہم آگے خلیجوں کا سبق پڑھیں گے تو میکسیکو کی مشہور خلیج ہے، خلیج میکسیکو (Gulf of macsico) وہاں سے ایک مشہور بحری رو چلتی ہے۔ میکسیکو بحر اوقیانوس کے پار ہے۔ نیم دائرے کی شکل میں ہے۔ یہاں سے رو چلتی ہے۔ اس کے ساتھ میامی امریکا کی ریاست ہے۔ اس میں فلوریڈا شہر ہے۔ یہ امریکا کی دم ہے۔ یہاں سے نکل کر بحری رو چلتی ہے۔ یہ خط استوا کے قریب ہے تو یہاں سے یورپ کی طرف گرم رو چلتی ہے۔ امریکا سے بحر اوقیانوس پار کر کے کوئی یورپ آنا چاہے تو وہ اپنا جہاز اس دریا کے اندر ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح اس کے انجن پر زور نہیں پڑتا۔ بہت مزے سے سفر کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ یورپ پہنچتے ہیں۔ یہاں پرتگال کی بندرگاہ لزبن ہے۔ انگلینڈ کی لیور پول ہے۔ اور اندر چلے جائیں تو جرمنی میں مصنوعی نہر ہے کیل۔ اس کو پار کر کے جرمنی پولینڈ پہنچ جاتے ہیں۔ تو یہ بحری رو جب ٹھنڈے علاقے کی طرف چلے گی تو یہ ٹھنڈا پانی ادھر گرم علاقے کی طرف لے کر جا رہی ہے۔ گویا ٹھنڈا دریا بہتا جا رہا ہے۔ جب یہاں آ کر ٹکرائے گی تو پورے سمندر کا موسم تبدیل کرے گی۔ جو ہوا اس کے ساتھ چل کر ادھر جائے گی، وہ بھی موسم میں تبدیلی کی ایک وجہ بنے گی۔

تو یہ وجوہات مل کر موسم میں فرق پیدا کر دیتی ہیں ایک ہی ملک میں۔ فورٹ منرو کو دیکھو کتنا ٹھنڈا ہے؟ اور نیچے ڈیرہ غازی خان میں جاؤ تو سبحان اللہ! مغز پگھل جائے۔ مؤثر اور متاثر یعنی اثر ڈالنے والا اور اثر قبول کرنے والا ایک ہی ہیں، یعنی سورج اور زمین، لیکن اللہ کی خلاقی ہے اور کمال صناعی ہے کہ بیک وقت تین طرح کے بڑے بڑے وقت وجود میں آ رہے ہیں اور گہرائی میں جاؤ تو صرف تین نہیں، کئی طرح کے وقت اور موسم وجود میں آ رہے ہیں۔ ہر عرض البلد کی کیفیت مختلف ہو رہی ہے۔

اب مجھے وقت کے تین منطقے کیسے بنیں گے؟ یعنی موسم کے اعتبار سے تین منطقے ہیں: حارہ، باردہ، معتدلہ۔ وقت کے اعتبار سے بھی تین ہیں: معتدلہ، غیر معتدلہ اور غیر معتادہ۔ تعریف آپ نے سن لی کہ معتدلہ کا مطلب ہے دن رات آتے ہیں، بہت کم فرق کے ساتھ۔ غیر معتدلہ کہ دن رات آتے ہیں اور سارا سال آتے ہیں لیکن فرق بہت بڑھ جاتا ہے۔ دو تہائی سے بڑھ جاتا ہے تو کہتے ہیں ''منطقہ غیر معتدلہ'' ہے۔ غیر معتادہ کا معنی جہاں سال بھر میں ایسا وقت بھی آتا ہے

کہ دن یا رات میں سے کوئی ایک آ تا ہی نہیں۔ غیر معتادہ کی حدود تو بالکل وہی ہے۔ کوئی نیا دائرہ کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ وہی حدود ہیں جو باردہ کی تھیں۔ جب سورج جنوب کی جانب خط جدی پر ہوگا تو منطقہ باردہ شمالیہ سے اس کا فاصلہ 90 درجے ہو جائے گا۔ اور جب سارا دن 90 درجے کا فاصلہ ہوگا تو اس منطقے پر پورے پورے دن سورج نہیں آئے گا۔ وہیں جدی پر گھومتا رہے گا اور یہ زمین کی گولائی اور یہ سورج سے دوری ادھر باردہ میں روشنی نہیں جانے دے گی۔ لہٰذا اس منطقے میں رات ہی رات ہوگی۔ جب وہ خط جدی سے اندر آئے گا۔ ایک دن کے لیے واپس سفر شروع کرے گا تو اب ایک درجہ آگے کی یہی صورتحال ہوگی۔ عین خط پر تو ٹھیک ہے دن آ گیا اگر چہ وہ بہت چھوٹا اور رات بہت بڑی تھی، لیکن اس سے آگے ساڑھے 22 سے آگے ابھی بھی دن نہیں آئے گا۔ اسی طرح آگے قیاس خود کر لو۔ جتنا قطبین کی طرف بڑھتے جائیں گے اتنا ہی یہ ''عدم اعتیاد'' بڑھتا جائے گا حتی کہ قطبین پر چھ مہینے تک سورج نہیں طلوع ہوگا، کیوں کہ سورج قطب شمالی سے پورے چھ مہینے تک 90 درجے کے فاصلے پر رہے گا۔ سورج نے خط استوا سے جنوب میں چھ مہینے رہنا ہے۔ تین مہینے جاتے ہوئے اور تین مہینے آتے ہوئے۔ ان پورے چھ مہینوں میں وہ قطب شمالی سے 90 درجے دور رہے گا۔ اب یہ منطقہ ایک ہے لیکن اس میں ایک ایسا علاقہ ہے جس میں پانچ مہینے سورج نہیں آتا اور کسی میں چھ مہینے نہیں آتا۔ 70 درجے پر آ جاؤ تو سورج تین مہینے نہیں آتا۔ تو ایک ہی منطقے میں کئی وقت بن رہے ہیں۔ یہ ہیں ''آیات آفاقیہ'' پوری زمین پر نہیں، صرف ایک ہی منطقے کی بات ہو رہی ہے کہ اس میں کئی وقت بن رہے ہیں۔ پوری دنیا میں تو پتہ نہیں کیا کیا ہوتا ہے؟ آہستہ آہستہ اسے سمجھتے ہیں۔ وقت کے اعتبار سے تین مناطق میں سے ایک تو سمجھ میں آ گیا ہے۔ اب بقیہ دو منطقوں کو سمجھتے ہیں۔

بقیہ دو منطقے یہ ہیں: غیر معتدلہ اور غیر معتادہ۔

معتدلہ اور غیر معتدلہ کا فرق 45 درجے سے شروع ہوتا ہے۔ خط استوا سے 45 درجے تک خطہ معتدلہ اس کے بعد 45 سے 66 تک غیر معتدلہ ہے اور پھر 66 سے 90 تک غیر معتادہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں ہم نے جب کرہ ارض کو شمالاً جنوباً دو حصوں میں تقسیم کیا تو 90 درجات وجود میں آئے۔ ہم نے 90 کو دو حصوں میں تقسیم کیا تو 45، 45 کے دو حصے بن گئے۔ 45 پر اگر ہم ایک فرضی خط کھینچ دیں تو صفر سے 45 تک خطہ معتدلہ بنے گا، وقت کے اعتبار سے، دن رات کے آنے جانے کے اعتبار سے اور اس سے آگے 45 سے 66.66 درجے تک غیر معتدلہ بنے گا۔ اب پہلے خطے میں یعنی خط استوا سے 45 درجے تک میں دن رات آتے جاتے ہیں اور کم فرق کے ساتھ بدلتے ہیں۔ اس دوسرے خطے میں یعنی 45 سے آگے دائرہ قطب شمالی تک (66 درجے تک) سارا سال دن رات آتے جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ رات ہی رات ہے۔ لیکن غیر معتدلہ ہوتے ہیں یعنی دن 22 گھنٹے کا اور 2 گھنٹے کی رات اور یہ ننھی منی سی جو رات آئی ہے یہ بھی گہری اور پکی رات نہیں ہے۔ اس میں ایسی کیفیت ہے جیسے کہ شفق ابیض کے غروب ہونے سے پہلے تک ہوتی ہے۔ غروب شمس سے غروب شفق ابیض تک جو کیفیت ہوتی ہے، اسے اردو میں جھٹپٹا کہتے ہیں۔ مکمل دن ہے نہ مکمل رات ہے۔ نہ مکمل روشنی ہے نہ گہرا اندھیرا ہے۔ غیر معتدلہ علاقوں میں اسی کیفیت کی رات رہتی ہے۔ یہ لوگ اپنے لیے سونے اور کھانے کا نظام تو بنا لیتے ہیں۔ پردے لگا کر کھڑکیوں پر رات کی کیفیت پیدا کر کے سو جاتے ہیں لیکن روزے اور نماز کا کیا ہوگا؟ یہ مسئلہ مفتیان کرام سے سمجھنے کا ہے کہ نماز اور روزے کے لیے قریب ترین علاقے کا نقشہ استعمال کریں گے۔

الغرض اختلاف الیل والنہار میں اور بیک وقت تین تین موسم اور تین تین وقت ہونے میں تین چیزوں کا زیادہ دخل ہے:

پہلی یہ کہ زمین گیند کی طرح گول ہے، تختے کی طرح چپٹی یا سکے کی طرح گول نہیں کہ تمام جگہ روشنی برابر جا رہی ہے۔ اس کی گولائی گیند کی طرح ہے، توے کی طرح نہیں؛ یا یوں سمجھو آٹے کے پیڑے کی طرح ہے، روٹی کی طرح نہیں۔ نارنگی کی طرح ہے، سکے کی طرح نہیں۔ بیچ میں یعنی خط استوا میں اس کی گولائی زیادہ ہے اور قطبین میں بہت کم ہے۔ لہٰذا بیچ میں اگر حرارت اور روشنی براہ راست پڑے گی، تو قطبین میں دونوں بہت دور سے اچٹ کر آئیں گی۔

دوسرے یہ ایک طرف جھکی ہوئی رہتی ہے۔ انسان کی طرح اکڑتی نہیں۔ جھکنے کا درجہ کتنا ہے؟ ساڑھے 23 درجے اس نے جھکا ہوا رہنا ہے۔ گویا رکوع کی

کیفیت میں رہتا ہے۔

تیسرے یہ کہ سورج سے قریب اور دور بھی آتی جاتی ہے۔ ہمیشہ ایک جیسے فاصلے پر نہیں رہتی۔ سورج کے گرد اس کا جو مدار ہے۔ وہ بیضوی ہے۔ گول نہیں۔ اس لیے یہ کبھی سورج کے بالکل قریب آ جاتی ہے۔ اس کو ''قُربِ اقرب'' کہتے ہیں۔ کبھی سورج سے بہت دور چلی جاتی ہے۔ اس کو ''بُعدِ ابعد'' کہتے ہیں۔ تو یہ تین مؤثر باتیں ہو گئیں یعنی: (1) زمین چپٹی نہیں گول ہے۔ گولائی مختلف ہے۔ (2) سیدھی نہیں ہے، جھکی ہوئی ہے۔ (3) سورج سے اس کا فاصلہ سال بھر برابر نہیں رہتا، بلکہ کبھی بہت قریب ہو جاتی ہے کبھی بہت دور۔

ان تین وجوہات کی وجہ سے اس پر موسم اور وقت یکساں نہیں رہتے، بدلتے سدلتے رہتے ہیں، بلکہ بیک وقت کئی موسم اور کئی وقت پائے جاتے ہیں۔ تو اب پہلا خطہ وقت کے اعتبار سے صفر سے 45 درجے تک بنتا ہے۔ دوسرا 45 سے لے کر ساڑھے 66 درجے تک پھر تیسرا 66.66 سے 90 تک۔ تین منطقے وقت کے اعتبار سے بھی ہو گئے۔ ہم نے کہا بظاہر تو یہ تین ہیں۔ حقیقت میں یہ تین نہیں، تیس سے بھی زیادہ ہیں۔ بیسیوں قسم کے موسم اس دنیا میں بیک وقت پائے جاتے ہیں اور بیسیوں طرح کا وقت پایا جاتا ہے۔ کچھ مشہور اوقات دیکھو۔

وقت کے اعتبار سے مختلف خطے:

(1) خط استوا پر سارے سال، چاہے سورج اُدھر جائے انتہائے شمال کی طرف، یا اِدھر آئے انتہائے جنوب تک، لیکن خط استوا کے نیچے جو ممالک آ رہے ہیں ان میں دن رات سارا سال برابر رہتے ہیں۔ مثلاً خط استوا کے نیچے ایشیا میں انڈونیشیا ہے۔ افریقہ میں سے تنزانیہ، کینیا اور کانگو ہے، آگے جنوبی امریکا میں جائیں گے تو برازیل اور بولیویا ہے۔ ان میں سارا سال دن رات برابر رہتے ہیں۔ 12، 12 گھنٹہ۔

(2) سال میں دو دن ایسے آتے ہیں کہ پورے کرۂ ارض پر دن رات برابر ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ 21 مارچ کو دوسری مرتبہ 22 ستمبر کو۔ اس کو کہتے ہیں ''اعتدالین''۔ ایک کو اعتدال ربیعی دوسرے کو اعتدال خریفی۔ وجہ تسمیہ خود سمجھ میں آنی چاہیے۔ بہار اور خزاں کو تو خود سے پہچاننا چاہیے۔ اعتدالین میں سورج جب خط استوا پر آیا ہوا ہوتا ہے تو پورے کرہ ارض پر اس دن یعنی 21 مارچ اور 22 ستمبر کو دن رات برابر ہوں گے۔ پورے کرہ ارض پر سال میں دو مرتبہ دن رات برابر ہوں گے۔ یہاں سورج پورے انصاف کے ساتھ مساوات کرتا ہے۔ "التَّنْصِيفُ عَيْنُ الانْصَافِ" اور کبھی کبھی پورے انصاف کے ساتھ عدم مساوات کرتا ہے۔ یہ دو باتیں سمجھ میں آ گئیں؟ پہلی یہ کہ خط استوا پر سارا سال دن رات برابر ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سال میں دو دن ایسے آتے ہیں (اعتدال ربیعی ہے 21 مارچ کو اور اعتدال خریفی ہے 22 ستمبر) جب پورے کرۂ ارض پر دن رات نے برابر ہونا ہے۔

(3) تیسرا کلیہ کہ جیسے جیسے آپ خط استوا سے آگے جائیں گے دن رات کا فرق بڑھتا جائے گا۔ مثلاً ہمارے ہاں سب سے زیادہ فرق 21 جون کو آ جائے گا کہ سارے سال کا سب سے بڑا دن ہوگا۔ سولہ سترہ گھنٹے کا۔ اور رات بہت چھوٹی سی۔ اللہ کی شان کہ 21 جون کل ہی ہے۔ اخباروں میں بھی آئے گا کہ آج سال کا سب سے بڑا دن ہے اور جب سورج 21 دسمبر کو خط جدی پر گیا ہوگا تو ہم کرہ شمالی والوں کے لیے کیا ہوگا؟ رات بہت بڑی ہوگی کیوں کہ سورج دور ہی دور سے سلام کرتے ہوئے جا رہا ہے اور دن چھوٹا سا۔ جب کہ جنوبی والوں کے لیے بالکل برعکس ہے۔ مثلاً کرۂ جنوبی میں آسٹریلیا ہے، نیوزی لینڈ ہے، چلی ہے، ارجنٹائن ہے، جنوبی افریقہ ہے۔ ان کے لیے کیا حساب کتاب ہے؟ اللہ والے جو دین کی محنت کے لیے یہاں گئے ہوئے ہیں، وہ دیکھیں گے وہاں نظام بالکل برعکس ہے۔ ہمارے ہاں دن بہت بڑا تھا۔ گرمی تھی۔ اُدھر رات بہت بڑی ہے۔ الٹا حساب ہو گیا۔ شمالی کرّے کا موسم جنوبی کرے سے ہمیشہ الگ ہوتا ہے۔

(4) چوتھا قاعدہ یہ کہ جیسے جیسے قطبین کی طرف جائیں گے۔ دن رات کا اختلاف، اختلاف اللیل والنہار بڑھتا جائے گا حتی کہ قطبین پر پہنچ کر تو آدھے آدھے سال کے دن رات ہو جائیں گے۔ اب دیکھو بیک وقت کتنے وقت وجود میں آ رہے ہیں۔ کرہ شمالی کے لیے جو موسم ہے جنوبی کے لیے اس سے بالکل

الگ ہے۔ خط استوا والوں کے لیے سارا سال ہی یکساں ہے۔ بقیہ دنیا کے لیے سال میں دو مرتبہ ایک ہی یکسانیت کی آئسکریم چکھنے کو ملے گی اور قطب شمالی وجنوبی تو سبحان اللہ! ان کی تو بات ہی نہ کرو۔ چھ چھ مہینے برف کے خیمے (اِگلو) میں گذارنے ہوں گے۔

یہ وہ چار خطوط تھے جو غیر مسلسل ہوتے ہیں اور ہر نقشے پر لازماً پائے جاتے ہیں۔ ان کی غرض کیا ہے؟ طول وعرض کے خطوط سے غرض کیا ہے؟ چند لفظوں میں صحیح صحیح بیان کریں۔ خطوط طول وعرض اس گول زمین پر جو کہ لاپتہ، لاہوت، لامکان ہے، جس پر کوئی نشانی رکھنے کی جگہ نہیں ہے، اس زمین پر خطوط طول وعرض کسی مقام کے محل وقوع کی بالضبط تعیین کے لیے ہیں۔ صرف طول سے آدھی تعیین ہوگی۔ اتنا پتہ چلے گا کہ کوئی مقام دنیا کے شرق میں ہے یا غرب میں۔ باقی شمالاً جنوباً کہاں واقع ہے؟ کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ اس کا پتا خطوطِ عرض سے چلے گا۔ دونوں خطوط جب ملیں گے تو بالضبط تعیین ہوگی۔ اس کی وجہ آپ نے پڑھی ہوگی ''میبذی'' میں کہ وہاں ایک کلیہ بیان کرتے ہیں: ''نقطہ'' کسی بھی بُعد میں انقسام کو قبول نہیں کرتا، جیسے ہم پڑھیں گے کہ ایک 'جہتِ مشرق ومغرب' ہے ایک ''نقطۃ المشرق والمغرب'' ہے۔ ''نقطۃ المشرق والمغرب'' انقسام کو قبول نہیں کرتا، البتہ جہت 90 درجے تک تقسیم کو قبول کرتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ فرماتے ''فَوَلِّ وَجْهَكَ إِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ.'' تو نقطۃ المغرب قبلہ ہوتا، پھر مسجدیں نصف دائرے کی شکل میں گول بنانی پڑتی جیسے آڈیٹوریم کی سیٹیں ہوتی ہیں، جیسے خانہ کعبہ کے گرد صفیں ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ.'' [البقرۃ:144,149,150] یعنی مسجدِ حرام کی طرف نہیں بلکہ مسجد حرام کی جہت کی طرف منہ کرو۔ اب جہت 90 درجے تک انقسام کو قبول کرتی ہے۔ ''نقطہ'' انقسام کو کسی بھی بُعد میں قبول نہیں کرتا۔ اور سطح کتنے بُعد میں انقسام کو قبول کرتی ہے؟ طول وعرض دو میں۔ اور جسم؟ وہ تین میں: طول، عرض اور عمق۔ اب جو زمین کی سطح ہے یہ دو بُعد کو قبول کرتی ہے طول اور عرض۔ ایک بُعد سے تو آدھا پتہ چلے گا، طول پتہ چلے گا۔ عرض کا پتہ نہیں چلے گا کہ شمال میں ہے جنوب میں ہے۔ شمال کے 90 درجات میں سے کون سا درجہ ہے؟ جنوب کے 90 درجات میں سے کون سا ہے؟ بالضبط مکمل تعیین کے لیے شرقی غربی کے لیے طول البلد اور شمالی جنوبی کے لیے عرض البلد کی ضرورت ہے۔

طول وعرض کے 40 خطوط ''خطِ مسلسل'' کی شکل میں ہوتے ہیں اور یہ چار خط غیر مسلسل کیوں ڈالے جاتے ہیں؟ یہ زمین پر تین منطقوں کی تعیین کے لیے ڈالے جاتے ہیں اور بالخصوص یہ دو خط یعنی خطِ سرطان وجدی یہ سورج کی سڑک کی حد بندی کے لیے ہیں۔ ادھر کا فٹ پاتھ یہ ہے اور ادھر کا یہ۔ بیچ کا گرین بیلٹ خط استوا ہے۔

21 جون اور 27 مئی:

جب 21 جون آتا ہے تو اخبار میں خبر شائع ہوتی ہے کہ آج سال کا سب سے بڑا اور گرم دن ہے۔ تو سب سے بڑا ہونے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ جتنے بھی بادل آجائیں، جتنی بھی ہوائیں چلیں، سب سے بڑا دن تو رہے گا، لیکن سب سے گرم ہونے میں فرق آسکتا ہے۔ کیونکہ گرمی کا ایک سبب ہے کہ سورج سر پر آیا ہوا ہے۔ کل پرسوں دور سے گزر جاتا تھا۔ آج تو سر پر لائٹ کھل گئی ہے۔ لیکن اگر ہوائیں چلنی شروع ہوجائیں، بادل آجائیں، بارش ہوجائے تو گرمی کم ہوجائے گی۔ سب سے بڑے دن میں تو فرق نہیں پڑسکتا لیکن سب سے گرم ہونے میں فرق ممکن ہے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس دن پانی سے بھرے ہوئے بادل بھیج دے۔ ٹھنڈی ہوائیں ادھر چلادے تو اس میں فرق پڑسکتا ہے۔

کچھ دن پہلے 27 مئی گزرا ہے۔ اس دن اخبار میں آیا تھا کہ آج اتنے بجے قبلہ رخ درست کرلیں۔ 16 جولائی کو پھر یہی صورتحال ہوگی۔ کیوں؟ اس لیے کہ سورج مکہ مکرمہ کے عرض پر بھی سال میں دو مرتبہ آئے گا۔ 27 مئی اور 16 جولائی۔ 21 جون سے اتنے دن پہلے جتنے 21 جون کے بعد۔ حساب لگالو! 21 جون سے پیچھے جاؤ 27 مئی تک جتنے دن ہیں، 21 جون سے آگے جاؤ 16 جولائی تک اتنے ہی دن ہیں۔ یعنی 21 دن سورج خطِ سرطان کی طرف انتہائے شمال کو جاتے ہوئے بھی آئے گا عرض مکہ پر اور واپس خطِ استوا کی طرف آتے ہوئے بھی عرض مکہ پر آئے گا۔

3-خطِ منحنی:

آخری اور چالیسواں خط جو کسی نقشے پر پایا جاتا ہے وہ مستقیم نہیں ہے۔ منحنی ہے۔ بقیہ 39 خط مسلسل ہوں یا غیر مسلسل، ہیں مستقیم۔ طول وعرض کے مستقیم خطوط تھے۔ بقیہ چار بھی مستقیم تھے۔ 35 مسلسل تھے اور یہ چار غیر مسلسل۔ یہ آخری خط منحنی ہوتا ہے۔ یہ عالمی تاریخ کی تبدیلی کے مقام سے گذرتا ہے 35 اور صفر درجہ طول البلد کے خط جسے ''خطِ گرین وچ'' بھی کہتے ہیں، کے بالمقابل ہوتا ہے۔ 1886ء سے پہلے کوئی جانتا ہی نہیں تھا کہ گرین وچ کیا ہے؟ لندن کا ایک محلہ ہے۔ یہاں انگریز لوگ خالی شراب کی بوتلیں سڑک پر پھینک دیتے تھے۔ کچرے کے ڈھیر لگے ہوتے تھے۔ یہ صفائی انہوں نے ابھی سیکھی ہے۔ جب مسلم ممالک سے بہت مال لوٹ کرلے گئے پھران کو ہوش آیا کہ چلو صفائی بھی کرلینی چاہیے۔ اس سے پہلے جمعے جمعے کو نہالینا ابن انشا نے لکھا ہے کہ اس پر پرچہ کٹ جاتا تھا کہ یہ تو مسلمان ہوگیا ہے۔ اس ''گرین وچ'' کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے دور میں انصاف کیا ہوا تھا کہ یہ جو جزائر خالدات ہیں یعنی ''کینری آئس لینڈ'' انہوں نے کہا سیدھی سی بات ہے مبدا طول وہاں رکھو جہاں سے مبدا ارض ہے۔ ادھر سے آگے ہمیں پتہ نہیں کہ اور زمین بھی ہے تو کیوں ہم آگے جائیں یا پیچھے ہٹیں؟ بس طول کی ابتدا وہاں رکھو انصاف کے ساتھ۔ جب مسلمان عالمی سطح پر فاتحین تھے اور تین تین براعظموں پر حکمرانی کرتے تھے۔ خلافت عثمانیہ تین تین براعظموں پر تھی۔ ایشیا پر بھی تھی، یورپ پر بھی اور افریقہ پر بھی تھی تو مسلمان ناانصافی نہیں کرتے تھے۔ یورپیوں کے پاس جب لوٹ کا مال آیا تو ان نو دولتیوں نے ناانصافی کی حد کردی۔ ہر چیز کو اپنے گھر میں لے جا کر ڈالا۔ سطح سمندر ناپنا چاہیں تو ''لیور پول'' کی بندرگاہ کے قریب کا سمندر۔ شرقاً غرباً زمین کی فرضی تقسیم کرنا چاہیں تو مرکزی نقطے کے لیے ''گرین وچ'' کا محلہ۔ وقت کے لیے معیار بنانا چاہیں تو لندن کا معیاری وقت۔ ہر چیز میں دھونس دھاندلی ہے۔

یہ جو بیچ کا خط ہے مبدا طول کا، یہ صفر درجہ طول البلد ہے۔ جیسے صفر درجہ عرض البلد کو ''خط استوا'' کہتے تھے۔ یہ شمالاً جنوباً زمین کو دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا۔ صفر درجہ طول البلد کے خط کو ''گرین وچ'' کہتے ہیں۔ یہ خط شرقاً غرباً زمین کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ہر طول البلد دائرۂ عظیمہ ہے۔ ''دائرۂ عظیمہ'' اس دائرے کو کہتے ہیں جو کسی کرّے کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرے۔ یہ پورے کرے پر دونوں طرف کھنچا ہوا ہوتا ہے۔ تو یہی خط سامنے سے ''خط گرین وچ'' کہلاتا ہے۔ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک۔ یہاں تو یہ مستقیم ہے۔ یہی جب پیچھے کی طرف گھومے گا تو اس کو ''عالمی خط تاریخ'' کہتے ہیں۔ وہاں یہ منحنی ہے۔ صفر درجے طول البلد پر یہی خط گرین وچ ہے۔ اور 180 درجے پر یہی ''عالمی خط تاریخ'' ہے اور وہاں یہ مستقیم نہیں رہتا، منحنی ہوجاتا ہے۔ صفر درجہ پر اس کی استقامت میں کوئی مانع نہیں ہے۔ سیدھا کھینچو کوئی ملک آدھا ادھر ہو جائے گا، کوئی ملک آدھا ادھر ہو جائے گا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وقت کا فرق تو ویسے ہی ہوتا ہے کسی بھی ملک کے دو حصوں میں، لیکن یہی خط جب 180 درجے پر جاتا ہے تو وہ وقت، گھنٹے منٹ کو تقسیم نہیں کرتا بلکہ تاریخ کو تقسیم کرتا ہے۔ رات کے 12 بجے پوری دنیا کی تاریخ تبدیل ہوتی ہے۔ کون سے 12 بجے؟ لندن کے 12 بجے۔ جب لندن میں دن کے 12 بج رہے ہوتے ہیں تو اس کا نصف النہار ہو رہا ہوتا ہے۔ اور 180 درجے پر فیجی والوں کی جو لائن گذر رہی ہے، اس پر رات کے 12 بج رہے ہوتے ہیں۔ تو دن بھی تبدیل ہونا ہے، تاریخ بھی تبدیل ہونی ہے۔ تو ایک ملک میں اِدھر ایک تاریخ، اُدھر دوسری تاریخ ہو تو بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ اس مشکل سے بچنے کے لیے ایک ملک کو ایک ہی تاریخ کی حد میں لانے کے لیے اس خط کو ''منحنی'' یعنی ٹیڑھا کر دیا گیا۔ تو یہ مبدا طول، صفر درجہ طول کے خط کا نام ہے گرین وچ۔ اس کی دوسری طرف 180 درجے پر واقع خط کا نام ہے ''عالمی خطِ تاریخ'' زیادہ سے زیادہ طول کتنا ہوگا؟ 180 اور زیادہ سے زیادہ عرض 90 ہوتا ہے۔ کیونکہ خط استوا سے فاصلے کا نام عرض ہے اور خط استوا سے قطب جنوبی یا شمالی تک زیادہ سے زیادہ فاصلہ 90 بنتا ہے۔ پھر سنیے! صفر درجہ طول البلد یا مبدا طول کے خط کا کیا نام ہے؟ خط گرین وچ۔ اور انتہائے طول 180 درجے طول البلد پر کھینچے ہوئے فرضی خط کا کیا نام ہے؟ عالمی خط تاریخ۔ ''انٹرنیشنل ڈیٹ لائن'' یہ ایک ہی دائرے کے دو حصے ہیں۔ جب سامنے سے ہے تو

خط گرین وچ اور یہی جب ادھر پیچھے سے گھوم کر آئے گا تو اس کا نام بدل جائے گا۔ اس کی استقامت بھی تبدیل ہوجائے گی اور منحنی ہوجائے گا۔ طول البلد کے خطوط دراصل دائرے ہوتے ہیں۔ نصف دائرہ اِدھر ہے اور نصف اُدھر ہے۔ نصف منور ہے اور نصف مظلم ہے۔ طول البلد دو خط: صفر اور 60 اور 180 یہ تو ''نامدار'' ہوگئے۔ یعنی جن کا مستقل نام ہے۔ ان کا کچھ نہ کچھ نام ہوگیا۔ بقیہ 11 ادھر شرقی ہیں اور گیارہ ادھر غربی ہیں۔ یہ بے نام ہیں۔ ان کا کوئی نام نہیں ہے۔ گیارہ اور گیارہ 22 اور 2 چوبیس۔ تو طول کے کل خط 24 ہوگئے۔

آخر میں یہ سمجھ لیجیے کہ گرین وچ برطانیہ کی رصدگاہ ہے۔ شاہی رصدگاہ۔ اس میں ایک باغ ہے اس کے بیچ میں سے ایک تار گزارا ہوا ہے۔ یہ صفر درجہ طول البلد یا مبدأ طول کہلاتا ہے۔ اور مسلمانوں کے انتظار میں ہے کہ وہ کب آکر دنیا کو انصاف دلواتے ہیں۔

نقشہ خوانی:3

نقشے پر دی گئی مختلف شکلیں

نقشہ پر عموماً تین شکلیں دی گئی ہوتی ہیں۔ستارہ،ہار،گھڑیاں۔

(1)16 نوکوں والا ستارہ:

یہ سولہ جہتیں دکھانے کے لیے ہوتا ہے۔چار بنیادی جہتیں ہیں:مشرق مغرب،شمال جنوب۔چار ضمنی ہیں:شمال مشرق،شمال مغرب،وغیرہ۔آٹھ ضمن الضمنی ہیں:شمال شمال مشرق،مشرق شمال مغرب وغیرہ۔اس کی پہلے چار نوکیں جو بنیادی جہات کو ظاہر کرتی ہیں،وہ بڑی ہوتی ہیں۔دوسری چار کچھ چھوٹی ہوتی ہیں اور آخری آٹھ اس سے بھی چھوٹی ہوتی ہیں۔

(2)منطقۃ البروج:

دوسری چیز نقشہ پر ''منطقۃ البروج'' ہوتی ہے۔یعنی ایک ہار بنا ہوا ہوتا ہے جس میں 12 کڑیاں ہوتی ہیں۔ہر کڑی میں ایک نگینہ (برج) لگا ہوا ہے جس کی بارہ مختلف شکلوں میں سے ایک فرضی سی شکل ہوتی ہے۔یہ بارہ بروج یا بارہ فرضی شکلیں کیا ہیں اور کیوں فرض کی جاتی ہیں؟ آیئے!اس کو سمجھتے ہیں۔

سورج چھ ماہ خطِ استوا سے شمال اور چھ ماہ جنوب میں رہتا ہے۔اب ان چھ ماہ کا شمار دو طریقوں سے کیا جائے گا۔

(1) ایک تو شمسی مہینے کا حساب ہے کہ 21 مارچ کو سورج خط استوا سے شمال کی جانب چلے گا اور آخر کار تین مہینے بعد 21 جون کو خطِ سرطان پر پہنچ جائے گا۔21 ستمبر کو خط استوا پر واپس آجائے گا اور جنوب کی طرف سفر شروع کرے گا۔پھر 22 دسمبر کو خط جدی پہنچ جائے گا۔تین مہینے جانے میں اور تین مہینے آنے میں لگائے گا۔اور اس کے سفر کی ان منزلوں کو شمسی مہینوں کے نام کا اعتبار رکھ کر گنا جائے گا۔یہ ایک طریقہ ہے۔

(2) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب سورج سفر کرے گا تو ہر مہینے آسمانوں پر ستاروں کا جھرمٹ ایک خاص شکل میں رہے گا۔اس جھرمٹ کی شکل پہلے مہینے یعنی مارچ میں ''حمل''یعنی بکری کے بچے کی ہوگی۔دوسرے مہینے میں دوسری شکل ہوگی۔تیسرے میں اس کی شکل سرطان (کیکڑے) کی ہوگی۔اس وقت سورج ''خط سرطان'' میں ہوگا۔اسی طرح واپس آتا ہے۔جب واپسی میں 22 ستمبر کو خط استوا پر آئے گا تو اس وقت ''برج میزانؑ'' میں ہوگا یعنی آسمان پر ترازو کی شکل میں ستاروں کا جھرمٹ ہوگا۔پھر اسی طرح جنوب میں جائے گا تو تین مہینے بعد 22 دسمبر کو انتہائے جنوب میں ''برج جدی'' میں پہنچے گا۔''جدی'' کا معنی بھی ''بکری کا بچہ'' ہے۔پھر تین مہینے میں واپس خط استوا پر آئے گا۔

ان بارہ بروج میں سے آٹھ کی شکلیں مختلف جانوروں کی سی ہیں،جیسے:سرطان،حمل،جدی،ثور،عقرب،حوت اور چار مختلف چیزوں کی،جیسے:میزان،دلو،

قوس اور سنبلہ۔ یہ ساری شکلیں فرضی ہیں جو نام یاد رکھنے میں آسانی کے لیے گھڑی گئی ہیں۔

(3) گھڑیاں:

نقشہ پر کچھ گھڑیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان گھڑیوں کا مطلب سمجھنے کے لیے آپ کے ذہن میں طول البلد کی تعریف ہونی چاہیے۔

ہر نقشے میں 12 یا 24 گھڑیاں ہوتی ہیں۔ زمین کے کل درجات 360 ہیں جن کو سورج 24 گھنٹوں میں طے کرتا ہے۔ اسی طرح 15 درجے پر ایک گھنٹے کا فرق بنتا چلا جائے گا۔ 30 پر دو گھنٹے کا فرق ہوگا۔ وعلیٰ ھذا القیاس. وقت کے اس فرق کو ظاہر کرنے کے لیے ہر 15 درجے کے فاصلے سے گھڑیاں بنائی جاتی ہیں۔

پاکستان چونکہ ''گرین وچ لندن'' سے پانچ گھنٹے پیچھے ہے تو پاکستان کے وقت کا لندن کے وقت سے فرق 75 درجات کا ہے۔

اوقات اور گھڑیاں دو اعتبار سے چلتی ہیں۔ ایک تو 24 گھنٹے کے اعتبار سے، دوسرا 12 گھنٹے کے اعتبار سے۔ وہ ادارے جو 24 گھنٹے کام کرتے ہیں وہ 24 گھنٹے کے وقت کے مطابق چلتے ہیں۔ جیسے ایر پورٹ وغیرہ اور وہ ادارے جو 24 گھنٹے کام نہیں کرتے جیسے تعلیمی ادارے وغیرہ، یہ ادارے 12 بجے کے بعد نئے سرے سے گنتی شروع کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں وقت کے ساتھ AM یا PM کی قید لگانی پڑتی ہے یعنی دوپہر 12 بجے سے پہلے یا دوپہر 12 بجے کے بعد۔

اس لیے نقشے پر دی گئی گھڑیوں میں سے آدھی کے ساتھ am اور آدھی کے ساتھ pm لکھا ہوتا ہے۔

نقشے کا اشاریہ

اس کے بعد اگلی چیز نقشہ میں اشاریہ ہوتی ہے۔اس کے ذریعے تین چیزیں بیان کی جاتی ہیں۔سب سے پہلے اس کا عنوان ہوتا ہے، جو یہ بتاتا ہے کہ یہ نقشہ پولیٹیکل (سیاسی) ہے یا فزیکل (طبعی) ہے یا کیا ہے؟

دوسری چیز اس میں ''رموز'' ہیں کہ اس نقشے میں ملک، شہر، ایرپورٹ اور ریلوے لائن وغیرہ کے لیے کونسی علامت استعمال کی گئی ہے۔

تیسری چیز اس میں پیمانہ ہوتا ہے۔پیمانہ تین قسم کا ہوتا ہے: کسری پیمانہ، خطی پیمانہ اور عبارتی پیمانہ۔اس کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام کا فاصلہ معلوم کیا جاتا ہے۔اسی طرح ایک شہر یا ملک سے دوسرے شہر یا ملک تک کا فاصلہ معلوم کیا جاتا ہے۔اب نقشہ خوانی کا سبق مکمل ہوا۔نقشہ میں چار چیزیں ہوتی ہیں: (1) چالیس قسم کے خطوط (2) سات قسم کے رنگ (3) تین طرح کی شکلیں اور (4) تین چیزوں پر مشتمل اشاریہ۔

بحمد اللہ تعالیٰ

جغرافیہ کی چند مفید کتابیں اور سوفٹ ویئرز

غیر تصویری کتابیں:

طبعی جغرافیہ:

شمار	نام کتاب	مصنف، مرتب	پبلشر، ناشر
1	ابتدائی طبعی جغرافیہ	محمد علی علوی	سرسید اکیڈمی، کراچی
2	رفیق طبعی جغرافیہ	پروفیسر محمد رفیق	علمی بکس ہاؤس لاہور
3	علمی جغرافیہ	پروفیسر عبداللطیف	مکتبہ خالد وعابد ناظم آباد، کراچی
4	الجغرافیا الطبعیہ وعلم الخرائط	طہ عثمان، سلیمان محمد نبیل فہمی	وزارۃ المعارف بالمملکۃ العربیۃ السعودیۃ

قرآنی جغرافیہ:

5	قصص القرآن	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی	
6	قصص القرآن	مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی	
7	تاریخ ارض القرآن	علامہ سید سلیمان ندوی	دارالاشاعت، کراچی
8	جغرافیہ قرآنی	مولانا عبدالماجد دریا آبادی	المکتبۃ البنوریہ

تصویروں اور نقشوں والی کتابیں:

9	أطلس تاریخ الاسلام	الدکتور حسین مؤنس	الزہرا ءللاعلام العربی مصر
10	أطلس الوطن العربی والعالم	لجنۃ من علماء جغرافیہ	مؤسسۃ جیو بروجکتس، بیروت
11	أطلس التاریخ العربی الاسلامی	الدکتور شوقی ابوالخلیل	دارالفکر المعاصر بیروت لبنان، دارالفکر دمشق
12	أطلس القرآن، الحدیث، السیرۃ	الدکتور شوقی ابوالخلیل	دارالفکر المعاصر بیروت لبنان، دارالفکر دمشق
13	الأطلس الفلکی	محمود عصام المیدانی	دارالدمشق للنشر والتوزیع والطباعۃ

جغرافیہ وفلکیات کے مفید سوفٹ ویئرز اور لنکس

عرض البلد وطول البلد معلوم کرنے کے لیے:

لنکس	شمار
Google Earth	1
fallingrain.com	2
findlatitudeandlongitude.com	3

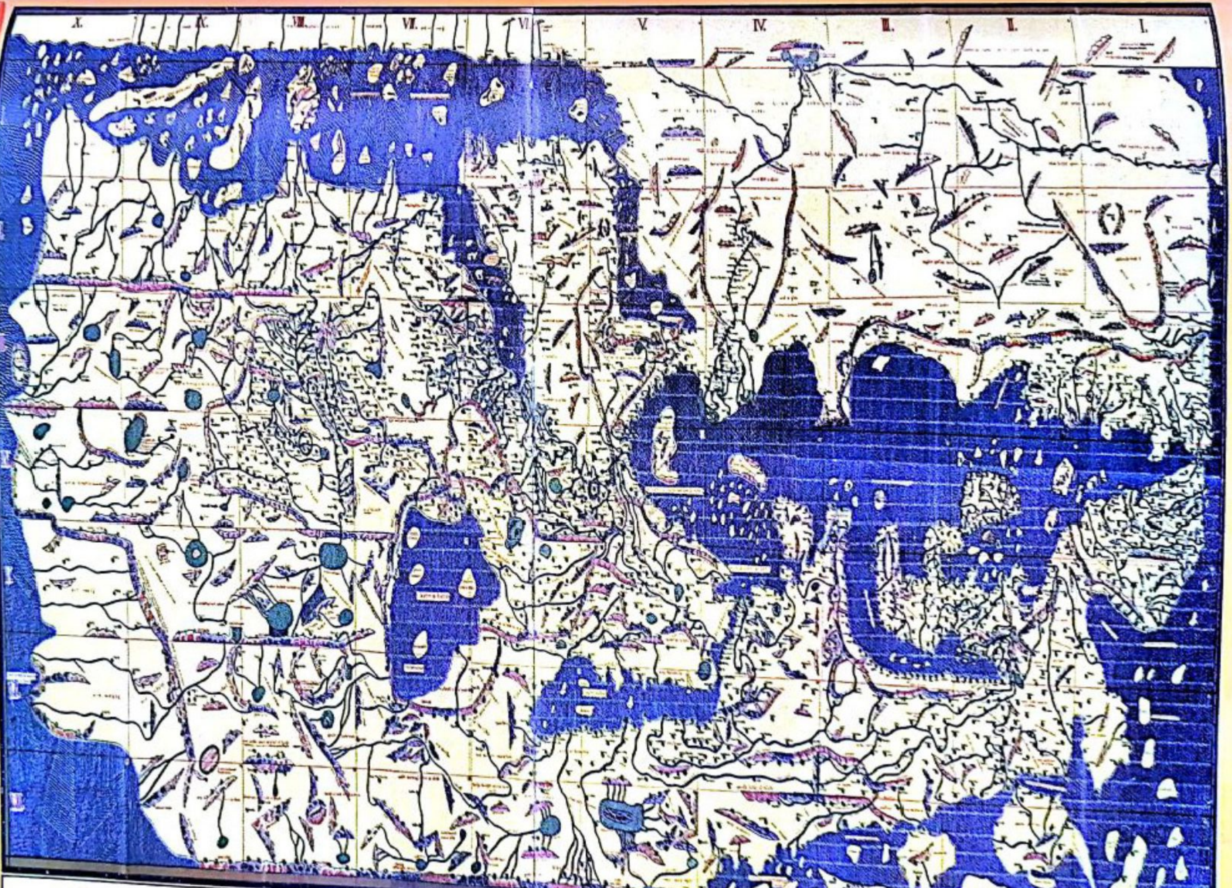
فلکیات کے اہم سوفٹ ویئرز:

Starrynight	4
Minaret	5
Moon calculator	6

جغرافیہ کے اہم سوفٹ ویئرز:

Seterra	7
Amiglobe	8
مواقع دول العالم علی الکرۃ الارضیۃ	9
Earth Explorer 4.5	10
World_Geography	11
GeoAze3	12

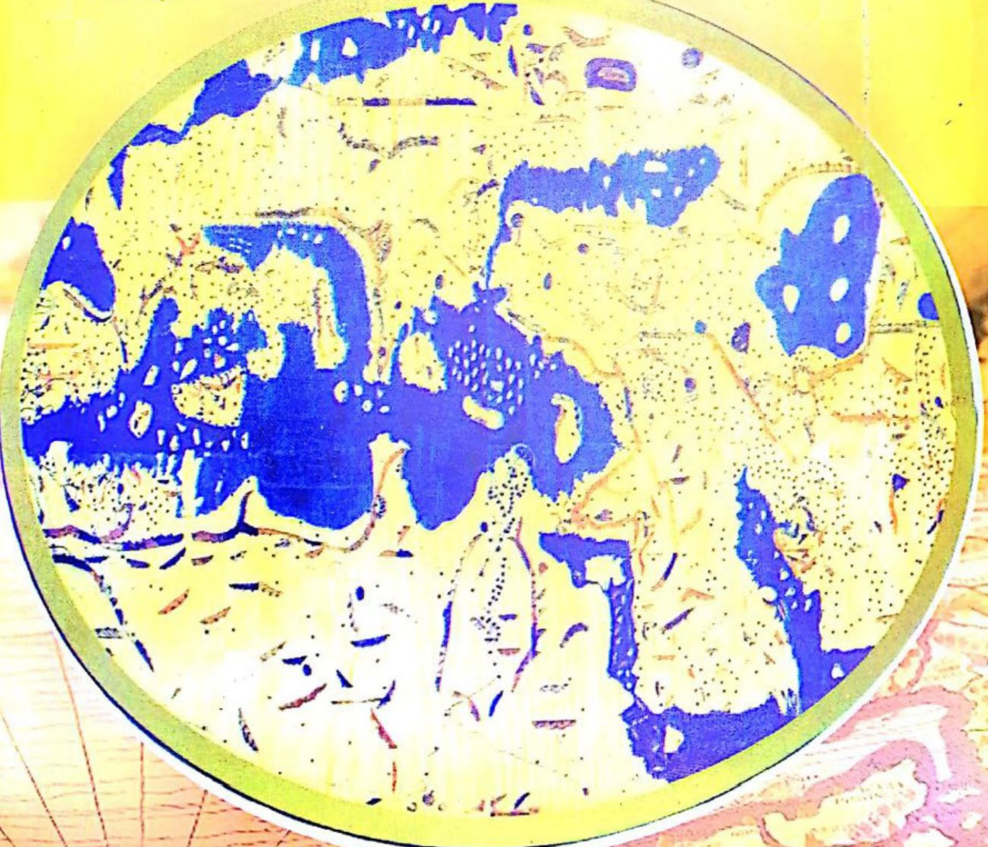
ادریسی کا نقشہ



محمد بن عبد اللہ بن ادریس وہ جغرافیہ دان ہیں جنہوں نے سب سے پہلے زمین کا نقشہ بنایا۔ انہوں نے اس نقشے کو چاندی کی ایک پلیٹ جس کا وزن 112 درہم تھا پر کندہ کرایا۔ اس نقشے میں انہوں نے کرۂ ارض کو سات بر اعظموں میں عرض البلد کے دائروں کے اعتبار سے تقسیم کیا۔ چاندی کی پلیٹ پر زمین کا انوکھا نقشہ ان کا اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

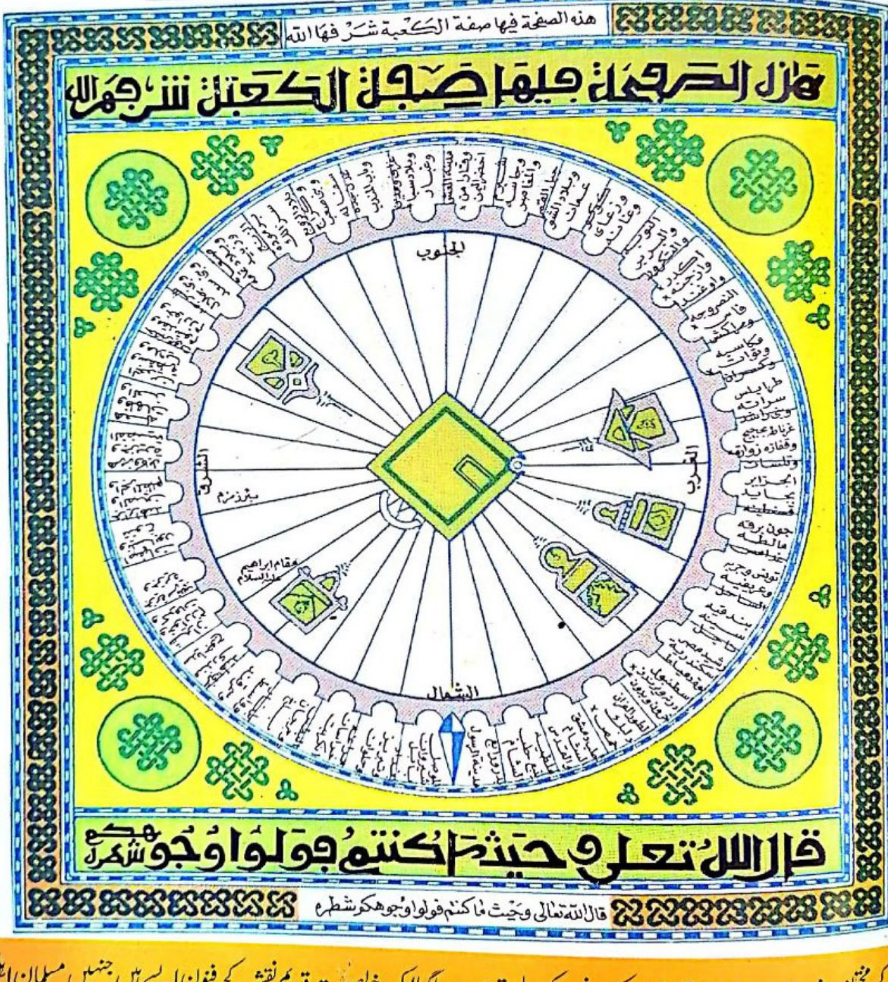
خريطة العالم للإدريسي

خريطة ١٢



فن جغرافیہ سے مسلمانوں کی دلچسپی مختلف وجوہات کے تحت رہی۔ سمتِ قبلہ، اوقات صلوٰۃ، حج، جہاد، تبلیغ، تجارت وغیرہ سب میں یہ فن معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ تصویر اس نقشے کی ہے جسے مشہور مسلمان جغرافیہ دان محمد بن عبد اللہ ادریسی نے اس زمانے میں ترتیب دیا جب نقشہ سازی کی جملہ سہولتوں کا تصور بھی نہیں تھا۔

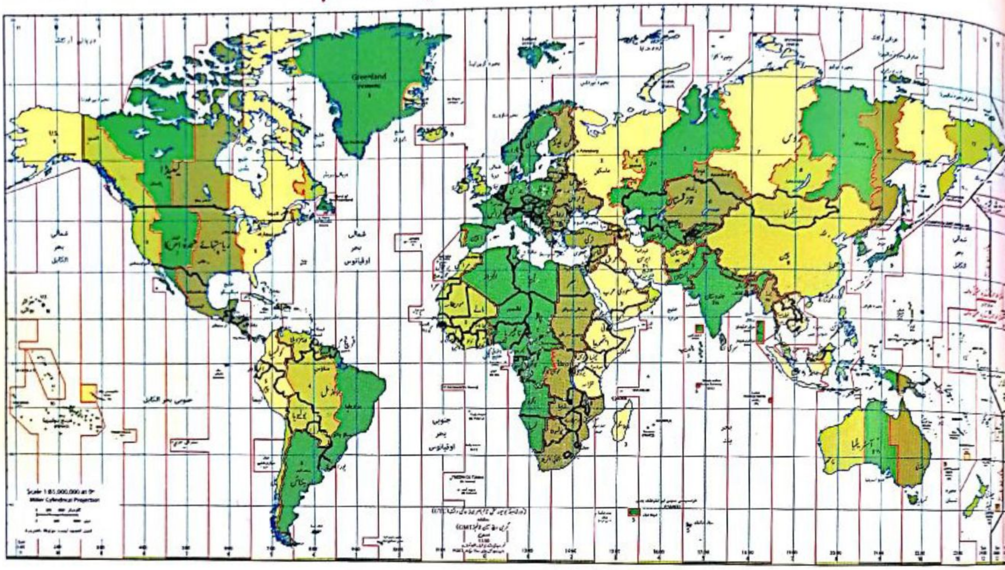
صُورَۃُ البلادِ الإسلامیۃ
بالنسبۃ إلی مکۃ المکرمۃ
للصفاقسی ٩٥٨ھ - ١٥٥١م



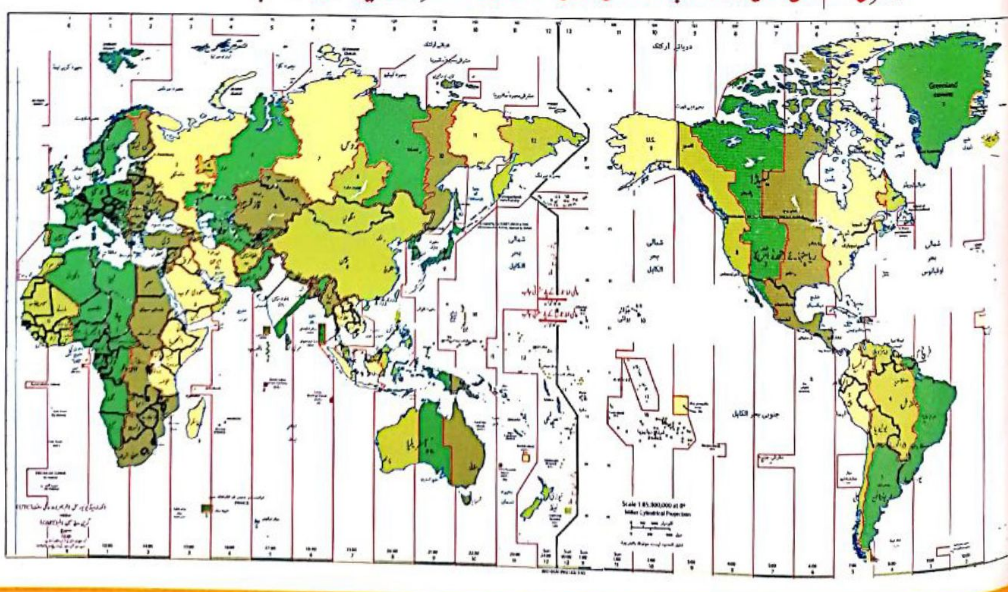
دنیا کے مختلف شہروں سے سمت قبلہ معلوم کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا ایک خوبصورت قدیم نقشہ۔ کچھ فنون ایسے ہیں جنہیں مسلمان اہل علم نے دین کے خادم علوم آلیہ کے طور پر برتا اور اس سے دینی معاملات میں قسما قسم فوائد حاصل کیے۔ فن جغرافیہ اسی طرح کے فنون میں سے ایک اہم فن ہے۔

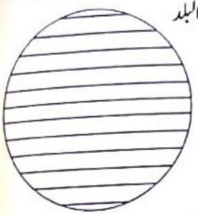
5 پیسفک اینڈ اٹلانٹک سنٹرل نقشہ

پہلی قسم: اس میں صفر درجہ خط طول اور بحر اوقیانوس بیچ میں ہوتا ہے۔



دوسری قسم: اس میں 180 درجہ خط طول (عالمی خط تاریخ) اور بحر الکاہل بیچ میں ہوتا ہے۔









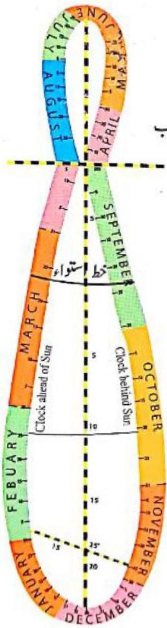


سولہ جہتی سمت نما

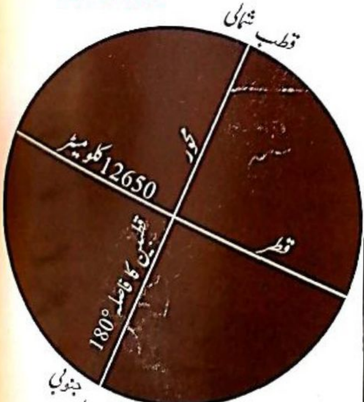


آٹھ جہتی سمت نما

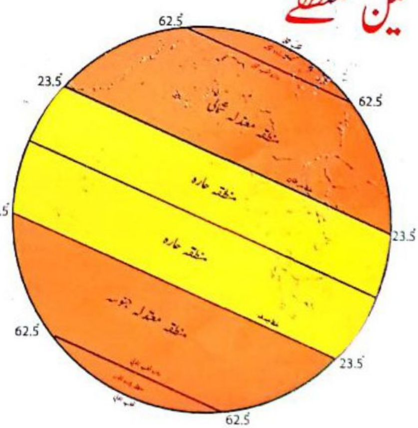




زمین کی پیمائش

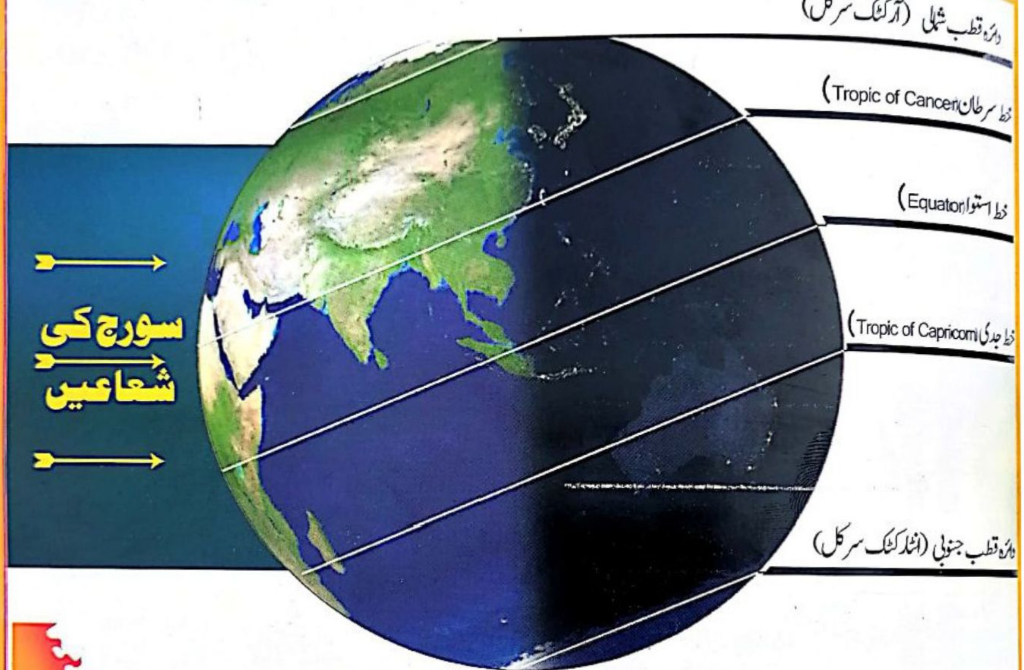


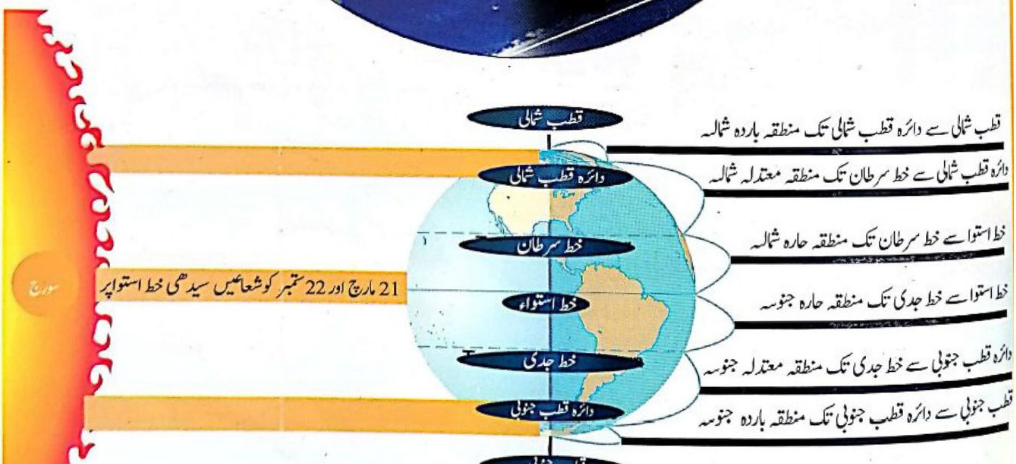
تین منطقے



معیاری گلوبوں اور نقشوں پر اس طرح کی شکل بنائی جاتی ہے تاکہ اس میں ہر دن کا میل شمس ظاہر کیا جائے، یعنی یہ بتایا جائے کہ سورج اپنی سڑک پر سفر کے دوران آج کس عرض البلد پر ہوگا۔

7 کرۂ ارض کے تین منطقے





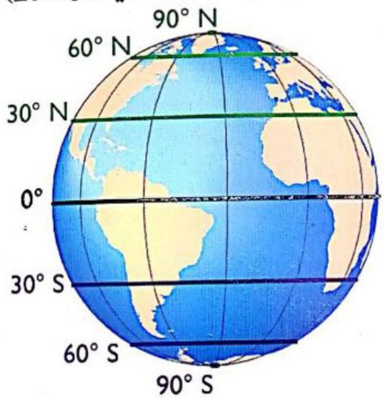
سورج عین خط استوا پر 21 مارچ اور 22 ستمبر کو آتا ہے۔ 21 مارچ تا 22 ستمبر خط استوا سے شمال کی جانب اور 23 ستمبر تا 21 مارچ جنوب کی جانب ہوتا ہے۔ اس روز پورے کرہ ارض پر دن رات برابر ہوتے ہیں۔ 21 جون کو خط سرطان پر ہوتا ہے۔ اس دن کرہ شمالی کا سب سے بڑا دن اور سب سے چھوٹی رات ہوتی ہے اور کرہ جنوبی سے میں سب سے بڑی رات اور سب سے چھوٹا دن۔ اس کے برعکس 21 دسمبر کو خط جدی پر ہوتا ہے۔

خطوط طول البلد و عرض البلد

زمین پر کسی جگہ کی بالکل صحیح تعیین کے لیے ہمیں ان خطوط کی مدد درکار ہوتی ہے۔ اسے Intersection and Grid system کہاجاتا ہے۔ جغرافیہ کی اصطلاح میں یہ عرض البلد اور طول البلد کے خطوط کہلاتے ہیں۔ زمین پر واقع ہر مقام کسی نہ کسی عرض البلد اور طول البلد کے خط کو چھو رہا ہوتا ہے۔ جس کی تعیین کر کے مطلوبہ مقام کا محل وقوع معلوم کیا جاتا ہے۔ ان کو معاون خطوط (Coordinate) کہاجاتا ہے، جبکہ ان کی پیمائش درجات میں کی جاتی ہے۔ ان دونوں خطوط کے ملنے سے درمیان میں بننے والی جگہ کو ”چوکور خطہ“ یا ”گریٹکول“ (Garticule) کہتے ہیں۔

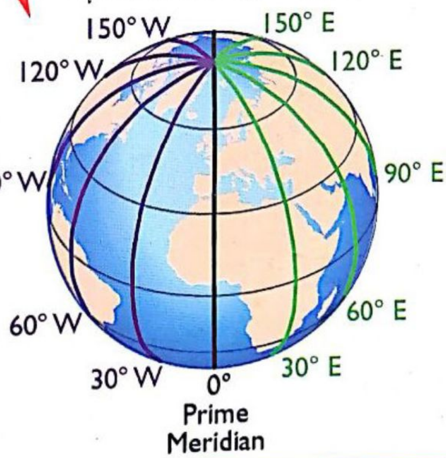
عرض البلد کے خطوط

عرض البلد کے خطوط زمین کے گرد مشرق سے مغرب کی سمت چلتے ہیں، لیکن نقشے پر انہیں شمالاً جنوباً ناپا جاتا ہے یعنی یہ زمین کو شمال و جنوب میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا خط استوا سے ہوتی ہے۔ جو بالکل زمین کے وسط میں ہے۔ دو عرض البلد کے درمیان کی جگہ کو ”عرضی خطہ“ یا ”زون (Zone)“ کہتے ہیں۔



طول البلد کے خطوط

طول البدل کے خطوط گلوب کے گرد شمال سے جنوب کی جانب چلتے ہیں، لیکن انہیں مشرق سے مغرب کی طرف ناپا جاتا ہے۔ یعنی یہ زمین کو مشرق اور مغرب میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا ”پرائم میریڈین“ سے ہوتی ہے، جو قطب شمالی سے گرین وچ سے ہوتے ہوئے قطب جنوبی تک پہنچتا ہے۔ دو طول البلد کے درمیان کی خالی جگہ ”خطہ“ یا ”گور (Gore)“ کہلاتا ہے۔

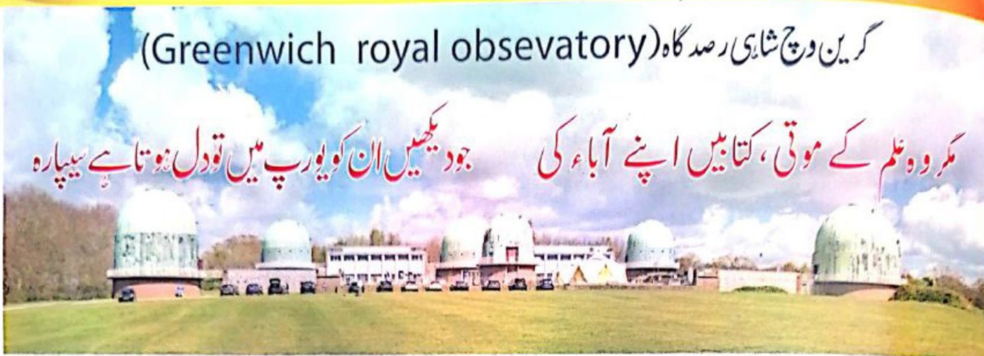




تصویر میں 45ویں متوازی خط (خط استوا) کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہاں زمین پر کوئی لائن موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ لکیریں تصوراتی ہیں، جنہیں زمین پر کسی مقام کی صحیح تعیین کے لیے کھینچا گیا ہے۔ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

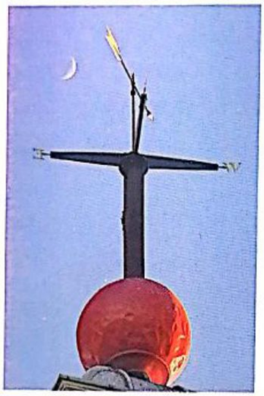
گرین وچ شاہی رصد گاہ(Greenwich royal obsevatory)

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

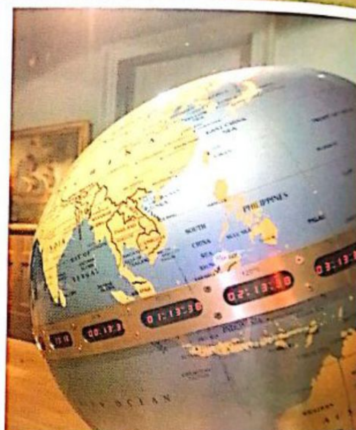




یہ گھڑی پورے 24 گھنٹے ظاہر کرتی ہے



رصد گاہ کے اوپر ٹائم بال کے نام سے موجود اس گیند میں مشرق و مغرب کی نشاندہی کی گئی ہے۔



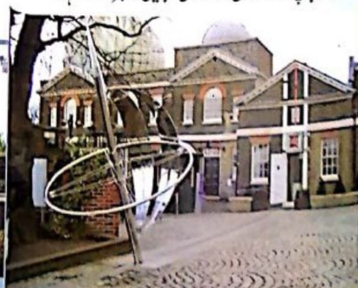
گرین وچ شاہی رصد گاہ میں موجود ڈیجیٹل گلوب، جو ہر 15 درجے پر وقت میں آنے والی تبدیلی ظاہر کرتا ہے۔



صفر درجے خط طول کو یوں ظاہر کیا گیا ہے۔



رصد گاہ میں موجود ٹیلی سکوپ

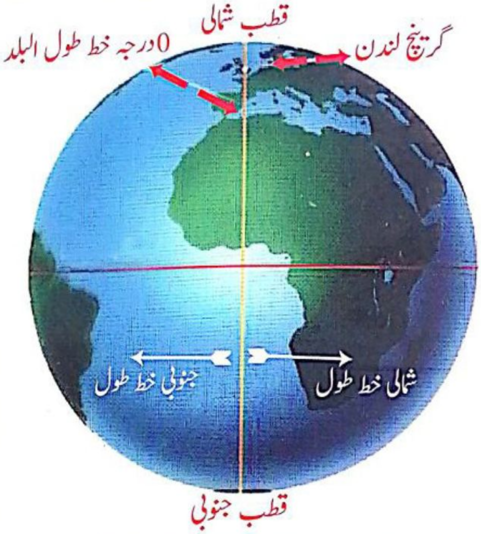


صفر درجہ خط طول پر بنایا گیا فرضی گلوب، جس میں زمین کو 23 درجے جھکا ہوا ظاہر کیا گیا ہے۔

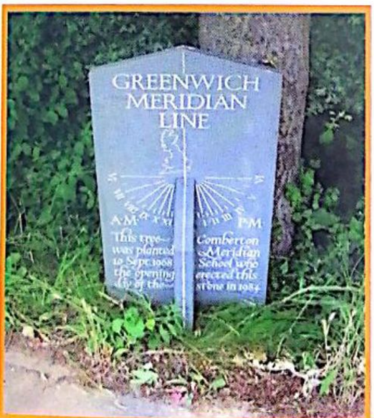
مسلمانوں کی اس فن سے لاتعلقی اور عالمی قوتوں کی دلچسپی کا کچھ اندازہ ان چیزوں کی تصاویر سے ہو سکتا ہے۔

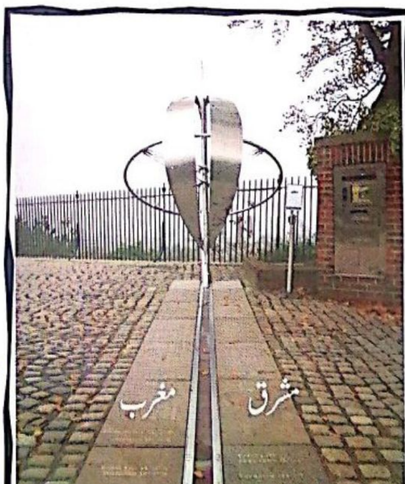
مشرق و مغرب ایک ساتھ

خط گرینچ کے درمیان باغ میں لگا ایک بورڈ جس کے دائیں طرف دنیا کا مشرق اور بائیں طرف دنیا کا مغربی حصہ ہے۔









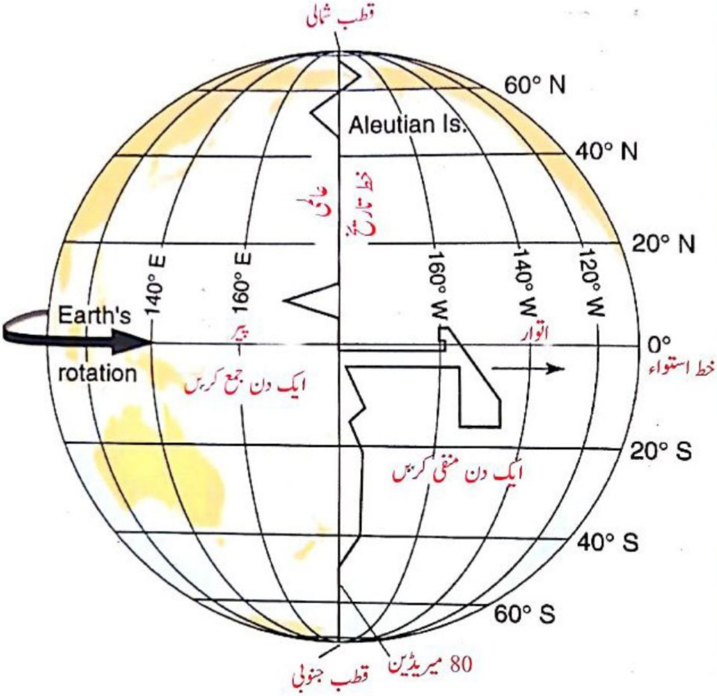
صفر درجہ خط طول

صفر درجہ طول البلد کے خط کو "خط گرینچ" کہتے ہیں۔ یہ خط شرقاً غرباً زمین کو دو مساوی حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ گرین وچ برطانیہ کی شاہی رصد گاہ ہے۔ اس میں ایک باغ میں ایک تار گذرتا ہے، جسے مبدا طول فرض کیا گیا ہے۔ یہاں یہ خط مستقیم ہے، لیکن یہی خط جب پیچھے کی طرف گھومتا ہے تو منحنی ہو جاتا ہے اور وہ "عالمی خط تاریخ" کا خط کہلاتا ہے۔

180درجہ خط طول: عالمی خط تاریخ

نقشہ خوانی

زمین پر صفر درجہ طول البلد کا خط گرینچ کو فرض کیا گیا ہے۔ صفر درجہ طول البلد سے بالکل دوسری جانب 180 درجہ طول البلد پر جو خط کھنچا ہوا ہے، یہ "عالمی خط تاریخ" کہلاتا ہے۔ لندن میں جس وقت دن کے بارہ بج رہے ہوں تو یہاں رات کے بارہ بجے ہوتے ہیں۔ سورج جیسے ہی اس خط کو پار کرتا ہے، تاریخ بدل جاتی ہے۔ اس کو ٹیڑھا اس لیے کیا گیا ہے کہ سیدھا لانے میں ایک ہی ملک میں دو تاریخیں ہو جاتیں۔ اس سے بچنے کے لیے اسے ٹیڑھا کیا گیا۔



دو دن ایک فٹ کے فاصلے پر

ان دو بورڈوں کے درمیان موجود خلا ہی "عالمی خط تاریخ" ہے۔ اس بورڈ کے بائیں طرف اگر آج اتوار ہے تو دائیں طرف پیر کا دن ہوگا۔ اگر آپ اس طرح کھڑے ہوں کہ آپ کا دایاں پاؤں دائیں بورڈ کی طرف اور بایاں پاؤں بائیں بورڈ کی طرف ہو تو آپ بیک وقت دو دنوں میں کھڑے ہوں گے۔



نقشے میں دیے گئے پیمانے (Map Scale) کی مدد سے سطح زمین پر موجود کوئی سے دو مقامات کے درمیانی فاصلے کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً دو مقامات کا درمیانی فاصلہ ایک میل ہے تو نقشے پر ایک میل لمبا خط کھینچنے کے بجائے زمین کے ایک میل یا کلومیٹر کو نقشے کے ایک انچ یا سینٹی میٹر کے برابر مان لیا جائے گا۔ پیمانے کی تین قسمیں ہیں:

1

عبارتی پیمانہ

پیمانہ کو عدد کی شکل میں بھی تحریر کیا جاتا ہے۔ اسے عبارتی پیمانہ کہتے ہیں۔

ایک انچ =25 میل

ایک سینٹی میٹر =25 کلومیٹر

2

کسری پیمانہ

پیمانہ کو کسری شکل (جس میں شمار کنندہ ایک اور نسب نما کئی گنا ہوتا ہے) میں بھی لکھا جاتا ہے۔

$$\frac{\text{نقشوں میں فاصلہ}}{\text{زمین پر فاصلہ}} \qquad \frac{\text{Map Distance}}{\text{Ground Distance}}$$

کسری پیمانہ لکھنے کے مختلف طریقے

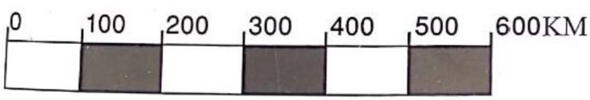
1- $\frac{1}{63360}$ 2- 1:63,360 3- 1/63,360

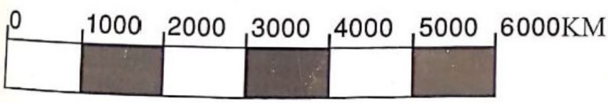
4- 1/One million 5- 1/5 million

3

خطی پیمانہ

ایک سیدھی لکیر کھینچ کر اسے ابتدائی اور ثانوی حصوں یعنی کلومیٹر اور میٹر ظاہر کرنے والی لکیروں میں تقسیم کرنا۔





سطح سمندر سے زمین کی بلندی ظاہر کرنے والے چھ معیاری رنگ

فٹ	میٹر	رنگ
10,000فٹ سے بلند	3،048 میٹر سے بلند	گہرا بھورا
5,000تا10,000فٹ	1,524تا3,048 میٹر	ہلکا بھورا
2,000تا5,000فٹ	610تا1,524 میٹر	نارنجی
1,000تا2,000فٹ	305تا610 میٹر	پیلا
500تا1,000فٹ	152تا305 میٹر	ہلکا ہرا
0تا500فٹ	0تا152 میٹر	گہرا ہرا

سمندر کی گہرائی ظاہر کرنے والے چار معیاری رنگ

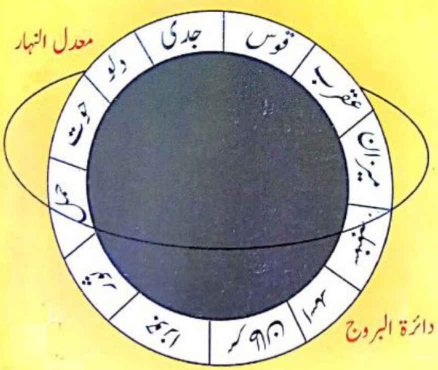
0- 200	
200 - 4 000	
4 000 - 8 000	
Below 8 000	8000 میٹر سے نیچے

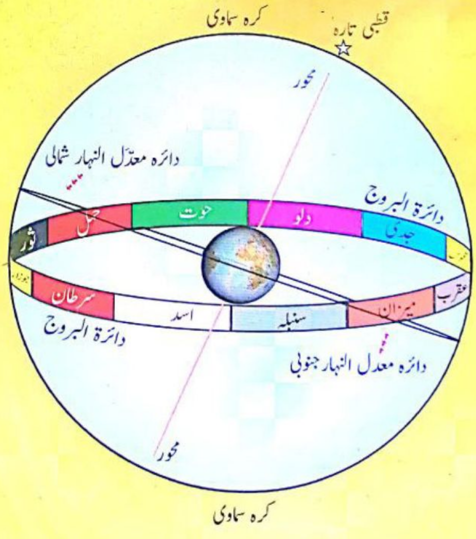
سمندر کی گہرائی کو نیلے رنگ سے ظاہر کیا جاتا ہے، زیادہ گہرائی کے لیے گہرا نیلا، کم گہرائی کے لیے کم نیلا اور یوں رنگ ہلکا ہوتا جاتا ہے۔

نقشہ خوانی



زمانہ قدیم سے ماہرین علم فلک دائرۃ البروج کو بارہ برابر ٹکڑوں میں منقسم کرتے ہیں۔ یعنی دائرہ بروج میں بارہ مساوی قوس فرض کرتے ہیں۔ ہر ٹکڑے اور قوس کا نام انہوں نے برج رکھا ہے۔ ان میں سے چھ بروج معدل النہار (یعنی آسمان کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرنے والے خط سے) شمالاً واقع ہیں اور باقی چھ بروج معدل نہار سے جنوباً واقع ہیں۔ مدارِ ارض کے محاذات میں آسمان پر بننے والا دائرہ "دائرۃ البروج" کہلاتا ہے۔

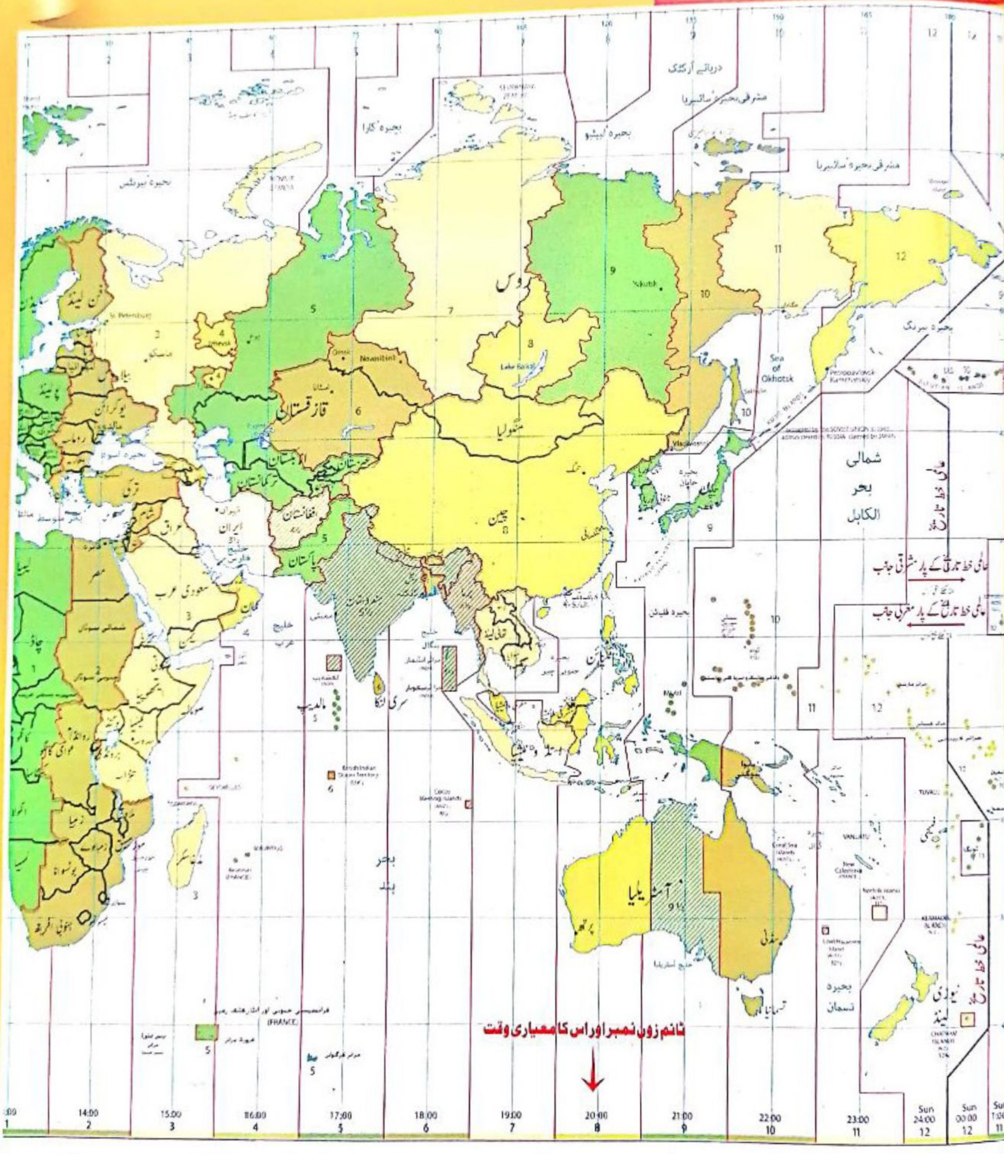




Standard Time Zone

15

معیاری منطقہ وقت



مشرق

مقامی وقت سے عالمی وقت تک: مربوط عالمی وقت (UTC) حاصل کرنے کے لیے ٹائم زون کے نمبر کو مقامی وقت سے منفی کریں

عالمی وقت سے مقامی وقت تک: مقامی وقت حاصل کرنے کے لیے ٹائم زون کے نمبر کو عالمی وقت (UTC) میں جمع کریں

Standard Time Zone 16 معیاری منطقہ وقت



مغرب

مقامی وقت سے عالمی وقت تک: مربوط عالمی وقت (UTC) حاصل کرنے کے لیے ٹائم زون کے نمبر کو مقامی وقت میں جمع کریں

عالمی وقت سے مقامی وقت تک: مقامی وقت حاصل کرنے کے لیے ٹائم زون کے نمبر کو عالمی وقت (UTC) سے منفی کریں



کتاب کے ساتھ سی ڈی بھی دستیاب ہے
اس سی ڈی میں دروسِ جغرافیہ کے علاوہ جغرافیہ
اور فلکیات کے مفید سوفٹ ویئرز جمع کیے گئے ہیں

فن جغرافیہ سے اسلامی جغرافیہ تک
تاریخ و جغرافیہ ساتھ ساتھ

یہ کتاب

تدریسی نصاب کے لیے بھی اور غیر نصابی مطالعے کے لیے بھی

اسے تدوین کے معروف اصولوں کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے، لیکن اندازِ بیاں ایسا رکھا گیا ہے کہ عوام و خواص کے لیے یکساں مفید ہو۔

جو چیز آپ حرفوں میں پڑھیں گے، ہر باب کے آخر میں نقوش میں بھی پائیں گے.

جو کچھ تصنیفی انداز میں ہے، "دروسِ جغرافیہ" کی شکل میں درسی انداز میں بھی ہے.

معلومات جدید ترین اور معیاری، طرز و انداز عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق.

مدرسین کے لیے مانوس و معروف اور طلبہ کے لیے پیچیدگیوں اور الجھنوں سے پاک دل نشین مواد.

64 رنگین صفحات: 50 سے زائد تصویریں، 100 کے قریب نقشے.

ایک ایسی کاوش جسے جامع اور آسان بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے